ہماری ویب ڈیجیٹل بک

اسرار احمد راجہ

ASRAR AHMED RAJA

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

HAMARI WEB.com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Asrar Ahmed Raja"
at Hamariweb.com

شہید کشمیر مقبول بٹ

مقبول بٹ شہید کے یوم شہادت پر بہت سے لکھنے والوں نے بٹ شہید پر لکھے گئے پچھلے مضامین اپنے کمپیوٹرز میں محفوظ رکھے ہونگے جنھیں نکال کر تھوڑے بہت اضافے منہائی فقروں کے ساتھ انھیں پھر اخباروں کی زینت بنا دینگے۔ کچھ ان پڑھ وزیر مشیر اپنے تنخواہ دار سکول ماسٹروں اور لفافہ صحافیوں سے لفاظی سے بھرپور مضامین لکھوا کر اخباروں کے حوالے کرکے جمہوریت اور کشمیریت کا حق ادا کرینگے۔ آزاد کشمیر میں پریس کانفرنس ہونگی۔ شاید کچھ سیمینار بھی ہوں مگر جلسے جلوس ضرور ہونگے۔ محاذ رائے شماری، حریت کانفرنس اور خود مختار کشمیر والے ان جلوسوں کو رونق بخشیں گے۔ جبکہ جماعت اسلامی والے بھی اپنا حصہ ڈالیں گے۔ مجھے خطرہ ہے کہ پیپلز پارٹی والے مقبول بٹ شہید کو بھٹو شہید کا ساتھی نہ کہہ دیں چونکہ چند دن قبل وزیر اعظم پاکستان نے انکشاف کیا ہے کہ پیپلز پارٹی کی بنیاد ہی مسئلہ کشمیر پر رکھی گئی تھی۔ موصوف کتنے بے خبر ہیں ؟ انھیں لاہور میں گنگا طیارے کی تباہی اور پھر محاذ رائے شماری والوں پر لاہور قلعے کے عقوبت خانوں میں ہونے والے مظالم یاد نہیں رہے ؟ کہ یہ سب پیپلز پارٹی کی حکومت کے ہی کارنامے تھے۔ دلائی کیمپ ، میانوالی جیل اور اٹک قلعے میں مسئلہ کشمیر کے حامیوں کا جو حشر بھٹو شہید کے دور میں ہوا اس

سے خود تحریک آزادی کشمیر کی بنیادیں اکھڑ گئیں جبکہ شملہ سمجھوتے نے مسلہ کشمیر کی بنیاد ہی ختم کر دی۔ بھٹو شہید کے بعد ضیاالحق نے بھی اس مسئلے کو مسلہ سمجھا ہی نہیں جبکہ رہی سہی کسر مشرف شاہ صاحب نے نکال دی جس کو مزید توسیع زرداری ٹولہ بخش رہا ہے۔

مقبول بٹ شہید کے متعلق ایک روائتی مضمون لکھنا میرے نزدیک بدیانتی ہے۔ شہید کشمیر مقبول بٹ نہ روائتی لیڈر اور نہ ہی سیاستدان تھا۔ بٹ کی زندگی انوکھی اور اجلی تھی۔ بٹ ایک تناور اور سایہ دار درخت تھا جسکے سائے میں مجاہدوں کی ایک جماعت ہی نہیں بلکہ ایک نسل پل کر جوان ہوئی اور آزادی کی حرمت پر کٹ مری بٹ ایک چشمے کا نام ہے جسکی بوند بوند آب حیات ہے۔ بٹ ایک روح ہے جسنے تحریک آزادی کے بے روح جسم کو جان بخشی اور خود امر ہوگیا۔ بٹ ہوس اور حرص سے متبرک فضاء کا نام ہے جہاں شہیدوں کی روحیں قیام کرتی ہیں بٹ ایک روائت کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے سچ کی روشنائی سے تاریخ میں لکھ دیا گیا ہے۔

بٹ شہید جیسے بے مثال اور غیر روائتی کردار پر لکھنا آسان نہ ہوا تو میں نے کتابوں کا سہارا لیا اور درجن کتابوں کے ورق الٹنے کے بعد کوئی ایک فقرہ بھی بٹ کی زندگی سے مطابقت کرتا نہ ملا انٹرنیٹ پر کل جماعتی حریت کانفرنس

لبریشن فرنٹ، مسلم کانفرنس پی جبکہ مقبول بٹ کی جگہ امان اللہ اور یٰسین ملک، براجمان ہیں۔ آزاد کشمیر کی ساری جیالی کابینہ نے کسی نہ کسی طرح اپنا رشتہ تحریک آزادی سے جوڑ رکھا ہے اور کھانے پینے کے نئے وسائل تلاشنے کے لیے آزادی بزنس کی ڈیلر شپ لے رکھی ہے۔ اور یہ سب اشتہارات انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔

میڈیا میں امن کی آشا کا بھوت سوار ہے اور پاکستان میں جمہوری حکومت ہر حال میں بھارت کو پسندیدہ ترین ملک قرار دینے پر ڈٹی ہوئی ہے۔ وزیر تجارت اور وزیر دفاع کو تجارت کا بخار ہے جس کی دوا صرف بھارت اور امریکہ کے پاس ہے۔ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین مولانا فضل الرحمان ہیں جن کی آنکھوں پر تناظرات کا چشمہ ہے۔ وہ ہر مسئلے کو تدبیراتی نہیں بلکہ تناظراتی آنکھ سے دیکھتے ہیں جس میں مفادات کو اولیت دی جاتی ہے۔ مولانا نے حال ہی میں بیان دیا ہے کہ بھارت سے تجارت کو مسئلہ کشمیر سے منسلک نہیں کرنا چاہیے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ حکومت میں بہت لوگوں کو ان کی کوالیفیکیشن کے برعکس عہدے دیے گئے ہیں جس بنا پر ادارے تباہ ہو رہے ہیں دیکھا جائے تو اس میں حقیقت بھی ہے، مولانا فضل الرحمان کا کشمیر کمیٹی کی چیئرمینی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے سوائے فنڈز کے؟ انھیں افغان تجارت کمیٹی کا سربراہ ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ وزیر دفاع کیلیے تجارت کا محکمہ موزوں ہے چونکہ وہ ایک صنعت کار

اور تاجر ہیں۔ ان کی سروس انڈسٹری فوجی جوانوں کے بوٹ بھی بناتی ہے شائد اسی بنا پر انھیں وزیر دفاع بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے وزیر تجارت ایک مخدوم ہیں اور بنیادی طور پر وہ ایک روحانی سلسلے اور جماعت کے سربراہ ہیں جن کے لیے موزوں ترین محکمہ حج اور اوقاف کا تھا۔ مگر انھیں تجارت کا قلمدان دیکر حکومت نے پریشان کر رکھا ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بھی بھارت اور امریکہ کی چال ہے اگر موزوں ترین لوگ محکموں اور اداروں کے سربراہ ہوتے تو بھارت من مانیاں نہ کرتا۔ اور مسئلہ کشمیر سرد خانے کی نذر نہ ہوتا نہ پاکستانی میڈیا بھارتی اشتہاروں، ایکٹروں اور دانشوروں کی یلغار ہوتی اور نہ ہی ہندو کلچر اور رسومات کو پاکستانیوں پر مسلط کرنے کی کاوش ہوتیں۔ اسی سلسلے کی کڑی کچھ ٹی وی چینلز پر ستارہ وہلال کے ساتھ ترنگا لہرانا ہے۔ تاکہ پاکستانی عوام ترنگے کی اہمیت اور قوت سے واقف ہو جائیں۔ کتابوں اور انٹرنیٹ سے مایوس ہو کر میں نے سوچا کہ شہید کشمیر کی زندگی اور شہادت پر لکھنے والوں کی کیا کمی ہے۔ بہت سے روائتی اور سرکاری لکھاری حسب دستور لکھیں اور بولیں گے تو اگر میں نے نہ بھی لکھا تو کیا فرق پڑے گا؟ آخر میں مقبول بٹ کے متعلق کچھ ایسا کیوں لکھوں جو مبنی بر حقیقت ہو۔ اگر ایسا لکھوں بھی تو اسکا فائدہ کیا ہوگا، اسے کون پڑھے گا اور کس پر اسکا اثر ہوگا۔ آزاد کشمیر اور

پاکستان میں سیاسی اور حکومتی نظام پر برادریاں، فرقے، مفاد پرست عناصر اور خاندان حاوی ہیں۔ برادری ازم کو جمہوریت اور خاندانی سیاست کا نام دیا گیا ہے اور عوام کو رعایا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے خاندان، برادریاں، فرقے اور مفاد پرست پریشر گروپ جن کے مفادات بھارت سمیت ساری دنیا سے جڑے ہوئے ہیں کسی نہ کسی صورت میں حکمران بھی ہیں تو ان کی حکمرانی کے شکنجے میں جکڑی رعایا کی کیا اہمیت ہے۔
آزادی کے بیس کیمپ آزاد کشمیر کا نظام سیاست وحکومت در حقیقت نظام تجارت و خدمت ہے۔ وہ لوگ جو سیاست کے کاروبار سے منسلک ہیں ان کے بڑے ڈیلر اسلام آباد میں بیٹھ کر آزاد کشمیر کی حکومت کی بولی دیتے ہیں اور جو برادری زیادہ مال لگاتی ہے اسے حکومت سونپ کر جمہوری حکومت ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا جاتا ہے۔ جب جمہوریت تجارت اور سیاست آقاؤں کی خدمت بن جائے تو مقبول بٹ جیسے کرداروں کی بات مذاق بن جاتی ہے۔ مقبول بٹ کا سب سے بڑا قصور یہی تھا کہ انھوں نے مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی ساری آفرز ٹھکرا دیں جس میں تاحیات آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی گورنری سے لیکر کسی بھی ملک میں سفارت کاری اور دیگر مراعات شامل تھی۔ مقبول بٹ نے بھٹو کی صرف ایک آفر قبول کی اور مقبوضہ کشمیر جا کر تحریک آزادی کو دوبارہ متحرک کرنے کی ٹھان لی جسے اب کسی پاکستانی اور بھارتی لیڈر اور آزاد کشمیر کے سیاسی ڈیلر کے لیے روکنا

ممکن نہیں رہا۔

میں سوچ رہا تھا کہ مقبول بٹ کے فکر و فلسفہ پر لکھنے کے بجائے کیوں نہ آزاد کشمیر کے کسی چوہدری اور پنجاب کے کسی بٹ کا قصیدہ لکھوں ؟ مگر پھر خیال آیا کی میں نہ تو بٹ ہوا اور نہ ہی جٹ آجکل پنجاب میں بٹوں اور آزاد کشمیر میں جٹوں کی حکمرانی ہے۔ اگر بٹ ہوتا تو پنجاب میں اچھی نوکری مل جاتی اور جٹ ہوتا تو کوٹلی ڈویلپمنٹ اتھارٹی، زکوۃ کمیٹی یا پھر میونسپلٹی کا چئیر مین ہوتا۔ ایم ڈی اے میں میرے پاس.برا عہدہ ہوتا اور اب تک میں دس بارہ پلاٹ ہضم کر چکا ہوتا۔ اسلام آباد میں ایک کوٹھی اور لینڈ کروزر گاڑی ہوتی اور رعایا میرے گھر کے سامنے لائنیں لگا کر بیٹھی ہوتی۔

ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ من کی وادی میں آواز آئی اے کاش تو ایک اچھا انسان ہوتا؟ کیوں ، میں اچھا انسان نہیں ہوں ؟ میں نے خود کو جواب دیا۔ پھر آواز آئی قرآن پڑھو، میں نے کہا۔ من بولا قارون کا واقعہ پڑھو۔ میں نے اٹھ کر قرآن کھولا تو لکھا تھا کہ قارون کے خزانے اور عیش و آرام دیکھ کر لوگ کہتے خواہش کرتے تھے کہ اے کاش ہم بھی قارون کی طرح ہوتے ہمارے پاس وسیع باغ اور ذرخیز زمینیں ہوتیں۔ غلاموں اور کنیزوں کے غول ارد گرد خدمت کی لیے منڈلاتے ، لوگ ہمارے ، قصیدے لکھتے اور پڑھتے ، ہمارے محل اور مکان ہوتے

سواریوں کے لیے عمدہ گھوڑے اور آرام دہ کشتیاں ہوتیں۔ ہم قارون کی طرح عیش کرتے۔ پھر رب کے بندے نے قارون کو مخاطب ہو کر کہا اے نفس کے غلام اللہ نے تجھے کیا کچھ نہیں دیا مگر تم متکبر اور ناشکرے ہو۔ تم اپنے مال سے رب کو حصہ نکالو اور اس کی راہ میں خرچ کرو۔ قارون نے تکبر کیا اور بولا اس میں رب کا کوئی کمال نہیں یہ میری محنت کا صلہ ہے۔ یہ سب میری کمائی ہے۔ اس پر صرف میرا حق ہے پھر رب کا عذاب نازل ہوا اور زمین دھنسنے لگی قارون کی ریاست، حکومت، باغ، محل سب غرقاب ہونے لگے تو وہ لوگ جو اس کے مال کو دیکھ کر کاش کہتے تھے اب ان لوگوں نے کہا اچھا ہوا ہم قارون کی طرح نہ تھے ورنہ ہم بھی غرق ہو جاتے۔

اس سے پہلے کہ من کی وادی سے کوئی آواز آتی میں من کی بات سمجھ گیا، بٹ نے حکمرانی ٹھکرائی اور شہادت پائی۔ اس نے اسلام آباد میں ایک بڑی کوٹھے میں رہنا ٹھکرا دیا اور تہاڑ جیل کی کال کوٹھڑی میں رہا۔ اس نے بھارتی حکمرانوں کی آفرز بھی ٹھکرا دی اور عزت و آزادی کا پرچم تھامے رکھا۔ اس کی بیگمات اور بچے کسمپرسی کی حالت میں رہے، مگر کسی حکمران سردار اور چوہدری کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو جس نے ٹانڈا ڈیم ریسٹ ہاؤس کوہاٹ میں طویل مزاکرات کے دوران شہید کشمیر کو تحریک آزادی کشمیر سے دستبرداری پر قائل کرنے کی کوشش کی اور پھر ناکامی پر اسے سرینگر جا کر تحریک کو منظم

کرنے کا جھانسہ دیا یکسر مقبول بٹ اور اس کے خاندان کو بھول گیا۔ کسی مجاہد اول اور آخر نے مقبول بٹ بے آسرا خاندان کی خبر نہ لی۔

وہ سب مادی فوائد جو مقبول بٹ ٹھکرا کر سرینگر گیا آج اسے سمیٹنے اور تحریک آزادی سے عملاً دستبرداری کیلیے ایک نہیں بلکہ سینکڑوں ڈیلر اور آزادی بزنس کے سوداگر اسلام آباد کے ایوانوں کے سامنے بیٹھے بولی کے منتظر ہیں۔ یہ ڈیلر اور سوداگر اسمبلی ٹکٹ، وزارت اور مشاورت سے لیکر صدارت تک خریدنے اور سارا آزاد کشمیر بیچنے کیلیے تیار ہیں۔ یہ جس مہاراجہ کے ظلم و جبر کی کہانیاں سنا کر روٹیاں کھاتے ہیں عملاً اسی کے پیروکار ہیں۔ جس طرح ڈوگرے اور سکھ اپنی برادریوں اور رشتہ داروں کو قومی خزانے سے نوازتے تھے آج جیالے اور متوالے ان سے بڑھ کر اقربا پروری کرتے ہیں اور شرماتے بھی نہیں۔ اسمبلیوں کی سیٹیں خاندانوں سے منسوب ہیں اور وزارتیں بولی پر ملتی ہیں کہتے ہیں کہ ایمن آباد کے دیوانوں کے پاس بہت پیسہ تھا۔ ڈوگروں نے جب انگریز سے کشمیر خریدا تو رقم ایم آباد کے دیوانوں سے ادھار لی۔ آج یہی حال آزاد کشمیر کا ہے۔ الیکشن سے پہلے کشمیری ڈیلر برطانیہ اور یورپ کا دورہ کرتے ہیں اور اپنی اپنی برادریوں سے سود پر رقم لیکر الیکشن جیتتے اور پھر سود سمیت اصل زر قومی خزانے سے نکال کر واپس کر دیتے ہیں۔

دیکھا جائے تو آج آزادی کا بیس کیمپ نیلامی کا اڈہ بن چکا ہے۔ آزاد کشمیر کی حکومت کے بدلے سیاسی ڈیلروں نے گلگت و بلتستان کا سودا کیا اور اب وزیر اعظم آزاد کشمیر نے فرمایا کہ کچھ لوگوں کے پیٹوں میں بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینے کا خواہ مخواہ مروڑ پڑ رہا ہے۔ جس ملک کے وزیر اعظم کی یہ حالت ہو وہاں کی کابینہ کی سوچ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ وہ لوگ جو کشمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کے پلاٹوں کی بندر بانٹ کے اشتہار گلوں میں سجائے گلیوں میں پھر رہے ہوں ان کے آگے شہید کشمیر کے فلسفہ و فکر کی بات کرنا بھینس کے سامنے بین بجانے کے مترادف ہے۔ پھر وہ لوگ جو نسل در نسل بھینسیں ہی، چوری کرتے اور بیچتے رہے ہوں جب حکمران بن جائیں تو ان کیلیے انسانوں اور حیوانوں میں فرق کرنے کی تمیز نہیں رہتی۔

گل مزن کا گل مزن دیوار بے بنیاد را

خدمت یک سگ نہ از آدم کمزاد را

آدم کمزاد گر عاقل شود

گردن زدن استاد

عزتِ سادات

شاہ صاحب گاؤں کی چھوٹی سی مسجد میں بیٹھے نمازیوں سے مخاطب تھے اور بڑی سادگی سے حاضرین کے سوالات کے جواب دے رہے تھے کہ ایک نوجوان نے عجیب وغریب سوال کردیا، جس سے حاضرین پر سکتہ طاری ہوگیا۔ نوجوان نے پوچھا کہ "شاہ جی اس بات کی کیا دلیل ہے کہ آپ سید ہیں"۔ حاضرین حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے کہ بوڑھے شاہ صاحب کو نوجوان نے شرمندہ کردیا ہے اور شاید شاہ صاحب کے پاس اسکا جواب بھی نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے کہ پریشانی بڑھ جاتی شاہ صاحب نے نوجوان کو اپنے قریب بلایا، دلاسہ دیا، شکریہ ادا کیا اور پھر بولے: "دیکھو! ہم یہاں کئی پشتوں سے آباد ہیں، لوگ ہمیں سید مانتے ہیں، دینی اور شرعی مسائل پوچھتے ہیں، عزت واحترام سے پیش آتے ہیں مگر آج تک ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ کوئی ہم سے ہمارے سادات ہونے کی دلیل مانگے"۔ پھر کہنے لگے کہ "دینی مسائل ہم سے بہتر بیان کرنیوالے عالم دین، مفتی اور مفکر ہر روز ریڈیو اور ٹیلیویژن پر آتے ہیں اور اُن میں کچھ سید بھی کہلواتے ہیں مگر کبھی کسی سننے اور دیکھنے والے نے یہ سوال نہیں اُٹھایا، حالانکہ یہ سوال بنیادی اور ضروری ہے"۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ سوال حضور ﷺ سے ان کے اصحاب نے بھی پوچھا کہ "یا رسول اللہ ﷺ آپ کی اولاد کی پہچان کیا ہوگی؟۔ آپ ﷺ کی اولاد سے مراد اہل بیت ﷺ

تھے جن کی نسل حضرت امام حسنؑ و حسینؑ سے چلی۔ آپ ﷺ نے فرمایا "میری نسل کی چار نشانیاں ہونگی، اول صاحب علم وبصیرت ہونگے، دوئم سخی وبُردبار ہونگے، سوئم خوش شکل وخوش گفتار ہونگے اور آخر میں فرمایا رحم کرنیوالے اور درگزر کرنیوالے ہونگے۔

شاہ صاحب نے ان چار نشانیوں کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ "میں علم کا گھر ہوں اور حضرت علیؑ اسکا دروازہ ہے"۔ یہ علم ظاہری بھی تھا اور باطنی بھی۔ آپؑ کے ظاہری علم کی میں چند مثالیں آپ لوگوں کی سہولت کیلئے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آپ میری باتیں آسانی سے سمجھ سکیں۔ حضرت علیؑ سے بڑھ کر آج تک کوئی ماہر فلکیات اس دنیا پر پیدا نہیں ہوا۔ آپؑ نے ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کے متعلق جو بیان فرمایا آج کی جدید سائنس اُس سے ایک قدم آگے نہیں جا سکی، اس طرح آپؑ نے زمین کی گردش، موسموں کی تبدیلی اور دیگر تغیر وتبدل کے متعلق جو پیشن گوئیاں فرمائیں وہ وقت کے ساتھ سچ ثابت ہو رہی ہیں۔ تاریخ میں ہے کہ آپؑ نے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا اور فرمایا کہ "یہ لڑکی بانجھ ہے"۔ اصحاب پاکؓ نے تحقیق کی تو بات سچ ثابت ہوئی، اس پر کچھ فتنہ پردازوں نے شور مچایا کہ آپؑ غیب کا علم جانتے ہیں۔ آپؑ نے فوراً اُن لوگوں کو طلب کیا اور سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ غیب نہیں بلکہ انسانی علم ہے"۔ یہ وہی علم ہے جسے آج ہم بائیالوجیکل سائنس

کہتے ہیں۔ آج جتنے ظاہری سائنسی علوم اس کائنات میں موجود ہیں انکی تشریح حضرت علیؓ نے ظاہری قرآنی علوم سے کی۔ کسی نے پوچھا "اے علی کرم اللہ وجہہٗ آپ نے یہ علم کس سے اور کیسے سیکھا"۔ آپؓ نے فرمایا کہ "اونٹنی کا بچہ ماں کے قدموں کے نشانات پر قدم رکھ کر چلتا ہے، میرا تعلق حضور اکرم ﷺ سے بھی ایسے ہی تھا جو حضور ﷺ نے کہا میں نے سیکھ لیا"۔ حضرت علیؓ ظاہری و باطنی علوم کا چشمہ تھے، آپؓ کی اولاد کی مثال بھی ایسے ہی ہے کہ جو کہ اس چشمے سے نکلنے والی ندیاں، نہریں اور دریا۔ ندیاں وہ ہیں جنکا تعلق تو خانوادہ رسول ﷺ سے ہے مگر زیادہ محنت نہ کی۔ نہریں اور دریا وہ ہیں جو راہ حق کے متلاشی ہوئے اور اپنے حسب ونسب پر قائم تزکیہ و مجاہدہ سے اعلیٰ ترین روحانی منصب پر فائز ہوئے، حسب و نسب کا خیال ہر انسان کی فطرت میں ہے، حضرت میاں محمد بخش فرماتے ہیں کہ

کمی تے کنگال کمینے اے گل کہنہ نہ بھاوے، دیہی چوڑے دی سید منگے تے او دیندا" شرماوے"۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ "حسب ونسب کے خیال واحترام کے ضمن میں اس سے بہتر مثال میرے علم میں نہیں۔ اگر کمی اور نیچ پیشے سے منسلک شخص کو اپنی ذات، نسل اور نسب سے اتنا لگاؤ ہے کہ وہ اپنی بیٹی سید کو دینے پر شرمندہ ہوتا ہے تو سید یہ کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ اسکی اولاد رقص و موسیقی کے پیشے.

اختیار کرے اور پھر اپنے نام کے ساتھ سید بھی لکھے۔ کوئی شخص ولی، پیر اور مخدوم بھی بنا پھرے اور جھوٹ، فریب، ریاکاری، بدعہدی اور بداخلاقی کا بھی مرتکب ہو، شاہ صاحب نے کچھ سوچا اور پھر بولے:۔ سنو میرے بھائیو! اور اہل بیت کی تاریخ پڑھو، خاتون جنت سیدہ فاطمہؓ کے در پر سوالی آتا ہے اور ہاتھ پھیلاتا ہے مگر گھر میں کچھ بھی نہیں، حسینؓ اور شیر خداؓ فاقے سے ہیں مگر سیدہؓ نے سوالی کو خالی ہاتھ نہ جانے دیا اور اپنی چادر دیکر کہا کہ فلاں یہودی کی دکان سے یہ چادر خریدی تھی اسے واپس کرکے اپنے لئے کچھ رقم لے لو۔ یہودی نے سوالی کو رقم تو دیدی مگر چادر نہ خریدی اور کہا کہ یہ چادر سیدہؓ کو واپس کردو۔ سوالی واپس آیا تو خاتون جنتؓ نے فرمایا کہ "جاؤ اور چادر یہودی کو دیدو اور کہو کہ نبی ﷺ کے گھر سے کوئی سوالی خالی ہاتھ نہیں جاتا اور نہ ہی ہم دی ہوئی چیز واپس لیتے ہیں۔ اس واقعہ نے یہودی کے دل پر اثر کیا اور وہ مسلمان ہوکر اصحاب رسول ﷺ میں شامل ہوگیا۔

دوستو! غور کرو اور سوچو کہ سیدہؓ جیسی سخی، بُردبار، رحمدل اور اعلیٰ کردار ماں کی اولاد کیسی ہوگی، وہ لوگ جو دن رات لوٹ مار کرتے ہیں، سیاست کو کاروبار سمجھ کر عوام الناس کی جیبیں خالی کرتے ہیں، جن کے سوٹ اور بوٹ فرانس سے سِل کر آتے ہیں وہ اہل بیت کیسے ہوسکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں اور اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے:۔ حسنؓ اور حسینؓ کا

مطلب ہی حسن وجمال کا پیکر ہے۔ یہ نام حضور پرنور ﷺ نے خود رکھا تو آپ ﷺ کی اولاد اس وصف سے مبرا کیسے ہو سکتی ہے۔ دوستو تاریخ گواہ ہے کہ غزوات میں سب سے زیادہ کفار حضرت علیؑ کی تلوار کی زد میں آئے اور واصل جہنم ہوئے۔ کفر واسلام کے درمیان ہونیوالے ان معرکوں میں صرف دو آدمی علیؑ سے بچ گئے اور آپؓ نے اُنہیں چھوڑ دیا۔ ایک وہ شخص جس نے خوف کی وجہ سے آپؓ پر تھوک دیا اور دوسرا جس نے تلوار پھینک دی اور اپنا کُرتہ اُتار کر بھاگ پڑا۔ حضرت علیؑ سے اصحاب رسول ﷺ نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ پہلا موت سے خوفزدہ ہوا اور مجھ پر تھوک دیا، اگر میں اُسے مار دیتا تو یہ ذاتی انتقام ہوتا جبکہ میری تلوار صرف اسلام کی سربلندی کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ دوسرا بُزدل تھا اور ہتھیار پھینک چکا تھا اسلئے ایک نہتے اور ہارے ہوئے شخص پر وار کرنا بھی درست نہیں۔

دوستو آج یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ سادات ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اپنے ناموں کے ساتھ سید، گیلانی، ہاشمی، قریشی اور پتہ نہیں کیا کیا لکھتے ہیں، اُنکی ذاتی زندگیوں میں خانوادہ رسول ﷺ کا ایک بھی وصف نہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ یزید نے حضرت امام حسینؓ کے اخراجات کیلئے لاکھوں دینار وظیفہ مقرر کیا جو موجودہ دور میں کروڑوں کے حساب سے تھا مگر آپؓ نے یزید

کا وظیفہ مسترد کر دیا اور اس بات کی تحقیق پر چل نکلے کہ یزید کے متعلق جو خبریں دمشق سے آ رہی ہیں کیا وہ واقعی درست ہیں یا نہیں۔ آپؓ نے ایک فاسق و فاجر حکمران کا وظیفہ خور بننے پر اکتفا نہ کیا اور میدان کربلا میں اسلام کی سربلندی اور اپنے نانا کی شریعت مطہرہ کی عظمت پر اپنی جان قربان کر دی۔

دوستو! آج میں ٹیلیویژن پر اور اخبارات میں اُن لوگوں کی کرپشن، لوٹ گھسوٹ اور بدعہدی کی خبریں سنتا اور پڑھتا ہوں تو دکھ ہوتا ہے کہ انہیں ذرہ بھر شرم بھی نہیں آتی کہ وہ اپنا تعلق تو اہل بیت سے جوڑتے ہیں اور عمل یزید سے بھی بدتر کرتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ اہل بیت کبھی اقتدار کے پیچھے نہیں بھاگے اور نہ ہی اہل اقتدار کے غلط رویوں کی تائید کی ہے۔ اہل بیت کبھی دربان اور درباری نہیں بنے۔ فقر اہل بیت کا فخر رہا ہے اور اسی فخر کی عظمت کا علم بلند کرنے کی خاطر آل رسول ﷺ نے ہمیشہ قربانیاں دی ہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ آج اہل بیت سے تعلق کا دعویٰ کرنیوالے اقتدار پر فخر کرتے ہیں اور مادی لالچ اور حرص پر قربان ہوئے جا رہے ہیں۔ آپ نے تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ حضرت امام رضاؓ خلیفہ ہارون الرشید کے داماد تھے، آپؓ نے ہارون الرشید کے شاہی محلوں اور آسائشوں کو ترک کیا اور صحرا نشینی اختیار کی۔ آج نہ ہارون الرشید کے محل ہیں نہ باغات اور اقتدار مگر

حضرت عالی مقام امام رضاؓ کا روحانی اقتدار پوری شان و شوکت سے قائم دوائم ہے۔
حضرت پیر مہر علی شاہؒ نے اُسوقت تک اپنے نام کے ساتھ گیلانی نہ لکھا جب تک اس بات کی تحقیق نہ کرلی کہ آپؒ کا سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے۔ آپؒ کی تحقیق و جستجو دیکھئے شیخ پیران پیر کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے سادات نے بغداد سے اپنا ایلچی گولڑہ شریف بھجوایا اور اس بات کی تصدیق کی کہ گولڑہ شریف اور حسن ابدال کے سادات کا تعلق شاہ گیلانیؒ سے ہے۔ حسن ابدال کے سادات حضرت پیر مہر علی شاہؒ کے ننھیال اور سسرال تھے اور دونوں گھرانے حسنیؓ و حسینیؓ ہیں۔
حضرت پیر مہر علی شاہؒ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنے والے مجاہد اسلام تھے، آپؒ نے سکھوں، انگریزوں، قادیانیوں اور مقامی بااثر لوگوں سے علمی اور عقلی محاذ پر جہاد کیا اور فتح یاب ہوئے، سکھ آپ کے اجداد سے ٹکرائے تو اقتدار سے محروم ہوگئے، انگریزوں نے مقامی لوگوں اور قادیانیوں کی ایماء پر آپؒ سے ٹکر لی تھی، آپؒ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انگریز نے آپ کے خاندان کو طرح طرح کے مادی لالچ دیئے مگر آپ نے سنت حسینؓ پر عمل کرتے ہوئے اقتدار اور اہل اقتدار کو اپنے پاؤں کے ٹھوکر پر رکھا۔ آپؒ کے کسی مرید نے جو

سرکاری عہدے پر فائز تھا آپ کو اطلاع دی کہ انگریز حکومت نے فیصلہ کرلیا ہے کہ آپ کو خاندان سمیت جلاوطن کردیا جائے، جناب مہر علی شاہؒ صاحب مسکرائے اور فرمایا: "انگریز خود جانیوالے ہیں، ہمیں کیا جلاوطن کریں گے"۔ کچھ ہی عرصہ بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ انگریز کا اقتدار ختم ہوگیا۔ آپؒ حج پر تشریف لے گئے تو کسی مجبوری کے تحت عشاء کی سنتیں ترک کردیں۔ اُسی رات حضور ﷺ خواب میں آئے اور فرمایا: "خانوادہ رسول ﷺ کیلئے ترک سنت منع ہے"۔ آپ فوراً اُٹھے اور سنتیں ادا کیں۔

دوستو! سید ترک سنت کرے تو اس پر پکڑ ہوتی ہے چہ جائیکہ سید کہلوانے والے انگریزوں سے جاگیریں لیتے پھریں اور پھر فخر سے انگریزی اقتدار میں شمولیت کا بیان کریں، سیدوں کیلئے بلدیہ کی چیئرمینیاں اور انگریز کی عطاء کردہ آسائشیں حاصل کرنا ثابت کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کا خانوادہ رسول ﷺ سے کوئی تعلق نہیں، اگر کہیں تھا تو وہ اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے مرتبے اور مقام سے گر چکے ہیں۔

اُس دن آکڑ تے مغروری نِکل جاسی سب تیری
جدوں کہیا محمد سرور ﷺ اے نئیں اُمت میری

آخر میں شاہ صاحب نے حضرت میاں محمد بخش کا یہ شعر پڑھا:

خاصیاں دی گل عاماں اگے نئیں مناسب کرنی
مٹھی کھیر پکا محمد کُتیاں اگے دھرنی

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے

سولہ (16) مئی کے روزنامہ نوائے وقت میں آزاد کشمیر کے نامور اور سینئر صحافی جناب رشید ملک کا کالم آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کے خدشات © شائع ہوا۔ جناب ملک نے فرمایا کہ سردار عتیق احمد خان نے جہلم میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ موجودہ حکومت بھارت کو خوش کرنے کے لیے جلد ہی آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کی سازش کر رہی ہے۔ اس انکشاف کے بعد سینئر کالم کار نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے حوالے سے تھوڑی قلم کشائی بھی کی کہ بھٹو مرحوم کی بھی یہی خواہش تھی مگر جناب مجاہد اول ان کے راستے میں حائل ہو کر ان کی خواہش کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔

موصوف سرادار عبدالقیوم خان اور ان کے خاندان سے خصوصی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ملک صاحب سرادر صاحب کی روحانیت کے بھی قائل ہیں اور انھیں ولی و مرشد کا درجہ دیتے ہیں۔ جناب نے سردار عبدالقیوم نے بھٹو کے حکم پر نظر بندی، جیل یاترا اور پھر پی این اے کی بھٹو تحریک جوئی کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ بھٹو نے ایک طرف تو کشمیر کے لیے ہزار سال جنگ کرنے کا عزم و ارادہ ظاہر کیا اور دوسری طرف شملہ مائدہ کی صورت میں مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح سے

اٹھا کر پنجائیت میں لے آئے۔

حیرت کی بات ہے کہ مجھ جیسے ادنیٰ قلم کار اور صحافت کے جونئر موسٹ طالب علم اس مسئلے پر کئی بار قلم و لب کشائی کر چکے ہیں کہ پاکستان میں این آر او بر سر اقتدار حکومت این آر او کی پیداوار ہے اور یہ این آر او برطانیہ اور امریکہ کا تیار کردہ ایک ایسا منصوبہ ہے جسکے ہمارے خطہ زمین پر دور رس نتائج مرتب ہوں گے۔ موجودہ حکومت نے پاکستان عوام کو جہاں بھوک، بیماری، غربت، مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، کرپشن، ہٹ دھرمی اور بے حسی کے دلدل میں دھنسا دیا ہے۔ وہی بھارت اور افغانستان کے درمیان زمینی راستے سے تجارت، بھارت کو پاکستانیوں منڈیوں تک رسائی، موسٹ فیورٹ نیشن کا خطاب دینے کا سہرا بھی اپنے سر سجایا ہے۔

این آر او کے پنوں پر کیا کیا لکھا ہے یہ ایک مخفی تحریر ہے جسے ان دیکھی سیاہی سے ہمارے سیاستدانوں کے قلب پر لکھ دیا گیا ہے۔ اسی فارموے کے تحت آزاد کشمیر میں وٹو فارمولے کے تحت جھرلو انتخابات ہوئے اور فرشتوں کے ووٹوں اور پاؤنڈوں کی قوت سے ایک جمہوری حکومت بنی جس نے پہلا کام ہی اپنی ہی عدالت کے فیصلے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے گلگت بلتستان کو صوبہ بنانے میں مدد کی اور بھارت کو موسٹ فیورٹ نیشن اور فری ٹریڈ کی بھی بھرپور حمائت کی۔

اس سلسلہ میں وزیر اعظم آزاد کشمیر، سینئر وزیر اور سپیکر اسمبلی کے بیانات ریکارڈ پر ہیں جنہیں آزاد کشمیر کے کسی سیاستدان اور لفافہ مارکہ صحافی نے چیلنج نہیں کیا کہ یہ یکطرفہ تماشہ ہمیں غلامی کی ایک اور زنجیر میں جکڑنے والا ہے۔

میرے علاوہ برادرم انوار ایوب راجہ نے برطانیہ کے اردو اخباروں اور اردو پوائینٹ پر سلسلہ وار کالم لکھے اور جس خدشات کا اظہار آج عتیق خان اور رشید ملک کر رہے ہیں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اردو پوائینٹ کے آرکائیو میں راجہ صاحب کا کالم " میرا خواب " آج بھی موجود ہے۔ جسے کشمیری طالب علم اور سیاسی کارکن پڑھ سکتے ہیں۔ انوار راجہ کی ہی کتاب "سرزمین بے آئین " میں کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے مگر دکھ یہ ہے کہ آجکل کتاب پڑھنے کا رواج ہی نہیں رہا ۔ صحافی حضرات اطلاعات بھی سیاستدانوں کے منہ سے نکلے پھولوں اور انٹرنیٹ

اطلاعات پر انحصار کرتے ہیں، جس سے حقائق پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ جہاں تک عتیق خان کا تعلق ہے تو عرض ہے کہ موصوف خود اس سازش کا حصہ ہیں ورنہ جہلم کی بجائے وہ یہی بات اسمبلی کے فلور پر کرتے، خصوصی اجلاس بلاتے اور عوام کو اس سازش کے خلاف متحرک کرتے۔ سردار صاحب کو پریشانی یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں جو سیٹ اپ سامنے آنے والا ہے اس میں سردار صاحب نہ گورنر ہونگے، نہ وزیر اعلیٰ یا سینئر وزیر

۔

آنے والے سیٹ اپ کی ایڈوانس بکنگ ہو چکی ہے اور پاؤنڈ مافیا ساری سیٹیں بک کروا چکا ہے۔

اگر سردار صاحب اور ان کے سابقہ ساتھی سکندر حیات اور انکے دیگر رفقاء واقعی کشمیری کاز سے مخلص ہیں تو سب سے پہلے گلگت بلتستان کا مقدمہ کراچی معاہدے کی روشنی میں عدالت میں لے جائیں اور اپنے سابقہ بیانات اور مصلحت کوشی پر کشمیری عوام سے معافی مانگیں۔ آج کشمیر کی جو سیاسی حالت ہے اس کے ذمہ دار بھی جولی چیڑھ اور فتح پور کے سردار ہیں۔ اگر سردار عتیق چانکیائی چالیں نہ چلتے تو آج ان کی پارٹی متحد ہوتی اور آزاد کشمیر میں پاؤنڈ مافیہ پوری قوت سے متحرک نہ ہوتا۔ جہاں تک یہاں نواز شریف اور عمران خان کا تعلق ہے تو وہ بھی بھارت کی خوشنودی میں پیپلز پارٹی سے پیچھے نہیں بلکہ دو قدم آگے ہیں۔ ایم کیو ایم اور اے این پی کو بھارت سے کوئی مسئلہ نہیں۔ اور دونوں جماعتوں کے بھارت کنکشن کسی سے خفیہ نہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن مفاد کی سیاست کرتے ہیں اور وہ اپنا فیصلہ عین وقت پر کرتے ہیں۔ ان کے لیے کشمیر اور کشمیریوں کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنا ان کا اور ان کی پارٹی کا مفاد ہے۔

دیکھا جائے تو آزاد کشمیر میں برادری ازم ، پاؤنڈ مافیا اور سکندر عتیق جنگ نے اچھی اور صاف ستھری کیساتھ کشمیر کاز کو عملاً تباہ کر دیا ہے۔ کشمیر کو

پاکستان کا صوبہ بننا این آر او کے خفیہ اوراق پر لکھ دیا گیا ہے اور ہمارے سیاستدان برطانیہ، امریکہ، بھارت اور کچھ عرب بھائیوں کے سامنے حامی بھر چکے ہیں۔ جس میں آزاد کشمیر کے سیاسی ڈیلر برابر کے شریک ہیں.

روشنی کی آڑ میں

چراغ تلے اندھیرا تو آپ نے سنا ہی ہوگا مگر روشنی کی آڑ میں اندھیرا ایک نئی اصطلاح آزاد کشمیر کے سرکاری دانشوروں کی اخذ کردہ ہے۔ یہ خطہ زمین جسے ہم آزاد کشمیر کہتے ہیں نہ تو آزاد ہے اور نہ ہی کشمیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ علاقہ سابقہ ریاست جموں وکشمیر کا حصہ ہے آجکل کشمیر کونسل کی زیر نگرانی متروکہ جائیداد یا جاگیر ہے جسے ہر پانچ سال بعد انتخابات کا ڈھونگ رچا کر زیادہ بولی دینے والے سیاسی ٹھیکیدار کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور پھر اس ٹھیکیدار کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس طریقے سے لوٹ مار کر کے نہ صرف اپنی لگائی ہوئی رقم بمعہ سود وصول کرے بلکہ اسے یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے عوام کو لوٹے ، مخالف برادریوں کی پولیس اور دیگر انتظامی اداروں کے ذریعے ٹھکائی بھی کرے ۔ اور آزادی بزنس کے نام پر اپنی برادری کے سرمائیہ کاروں، دوست یاروں اور وزیروں مشیروں کو عیاشیاں بھی کرائے ۔

اگر آپ اعداد وشمار کے حوالے سے دیکھیں تو آزاد کشمیر اسمبلی کے دس پندرہ ممبر اور دو چار وزیر ہمیشہ ہی بیرونی دوروں پر ہوتے ہیں اور مغربی ممالک کے عیش کدوں میں جام غم لنڈا کر کشمیر کا غم ہلکا کرتے ہیں ۔ یہ اعزاز بھی

آزاد کشمیر کے سیاستدانوں کو ہی حاصل ہے کہ اس خطہ کی لیجسلیٹیو اسمبلی میں ٹن وزیروں اور علماء و مشائخ کی سیٹیں ایک ساتھ ہیں۔ ایک طرف جبہ و دستار کی آڑ میں لوٹنے والے ہیں اور دوسری جانب عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے جمہوریت کے علمبردار بھی ہیں جبکہ یہاں انسانی سمگلنگ جیسے گھناؤنے کاروبار والے بھی براجمان ہیں۔ یہاں قرآن جلانے والے بھی ہیں اور اپنے جھوٹ و فریب چھپانے کے لیے قرآن پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسمیں کھانے والے بھی موجود ہیں۔ یہاں ملٹری ڈیموکریسی جیسی اصطلاحات پیش کرنے والے دانشور بھی ہیں اور روشنی کی آڑ میں اندھیرا پھیلانے والے جاہل بھی ہیں۔ یہاں لکڑ چوروں کا ایک گروہ بھی بیٹھتا ہے اور آزادی بزنس سے مال کمانے والوں کا ٹولہ بھی ہمہ تن گوش جمہوریت کے راگ الاپتا ہے مگر شرماتا نہیں۔ یہ اسمبلی کئی لحاظ سے اعزاز یافتہ ہے۔ مثلاً یہاں عوامی نمائیندگی کے بجائے برادریوں کے نمائیندے بیٹھتے ہیں اور اپنی اپنی برادریوں کے امیروں، سرمایہ داروں اور منہ پھٹ افراد کے منہ بند کرنے کے لیے انھیں نوازتے ہیں۔ اگر آپ نے اس کی ایک جھلک دیکھنی ہے تو کوٹلی ضلع کی ایڈمنسٹریشن کو ملاحظہ فرمائیں تو آپ ڈوگرہ راج کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائینگے۔ کوٹلی کا انتظامی ڈھانچہ ایک مثال ہے جبکہ دیگر اضلاع کی بھی یہی حالت ہے۔ آزاد کشمیر کے قانون ساز قانون سازی کم اور قانون شکنی زیادہ کرتے ہیں۔ اگر آپ اس سلسلے کی ایک جھلک دیکھنے کے تمنائی ہیں تو آپ عدالتوں میں چلے جائیں اور ایم ایل اے حضرات کی

ایماء پر قائم ہونے والے مقدموں کی تعداد دیکھ لیں۔ اگر آپ ان مقدمات کی تہہ میں جائینگے تو ہر مقدمے کا محرک ایک پٹواری اور تھانے دار نکلے گا جسے اس کی برادری کے ایم ایل اے یا وزیر مشیر کی حمایت و تائید حاصل ہو گی چونکہ ہر ضلع کی انتظامیہ ایم ایل اے اور وزیر حضرات کی پسند کی ہوتی ہے۔ تھانے اور پٹوار خانے ان کے گھروں میں شفٹ ہو جاتے ہیں جہاں خرد برد اور جعلسازی کے نت نئے طریقے ڈھونڈ کر قبرستانوں، شاملاتوں اور سرکاری زمینوں پر قبضے اور پھر فروخت کے سامان پیدا ہوتے ہیں اور فوراً عمل درآمد بھی ہو جاتا ہے۔ محکمہ مال، جنگلات، اوقاف، عشروزکواۃ، بلدیات اور تعمیرات عامہ کے بعد اب محکمہ تعلیم بھی کھابہ خوری کا اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ آزاد کشمیر کے جنگلات میں درخت کم اور ملازمیں زیادہ ہیں۔ واچر، گارڈ اور فارسٹر سیاستدانوں کو منتھلیاں دیتے ہیں اور موسم گرما میں جنگلات میں ایک منصوبے کے تحت آگ لگواتے ہیں تاکہ جلے ہوئے درختوں کو کٹوا کر سیاستدانوں کے رشتہ داروں اور برادری والوں کی آرا مشینوں پر لکڑ بھجوا کر انھیں نواز سکیں۔ آزاد کشمیر میں جنگلات میں لگی آگ بجھانے کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ ڈوگرہ دور سے لیکر بعد کے کچھ عرصہ تک جنگلات کے لیے باقاعدہ قانون تھا کہ آگ لگنے کی صورت میں ضلعی انتظامیہ فوراً حرکت میں آتی تھی اور علاقہ کے لوگوں کو جمع کر کے آگ کو مزید پھیلنے سے روکا جاتا تھا اور پھر بجھایا جاتا تھا۔ اب انتظامیہ کا کام آگ لگوانا اور جلی ہوئی لکڑ چوری کروانا ہے۔ بجھانے والے عمل کو ڈوگرہ

روایات کا حصہ سمجھ کر ختم کر دیا گیا ہے۔ یقین نہ ہو تو اپنی آنکھوں سے یہ منظر آزاد کشمیر کے تمام اضلاع میں آج کل دیکھا جا سکتا ہے۔

اوقاف، عشروزکواۃ کے محکمے نقدی وصولی کے خزانے ہیں جو روز بھرتے اور لٹتے ہیں۔ وزیروں، مشیروں کی شاہ خرچیاں اور عیش و عشرت کا سامان عشروزکواۃ کا محکمہ پورا کرتا ہے جسکا بندوبست ضلعے کا چیئرمین زکواۃ کمیٹی کرتا ہے۔ ضلعے کی زکواۃ کمیٹی کا چیئرمین ہونا ڈپٹی کمشنر ہونے سے بہتر ہوتا ہے۔ چونکہ چیئرمین کے پاس زکوۃ کا بجٹ موجود ہوتا ہے اور وہ چوری کرنا چاہئیں تو بھی ضلع کا دفتر آپ کے لیے بہترین چورگاہ ثابت ہو سکتی ہے۔ آپ اس بات سے بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زکوۃ کمیٹی یا کونسل کا چیئرمین کتنے حج عمرے اور بیرونی دورے کرتا ہے۔ چیئرمین زکوۃ کا حکمران برادری سے ہونا بھی ایک، کوالیفکیشن ہے چونکہ اسے اپنی برادری کے ممبران اسمبلی اور وزیروں کے غریب اور بے سہارا بچوں کی کفالت کرنا ہوتی ہے۔

تعمیرات عامہ اور بلدیات کے محکموں پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ آزاد کشمیر میں جنرل حیات کے دور میں تعمیر ہونے والی سڑکوں اور سرکاری عمارتوں کے علاوہ باقی سب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہیں یا پھر خطرے ناک قرار دی جا چکی ہیں۔ اس تعمیری کام میں تعمیر کم اور تخریب زیادہ ہوئی ہے جس میں

پیپلز پارٹی پہلے نمبر پر اور مسلم کانفرنس دوسرے نمبر پر ہے۔ کماؤ محکموں میں خوراک کا محکمہ بھی ہے جو کہ زیادہ کمائی کرتا ہے۔ خوراک کا وزیر زیادہ بھوکا ہوتا ہے اسلیے زیادہ کھاتا ہے چونکہ وہ اس اصول پر گامزن رہتا ہے کہ خوراک کا پہلا حق بھوکے کا ہے اور جسکا پیٹ اور آنکھیں بھوکی ہوں اسکی دونوں بھوکیں پہلے مٹائی جائیں۔

آزاد کشمیر کی مثالی جمہوریت میں یہ واقع بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ وزیر خوراک نے خوراک کی مل خرید لی اور پھر اسی مل سے آزادی کے بیس کیمپ کے باسیوں کو کوٹے سے زیادہ اور غیر معیاری خوراک مہیا کی اور آخر کار مل بیچ کر سپین میں ہوٹل خرید لیا۔ آزاد کشمیر میں ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر بھی انتہائی اہم اور کماؤ پوت ہوتا ہے۔ اس پوت کی پہچان بھی پوتڑوں سے ہوتی ہے۔ زیادہ گندے پوتڑوں والے کو یہ پوسٹ عنایت کی جاتی ہے تاکہ وہ برادری اور پارٹی کے گندے پوتڑے دھو کر پوتر ہوتا رہے۔ چانکیہ نیتی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اندر سے خواہشات اور تعصبات کا اُبلتا چشمہ اور باہر سے دھیما اور میسنا ہونا چاہیے۔ اسکا اخلاق دکھلاوہ اور مزاج ٹھنڈا ہو تاکہ پرکھنے والا دھوکہ کھا جائے۔ اگر آپ سابق صدر جنرل انور کی شخصیت کو دیکھیں تو ان میں یہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں اور اسی

بناپر وہ فوج میں جنرل کے عہدے پر پہنچے اور پھر ان ہی خوبیوں کی بناپر انھیں پرویز مشرف نے جنرل عزیز اور دیگر قابل اور ذھین لوگوں پر فوقیت دیتے ہوئے پانچ سال تک حاکم کشمیر مقرر کر دیا۔ جنرل انور کی بطور صدر تعیناتی کے پیچھے کئی مقاصد پنہاں تھے مگر سکندر ،انور اور عتیق اختلافات کی وجہ سے بیل منڈھے نہ چڑی۔ جنرل انور اور قصوری برادران جو کام بیک چینل ڈپلومیسی کی آڑ میں کرنا چاہتے تھے وہ اب حکومت امن کی آشا اور دیگر اقدامات کے ذریعے کر رہی ہے۔ گلگت بلتستان کا وجود کشمیر سے کاٹ دیا گیا ہے اور اب آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کی تیاریاں ہیں جس کی تکمیل کے لیے آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کی حکومت پہلے سے قائم کردی گئی ہے۔

آزاد کشمیر کی موجودہ حکومت نے علم دوستی کا سبق بھی جنرل انور ہی سے یکھا کہ کس طرح علم کی روشنی کی آڑ میں اندھیرا پھیلایا جائے اور مال کمایا جائے۔ جنرل انور نے ٹائیں ڈھلکوٹ جو کہ انکی آبائی بستی ہے میں ایک ماڈل گرلز کالج بنانے کی منصوبہ بندی کی اور کروڑوں کا ٹھیکہ اپنے چہیتے ایم ایل اے کے والد کو دیا جسپر تب کے سیکٹری وزارت امور کشمیر نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ نیب کیس ہے۔ یہ مقام سلائیڈ ایریا میں ہے اور آبادیوں سے دور اور سہولیات سے محروم ہے۔ اگر کالج بنانا ہی ہے تو اس کے لیے موزوں جگہیں باغ، راولاکوٹ ، پلندری ، سہنسہ ، کوٹلی اور تراڑ کھل

ہیں۔مگر المیہ یہ تھا کہ یہ جگہیں جنرل انور کے گھر سے دور تھیں اور آبادیوں کے قریب ان کا دوست تعمیرات میں ڈنڈی مارنے کے قابل نہ تھا۔اگر آپ چاہیں تو کسی بھی وقت اس کالج کا معائینہ کر سکتے ہیں۔اس کالج میں کشمیر بھر کی ذھین بچیاں زیر تعلیم ہیں اور پہلے دو بیچ اپنی تعلیم مکمل کرکے عوام کی خدمت پر مامور ہیں۔اس میں سے بہت سی بچیاں ڈاکٹر، انجینئر، سائینسدان ، ماہرین تعمیرات ہیں اور کچھ نے مقابلے کے امتحانات میں نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔

موجودہ حکومت نے جنرل انور کے علم پھلاؤ فارمولے کے تحت بہت سی یونیورسٹیاں ، میڈیکل کالج، سائنس یونیورسٹیاں اور ریسرچ سسٹم قائم کیئے ہیں اور تاحال کیئے جارہے ہیں۔ان منصوبوں کی افتتاحی تقریبات پر کئی کروڑخرچ ہو چکے ہیں اور حکمران .برادریوں کے بہترین ذھن ان منصوبوں کو پائیہ تکمیل تک پہنچانے میں مصروف ہیں۔روشنی کی آڑ میں اندھیرا پھیلانے کے منصوبے مزید پانچ سال تک جاری رہے توہر وزیر کی .برادری کا اپنا کالج اور یونیورسٹی ہو گی جہاں ان کے میٹرک اور مڈل پاس .برادری کے پروفیسر اور لیکچرار ہونگے اور اپنی .برادری کے طلباو طلبات کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرینگے۔جن جن مقامات پر یہ ادارے بن رہے ہیں وہاں حکمران .برادریوں کے علاوہ کسی دوسری .برادری کا انسان تو کیا مال مویشی بھی چلا جائے تو زندہ واپس نہیں آتا۔جنرل انور کی تقلید میں

ان اداروں کی تعمیر کا کام بھی برادری اور پارٹی کے ٹھیکیداروں کو سونپا جا رہا ہے اور متعلقہ ایم ایل اے اور وزیر کام کے آغاز سے پہلے ہی اپنا کمیشن لے چکے ہیں۔ بقول لارڈ نذیر احمد کے جناب وزیر اعظم بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں اور اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں۔

د۔ دور غرور کر مغزوچوں دنیا خواب جانی متوالیا اوٗ
لقمے چرب کھوا کے نفس ظالم ویری بغل اندر تُد پالیا اوٗ
اوکھا ہوسیں وقت حساب دے توں دفتر منشیاں جدوں نکالیا اوٗ
کہہ دیں جواب ھدائت اللہ پچھن تُد تھیں جدوں منہہ کالیا اوٗ

اینکر پرسن یا جمپنگ جیک

جمپنگ جیک کہہ لیں یا پھر پھدکنے والا ہیرو۔ یہ ایسا شخص ہوتا ہے جو موسیقی کے آلات بجتے ہی بغیر سوچے سمجھے اچھل پڑتا ہے اور تھرکنے لگتا ہے اگر آپ ٹیلی ویژن دیکھنے کے عادی ہیں تو آپ نے غور کیا ہو گا کہ ہمارے کچھ دانشور اینکر پرسن ہر خبر پر تو نظر رکھتے ہی ہیں مگر ساتھ ہی پھدکنے بھی لگتے ہیں۔ ان پھدکنے والے اینکروں میں سے کچھ کے کرتوت تو سامنے آ گئے ہیں اور امید ہے باقی گندی مچھلیاں بھی جلد ہی کسی محب وطن دوست کی ریکارڈنگ کے زریعے یا سپریم کورٹ کی تحقیقات سے جھال میں ضرور پھنسیں گی۔

کہاوت ہے کہ ایک بھانڈ کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ گاؤں کے چوہدری نے دھوتی مانگ کر پہن رکھی ہے بس بھانڈ خبر بریک کرنے کے لیے چوہدری صاحب کے گھر جا پہنچا اور مجمع لگا کر چوہدری صاحب کی تعریفیں کرنے لگا کہ چوہدری صاحب انتہائی ایماندار، ہمدرد اور رحم دل ہیں، مگر۔۔۔ دھوتی کی کوئی بات نہیں ! بھانڈ کئیں گھنٹوں تک پیپڑی پڑھتا رہا اور چوہدری صاحب کی تعریفوں کے پُل باندھتا رہا اور آخر میں دھوتی کی کوئی بات نہیں بھی کہتا رہا۔ مجمع ختم ہوا، بھانڈ نذرانہ لے کر چلا گیا اور گاؤں میں دھوتی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح

پھیل گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہر کسی نے اپنا اپنا تبصرہ اور تجزیہ پیش کرنا شروع کیا تو بات دھوتی سے آگے اور دھوتی کے اندر جا پہنچی ۔چوہدری صاحب پریشانی میں مبتلا ہوئے اور ہر شخص انہیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ دوست یار اور گھر والے بھی کنی کترانے لگے اورچوہدری صاحب نفسیاتی مریض بن گئے ۔ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوئے اور دار فانی سے کوچ کر گئے۔چوتھے کا ختم ہوا اور بھانڈ پھر آ گیا۔ پہلے رویا اور پھر کہنے لگا کہ چوہدری صاحب ایک نیک دل اور شریف آدمی تھے ۔ مسجد میں نماز کے لیے گئے تو دیکھا کہ امام صاحب کی دھوتی پھٹی ہوئی ہے اور بے پردگی کا اندیشہ ہے۔ گھر آ کر اپنی نئی دھوتی اتار کر دھوئی اور پھر امام صاحب کو دے دی۔ خود ڈیرے پر گئے اور بخشو کامے سے دھوتی ادھار مانگ لی ۔ بخشو سے کہا کہ بخشے تو، توڈیرے پر ہی رہتا ہے پرانی دھوتی کا لنگوٹ مار لینا تمہیں کس نے دیکھنا ہے۔ایک ڈیڑھ ماہ کی بات ہے فصل اٹھ گئی تو میں تمہارے لیے اور اپنے لیے شہر سے نئی چادریں خرید لوں گا۔ہائے ۔۔لوگو۔ایسا ہمدرد، غمخوار اور عزت مند چوہدری اب کہاں ملے گا۔ دعا کرو اللہ چوہدری کے درجات بلند کرے اور سب غریبوں کو نئی دھوتیاں اور چادریں دے ۔ اصل عزت تو دھوتی میں ہے دھوتی کی کیا بات ہے۔

ارسلان افتخار کے متعلق ان جمپنگ جیکس کے پہلے پہلے شو دھوتی شو سے کم نہ تھے ۔ ان کے گلے خشک ہو رہے تھے ، منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی، الفاظ پھسل

اور پھدک رہے تھے اور وہ ملک ریاض کے ثبوتوں کو کئی بار سچ اور صحیح کہنے کے بعد ایک بار بادی النظر کا اضافہ کرتے اور پھر کہتے اس میں چیف جسٹس کا کوئی ذکر نہیں دوسرے دن جب عدالت میں پہنچے تو معاملہ کچھ اور تھا۔ اکثر عدلیہ کو سلیوٹ پیش کررہے تھے، کچھ کا چہرہ بجھا بجھا تھا، مالک صاحب اور صافی صاحب ان کی حوصلہ افزائی کررہے تھے اور جاوید چوہدری الفاظ کو نئے معنی پہنا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ دھوتی ایک ضروری چیز ہے دھوتی کی کیا بات ہے۔ چند ایک نے درمیانہ راستہ اختیار کی پالیسی پر گامزن ہوئے جبکہ طلعت حسین نے سچائی کا ساتھ wait and see کیااور دیا اور کسی بیٹی بھرا کو بھی معاف نہ کیا۔ حکومت کہتی ہے کہ ہم ملوث نہیں، سونامی والے عمران نیازی، شریف برادارن، چوہدری آف گجرات، خانز آف پشاور، الطاف بھائی آف لندن اور دیگر انقلابی، جمہوری اور عوامی لیڈروں پر سکتہ طاری ہوگیا ہے بلکہ کو براسانپ سونگھ گیا ہے۔ حکومت کا ملوث نہ ہونا بھی ایک مذاق ہے۔ اگر ملک ریاض نے جناب حامد میر کو کہا ہے کہ ارسلان کی ویڈیو ایک وزیر نے بنوا کر دی ہیں تو سب جانتے ہیں کہ جس وزیر کا نام لیا گیا ہے وہ ان کاموں کا ماہر ہے اور اسی خوبی کی بناء پر پیپلز پارٹی میں گیا تھا اور آج نہ صرف وزیر ہے بلکہ پارٹی کی مجبوری بھی ہے۔ کامران خان فرماتے ہیں کہ ارسلان کے سال بہ سال بنائے گئے فولڈرز پر پاسپورٹ کی کاپیاں لگی ہیں۔ ارے جناب آپ کا اقبال بلند ہو۔ آپ کتنے کاکے بلکہ آلے بولے ہیں۔ جب کوئی آدمی ملک سے باہر جاتا

ہے تو ائیر پورٹ پر اپنے پاسپورٹ کی دو فوٹو کاپیاں جمع کروا کر جاتا ہے۔ پاسپورٹ سیل بھی تو اسی وزیر کے زیر سائیہ چلتا ہے۔ کاپی تو کیا وہ مکمل پاسپورٹ بھی کسی کو دے سکتا ہے۔

جہاں تک ویڈیو بنانے کا تعلق ہے تو کسی صحافی اور دانشور نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ایک جرم ہے۔ جو لوگ یورپ کی سیر کے لیے جاتے ہیں وہ وہاں چلہ کشی کرنے نہیں جاتے بلکہ عیش موج کرنے جاتے ہیں ۔ اگر ویڈیو بنوانے کا رواج شروع ہو گیا تو پاکستان کی 90 فیصد اشرافیہ ننگی ہو جائے گی اور ان کے فیصلے کرنے کے لیے سو ججوں پر مشتمل ایک علیحدہ سپریم کورٹ بنانی پڑے گی۔ ہر شخص کی ایک پرائیویٹ لائف ہے اگر آپ نے ان ویڈیوز پر انحصار کیا تو کل کلاں آپ کی ویڈیو بھی بن جائے گی اور پھر کوئی محفوظ نہیں رہے گا۔ کچھ لوگ سوال کرتے ہیں کہ چار سالوں میں ارسلان چوہدری کروڑ پتی کیسے بن گیا۔ ارے عقلمندو یہ سوال بھی اٹھاؤ کہ پندرہ سالوں میں ملک ریاض کھرب پتی کیسے بن گیا۔ ائیر کنڈیشنڈ سٹوڈیوز سے باہر نکلو اور بحریہ ٹاؤن کا چکر لگاؤ ۔ دیکھو کہ یہاں کے قدیم رہائیشیوں کی کیا حالت ہے۔ دس دس گھروں پر مشتمل دیہاتوں کے ارد گرد دو دو سو فٹ گہری کھائیاں کھود دی گئی ہیں اور لوگ محصور ہو کر رہ گئے ہیں یہ سب اس لیے کیا گیا ہے تاکہ یہ لوگ گھر بار چھوڑ کر چلے جائیں۔ جنگلات غائب ہو گئے ہیں اور 50 کلو میٹر پر پھیلے بحریہ ٹاؤن اور ڈی ایچ اے

کا ریونیو ریکارڈ غائب کر دیا گیا ہے۔ گجر گڑی اور گلی گاؤں کے محصورین کے مطابق ریکارڈ جلا دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ صحافت کے باوا آدم حضرت مالک جن کا فرمان ہے کہ کسی نہ کسی نے تو نیوز بریک کرنی ہی ہوتی ہے تو ہم کیوں نہ کریں۔ جناب عرض ہے کہ آپ، جناب حامد میر، سلیم صافی، نجم سیٹھی ،کامران خان اینڈ ہمنواؤں کو گلی گاؤں لے جائیں،اور ذرا ان مظلوموں کا انٹرویو بھی کریں چونکہ یہ لوگ آپ کے دفتروں تک نہیں آ سکتے۔ اگر آپ بزور شمشیر پچاس ہزار سے لے کر ڈیڑھ لاکھ فی کنال کے حساب زمین خریدیں اور دو لاکھ ڈویلپمنٹ کے لگا کر 60 لاکھ سے سوا کروڑ فی کنال کے حساب سے بیچیں تو آپ ایک سال میں ارب پتی بن سکتے ہیں۔ اس میں خالصہ سرکار اور شاملات شامل ہیں جو حکومتی کارندوں کی ایماء پر قبضہ کی گئی۔ اس وقت بحریہ ٹاؤن کی سرحدیں گوجر خان، کلر سیداں اور چکوال سے ملتی ہیں۔ زیادہ تر زمینیں جنگلات، شاملات اور خالصہ سرکار کی ہیں اور سرکار کا ہر بندہ ملک ریاض کا زرخرید غلام ہے۔ آج ملک ریاض کی ریاست پٹودی، لوہارو، دجانہ، ملیر کوٹلہ، پٹیالہ، نگر، ھنزہ اور امب سے بڑی ہے۔ بحریہ ٹاؤن کے اپنے قوانین اور آئین ہے جن کے مطابق بحریہ ٹاؤن میں بنی عالیشان کوٹھیاں اور بنگلے ملک ریاض کے ذاتی ہیں۔ آپ ارسلان چوہدری کی فائیلیں پڑھنے پر مغز کھپائی نہ کریں بلکہ بحریہ ٹاؤن کے بائی لاز (by laws) پڑھیں جن کے مطابق بحریہ ٹاؤن انتظامیہ کسی بھی شخص کا پلاٹ کینسل کرکے اسے بیدخل کر سکتی ہے اور ان لوگوں کو کسی بھی عدالت میں جانے

کا حق نہیں۔ یہ بائی لاز انگریزی میں اور اتنی باریکی سے لکھے گے ہیں کہ عام کسٹمر اسے نہ توپڑھتا ہے اور نہ ہی اسطرف دھیان دیتا ہے۔ بحریہ ٹاؤن ایک ہاؤسنگ سکیم نہیں بلکہ ایک ریاست ہے جسکا سربراہ ملک ریاض اور ولی عہد علی ریاض ہے۔ اس کی پڑوسی ریاست کا نام ڈی ایچ اے ہے اور دونوں ریاستوں کے اچھے اور مثالی تعلقات ہیں۔ دونوں ریاستوں کے درمیانی علاقے میں محکمہ جنگلات پنجاب کا کچھ حصہ تھا جو خادم اعلیٰ نے بحری ریاست کو دے دیا۔ بحریہ نے میدانی علاقوں پر قبضہ کرکے رفع بلاک کے نام سے تین چار سو پلاٹ بنا کر بیچ ڈالے اور اونچی چوٹیوں پر ملک کے مائیہ ناز جرنیلوں نے قبضہ کرکے محل تعمیر کر لیے۔ امید ہے کہ جناب محمد مالک، سلیم صافی، نجم سیٹھی، حامد میر اور دیگر دانشور جلد ہی اس علاقے کا بھی دورہ کرینگے۔

ریاست پٹودی کا کل رقبہ 52 میل تھا اور آبادی 20 لاکھ تھی۔ اس لحاظ سے دیکھاجائے تو بحری ریاست کا رقبہ اور آبادی ذیادہ ہے۔ اسوقت اخباری اطلاعت کے مطابق بحری ریاست کی فوج میں 9 جرنیل، 20 بریگیڈیئر کئی درجن کرنل اور میجر ہیں۔ سپاہیوں کی تعداد پندرہ ہزار بتائی جاتی ہے جبکہ بوقت ضرورت پاکستان رینجرز اور اسلام آباد پولیس بمعہ بکتر بند گاڑیوں کے اپنی خدمات پیش کرتی ہے۔ والی ریاست اور ولی عہد کا پرٹوکول وہی ہے جو سلطان آف برونائی اور عرب شیوخ کا ہے۔ کالے شیشوں والی کئی درجن گاڑیاں، موٹرسائیکل، مشین

گن فٹڈ جیپیں شاہی سواری کے ساتھ چلتی ہیں اور ہوٹر کی آواز ساری ریاست میں سنی جاتی ہے۔اس ریاست میں ایک جدید ہسپتال ہے جس کا نام بیگم اختر ویلفیئر ٹرسٹ ہسپتال ہے مگر کمرے کا کرایہ فی رات 25ہزار روپے ہے۔ ٹاک شو اینکر دانشوروں سے گزارش ہے کہ وہ ٹرسٹ اور ویلفیئر پر بھی تھوڑا دھیان دیں اور عوام کو بتائیں کے ٹرسٹ کیا ہوتا ہے۔

اب ایک نظر ارسلان چوہدری پر بھی ڈالتے ہیں ۔ ارسلان جناب چیف جسٹس کا بیٹا تو ہے مگر وہ میجر جرنل (ر) ضیاالحق کا داماد بھی بتایا جاتا ہے۔ جرنل ضیا کا تعلق برنالہ ضلع بھمبر کی گجر برادری سے ہے اور ملک بھر میں اثرورسوخ رکھنے والی شخصیت ہیں جرنل صاحب کا ایک بھائی اے جے کے سپریم کورٹ کا جج اور دوسرا کئی حکومتوں میں وزیر رہا ہے ۔ یہ لوگ علاقہ کوٹ جیمل کہ بڑے زمیندار اور پشتوں سے رئیس چلے آرہے ہیں اور یقینا ان کے کاروبار بھی ہونگے۔ جیسا کہ ملک ریاض سے منسوب ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ ارسلان نے سیمنٹ بھی مہنگا فروخت کیا ہے ۔ اس سے لگتا ہے کہ وہ سیمنٹ کے کاروبار سے منسلک ہے۔ اگر ایسا ہے تو ارسلان کو ایک سال میں ہی کروڑ پتی بن جانا چاہیئے تھا کیونکہ جو لوگ چینی ، گندم، گوشت ، گھی ، سیمنٹ اور پھلوں کے کاروبار سے منسلک ہیں وہ ایک ہی سال میں کروڑ پتی بن گے ہیں ۔ چونکہ یہ اشیاء افغانستان میں پانچ گنا اور سنٹرل ایشیاء میں دس گنا مہنگی ہیں۔ پچھلے سال سرگودھا سے

تاشقند پہنچنے والے کینو کی قیمت ایک ڈالر سے زیادہ تھی جس کی وجہ سے پاکستان میں کینو صرف امیروں کا فروٹ تھا۔آٹے کی ڈھائی من بوری کابل میں 8ہزاراور مزارشریف میں 12ہزار کی تھی جبکہ دالیں اور خردنی تیل بھی ڈالروں میں بکتا ہے۔ ایسا ہی قصہ لائیؤ سٹاک کا ہے۔ اگرآپ چمن باڈر پر تشریف لے جائیں توآپ حیران ہونگے کہ جتنے مویشی پاکستان سے افغانستان سمگل ہوتے ہیں اتنی افغانستان کی آبادی ہی نہیں ۔ظاہر ہے کہ یہ مویشی افغانستان میں ذبح کرکے گوشت سنٹرل ایشیاء، بھارت اور یورپ تک بھجوایا جاتا ہے۔ ارسلان چوہدری کوئٹہ کو پیدائشی اور رہائشی ہے اوریقینا اس کے بزنس لنک بھی ہونگے اور اگر وہ اوپر بیان کردہ کسی بھی کاروبار سے منسلک ہے تو چارسالوں میں اس کے پاس 50 کروڑ ہونے چاہیے۔

ارسلان چوہدری نہ کسی گدی نشین پیر، مخدوم، خودساختہ ولی اللہ یا نودو لتیے قبضہ گروپ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور نہ ہی کسی جرنیل اورسیکرٹری کا بیٹا ہے۔ جرنیلوں اور سیکرٹریوں کی اندرون ملک اور بیرون ملک جائیدادیں اوران کے بچوں کے کاروبار اور عیاشیاں اگر فلمائی جائیں توآپ حیران ہوں گے کہ یہ لوگ بیرون ملک جسقدر اخراجات کرتے ہیں اتنا خرچ تو عرب شیوخ بھی نہیں کرتے۔ آپ ڈی ایچ اے پنڈی، لاہور، اسلام آباد اور کراچی کا چکر لگائیں توحیران ہونگے کہ جرنیل اور ان کے بچے پلاٹوں کی خریدوفروخت سے کسقدر کمارہے ہیں۔

یہی حال بحریہ کا بھی ہے۔ بحریہ میں بھی جرنیلوں کی بڑی بڑی انوسٹمنٹ ہیں اور ان کے گھروں میں دولت کے چشمیں ابل رہے ہیں۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ارسلان چوہدری کنسلٹنسی بھی کرتا ہے اور غیر ملکی موبائل فون کمپنیوں سے منسلک ہے۔ یہ کاروبار بھی تو پیسے والا ہے۔ جناب رحمان ملک بھی تو انگلینڈ میں یہ ہی کاروبار کرتے تھے اور چند سالوں میں ارب پتی بن گے۔ اگر کنسلٹنسی سے رحمان ملک ارب پتی بن سکتا ہے تو ارسلان چوہدری کیوں نہیں۔

بحریہ ٹاؤن میں ایک خاتون چند سال پہلے ریسپشنسٹ تھی اور آج کل پلازوں کی مالکہ ہے اور کروڑوں کی گاڑیوں میں گھومتی ہے۔ دور جانے کی بات نہیں چار سال پہلے ہمارے وزیراعظم ایک مقروض شخص تھے اور گاڑی بیچ کر بچوں کی فیسیں ادا کرتے تھے۔ کیا کوئی اینکر دانشور وزیراعظم سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ وہ کونسی گیدڑ سنگی ہے جس نے آپ کو چار سالوں میں ارب پتی بنا دیا۔ ملک ریاض تو کھلے عام کہتا ہے کہ وہ اپنی فائیلوں کو پہیے لگاتا ہے تو یقینا یہ فائیلیں وزیراعظم ہاؤس تک بھی جاتی ہوں گی ورنہ عبدالقادر گیلانی اس فائیل ماسٹر کے لیے مضطرب نہ ہوتا۔ اگر اس ملک میں کوئی آئین اور قانون ہوتا تو جس دن ملک ریاض نے فائیلوں کو پہیے لگانے کی بات کی تھی اسی دن اسے دھر لیا جاتا اور ان تمام رشوت خوروں بمعہ صحافیوں کے جو ملک ریاض کے وظیفہ خور ہیں کو قانون کے شکنجے میں کس دیا جاتا۔ مگر یہ کیسے ہو؟ کمانڈو

صدر کا مالی ٹیلیویژن انٹرویو میں کہتا ہے کہ میں صدر ہاؤس کا مالی ہوں میں نے جنرل پرویز مشرف سے عرض کی کہ جناب ہماری زمینوں پر ملک ریاض زبردستی قبضہ کر رہا ہے آپ ہمیں انصاف دلائیں۔ صدر مشرف نے جواب دیا کہ جو کچھ دیتا ہے لے لو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ کہ ملک کا صدر بھی ملک ریاض کے سامنے بے بس ہے چونکہ وہ بھی رشوت خوروں میں شمار ہے۔کامران خان نے اپنے انٹرویو میں ملک ریاض سے پوچھا کہ اگر آپ ملک کے صدر بنا دیے جائیں تو؟۔

اس تو کے پیچھے بھی ایک خواہش اور پیغام تھا۔ اگر ملک ریاض اپنے حامیوں کی مدد سے موجودہ عدلیہ کو گرانے میں کامیاب ہو گیا یا پھر عدلیہ نے اسے کسی بھی جرم پر سزا نہ دی تو وہ یقینا اس ملک کا اگلا صدر ہو گا اور کسی بھی سیاستدان کو اس کی صدارت پر اعتراض بھی نہیں ہو گا۔ یاد رکھیے جو کچھ موجودہ جمہوری جبر اور کرپشن سے بچے گا وہ ملک ریاض اڑا لے جائے گا۔جہاں تک جمہوریت پسند اور باشعور عوام کا تعلق ہے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بھارت سے درآمد کردہ مردہ اور بیمار جانور کا گوشت ہو یا بھارتی گٹروں کے پانی سے پیدا کردہ سبزیاں اور پھل وہ امن کی آشا کا تحفہ سمجھ کر سب کچھ کھانے کو تیار ہیں۔ چار سو روپیہ درجن بھارتی کیلا ہو یا دو سو روپیہ کلو گوبی انہیں کسی بات پر اعتراض نہیں۔ ملک کا صدر چوہدری شجاعت ہو یا ان کا فیملی فرینڈ ملک ریاض یا پھر ملک ریاض کا دوست نواز شریف ہو یا پھر ان کا چھوٹا بھائی جناب آصف علی

زرداری، عوام کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو لوگ عوام کو باشعور اور جمہوریت پسند کہتے ہیں در حقیقت وہ عوام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ چونکہ اس ملک میں صرف دو طرح کے لوگ رہتے ہیں جنہیں متوالے اور جیالے کہا جاتا ہے اگر عوام باشعور ہوتے تو آج اس ملک میں جمہوری آمریت نہ ہوتی اور نہ ہی کوئی ملک ریاض ملک کے آئین اور قانون سے مبرا ہوتا۔

مفاد اور مطلب کی رشتہ داریاں

ہمارے ملک میں دو طرح کی سیاسی پارٹیاں ہیں جنہیں دائیں بازوں والی اور بائیں بازوں والی کہا جاتا ہے۔ ملک اور قوم تو ایک ہی ہے مگر ایک بازو دینی رجحان کا حامل اور دوسرا سیکولر ہے۔ ایسی جماعتیں تقریباً ہر ملک میں پائی جاتی ہیں مگر وہاں مدین اور سیاست کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ہم دونوں طرح کی سیاسی جماعتوں کا مزید تجزیہ کریں تو دینی جماعتیں کئی فرقوں میں تقسیم ہیں اور ہر فرقے کی ایک اپنی سیاسی جماعت ہے۔ اسی طرح سیکولر نظریات کی حامل جماعتوں میں بھی بہت سے طبقات ہیں۔ جس میں امریکہ نواز، روس نواز اور بھارت نوازوں کی الگ پہچان اور رجحان ہیں۔ پاکستان بنا تو اس کی خالق جماعت پاکستان مسلم لیگ پر انگریز کے پروردہ گھرانوں اور خاندانوں نے قبضہ کر لیا۔ ایک طرف انگریز کے وفادار خان بہادر، جاگیردار، زمیندار، پیر، گدی نشین مخدوم اور مجاور تھے تو دوسری طرف لوٹ مار کی دولت اکٹھی کرنے والے نودولتیے اور فوجی جرنیل جنکا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا۔

فوجی جرنیلوں نے اپنے مقام اور مرتبے کی بڑھوتری کیلیے ملکہ معظم کے وفاداروں اور نودولتیوں سے نہ صرف رشتہ داریاں قائم کی بلکہ ان کی مدد سے

ایک نیا معاشرہ اور سوسائیٹی قائم کی تاکہ آئیندہ ان کی مشترکہ نسلیں اس ملک پر حکمرانی کریں۔ ایوب خان کے والد رسالدار میجر ریٹائرڈ ہوئے وہ کثیر اولاد تھے اور کسی بھی صورت اس قابل نہ تھے کہ سینڈہرسٹ میں اپنے بیٹے کی کمیشن کی فیس اور دیگر اخراجات.برداشت کر سکتے۔ خان آف امب نے ایوب خان کے علی گڑھ اور پھر سینڈہرسٹ کر اخراجات.برداشت کیے جسکے صلے میں فیلڈ مارشل نے یقینی بنایا کہ امب سٹیٹ کی ایک انچ زمین تربیلہ ڈیم کی حدود میں نہ رہے۔ فیلڈ لارشل نے کرک کے خٹکوں اور والئی سوات سے رشتہ داریاں جوڑیں اور ایک نیا سیاسی اور صنعتی گھرانے وجود میں آیا گیا۔ ریحانے کے ترین ، کرک کے خٹک ، لکی مروت کے مروت اور پشاور کے بلوراب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں جنکا اثر و رسوخ ہر سیاسی جماعت اور گروپ مین موجود ہے۔ گجرات کے چوھدری 1947 سے پہلے کچھ بھی نہ تھے پاکستان بنا تو گجرات کے چوھدری ایک نئی پہچان اور شان کے ساتھ پاکستان کی صنعت اور سیاست پر چھا گئے اور چند ہی سالوں میں ارب پتی اور کھرب پتی بن گئے۔ گجرات کے چوھدریوں کی بھی رشتہ داریاں پاکستان کے سبھی سیاسی اور صنعتی گھرانوں میں ہیں۔ جن کے اثرات پاکستان کی اشرافیہ سے لیکر عام آدمی تک یکساں ہیں۔ ملک میں مصنوعی مہنگائی ہو یا سیاسی ابتری چوھدری بہرحال اپنا اثر دکھاتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت دولت کماتے ہی رہتے ہیں ۔ یہی حال میاں صاحبان اور دیگر سیاسی گھرانوں کا ہے۔ جو ملکی سیاست اور معیشت کی ابتری میں.برابر کے شریک ہیں اور کسی نہ کسی طریقے سے عوام کی

جیبوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔
لوٹ مار گھرانوں اور خاندانوں میں نیا اضافی ملک ریاض کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جس نے ایک ہی وار میں اپنے سمیت ہر سیاستدان، حکمران اور دانشوری کا زعم رکھنے والے صحافی اور ٹیلی ویژن سکرین پر بن سنور کر بیٹھنے والے میزبانوں کو عوام کے سامنے ننگا کر دیا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ سیاستدانوں، حکمرانوں، صحافیوں دانشوروں اور اینکروں میں سے کسی کی صحت پر اس بے عزتی اور بدنامی کا اثر نہ ہوا اور ہر ایک نے کسی نہ کسی صورت نہ صرف ملک ریاض کی حمائت کی بلکہ ملک ریاض کی طرف سے پھینکے گئے گندے چھینٹوں کو چہرے پر سجائے اپنی اپنی جگہ قائم بھی رہے۔ میاں صاحبان، عمران خان، ایم کیو ایم، اے این پی اور جمعیت علمائے اسلام نے خاموشی اختیار کی۔ پیپلز پارٹی نے وضاحتیں پیش کی اور چوھدریوں نے حمائت میں بیان دیے۔ فوج جو کہ ڈی ایچ اے کی صورت میں ملک ریاض کی پارٹنر ہے نے خود تو کوئی بیان نہیں دیا مگر فوج کی جانب سے محترم ہارون الرشید نے فرمایا کہ فوج اس سکینڈل میں ملوث نہیں۔ مگر ہارون الرشید بھول گئے کہ فوج اس سکینڈل میں کیسے ملوث ہو سکتی ہے۔ فوج کے نو (۹) ماٹیہ ناز جرنیل جو کبھی اپنی چھاتیوں پر بھادری کے تمغے سجاتے تھے آج ملک صاحب کے مہمانوں کو چائے اور کافی پیش کرتے ہیں۔ یہ میرا نہیں انھیں فوجی بھائیوں کے ایک جرنیل بھائی حمید گل کا بیان ہے جسے پروفیسر

نعیم قاسم نے تحریر فرمائے ا۔ جس طرح سیاسی گھرانوں کی باہم رشتہ داریاں ہیں اسی طرح ملک ریاض اور فوج کا ایک رشتہ ہے جو اٹوٹ اور الگ نوعیت کا ہے۔ ملک صاحب کی کمان میں اس وقت 9 ریٹائرڈ جرنیل ، 15 کے قریب برگیڈیئر ، درجنوں کرنل، میجر، کپتان اور پندرہ ہزار کے قریب سپاہی اور چھوٹے رینک والے عہدیدار ہیں، اگر فوجی ترتیب کے مطابق جائزہ لیا جائے تو ملک ریاض کے پاس ڈیڑھ ڈویژن فوج ہے جبکہ رینجرز اور اسلام آباد پولیس بوقت ضرورت بمعہ بکتر بند گاڑیوں کے دستیاب ہو سکتی ہے۔ ملک ریاض ، وزارت داخلہ اور ڈی ایچ اے کے درمیان اعتماد اور اخلاص کا ایسا رشتہ قائم ہے جسکی مثال نہیں ملتی۔ بحریہ ٹاون کا فیز 7 اور 8 ضلع راولپنڈی میں واقع ہے مگر یہاں قائم پولیس اسٹیشن اسلام آباد پولیس کا تھا جو حال ہی میں اٹھا دیا گیا ہے۔ پولیس اسٹیشن کے صدر دروازے پر واضح الفاظ میں بحریہ ٹاون ، ڈی ایچ اے پولیس اسٹیشن اسلام آباد لکھا تھا اور بلڈنگ پر اسلام آباد پولیس کا کلر بھی کیا گیا تھا۔ آئین ، قانون اور جمہوریت کا راگ الاپنے والے دانشوروں اور سیاستدانوں سے سوال ہے کہ کیا کسی جمہوری ، آئینی اور قانون کا احترام کرنے والے ملک میں اتنی بڑی قانون شکنی ہو سکتی ہے ؟ جس ملک میں دو تھانوں کی سرحد پر کوئی واقع ہو جائے تو کوئی بھی تھانہ رپورٹ درج نہیں کرتا اور انچوں اور فٹوں کی باہمی جنگ میں کیس اس قدر خراب کیا جاتا ہے کہ بالآخر قتل جیسے مقدمات کی فائیلیں داخل دفتر ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف تو دو تھانوں کی سرحدیں دو دشمن ملکوں کی

سرحدیں سمجھی جاتی ہےں اور دوسری جانب اسلام آباد پولیس کا ایک مکمل تھانہ جی ٹی روڈ کراس کرکے راولپنڈی کی حدود میں قائم ہو جاتا ہے مجھے امید ہے کہ جناب ہارون الرشید اس بے قائدگی اور لاقانونیت پر بھی کچھ ضرور روشنی ڈالیں گے۔ اس ملک میں اثر ورسوخ، دولت اور مفاد کی سیاست عام ہے جبکہ غریب جس کے پاس دولت ہے نہ کسی امیر کا اس سے کوئی مفاد لہٰذا اس ملک کا ہر قانون اس کے لیے بنتا ہے اور ہر آنے والے حکمران اور مفاد پرست کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اس غریب کا خون چوسے اور اپنی تجوریاں دولت سے بھرے۔ جبکہ کرپشن اور لوٹ کھسوٹ سے پیسہ جمع کرنے والے نو دولتیے اپنی دولت کی بنیاد پر نئے رشتے ناطے بناتے ہیں اور یوں اس ملک کے عوام پر حکمرانی کے لیے یہ نئی کھیپ مارکیٹ میں آ جاتی ہے۔ جن کے تحفظ کے لیے اسمبلیاں قانون بناتی ہیں اور ان اسمبلیوں میں بیٹھے مفاد پرست اس قانون کے حق میں دلائل دے کر حق رشتہ داری ادا کرتے ہیں۔ لیڈرشپ یا حکمرانی کے لیے ایک حقیقی لیڈر یا حکمران کے لیے کیا ضروری ہے اور پاکستان کا لیڈر بننے کے لیے کیا ضروری ہے انشااللہ اگلی تحریر میں تفصیل سے بات کرنے کی کوشش کروں گا۔

حقیقی لیڈر کون۔۔۔؟

علم سیاست کے مطابق لیڈر دو طرح کے ہوتے ہیں اول وہ لوگ جو پیدائشی طور پر ایسی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ ایک نظریہ اور اصول واضح کرتے ہیں اور پھر اس نظریے اور اصول کی بنا پر لوگوں کی راہنمائی کرتے ہوے انھیں ایک قومی پلیٹ فارم میں جمع کرتے ہیں۔ نظریے اور اصولوں کی بنیاد پر قائم پلیٹ فارم سے ہی ایک لیڈر قوم کی راہنمائی کرتا اور انھیں ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ ابرہام لنکن، قائدا عظم ، ماوزے تنگ، ابن سعود، مارشل ٹیٹو، ڈیگال اور امام خمینی جیسے شخصیات کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ کس طرح ایک منتشر جنگ زدہ اور معاشی اور سیاسی لحاظ سے شکست خوردہ معاشرے اور ریاست کو ان لیڈروں نے ایک نظریے اور اصول کے تابع ایک نئ پہچان دے کر ترقی اور خوشحالی کے ساتھ ایک نئ راہ پر گامزن کیا۔ دوسری قسم کے لیڈر وہ ہوتے ہیں جنھیں عوام آگے لاتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کی بنا پر انھیں اپنا قائد اور راہبر تصور کرتے ہیں۔ ماضی قریب میں اس کی مثالیں جناب ذوالفقار علی بھٹو، لیخ ولیسائ، اور نیلسن مینڈیلا کی ہیں۔ انھیں عوام نے لیڈر تو مانا مگر وہ ناکام رہے۔ موجودہ دور میں روس کے صدر پوٹن، ایران کے احمدی نژاد، ترکی کے طیب اردگان، ملائیشاء کے مہاتیر محمد ایسے لیڈروں میں شمار ہیں جنھوں نے اپنی

قوم کو معاشی سیاسی اور نفسیاتی دباؤ سے نکال کر امن اتحاد اور خود داری سے جینے اور ترقی کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ سیاسی مفکرین نے لیڈر شپ پر جو کچھ لکھا ہے اس کے مطابق جناب آصف زرداری، نواز شریف، عمران خان اور دیگر کسی ایک خوبی کے مالک بھی نہیں کہ انھیں قومی لیڈر کہا جائے۔ایم کیوایم، جمعت علماء اسلام (ف)، مسلم لیگ (ق) جس کا موزوں ترین نام مسلم لیگ گجرات گروپ یا چوہدری گروپ ہے۔ ہمیشہ ہی سے، حکومتی اتحاد کا حصہ ہوتے ہیں۔ اور اپنے اپنے مفادات کا تحفظ یقینی بناتے ہیں۔ اے این پی کو پہلی مرتبہ مرکز تک رسائی ملی ہے اور وہ بھی اپنے حصے کی بربادی کے ذمہ داروں میں شامل ہوگئے ہیں۔ اے این پی نے جو حشر پاکستان ریلوے کا کیا ہے اگر سارا پاکستان ان کی مٹھی میں آجائے تو اس کا حشر بھی ریلوے جیسا ہی ہوگا۔ مسلم لیگ ن) اور پیپلز پارٹی میں خاموش مفاہمت چل رہی ہے۔ جسکے گارینٹر امریکہ، برطانیہ،) سعودی عرب اور عرب امارات کے شیوخ شامل ہیں۔

دیکھا جائے تو ایک طرف یہ ملک امیر ممالک کی گارنٹیوں پر چل رہا ہے جب کہ دوسری طرف امیر بحر وبر جناب ملک ریاض اپنی مرضی کے حکمرانوں کا چناو کرتے اور انھیں کرسی صدارت پر بٹھاتے ہیں۔ جس کا تذکرہ جناب چوھدری شجاہت نے اپنے بیان میں کیا ہے۔ چوہدری شجاہت کے بیان میں صداقت کا شائیبہ اس لیے ہوتا ہے چونکہ ان کے مشیر خاص جناب مشاید حسین سید نے اس بیان کی تردید

نہیں کی۔ ویسے بھی آج کل شاہ صاحب کو فرصت نہیں اور "لوٹے پھٹو" والے بیان پر وہ معافی در معافی مانگنے پر لگے ہوئے ہیں۔ جو ابھی تک انھیں نہیں مل رہی۔ حسین حقانی کی تنزلی کے بعد شاہ صاحب کو امریکہ میں سفیر لگانے کا پروگرام بھی شائد اس لیے کینسل ہوا، ورنہ وہ شیری رحمٰن کی جگہ آپ ہوتے اور اپنے ہاتھوں سے نیٹو سپلائی کا فیتہ کاٹتے۔

جناب ملک ریاض کی حمائت میں جناب چوہدری شجاعت نے جو مدبرانہ بیان جاری کیا اور فرمایا کہ ملک صاحب کی سخاوت، دریا دلی، غریبوں سے محبت اور عوام دوستی کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں نہ چھیڑا جائے۔ملک صاحب کے پاس حکومتیں بننے اور ٹوٹنے کے بہت سے راز ہیں جو اگل دیے جائیں گے تو بہت سے شرفاء ننگے ہو جائیں گے۔ چوہدری صاحب کا بیان اس لحاظ سے ناقابل فہم ہے کہ اب کونسے شرفاء باقی ہیں جنھیں ننگا نہیں کیا گیا۔ جہاں تک حکومتیں ٹوٹنے اور بننے کا تعلق ہے تو یہ بیان چوہدری شجاعت کا اعترافی بیان ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک کے سیاسی نظام کو تلپٹ کرنے میں بھی ملک ریاض کا ہاتھ ہے۔ ملک ریاض نہ تو کسی اعلی سرکاری عہدے پر فائز رہا ہے اور نہ ہی کسی ایجنسی اور ادارے کا سربراہ رہا ہے جس کے پاس قومی اور ملکی معاملات کے حساس نوعیت کے راز ہوں۔ حکومتیں بنانا اور توڑنا بھی ایک جرم ہے اور عوام کی منشاء اور مرضی کے خلاف ایک ایسا فعل ہے جس سے اٹھارہ کروڑ پاکستانیوں کی توہین ہوتی

ہے۔اگر اس ملک میں واقعی ایک آئینی ، جمہوری اور قانونی حکومت ہوتی تو چوہدری شجاعت کے بیان پر فوراً انکوری ہوتی اور ملک ریاض سے پوچھا جاتا کہ انھیں ملکی اور حکومتی اداروں میں مداخلت کا کس نے حق دیا اور کسطرح آپ نے حکومتیں گرانے اور بنانے کے راز حاصل کیئے۔

چوہدری شجاعت نے ملک ریاض کی سخاوت اور انسان دوستی کا بھی حوالہ دیا جو اس فعل کی ضمانت دیتا ہے کہ آپ اگر ہمت رکھتے ہیں تو رشوت اور سفارش کے ذریعے یا پھر دھونس اور دھاندلی سے جسقدر لوٹ مار کریں وہ آپ کی ہمت ، مردانگی اور قوت بازوں کی کمائی تصور کی جائے گی ۔آپ دولاکھ لوگوں سے ان کے گھر بار چھین لیں، جدی جائیدادوں پر قبضہ کرلیں ، پٹوار خانے جلادیں ، سرکاری ملازمین کو رشوت کے ذریعے خرید لیں ، حکمرانوں ، سیاستدانوں اور دانشوروں کے لیے عیش و عشرت کے سامان مہیا کریں اور قانون سے مبرا حیثیت اختیار کرتے ہوئے جیسے چاہیں دولت کمائیں اور پھر پانچ دس ہزار غریبوں کو اپنی کفالت میں لیکر حاتم طائی بن جائیں ۔

ہماری بد قسمتی کہ ہمارے ملک میں آئین اور قانون کا احترام غریب اور بے بس پر لاگو ہے۔ مگر خوش قسمتی کہ یہاں پر پانچ دس سال بعد نو دولتیوں کی لڑی میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور ایک نیا ملک ریاض ، ایک نیا چوہدری شجاعت ، ایک نیا ملاں ، ایک نیا خان گھرانہ وجود پذیر ہوتا ہے جو ایک ہاتھ سے لوٹتا اور دوسرے سے سخاوت کرتا ہے۔ وہ

دولت کے بل بوتے پر ملکی اور حکومتی رازوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور قانون کو گھر کی لونڈی بنالیتا ہے۔ وہ جب چاہئے حکومت بناتا اور جب چاہئے اسے گرادیتا ہے۔ دانشور اس کے حق میں اور اس کی جانب سے کالم اور کتابیں لکھتے ہیں اور قیمت وصول کرتے ہیں جبکہ ایک طبقہ پریشان ہے کہ آخر اس مرض کی دوا کیا ہے۔ آمریت اور جمہوریت ایک ہی سکے کے دورخ ہیں اور سیاستدان اور حکمران رشتہ داریوں اور مفاد پرستیوں کے بندھن میں بندھے ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ جمہوریت عوام کے لیے عذاب اور ممبروں اور وزیروں کی سہولیات اور اخراجات پر خرچ ہوتا ہے اور باقی کرپشن کی نذر ہوتا ہے۔ آمریت سستی حکمرانی کا نام ہے اس لئے تھوڑا بہت حصہ عوام تک بھی پہنچ جاتا ہے مگر مقبول عام نظام نہیں اس لیے قابل احترام بھی نہیں۔ یہ بھی بد قسمتی ہے کہ آمریت بھی نقلی اور بد نسلی ہوتی ہے۔ جرنیل اکیلے نہیں آتے بلکہ مسلم لیگ بھی ساتھ لاتے ہیں اور جاتے ہوئے کسی سیاستدان کے ہاتھ بیچ جاتے ہیں۔

لاتڑھک اور حاضر جواب سیاستدان جناب شیخ رشید سے ملک ریاض کے متعلق پوچھا گیا تو پہلے ان کی سپیڈ کم ہوئی، پھر سوئی اٹکی اور پھر لمبی 'میں میں' کے بعد بلٹ پروف گاڑی میں نے بھی استعمال کی اور پھر واپس کردی۔ ملک ریاض کتنے دیالو ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ملک ریاض ناخواندہ ہیں اور جناب آصف علی زرداری پی ایچ ڈی ہیں۔ مولانا فضل الرحمان

اس سے بھی دو فرلانگ آگے اور میٹر اونچے ہیں۔ جناب صدر محترم کی سیاسی بصیرت جہاں ختم ہوتی ہے، وہی سے مولانا کا تدبر شروع ہوتا ہے۔ چانکیا، میکاولی، ٹائن بی، روسو اور ھیگل اگر اس دور میں ہوتے تو یقینا ملک ریاض کے کسی

میڈیا اے گزے کے کٹولانج ییں رہائیش پذیر ہوتے اور ملک صاحب کی دی ہوئی بلٹ پروف گاڑیوں میں گھومتے پھرتے، ملک صاحب کے نام سے کالم اور کتابیں لکھ کر معقول معاوضہ بھی کماتے۔ ماضی کے یہ مفکر اس لحاظ سے بھی بد قسمت ہیں کہ انھیں مولانا فضل الرحمٰن جیسا استاد اور گورو میسر نہ ہوا۔ سیاسی بصیرت اور تدبر کا موازنہ کیا جاے۔ تو ملک میں موجود تین عالی دماغوں میں ملک ریاض کا پہلا، جناب مولانا فضل الرحمٰن کا دوسرا اور جناب آصف زرداری کا تیسرا ہے۔ حالیہ سکینڈلز سے ثابت ہوا ہے کہ ملک ریاض کو صدر مملکت تک رسائی ہے اور صدر صاحب ملک ریاض کی کسی بھی خواہش اور فرمائش کو رد نہیں کر سکتے جبکہ ملک ریاض کے دست شفقت کے وسیع سایے میں مولانا کو وجود فٹ نہیں آیا اور نہ ہی ملک ریاض کے کسی فائل اور فولڈر پر مولانا کا نام لکھا پایا گیا ہے۔ ملک صاحب کا مولانا کے حجرے تک رسائی کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک زرداری سب بھاری کی اصلاح لغو اور بے معنی ہے۔ میرے ایک جاننے والے کا کہنا ہے کہ ابھی تک اس سائیز کا شیشہ ایجاد نہیں ہوا جس میں مولانا کو اتارا جا سکے اس لیے شیشے میں اتارنے کی اصطلاح بھی غلط ثابت ہوئی ہے۔ مولانا کو ملک ریاض کی شائد ضرورت اس لیے بھی نہیں تھی چونکہ ان کے پاس اعظم سواتی جیسا

فنانسر موجود تھا جو اب عمران خان کی محفل کو سجا رہے ہیں۔
جو دانشور اور کالم نگار جناب آصف علی زرداری کی سیاست اور فراست کے گیت گاتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ جناب آصف علی زرداری نہ تو لیڈر ہیں اور نہ ہی سیاست دان۔ لیڈری اور سیاست حکومت پر قبضہ کرنے اور محلاتی سازشوں کے زریعے اقتدار کو طول دینے کا نام نہیں ۔ سیاست نظریات پر قائم رہ کر حکومت حاصل کرنے اور ایسی پالیسیاں اپنانے کا نام ہے جس سے عوام الناس کا نظریات پر یقین پختہ ہو اور وہ سیاست دانوں کی سیاسی بصیرت اور نظریاتی اصولوں پر مبنی پالیسیوں سے فیض یاب ہو کر ریاست کے اندر خوشحال زندگی گزارے۔ جس شخص کی سیاسی بصیرت اپنی حلقہ احباب تک محدود ہو اور جس کی پالیسیاں عوام کے بجائے ایک مخصوص طبقے کے مفاد پر مبنی ہو وہ سیاست دان نہیں ہو سکتا اگر ہمارے دانشور اور دیگر سیاست دان جناب آصف علی زرداری کو ان کی چانکیہ نیتی اور جوڑ توڑ کی مہارت پر انھیں بڑا لیڈر اور سیاست دان کہتے ہیں تو یہ تصور بذات خود ان کی دانشوری اور سیاسی سوچ پر سوالیہ نشان ہے۔ اگر طمعہ اور ہوس کے مارے ہوے لوگوں پر قومی خزانہ لوٹانے ، ان کی دسترس میں قومی ادارے دیکر انھیں تباہ اور برباد کرنے اور نااہل اور نیم خواندہ لوگوں کو اہم قومی اداروں کا سربراہ بنا کر انھیں لوٹ مار کرنے کا اختیار دینے کا نام لیڈری اور سیاست ہے تو اس سے بدرجہا بہتر سیاست دان اور لیڈر ملک ریاض ہے۔

یہ نسخہ بھی آزمائیں

آج جو حالت پاکستان کی ہے اور جس طرح اندرونی اور بیرونی سازشوں کے چنگل میں یہ ملک پھنسا ہوا ہے کبھی ایسی ہی حالت ایران کی بھی تھی ایک طرف روسی یلغار تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور دوسری جانب برطانیوں خفیہ اداروں نے ملکی نظام تہ و بالا کر رکھا تھا، بادشاہ شاہ احمد کاچار کی حالت راجہ پرویز اشرف اور یوسف رضا گیلانی جیسی تھی۔طاقت کا منمبہ کابینہ کے کرپٹ وزیر تھے جو ملکی حالت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔ فوج کا مورال انتہائی پست تھا جبکہ جرنیل بڑی بڑی جاگیروں اور عالی شان محلوں میں دار عیش لے رہے تھے۔ صوبائی حکومتیں کمزور اور بد انتظامی کا شکار تھی ۔ کرمان اور سیستان میں انگریز اور روسی مداخلت ہی تھی کہ دونوں بڑی قوتوں کے ایجنٹ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے مقامی ایجنٹوں کی مدد سے ایرانیوں کا خون بہا رہے تھے۔ افغانستان ہمیشہ کی طرح گریٹ گیم کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ اور ایران اس کھیل سے بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ بغداد پر انگریز کی گرفت تھی اور ترکی کمال ازم کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔

روڈ ٹومکہ کا مصنف محمد اسد لکھتا ہے کہ ہر قوم میں ایک ہیرو چھپا ہوتا ہے

ایرانیوں کو بھی سپاہی محمد رضا کی صورت میں ایک ہیرو میسر آگیا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے اور بالیشوک انقلاب کے بعد روسیوں نے شمالی ایران سے فوجیں واپس بلانی شروع کیں تو روس کیمونسٹ انقلاب کی زد میں آ گیا۔ کیمونسٹ انقلابیوں کی مدد سے ایرانی صوبہ گیلان کے ایک بڑے سردار کوچک خان نے بغاوت کر دی اور پے در پے ایرانی فوجی یونٹوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ ایرانی افسر روسیوں کے نام سے گھبراتے تھے اور جدھر سے دباؤ پڑتا وہاں سے بھاگ نکلتے۔ ایسے ہی ایک محاذ پر روسی توپخانے نے بمباری شروع کی تو افسروں نے پسقدمی کا حکم دے دے ا۔ ایرانی سپاہی بھاگ رہے تھے کہ ان پر سپاہی رضا نے اپنے ساتھیوں کو للکارہ اور طعنہ دیا۔ رضا نے کہا اے دارا، خسرو، جمشید، کیقباد اور کنان کی اولاد و کچھ غیرت کرو آخر تم بھاگتے کیوں ہو؟ سپاہیوں نے کہا ہمیں لڑانے والا کوئی نہیں، ہمارے پاس کوئی منصوبہ نہیں، ہمارا کوئی لیڈر نہیں، ہم کیسے لڑیں؟ رضا نے کہا میرے پاس منصوبہ ہے، میں تمارا لیڈر بنوں گا اور میں تمہیں لڑاؤ نگا کیا تمھیں منظور ہے۔افسر میدان سے بھاگ گئے اور جوانوں نے کہا ہاں ہم تمہیں لیڈر مانتے ہیں اور ہمیں تمہاری قیادت منظور ہے۔ رضا نے کچھ سپاہیوں کو مورچہ بند کیا اور ایک ٹکڑی کی مدد سے روسی توپخانے کی بیٹری پر عقب سے حملہ آور ہوا۔ روسی فوجی مارے گئے اور توپوں کا رخ روسیوں کی جانب ہو گیا۔ مورچہ بند سپاہی آ گئے بڑھے اور روسیوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ بادشاہ سلامت کو خبر ہوئی تو چٹے ان پڑھ رضا کو میدان جنگ

میں ہی کپتان بنادیاگیا۔ رضا نے اپنے نام کے ساتھ خان کا اضافہ کر لیااور قزاق قبائیلوں کو فوج میں بھرتی کرکے ایک بریگیڈ ترتیب دیا۔

رضا کو چند یوم بعد میجر، پھر کرنل اور آخر میں قزاق بریگیڈ کا بریگیڈ کمانڈر بنا دیا گیا۔

گیلان میں بغاوت ختم کرنے کے بعد رضا نے اندرونی حالات پر توجہ دی اور قزاق بریگیڈ کے دوافسروں اور اپنے دوست صحافی ضیاالدین کی مدد سے شاہی محل پر قبضہ کر لیا۔ رضا نے احمد شاہ کو حکم دیا کہ وہ کرپٹ کابینہ کا خاتمہ کرے اور اس کے تجویز کندہ اشخاص پر مشتمل نئی کابینہ کا اعلان کرے۔ احمد شاہ نے شاہی فرمان جاری کیا جسکے مطابق رضا وزیر دفاع اور ضیاالدین وزیراعظم بن گیا۔ کرپٹ کابینہ کو قزاق بریگیڈ نے گرفتار کر لیا۔ بہت سے مارے گئے اور جو گرفتار ہوئے انکا انجام بھی برا ہوا۔ ایرانی اشرافیہ جو لوٹ کھسوٹ میں ملوث تھی ملک سے بھاگ گئی اور جو بھاگ نہ سکے وہ قزاق بریگیڈ کے ہتھے چڑھ گئے۔

یہ زمانہ 1921ء کا تھاجب علم وادب کا گہوارہ ایران ان پڑھ سپاہی رضا اور اس کے قزاق بریگیڈ کی گرفت میں آ رہا تھا۔ ضیاالحق کے ساتھی جنرل چشتی اور پرویز مشرف کے جنرل عزیز اور عثمانی کی طرح رضاکے ساتھی افسر جلد ہی منظر سے ہٹ گئے۔ رضا بدستور وزیر دفاع رہااور وزیر اعظم ضیاالدین نے لندن سے

سر نکالا اور سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ رضا خان نے دوستوں سے جان چھڑائی اور دشمنوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اسکا پہلا ہدف قاچار قبیلے کا آخری بادشاہ احمد شاہ تھا۔ وزیر اعظم رضا خان نے اعلان کیا کہ بادشاہ سلامت طویل رخصت پر یورپ جارہے ہیں۔ رضا خان نے احمد شاہ کا سامان بھجوایا اور شاہی جلوس کے ساتھ عراق کی سرحد تک گیا۔ سرحدی چوکی پر ایرانی فوج نے احمد شاہ کو شاہی سلامی پیش کی اور وزیر اعظم رضا خان نے جھک کر بادشاہ کا ہاتھ چوما اور کہا "اگر حضور اعلیٰ کبھی زندگی میں ایران آئے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جائینگے کہ رضا خان اس دنیا کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا"۔

محمد اسد کے مطابق سانپ اور سیڑھی کا یہ کھیل دس سال کے اندر اندر مکمل ہوا۔ محمد اسد لکھتے ہیں کہ تہران میں جرمن ایمبیسی کے ہیڈ کلرک نے انھیں بتایا کہ دس سال پہلے محمد رضا ایمبیسی کے باہر سنتری کی ڈیوٹی انجام دیتا تھا اور تہران کی کسی جھونپڑپٹی میں رہائش پذیر تھا۔ وہ ایک بھدا اور بظاہر بیوقوف سپاہی تھا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی وردی میں ملبوس رہتا اور کبھی بھی اپنی وردی کو دھونے یا استری کرنے کی زحمت نہ کرتا ہیڈ کلرک نے بتایا کہ کبھی کبھی وہ رضا کو بلا کر اسے ارجنٹ لیٹر دیتا اور کبھی کبھی ساتھ دو چار گالیاں بھی دیتا کہ جلدی جا کر لیٹر وزارت داخلہ میں دے آؤ کہیں بازار میں نہ گھومتے رہنا۔ پھر ہیڈ کلرک آہ بھرتا اور کہتا، "دیکھو میں آج بھی کلرک

ہی ہوں اور ان پڑھ رضا خان کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے" آج پاکستان کی حالت اور 1924 کے ایران سے مختلف نہیں مگر اس ملک میں کوئی قزاق سپاہی محمد، 1921 رضا خان بھی نہیں۔ رضا خان ان پڑھ تھا مگر ملک ریاض کچھ نہ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ سپاہی رضا نے میدان جنگ میں قزاق سپاہیوں کی مدد سے اپنی ترقی کا آغاز کیا جبکہ ملک ریاض نے جرنیلوں کی مدد سے راولپنڈی اور لاہور کے ارد گرد فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیے۔ رضا خان دس سال میں وزیر اعظم اور 15 سال بعد ایران کا بادشاہ بن گیا جبکہ ملک ریاض 15 سالوں میں بادشاہ تو نہ بنا مگر بادشاہ گر بن گیا۔ پاکستان کی قومی قیادت ملک ریاض سے خائف ہے اور قومی اسمبلی اس کی سہولیات کے لیے قانون سازی پر مجبور ہے۔ عوام بد حال اور بد حواس ہے اشرافیہ ملک ریاض سے متفق اور بیورو کریسی خدمت گزار اور تابعدار ہے۔ ملک ریاض کا دفتر جرنیلوں کاری ایمپلائمنٹ اور صحافیوں کا سہولت سنٹر ہے۔ ملک ریاض کو کسی قزاق بریگیڈ کی بھی ضرورت نہیں اسکے پاس پہلے سے ہی سیالکوٹ بریگیڈ موجود ہے۔ 9 جرنیلوں کی کمان 15 ہزار ریٹائرڈ فوجی قزاق بریگیڈ سے بہتر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ملک ریاض صلاحیتوں کے لحاظ سے سپاہی رضا خان سے بدرجہا بہتر تقاضوں سے بہرہ ور ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ چوہدری شجاعت حسین کی جانب سے اتحادی سیاسی جماعتوں کے قائدین کی ایک کانفرنس بلائی جائے اور جناب صدر صاحب ایک حکم کے ذریعے ملک ریاض کو ملک

کا بادشاہ تسلیم کرلیں ۔ اسطرح یہ ملک ملک ریاض کی منشاء کے مطابق حکومتیں ٹوٹنے کے عذاب سے بچ جائے گا۔ سیاستدان پہلے سے ہی ملک ریاض سے ادھار کھائے اور اسکی دی ہوئی بلٹ پروف گاڑیوں اور دیگر سہولےات کے ساتھ حکومتی امور میں بھی شامل رکھیں گے میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بادشاہ ملک ریاض چوہدری شجاعت ، آصف علی زرداری ، نواز شریف ، اسفندیار ولی ، الطاف حسین ، عمران خان اور دیگر کی نسبت ملکی نظام بہتر طور چلائیں گے ۔ چند مہینوں میں ریلوے ، واپڈا ، پی آئی اے اور دیگر ادارے کمرشلائز ہوجائیں گے اور بہتر انداز سے چلیں گے۔ ریکوڈک کا سونا ، تانبا ، پیتل مارکیٹ میں پہنچ جائے گااور تھر کا کوئیلا بجلی پیدا کرنے لگے گا ، کالا باغ اور باشاہ ڈیم بن جائیں گے اور ایم کیو ایم ، اے این پی اور قوم پرستوں کو ان کا حق ایڈوانس میں دے دیاجائے گی ملک ریاض کو پتہ ہے کس کی کیا قیمت ہے اور ادائیگی کیسے کرنی ہے۔امریکہ فوج اور یورپی یونین کو بھی ملک ریاض پر اعتراض نہ ہوگا۔یورپی اقوام اور امریکہ بادشاہوں کو پسند کرتا ہے چونکہ ان سے ڈیل کرنا آسان رہتا ہے جب سے ملک ریاض نے عدلیہ کے ساتھ سینگ پھسانے کی غلطی کی ہے اسے احساس ہوگیا ہے کہ رعونیت اور تکبر کے بجائے سادگی اور غریب پروری کے لبادے میں کرپشن کرنا آسان رہتا ہے۔ سنا ہے کہ ملک ریاض نے اپنے متاثرین اور محصور بستیوں میں مفت راشن تقسیم کرنا شروع کردیا ہے اور جن دیہاتوں کے گرد گہری کھائیاں اور مٹی کے پہاڑ کھڑ ے کیے تھے وہاں کچھ آسانیاں فراہم کرنے کا

فیصلہ بھی کیا ہے۔ ملک ریاض نے اپنے متاثرین سے دعا کی بھی اپیل کی ہے کہ سپریم کورٹ سے فارغ ہو کر انھیں مزید سہولیات دی جائینگی۔ ملک ریاض کو چاہیے کہ وہ بادشاہ بننے سے پہلے محصورین بحریہ ٹاؤ ن کو ماڈل بستیوں میں بدل دیں اور ان لوگوں کو بحریہ ٹاؤ ن میں نوکریاں دے کر انھیں آباد کر دیں۔ ماڈل بستیوں کے ساتھ ماڈل زرعی فارم بھی بنائیں تو یہ لوگ ان کی رعایا میں سب سے پہلے شامل ہونگے اور سیالکوٹ بریگیڈ کا حصہ بن جائینگے۔ ملک صاحب اگر بحریہ ٹاؤ ن کو کوئی اسلامی نام دے دیں تو دینی جماعتوں کے لیے انھیں بادشاہ تسلیم کرنے میں آسانی رہے گی۔

وہ ٹی وی اینکر، تجزیہ نگار اور دانشور جنھیں ملکی حالات کا غم کھائے جا رہا ہے اور وہ ملک کے مستقبل سے مایوس ہیں انھیں اب بادشاہی کا تجربہ کرنا چاہیے۔ پچھلے پینسٹھ سالوں سے سیاست دانوں اور جرنیلوں نے جس انداز سے یہ ملک چلایا اس کی مثال نہ سیاسی اور جمہوری تاریخ میں ملتی ہے اور نہ ہی ڈیکٹیٹر شپ میں۔ سیاست دان جمہوریت چلانے کے لیے جرنیلوں کا سہارہ لیتے اور جرنیل حکمران بنتے ہی سیاست دانوں سے رشتہ داریاں جوڑ لیتے ہیں۔ ایوب خان نے سیاسی اور صنعتی گھرانوں سے رشتے قائم کیئے اور ضیا الحق نے سیاست دانوں اور دینی جماعتوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ گجرات کے چوہدری، لاہور کے میاں، ملتان کے مخدوم، سندھ اور بلوچستان کے سردار، وڈیرے، پیر،

جاگیر دار اور خیبر پختونخواہ کے خان، جرنل ضیا الحق کی حکمرانی کو سہارہ دیتے رہے۔ جرنل مشرف کی ٹیم میں مائنس میاں باقی سارے چہرے وہی تھے جو دس سال تک جرنل ضیا الحق کے دیدار سے فیض حاصل کرتے رہے۔

اب ذرا سیول سوسائیٹی کا جائزہ لیں تو تصویر کا دوسرا رخ بھی ایسا ہی ہے۔ سکندر مرزا نے ایوب خان کو وزیر دفاع لگایا اور فوج کا سہارہ لیا۔ رضا خان کی طرح ایوب خان نے بھی سکندر مرزا کو سلیپنگ گون میں جہاز پر بٹھایا اور تہران بھجوا دیا۔ ذولفقار علی بھٹو نے ضیا الحق کا چناؤ کیا اور اپنے انجام کو پہنچے۔ محترمہ بینظیر نے اسلم بیگ سے خفیہ معائدہ کیا مگر تجربہ ناکام رہا۔ میاں نواز شریف اور فوج کے درمیان اچھے تعلقات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ۔ میاں صاحبان کرکٹ کے کھلاڑی بھی تھے اور کھیل کے اصولوں سے باخوبی واقف ہیں۔ فوجی دوستی میں لائن ایئنڈ لینتھ کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ میاں صاحبان پر ہیوی مینڈیٹ کا بوجھ پڑا تو وہ بنیادی اصولوں سے انحراف کرنے لگ گئے ۔ میاں صاحبان یہ بھی بھول گے کہ کھیتی باڑی بیلوں اور ٹرکٹوں سے کی جاتی ہے ہاتھیوں اور ٹینکوں سے نہیں۔ ہاتھی اور ٹینک کھیت تباہ کرتے ہیں آباد نہیں ! میاں صاحب نے مشرف کا چناؤ کیا اور مشرف نے انھیں چلتا کیا وہی سیاسی خانوادے پیر، وڈیرے، گدی نشین اور سردار جو کبھی ایوب خان کے ساتھ تھے ان کے پوتے پوتیاں اور بیٹے بیٹیاں پرویز مشرف کی حکومت میں بھی موجود

رہے۔ فوج اور پیپلز پارٹی میں این آر او ہوا تو مسلم لیگ (ق) نے اس کی تعریفوں کے گیت گائے اور خوشیوں کے بینڈ بجائے۔

فوج نے اپنے وعدے کا پاس کیا اور حکومت کو جمہوریت کی آڑ میں کرپشن اور بدانتظامی کا لائسنس مل گیا۔ وہ سب گھرانے جو پرویز مشرف کی روشن خیال حکومت کا حصہ تھے زرداری حکومت کا حصہ بن گے۔ جمہوریت، آمریت، ضیاالحق کا شرعی نظام، بھٹو کا سوشلزم اور پرویز مشرف کی روشن خیالی سب نظام ناکام ہو گیے اور، ملک بدحال اور قوم خستہ حال ہو گئی۔ اب اگر بادشاہی نظام کے نسخے کو بھی آزماء لیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔

میرپور کی مٹی

کہاوت ہے کہ شہزادی نے ایک طوطا پال رکھا تھا جسکی دیکھ بھال کے لیے سات خوبصورت کنیزیں ہمہ وقت دستیاب رہتی۔ طوطا سونے کے پنجرے میں رہتا اور چاندی کی کٹوری میں پانی پیتا۔ قیمتی بیج اور عمدہ پھل اس کی غذا میں شامل تھے مگر وہ دیگر پالتو طوطوں کی طرح باتیں نہ کرتا اور ہمیشہ اداس رہتا۔ جب کبھی تنہائی میسر ہوتی وہ ایک ہی فقرا بار بار دھراتا اور کہتا ہائے میرا وطن۔ شہزادی طوطے کی اداسی اور ناشکری پر تنگ آ گئی اور نوکروں کو حکم دیا کہ طوطے کو محل سے باہر پھینک دیا جائے اور دیکھا جائے کہ یہ کہاں جاتا ہے اور اس کا کون سا وطن ہے جس کی یاد اس کے دماغ میں رچ بس گئی ہے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور ایک سدھایا ہوا باز طوطے کے تعاقب کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ شاہی خدام نے دیکھا کہ طوطا صحرا میں موجود ایک پرانے اور اکیلے درخت پر جا بیٹھا اور خوشی کے گیت گانے لگا۔

انسان ہو یا حیوان یا پھر دیگر مخلوق ہر ذی روح کو اپنی مٹی سے پیار ہوتا ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ کو جب کفار مکہ نے ہجرت پر مجبور کر دیا تو آپ ﷺ بار بار شہر مکہ کی طرف پلٹ کر دیکھتے اور فرماتے اے شہر مکہ تیرے مکینوں نے مجھے تجھ سے جدا کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ مصر سے مدائن ہجرت کر گئے اور رب

تعالٰی نے مدائن میں ان کے لیے آسودگی کے سبھی سامان مہیا کر دیے مگر وہ اپنے وطن کی یاد میں اکثر مغموم رہتے۔ وطن کی اصطلاح انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمان ہے اور وطن کی مٹی اس اصطلاح کی روح ہے۔ جو لوگ وطن سے دور ہوتے ہیں یا پھر کر دیے جاتے ہیں ان سے بہتر وطن کی قدر و قیمت کوئی نہیں جانتا۔ وہ لوگ جنکا کوئی وطن نہیں ہوتا ان کی کوئی پہچان بھی نہیں ہوتی۔ انسان کی پہچان اس کی دھرتی سے منسلک ہوتی ہے اسی لیے دھرتی کو دھرتی ماں کہا جاتا ہے۔

دھرتی ماں اور ماں میں فرق یہ ہے کہ ماں کی محبت صرف اپنی اولاد تک محدود ہوتی ہے جبکہ دھرتی ماں ساری مخلوق کو جنم دیتی ہے اور مرنے کے بعد اپنے پیٹ میں رکھ لیتی ہے۔ وہ کسی قوم، قبیلے اور برادری کی نہیں بلکہ ہر ذی روح کی ماں ہوتی ہے۔ لوگ اس کی مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور پھر اسی میں آسودہ خاک ہو جاتے ہیں۔ اس کے وجود پر پھیلے کھیت کھلیان، پہاڑ، جنگل، دریا، ندی نالے، چشمے، نہریں، باغ، آبشار اور دیگر آسائیشیں انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کیلیے غذا، دوا، رہائش اور زیبائش کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ دھرتی ماں کبھی اپنے بچوں میں تفریق اور تقسیم نہیں کرتی۔ وہ مذہب، رنگ و نسل اور ذات پات کا بھی خیال نہیں کرتی اور اپنی اولاد کے لیے ہمہ وقت سہولیات فراہم کرتی ہے۔ دھرتی کا حسن ہے کہ اس کی مٹی میں کئی رنگ اور

کئی خوبصورتیاں ہیں۔ کئی اقدار اور خاصیتیں ہیں، کئی حسن اور رعنائیاں ہیں جو سب اس کے بچوں کے لیے مختص ہیں۔

دھرتی کبھی بانجھ نہیں ہوتی مگر ہماری عقل اور سوچ کا دائیرہ اتنا محدود ہے کہ.برادری ازم کے گن چکر سے آگے ہمیں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ چند روز قبل جناب مرتضےٰ علی کالس نے میرپور کے سپوت کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اپنی علمی استعداد اور عقلی قوت سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میرپور کی بانجھ مٹی نے بہت علاج معالجے اور دوا داروں کے بعد صرف ایک بچے کو جنم دیا جسکا نام ڈی آئی جی پولیس خالد چوہان ہے۔ جناب کالس نے جنرل سروپ پر چند حروف اس حوالے سے لکھے چونکہ جنرل صاحب نے جناب ڈی آئی جی صاحب کو ڈگری عطا کی تھی ۔ جناب خالد چوہان اب پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں اور جناب مرتضیٰ علی کالس کے مطابق وہ چند ایسی خوبیوں کے مالک ہیں جو ساری ریاست میں کسی اور میں موجود نہیں ۔ شائد ایسا ہی ہو اور یہ سب فخر کی بات ہے کہ صدیوں بعد میرپور کی بنجر زمین پر علم و عقل کا ایک سائیہ دار درخت پروان چڑھا جسکی ٹھنڈی چھایا اس کی برادری تک محدود ہے۔ فیض خاص ہو یا عام فیض ہی ہوتا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں جناب چوہان صاحب جب میرپور میں اے ایس پی تھے تو بیچ سڑک کے گاڑی کھڑی کرکے دوسری سمت سے آنے والے کسی دوست سے گپ شپ کرتے رہتے تھے جس سے ٹریفک جام رہتا۔ پولیس کا کام ٹریفک بحال رکھنا ہے نہ کہ روکنا ۔

سڑکوں پر آنے والے مسافر ہوتے ہیں جن میں بچے، عورتیں، بوڑھے اور بیمار بھی ہوتے ہیں اور کچھ مسافروں کو تھانوں، کچہریوں اور دیگر مقامات پر بر وقت پہنچنا ہوتا ہے۔ اگر پولیس والا ہی ٹریفک جام کردے تو بحال کون کریگا۔ بہر حال عوام بیچارے ہوتے ہیں اور پولیس پٹواری اور کلرک بادشاہ ہوتے ہیں۔

جناب خالد چوہان کوٹلی میں ایس پی تھے تو انکا انصاف اپنی برادری اور شہر کوٹلی کے حکم تک محدود تھا۔ شیر کاٹھ کا ہو یا بھوسے کا شیر شیر ہی ہوتا ہے۔ جناب خالد چوہان اور سابق ڈپٹی کمشنر کوٹلی چوہدری منیر یکساں خوبیوں کے ملک ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جناب کالس چوہدری منیر جو کہ شاعر بھی ہیں کے لیے الگ کالم باندھنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ کوٹلی میں تعیناتی کے دوران دونوں اعلیٰ افسر اپنی برادری کے ولیمے، ختنے، حقیقے، جنازے، چوتھے اور چالیسویں باقائدگی سے اٹینڈ کرتے اور ثواب کماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب اتنے بڑے اور عالم و عاقل افسران اپنی برادری کا ہر سطح پر خیال رکھیں گے تو دیگر برادریوں کو احتیاط کا پیغام خود بخود مل جائے گا۔

جناب خالد چوہان کی خوبیاں پڑھ کر افسوس ہوا کہ اتنے ذھین و فطین شخص کو پی ایس سی نہیں بلکہ سی ایس پی افسر ہونا چاہیے تھا تاکہ پاکستان کی سطح پر وہ اپنے جوہر دکھلاتے اور عالمی سطح پر کوئی کارنامہ انجام دیتے۔

ذہانت اور قابلیت رب کی عنائت ہوتی ہے اور ہر شخص کسی نہ کسی فیلڈ میں ذھین ضرور ہوتا ہے۔ اصل چیز ذھانت نہیں ہوتی بلکہ اسکا استعمال ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ذھین ہو اور اسکی ذھانت سے مخلوق کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو تو ایسی ذھانت بیکار اور مضر ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے پولیس اصلاح اور فلاح کے بجائے جبر و استبداد کا محکمہ ہے اور جب تک پولیس افسر بد اخلاق ، بدمزاج ، متکبر اور جابرانہ ہو اسکا ٹھکہ نہیں جمتا۔ آج ہمارے معاشرے میں جتنی بُرائیاں ہیں اسکا منبع اور مخزن پولیس اور پٹواری ہے۔ پولیس برائی اور قانون شکنی روکنے کے بجائے برائی پھیلانے اور قانون شکنی کی ترغیب دینے پر معمور رہتی ہے۔ ہم جناب خالد چوہان کے لیے دعا گو ہیں کہ وہ اپنی برادری سمجھ کر ان کی دعائیں لیں۔

آزاد کشمیر پولیس کے دو افسروں میں سابق ضلع میرپور کے گاؤں پنجیڑی کے ایس پی راجہ ممتاز خان تھے اور بعد میں راجہ فہیم عباسی جنکا تعلق ضلع باغ سے ہے۔ فہیم عباسی میرپور میں ایس پی تعینات ہوئے تو سیاستدانوں کی سفارشات کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنا شروع کر دیا۔ الیکشن سے پہلے چوہدری نور حسین نے فہیم عباسی کو وارننگ دی کہ ان کا بیٹا وزیر اعظم بن گیا تو تمہاری ساری تڑ نکال دونگا۔ چوہدری صاحب روائتی سیاستدان ہیں اور اپنی برادری کا خیال رکھتے

ہیں۔ ریکارڈ دیکھا جائے تو آزاد کشمیر میں برادری ازم کی بنیاد چوہدری نور حسین اور بھمبھر کے چوہدری صوبت نے رکھی اور اسی بنیاد پر اپنی سیاست کی عمارت بھی قائم کی۔ چوہدری صوبت کا مقابلہ بھمبھر کے جاگیر دار راجہ ذوالقرنین اور چوہدری نور حسین کا ٹاکرہ ان کے پڑوسی ذیلدار راجہ صفدر سے تھا۔ چوہدری صوبت اور راجہ ذوالقرنین کے درمیان سیاسی چپقلش تو رہی مگر کوئی خونی حادثہ نہ ہوا۔ راجہ صفدر اور چوہدری نور حسین کی دشمنی وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی گئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ذیلدار راجہ صفدر نے میرپور چوک میں چوہدری صاحب پر اپنی ڈبل بیرل سے ڈبل فائیر کردیا۔ چوہدری صاحب شدید زخمی ہوئے مگر اللہ نے ان کی جان بچالی۔۔ برادری ازم اپنی جگہ مگر اس کے باوجود چوہدری نور حسین اور ان کے بھائی چوہدری خادم کئی خوبیوں کے بھی مالک تھے۔ جٹ راجپوت دشمنی کے باوجود دونوں جانب سے بہو بیٹیوں کے احترام اور حفاظت کو جز ایمان سمجھا جاتا رہا اور کبھی کسی بداخلاقی اور برائی کی شکائت نہ ہوئی۔ دوسری جانب شیر کوٹلی نے ہمیشہ گیدڑ اور گدھ پن کا مظاہرہ کیا اور مخالفین کی بہو بیٹیوں کو بھی معاف نہ کیا اور اپنی برادری کے پولیس والوں کی مدد سے بچیوں اور بوڑھی عورتوں کو اٹھوا کر تھانوں میں بند کروایا۔

اسقدر گھناؤنی حرکات اور انتہائی سطح کی اخلاقی گراوٹ کے باوجود یہ شخص

اپنے آپ کو بھٹو کا شیدائی بے نظیر کا سپاہی اور آصف علی زرداری کا بھائی کہتا ہے۔
جناب بھٹو اور محترمہ بے نظیر تو اب اس دنیا میں نہیں رہے مگر جناب آصف علی زرداری کو اسطرف توجہ دینا چاہیے کہ ان کا بھائی ہونے کے دعویدار کی اخلاقی اقدار کیا ہیں۔ جناب چوہدری نور حسین نے ڈی آئی جی فہیم عباسی کی تڑ نکالنے کی بات تو کی تھی مگر دونوں جانب سے مردانگی، جرات اور اصولوں کی پاسداری کا مظاہرہ کیا گیا۔ شائد چوہدری نور حسین نے یہ بات غصے میں کہہ دی مگر جب انکا بیٹا وزیر اعظم آزاد کشمیر بن گیا تو کوٹلی کی طرح کا کوئی ایکشن فہیم عباسی کے خلاف نہ ہوا۔ دوسری جانب فہیم عباسی نے بھی اپنی تڑ قائم رکھی اور سلطان محمود چوہدری کی وزارت عظمیٰ کے دوران طویل رخصت پر چلے گئے اور جب تک سلطانی حکومت رہی عباسی صاحب چھٹیوں کے مزے لیتے رہے۔ چوہدری نور حسین، چوہدری خادم اور چوہدری اعظم سیاسی اخلاقیات اور ذاتی کردار کے حوالے سے بھی منفرد تھے مگر ان کے جانشین بیرسٹر سلطان محمود نے اپنی سلیٹ کبھی صاف نہ رکھی۔ شراب، شباب اور کرپشن کے حوالے سے ان پر کتابیں، کالم اور مضامین لکھے گئے مگر موصوف نے کبھی اخلاقیات کو اہمیت نہ دی۔ بیرسٹر صاحب کی
وزارت اعظمیٰ کے دوران ان پر ہر وزیر اور مشیر محمد شاہ رنگیلا تھا اور رنگ رلیاں منانا ان کے فرائض میں شامل رہا۔ کسی مغربی محقق نے لکھا ہے کہ کشمیر کئی منزلہ عمارت کی مانند ہے۔ جسکا صحن یہی علاقہ ہے جسے ہم کھڑی کہتے ہیں۔ کھڑی کی ایک منفرد تاریخ ہے جسکا احوال پڑھے بغیر

کشمیر کے تاریخی حقائق سمجھنا مشکل ہے۔ علاقہ کی مشہور شخصیات میں سر فہرست برصغیر کی مشہور روحانی شخصیت حضرت پیر شاہ غازیؒ اور ان کے مرید خاص حضرت میاں محمد بخشؒ رومی کشمیر اور عارف کھڑی ہیں۔ جناب مرتضٰی کالس ان دو عظیم ہستیوں کا ذکر کرنا کیوں بھول گئے؟ اور اپنی ساری توانائیاں جناب خالد چوہان پر خرچ کر بیٹھے اس کا جواب وہ خود ہی دے سکتے ہیں۔ جناب پیر شاہ غازی سرکارؒ اور جناب میاں محمد بخشؒ کا تعلق بھی گجر برادری سے ہے اور غالباً ان کی گوت چیچی ہے۔ چیچیاں چیچی گجروں کی بستی کا نام اور آج بھی گجر قبیلہ یہاں آباد ہے۔ سابق حکومتی وزیر اور ایم ایل اے جناب چوہدری رخسار کا تعلق بھی اسی علاقہ اور قبیلہ سے ہے۔ چوہدری صاحب کی بیگم محترمہ اوینا رخسار علاقہ کی واحد خاتون سیاستدان ہیں جنھوں نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز بیرسٹر خاندان کو چیلنج کرتے ہوئے کیا۔ گو کہ وہ اس بار الیکشن نہیں جیت پائیں مگر آئیندہ انکا مستقبل روشن ہے۔ اوینا رخسار دلیر، باہمت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں اور امید ہے کہ وہ میدان سیاست میں کامیابیاں حاصل کرینگیں۔ کھڑی کا علاقہ مردم خیز اور زرخیز ہے۔ راجہ حفضر اقبال کی تصنیف "علاقہ کھڑی تہذیب و ثقافت کے تناظر میں `` ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ جناب چوہدری نور حسین، چوہدری خادم، بیرسٹر سلطان، میجر ریٹائیرڈ چوہدری ارشد، چوہدری اعظم کے علاوہ جنرل نظامی، کرنل راجہ ایوب آف گورسیاں، راجہ سلطان زمرد سابق ڈی آئی جی پولیس، جنرل راجہ سروپ، راجہ ظفر معروف، راجہ

شبیر کیانی، چوہدری رخسار، محترمہ اوینا رخسار، راجہ نوید اختر گوگا، چوہدری یونس آڑوی اور بے شمار نام ایسے ہیں جو سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی میدانوں میں سرگرم عمل ہیں۔

میرپور شہر کا رخ کریں تو شہر میں داخلے سے پہلے جھلا بھائی کا دربار دیکھتے ہی گاڑیوں کی سپیڈ کم ہو جاتی ہے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔ موجودہ میرپور شہر جسے نیو میرپور کہنا چاہیے کا پرانا نام بلا گالہ تھا۔ میرپور کی مٹی میں جھلا بھائیؒ کے علاوہ قطب العارفین حضرت پیر سید محمد نیک عالم شاہؒ اور تحریک آزادی کشمیر کے نامور لیڈر اور مجاہد جناب راجہ اکبرؒ آسودہ خاک ہیں۔ میرپور کی اہم شخصیات کی فہرست طویل ہے جسے رقم کرنا دشوار ہے۔ علاقہ کلری، بنجیڑی اور کسگمہ جو اب ضلع بھمبھر کا حصہ ہیں پہلے ضلع میرپور ہی میں شمار کئے جاتے تھے۔ کسگمہ سابق صدر راجہ ذوالقرنین کا گاؤں ہے جنکے والد متحدہ ھندوستان میں لاہور کے کمشنر اور دادا جنرل راجہ فرمان علی خان ڈوگرہ دور میں ریاست کے چیف آف آرمی سٹاف تھے۔ کلری کے جنرل راجہ اکبر خان، بریگیڈیئر غوث محمد راجہ کے علاوہ ان تین گاؤں کے درجنوں آفیسرز کا تعلق فوج اور سول بیوروکریسی سے رہا ہے۔ سابقہ تحصیل بھمبھر ضلع میرپور کے سپوتوں میں جنرل عبدالرحمان، جنرل نصیر احمد اور چوہدری صوبت کے صاحبزادگان میں سابق سپیکر چوہدری انوار اور میجر جنرل اکرام کمانڈر نادرن

ایریا شامل ہیں ، بھمبھر ہی کے بریگیڈیئر شیر محمد چوہدری ستارہ جرات اور گاؤں پونہ کے حوالدار نور عالم شہید ستارہ جرات (لیپا ہیرو) قابل قدر اور قابل ذکر شخصیات میں شامل ہیں۔ میرپور کی اہم شخصیات کا ذکر ہو اور لکھنے والا بریگیڈیئر راجہ دلاور ، بریگیڈیئر اسلم (لیپا ہیرو) جنرل چیمہ مرحوم، مصنف کشمیریات جناب غلام محمد میر ، جناب ممتاز ہاشمی ، عبدالخالق انصاری ، چوہدری یوسف، بریگیڈیئر جبار بھٹی ، کرنل راجہ عدالت خان ، میجر عباس ، چاچا علی محمد ایڈووکیٹ ، پیر عتیق الرحمان ، پیر ثاقب اقبال شامی، غازی الہی بخش، مفتی عبدالحکیم ، بشارت شہید ، حنیف شہید ، کیپٹن سرفراز مرحوم، جسٹس تاج ، موجودہ چیف جسٹس جناب خان اعظم ، جسٹس عبدالمجید ملک ، جسٹس شیر زمان چوہدری ، جسٹس ریاض اختر چوہدری ، سید زمان شاہ صاحب ، جناب پیر علی جان شاہ صاحب، ارشد غازی ، بیگم ناھید ، ڈاکٹر ریاض اور دیگر اہم شخصیات کو کیسے بھول سکتا ہے۔ میرپور کی مٹی کبھی بانجھ نہ تھی اور نہ ہی ہے۔ اس دھرتی نے سینکڑوں غازی ، مجاھد ، عالم ، محقق ، ولی ، درویش ، عابد ، زاھد ، قانون دان ، سیاستدان جرنیل اور دلیر سپاہی پیدا کئے ہیں ۔ جنکا نام تاریخ کے صفحات پر نہ سہی مگر دل کی گہرائیوں میں محفوظ ہے۔

دکھ کی بات ہے کہ میرپور کی دھرتی پر کچھ ایسے لوگ بوجھ بنے ہیں جو سیاست کو خدمت کے بجائے کاروبار سمجھتے ہیں اور جن کا دین و ایمان کرپشن اور

برادری ازم ہے۔ ایسے لوگ نہ تو اہم ہیں اور نہ ہی قابل ذکر۔ ایسے لوگ چاہے کسی بھی عہدے یا رتبے پر فائز ہوں یا قارون کے خزانوں کے حقدار ہوں وہ کبھی بھی قابل عزت و احترام نہیں ہو سکتے۔ بقول کرنل اشفاق کے ``میں نے زندگی چھوٹے عہدوں پر بڑے لوگ اور بڑے عہدوں پر چھوٹے لوگ فائز دیکھے ہیں، ہماری بدقسمتی کہ آج بڑے بڑے عہدوں پر فلیئز ہیں۔ اخلاقیات، اقدار اور روایات کی جگہ برادری ازم، کرپشن اور لاقانونیت لے لی ہے۔ تہذیب و ثقافت کی جگہ ٹن کلچر کو پروان چڑھایا گیا ہے اور شرافت کو جیالے پن میں بدل دیا گیا۔

سازشی سیاست اور میڈیا کا کردار

سو جاؤ مکینو کہ فصیلوں پر ہر سمت
ہم ابھی زندہ و بیدار کھڑے ہیں

شائد یہ شعر میں نے درست نہ لکھا ہو مگر مقصد واضح ہے۔ شعر میں نے کوئٹہ انفنٹری سکول کے ایک فائیر پاور مظاہرے کے ابتداء میں سُنا تھا شعر بہت ہی بامعنی اور موقع کی مناسبت سے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی بہادر مسلح افواج کے جوان اس شعر کی روح کے مطابق آج بھی وطن عزیز کی فصیل پر کھڑے اپنی زندگیوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں مگر مکینوں کو میڈیا اور سیاستدان ذہنی لحاظ سے مفلوج اور محکوم بنانے میں دن رات ایک کئے ہوئے ہیں۔ فصیلوں پر افواج پاکستان کے باجرات جوان اور فصیلوں کے اندر عدلیہ کے سولہ سپاہی پر سرپیکار ہیں جبکہ پچاس سے زیادہ ٹیلیوژن چینل اور دس بارہ اینکر اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے در پے ہیں۔
ان چینلوں اور اینکروں کے لئے سیاستدان، بھانت بھانت کے دانشور اور مفکر ایسا ایسا چارہ فراہم کر رہے ہیں کہ اینکروں کو جگالی لینے کی فرصت نہیں ہوتی۔ ایک ہی دانشور یا سیاستدان دو دو تین تین چینلوں پر اپنی عقل و دانش

کے موتی بکھیر رہا ہوتا ہے جس کا ہدف فوج، آئی ایس آئی اور عدلیہ ہوتی ہے۔
ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ ملک میں کرپشن، ہنگامی، برائی اور بے حیائی نے جتنی ترقی موجودہ دور جمہوریت میں کی ہے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی مگر میڈیا مسلسل کوشش میں رہا ہے کہ نئے ایشوز کھڑے کرکے عوام کی توجہ اصل ایشوز سے ہٹائی جائے۔ بہت سے اینکروں کے لب و لہجے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس کے وظیفہ خوار ہیں اور ان کا مقصد اور مشن کیا ہے۔ جناب کامران خان صاحب کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ موصوف کو علمائے حق کی باتیں یاد نہیں یا پھر انہیں اُسکا علم ہی نہیں مگر مولانا آزاد کی پشین گوئیاں ڈھونڈ لانے اور پاکستان ٹوٹنے کا عندیہ دے کر اپنی ذہنی کیفیت کا مظاہرہ کر دیا، اس طرح کی باتیں تو مرحوم خان عبدلوالی خان بھی کیا کرتے تھے مگر ان خان صاحب کو شائد جناب عبدلولی خان کی تحریروں تک رسائی حاصل نہیں ہوئی۔ ان کا ایک ٹارگٹ عدلیہ اور دوسرا آئی ایس آئی بھی ہے۔ موصوف نے پچھلے ہفتے اپنے انداز میں ایک واویلہ پروگرام کیا اور ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہوئے ارسلان چوہدری سے گیارہ سوال پوچھے جسکا مقصد اس مقدمے کو فریش کرنا اور کسی نہ کسی بہانے جناب محترم چیف جسٹس کا نام لینا اور آئی ایس آئی کو ملوث کرنا تھا۔ ان جناب سے کوئی یہ پوچھے کہ بھائی آپ صحافی ہو یا جج یا پھر پولیس؟ آپ کو دو آدمیوں کے

درمیان لین دین پر سوال پوچھنے کا کیا حق ہے ؟اس کا صاف مطلب ہے کہ آپ ایک فریق سے سوال پوچھ کر دوسرے کی پذیرائی کر رہے ہو یا پھر اس کے نمک کا حق ادا کر رہے ہو۔فرض کریں اگر ارسلان نے ملک ریاض سے بتیس کروڑ لئے ہیں تو ملک ریاض نے حکومت، جنگلات اور مقامی آبادی سے تیس ارب چھینے بھی تو ہیں۔ان نام نہاد خان صاحب کو چاہیے کہ وہ پنڈی کے نواح میں جا کر بحریہ ٹاون اور ڈی ایچ اے کے محصور بستیوں کے مکینوں سے ملے اور ان کا حالت زار دیکھ کر ملک ریاض سے بھی پندرہ سوال پوچھے۔اینکر حضرات اکثر سوال کرتے ہیں کہ پانچ چھ سالوں کے اندر اندر ارسلان کروڑ پتی کیسے ہوگیا۔یہی اینکر ملک ریاض سے کیوں نہیں پوچھتے کہ بھائی آپ دس بارہ سالوں میں کھرب پتی کیسے ہو گئے۔ایسے ہی سوال شہباز شریف اور چوہدری شجاعت اور پرویز الہی سے بھی پوچھے جانے چاہیے کہ پنجاب کی زمینوں پر قبضہ کیوں ہوا اور آپ نے سرکاری اور جنگلات کی اراضی پر ڈی ایچ اے اور ملک ریاض کو کیوں قابض ہونے دیا؟

خود اس اینکر سے بھی بہت سے سوال کئے جا سکتے ہیں کہ وہ ہر سال چھٹیاں منانے کہاں جاتے ہیں اور اور ان کے اخراجات کون برداشت کرتا ہے اور جو الزامات بحریہ ٹاون کی جانب سے آپ پر لگائے گئے تھے آپ نے انکا جواب کیوں نہ دیا اور حامد میر اور ابصار عالم کی طرح بحریہ ٹاون کے خلاف عدالت میں کیوں نہ گئے؟

خان نے ارسلان چوہدری کے اس بیان پر حیرت کا اظہار کیا جب ارسلان نے میڈیا والوں کو بتایا کہ میں فیصل رضا عابدی کو نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔ خان نے کہا کہ یہ اچنبے کی بات ہے عابدی کو کون نہیں جانتا وہ ہر ٹی وی چینل کے پرائم ٹائم میں آ کر چیف جسٹس اور ارسلان کے خلاف بولتا ہے اور چیلنج کرتا ہے کہ اسے عدالت میں طلب کیا جائے۔ خان کی مایوسی دیدنی تھی۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے"۔ شائد حکومت اور خان سمیت بہت سے اینکروں کی یہ خواہش پوری نہ ہو۔ کیا فیصل رضا عابدی کو پرائم ٹائم میں دعوت دے کر اور عدلیہ کو برا بھلا کہلوا کر اینکر حضرات اچھا کام کر رہے ہیں اور ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ کیا یہی صحافیانہ اخلاقیات اور اقدار ہیں جو اینکر اور چینل فیصل رضا عابدی، فواد چوہدری، مبشر لقمان کے بیانات اور کلمات نشر کرتے ہیں انہیں اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیئے اور دل کی آواز سننی چاہیئے۔ مبشر لقمان کے لئے یہ سزا کافی نہ تھی کہ عدلیہ نے اس کے خلاف مقدمہ سننے سے انکار کر دیا۔ باقی دو کا بھی یہی حال ہے کہ یہ لوگ اس قابل ہی نہیں کہ ان کے متعلق بات کی جائے۔ خان کو چاہیئے کہ وہ ایک سروے کنڈکٹ کروائیں اور عام لوگوں سے اپنے، فواد چوہدری اور فیصل رضا عابدی کے متعلق پوچھیں کہ عام آدمی کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ٹی وی اینکروں کا ایک پسندیدہ ٹاپک پاکستان کا ٹوٹنا ہے (ایسے اینکروں اور میزبانوں کے منہ میں خاک)۔ میں نے اپنے مضمون میں چند مثالیں رقم کرنی تھیں مگر بابر اعوان نے ان ہی مثالوں سے اپنے کالم کی ابتداء کی جو 30 اگست کے نوائے وقت میں شائع ہو چکا ہے۔ اگر جمشید دستی، شوکت بسرا، فواد چوہدری اور فیصل رضا عابدی کا پاکستان ٹوٹ رہا ہے تو اسے ٹوٹنے دو چونکہ ان کا پاکستان ان کا مفاد، ذہنی خلفشار اور سیاسی انتشار ہے۔ یہ لوگ خود ٹوٹ کر بکھر جائینگے مگر وطن عزیز پاکستان ہمیشہ قائم رہے گا۔ جو سیاستدان، صحافی اور دانشور پاکستان ٹوٹنے کا عندیہ دے رہے ہیں وہ اپنے آقاؤں کی زبان بول رہے ہیں اور ان کی خواہشات کا پرچار کر رہے ہیں۔ میں خان اور ان کے ہم خیال و ہم زبان اینکروں اور صحافیوں سے درخواست کروں گا کہ وہ امریکی صحافیوں کی لکھی ہوئی پراپیگنڈہ کتابوں کا پرچار کرنے کے بجائے جناب محمد اسد کی کتاب" روڈ ٹو مکہ" پڑھیں جس میں لکھا ہے کہ جناب محمد اسد کو حضرت علامہ اقبال نے کہا کہ سیاست بند کرو اور پاکستان کے لئے کام کرو۔ جناب محمد اسد لکھتے ہیں کہ یہ تب کی بات ہے جب پاکستان کے متعلق چند لوگ باتیں کرتے تھے اور دیگر اسے افسانہ سمجھتے تھے۔ جناب اسد نے علامہ کو جواب دیا کہ پاکستان تو محض ایک افسانہ ہے جبکہ علامہ نے زور دے کر کہا نہیں یہ اٹل حقیقت ہے۔

ممتاز مفتی کی دو کتابیں علی پور کا ایلی اور الکھ نگری بھی اسی طرف اشارہ

کرتی ہیں کہ پاکستان کا وجود پذیر ہونا ایک سچائی اور روحانی حقیقت ہے۔ جو لوگ پاکستان کے ٹوٹنے کی باتیں کرتے ہیں وہ سچائی روحانیت اور حقیقت سے واقف نہیں۔ کامران خان اور حامد میر سے گزارش ہے کہ وہ امن کی آشا کے گیت ضرور گائیں مگر ارتھ شاستر کا مطالعہ بھی کرلیں۔ جس قوم کا مذہب اور سیاست چانکیہ نیتی کے اصولوں پر مبنی ہے اس کے ساتھ امن کی آشا کی آس لگانا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ آپ بنگلہ دیش کی مثال سامنے رکھ لیں تو آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ میرا چھوٹا بھائی دو سال پہلے بنگلہ دیش گیا اور وہاں سے مختلف اشیا کی قیمتیں لکھ کر لایا۔ بنگلہ دیش کی مارکیٹوں میں بھارتی اشیاء کی بھرمار ہے جو پاکستان کی نسبت بہت ہی مہنگی ہیں۔ بھائی نے بنگالی تاجروں، مزدوروں اور محنت کشوں سے پوچھا کہ جو چیزیں آپ بھارت سے مہنگی اور گھٹیا کوالٹی کی خریدتے ہو وہی چیزیں پاکستان میں سستی اور اعلیٰ کوالٹی میں دستیاب ہیں۔ آپ پاکستان سے کیوں نہیں خریدتے؟ تاجروں نے بتایا کہ بنگلہ دیش اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی چیزیں صرف بھارت سے خریدے۔ ورنہ ہمارے پسندیدہ ملک پاکستان اور چین ہیں۔ امن کی آشا کے مبلغین اور موجودہ حکمران بشمول میاں برادران جس طرح بھارت کی طرف کھنچے چلے جارہے ہیں اس کا ایک مزہ چھ سو روپے درجن بھارتی کیلوں کی صورت میں قوم چکھ چکی ہے۔ آنے والے چند سالوں میں جب کشمیر اور شمالی علاقوں کے پانیوں پر بھارت مکمل کنٹرول حاصل کرلے گا تو پاکستان کے عوام جیالہ پن اور متوالہ پن بھول

جائیں گے۔ عوام مہنگائی اور غربت کے بوجھ کے باوجود جیالہ اور متوالی جنون اپنے دماغوں پر طارے کئے جس مدہوشی کا شکار ہیں بہت جلد ان کا نشہ ہرن ہونے والا ہے۔ جہانگیر بدر کے اس بیان میں بڑا وزن ہے کہ عوام ایسی ہی جمہوریت چاہتے ہیں اور ہمیں پسند کرتے ہیں۔ بے شک اگر عوام یہ سب پسند نہ کرتے تو ڈیزل 116 روپے نہ ہوتا۔ ایک ٹیلیویژن رپورٹر پنڈی کے کسی پٹرول پمپ پر عوامی رائے جاننے کی کوشش کر رہا تھا تو ہر شخص اس مہنگائی پر افسردہ تھا اور ساتھ ہی بے بس بھی دکھائی دیتا تھا۔ ہر ایک نے کہا کہ ہم کیا کریں حکومت ہمارے خلاف سازش کر رہی ہے۔ اگر ڈیزل 216 روپے فی لٹر بھی ہو گیا تو ہم گزارہ کر لینگے۔ کیا کریں مجبور جو ہوئے۔

عمران خان فرماتے ہیں کہ وہ ملک کی تقدیر بدل دیں گے۔ موصوف کی شائد پتہ نہیں کہ تماش بین مقدر نہیں بدل سکتے۔ آج عمران خان اور میاں برادران سمیت جماعت اسلامی اور دیگر جن میں مولانا فضل الرحمٰن شامل ہیں، عوام کو یہ احساس دلانے میں ناکام ہیں کہ جیالے اور متوالے بن کر وہ اپنی عزت اور آزادی کا سودا کر رہے ہیں۔ عمران خان کرکٹ کے اچھے کھلاڑی رہے ہیں اور وہ اپنی سیاست بھی کرکٹی انداز میں چلا رہے ہیں۔ ان کا سونامی نواز شریف کے گرد گھوم رہا ہے جس کا نقصان نواز شریف کو تو ضرور ہوگا مگر فائدہ عمران خان کو بھی نہیں ہوگا۔ سیاست میں انتظار نہیں ہوتا۔ جو سیاستدان انتظار

کرتا ہے وہ ذاتی مفاد حاصل کر لیتا ہے مگر عوام کو سازش کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔
مولانا فضل الرحمٰن، ایم کیو ایم، اے این پی، ن اور ق سمیت سبھی سیاسی پنڈت مفاد سے جڑے ہوئے ہیں اور عوام سے منہ موڑے ہوئے ہیں اور میڈیا نے بھی اپنی اپنی پسند کے بت تراشے ہوئے ہیں اور انہیں خدا ثابت کرنے کی جستجو میں ہیں۔
محترم عبدالقادر گیلانی نے اپنے والد کی چھوڑی ہوئی سیٹ پر کامیابی کے بعد اسمبلی میں حلف اٹھایا اور میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے پہلا پتھر عدلیہ پر پھینکا۔ گیلانی نے کہا اگر موسیٰ گیلانی کا باپ جج ہوتا تو وہ اس حال میں نہ ہوتے جس سے وہ دو چار ہیں۔ لگتا ہے کہ کامران خان ایسے موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ اپنے اگلے ہی پروگرام میں موصوف نے عبدالقادر گیلانی کا یہ انٹرویو خصوصی طور پر دکھایا اور اسے نیچرل ری ایکشن قرار دیا۔ جب سے عبدالقادر گیلانی نے عدلیہ پر تنقیدی جملے کسے ہیں کامران خان اپنے کسی نہ کسی پروگرام میں یہ جملے سنانے کی گنجائش نکال ہی لیتے ہیں۔ کامران خان اور دوسرے لنکر کو صحافیانہ اقدار و اخلاقیات کے پیش نظر احتیاط سے کام لینا چاہیے۔
آج وہ جن آقاؤں کی خدمت کی بجا آوری میں فوج، آئی ایس آئی، عدلیہ اور عوام کے خلاف نبرد آزما ہیں کل کلاں اگر عوام کی طرف سے نیچرل ری ایکشن شروع ہو گیا تو اعلیٰ حکمرانوں سے رابطے، بڑے ہوٹلوں کی ضیافتیں، سیاسی

پنڈتوں کی مہربانیاں اور مفادات کے بتوں کی پوجا کسی کام نہ آئی گی۔ میڈیا جس انداز سے اہم قومی اداروں کی تضحیک اور عوام کی تذلیل کر رہا ہے اسے آج نہیں تو کل اسکا جواب دینا ہی ہوگا۔

کامران خان اور ان کے ہم خیال اینکر بھول رہے ہیں کہ شائد عوام ان کی لگی لپٹی باتوں، طنزیہ اور ذلت آمیز رویے اور تضحیک آمیز الفاظ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ سب ان اینکروں کی بھول ہے اور انہیں پتہ نہیں کہ عوام ری ایکشن اصل سونامی ہوگا جس میں ان خود ساختہ سکالرز سمیت خود عمران خان کا سفینہ بھی ڈوب سکتا ہے۔ اس لیے وطن کی مٹی سے محبت اور اس کے اداروں کی قدر کرنا ہر پیشے کے فرد کے لیے لازم ہے۔ تنقید ہی سے تعمیر منسوب ہے مگر تنقید میں ذاتی پسند و ناپسند کی بجائے ملکی اور قومی مفادات کو مد نظر رکھا جائے۔

صوبوں کی تقسیم اور میڈیا

میڈیا پر پیش کردہ سوالات میں ان کا جواب بھی موجود ہوتا ہے اور ان سوالات کے اٹھانے والوں کے مفادات کا عکس بھی بالکل واضح ہے۔ میڈیا کا ایک پسندیدہ موضوع نئے صوبوں کا قیام ہے جسے بھاری بوجھ اُٹھانے والے اینکر اس انداز سے پیش کرتے ہیں جیسے وہ اصل محرکات اور ان کے پیچھے سازشوں سے ناواقف ہوں۔ وہ نئے صوبوں کی بات کرنیوالے سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں کے نمائندوں سمیت ان کی سوچ اور مفاد کو نئے رنگ میں پیش کرنیوالے صحافیوں اور دانشوروں کو پہلے سے طے فارمولے کے تحت بولنے کی نہ صرف آزادی دیتے ہیں بلکہ ایک آدھا لقمہ ان کی تائید میں بھی ادا کردیتے ہیں۔ یہ اینکر جو سرکاری دانشور بھی ہیں کبھی بھی سچی اور حقیقی رائے دے کر پروگرام کا اختتام نہیں کرتے جو کہ صحافتی اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ اینکر دانشوروں میں سے بہت کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ وہ سال ہا سال سے لکھتے آئے ہیں اور ان کا تجربہ ان کی دانش کا سرٹیفیکیٹ ہے۔ ان اینکروں اور دانشوروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ ان کی تحریروں کو کون پڑھتا تھا اور اس کا عوام الناس پر کیا اثر ہوتا تھا۔ کچھ دانشوروں اور اینکروں نے جیلیں بھی کاٹی ہیں اور ان کی بھی ڈیمانڈ ہے کہ انہیں اب سزا کے طور پر سنا جائے ورنہ وہ ہر چیز کو تہس نہس کردینگے۔

جو وہ ویسے بھی کر رہے ہیں۔ معذرت کے ساتھ ، میں بھی اسی پیشے سے وابستہ ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں صحافی بھی عوام دوست نہیں رہے اور نہ ہی کسی صحافی نے عوامی مشکلات اُجاگر کرنے کی وجہ سے جیل کاٹی ہے۔ صحافت ہمیشہ دائیں یا بائیں بازوں کی ترجمان رہی ہے۔ اسی طرح جس بازوں نے اقتدار سنبھالا دوسرے بازوں کو مڑوڑ دیا جس کی لپیٹ میں صحافی حضرات بھی آ گئے۔ ان صحافیوں میں ایسے بھی ہیں جو ہر برسر اقتدار بازوں سے چمٹنے کا گُر بھی جانتے ہیں اور ہمیشہ اقتدار کی چھتر چھایا میں رہتے ہیں۔ جہاں تک نئے صوبوں کا تعلق ہے تو اگر اس کی واقعہ ہی ضرورت پہلے سے تین حصوں میںPK سے ہونا چاہیے۔ خیبرPK ہے تو آغاز بلوچستان اور خیبر تین الگ سیاسی وجود ہیں۔ دیکھا جائے توPK تقسیم ہوچکا ہے جس میں فاٹا، پاٹا اور خیبر ملک کے اندر جو سیاسی ابتری اور دہشت گردی کی لہر موجود ہے اس کا باعث صوبہ خیبر کی سیاسی، سماجی اور انتظامی تقسیم ہے۔ جب تک یہ تقسیم ختم نہیں ہوتی اور سرحدی PK علاقوں کے عوام کو ملک کے دیگر صوبوں کے برابر حقوق نہیں ملتے نہ دہشت گردی ختم ہوگی اور نہ ہی ملک میں سیاسی استحکام پیدا ہوگا۔

اس قضیے کو حل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ ساتوں قبائلی پولیٹیکل میں ضم کر دیا جائے اور آئینی ترمیم کے ذریعے قبائلی علاقوںPK ایجنسیوں کو صوبہ خیبر اور عوام کو مساویانہ حقوق دیئے جائیں۔ ہر ایجنسی کو رقبے

اور آبادی کے لحاظ سے ضلعوں اور تحصیلوں میں تقسیم کرکے وہاں ایڈمنسٹریشن قائم کی جائے اور ہنگامی بنیادوں پر ہر ایجنسی میں دو دو یونیورسٹیاں اور میڈیکل کالج قائم کئے جائے ں۔ اسطرح سکولوں اور کالجوں کی تعداد بڑھائی جائے اور اقوام متحدہ کے ذریعے ساری دنیا کے امیر ممالک سے ان ایجنسیوں کی ترقی اور خوشحالی کے لئے امداد کی اپیل کی جائے اور حاصل شدہ رقوم کو اقوام متحدہ کے بنائے ہوئے کسی امدادی کمیشن کے ذریعے ہی خرچ کیا جائے۔ جب تک افغان سرحد پر فاٹا اور پاٹا موجود ہیں۔ دنیا میں اور خاصکر پاکستان میں دہشت گردی میں اضافہ ہوگااور پاکستان کبھی خوشحال اور سیاسی لحاظ سے مضبوط ملک نہیں بن سکے گا۔

چونکہ فاٹا اور پاٹا کی موجودگی سے بڑے بڑے مگر مچھوں کے مفادات منسلک ہیں اور ان کی خوشحالی اور آسودگی کے سامان ان سات ایجنسیوں کے مرھون منت ہیں اسلئے کسی لشکر، دانشور اور سیاستدان کی نظر اس طرف نہیں جاتی۔ فاٹا اور پاٹا دہشت گردی کے مراکز ہی نہیں بلکہ دنیا بھی کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی آماجگاہ بھی ہیں۔فاٹا اور پاٹا منشیات، مہلک ہتھیاروں اور دیگر اشیاء سمگلنگ کے مراکز اور منڈیاں ہیں۔ ان ایجنسیوں میں عوام اور سرکاری مشینری بشمول فوج جس قدر غیر محفوظ ہیں، سمگلر، دہشت گرد اور غیر ملکی ایجنٹ اتنے ہی محفوظ ہیں۔ فاٹا کے ایم این اے اور سینیٹر مرکزی حکومت میں سیاسی اپ سیٹ کرنے

کا اہم ذریعہ ہیں۔ یہ سنیٹرز اور ایم این اے اپنے عوام کی کیا نمائندگی کرتے ہیں ؟ اس کا احوال ساری دنیا کے سامنے ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ حکومتی پارٹی کا حصہ ہوتے ہیں اور ہر سال کروڑوں کماتے ہیں۔ اگر ان حضرات کے حلقہ انتخاب کی طرف دیکھا جائے تو سوائے مایوسی اور محرومی کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ فاٹا کے ایم این اے طلسماتی لوگ ہیں ان کی اس جرات کو بہر حال داد دینی چاہیئے کہ وہ الیکشن لڑنے ایک بار ضرور جاتے ہیں اور ہمیشہ جیت کر اور زندہ و سلامت واپس آ جاتے ہیں۔ حلف برداری کے بعد یہ لوگ پشاور اسلام آباد یا پھر دبئی ، شارجہ اور مشرق بعید کے ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاقوں پر طالبان یلغار کریں، افغان افواج حملہ آور ہوں یا امریکی ڈرون آگ برسائیں ان کی بلا سے۔

یہی حال بلوچستان کا ہے۔ بلوچستان بھی چار حصوں میں تقسیم ہے جسے یکجا کرنے یا پھر چار صوبوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ہے۔ ساراوان اور جھالاوان پہلے سے موجود ہیں جو کہ سرداری اور نوابی نظام کی تقسیم ہے۔ اسی طرح بلوچستان کا پختون علاقہ بلوچ علاقوں سے الگ ہے اور کسی بلوچ پختون قبائل سے تعلق داری، رشتہ داری اور قربت نہیں جبکہ مشرقی بلوچستان جس میں جھل مگسی، ڈیرہ مراد جمالی اور سبی وغیرہ شامل ہیں ایک وسیع علاقے پر مشتمل الگ پہچان کا حامل خطہ ہے۔ جس پر بلوچی کم اور سندھی تہذیب کی زیادہ چھاپ ہے۔ کوئٹہ مرکز سے

دور اور سو میل سے زیادہ سلسلہ کوہ کی دوسری جانب واقع ہونے کی وجہ سے اس علاقہ پر حکمران طبقے کی نظر کم ہی پڑتی ہے۔ جس طرح موجودہ حکومت سندھ کی شہری اور دیہی تقسیم پر ڈٹی ہوئی ہے اگر سندھ سے منسلک بلوچستان کے علاقوں پر مشتمل ایک انتظامی یونٹ بنا دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان علاقوں میں بسنے والے عوام کی زندگیوں میں بھی خوشحالی نام کی کوئی چیز آ جائے۔ بلوچستان میں بھی فاٹا اور پاٹا کی طرح A اور B ایریاز ہیں جہاں حکومت کی کوئی گرفت نہیں۔ فاٹا کی طرح یہ علاقے بھی افغان سرحد پر ہیں جہاں کسی اینکر کا کیمرہ، صحافی اور دانشور کی سوچ نہیں جاتی۔ بلوچستان کے حالات پر تو بہت بات ہوتی ہے اور پاکستان کو ٹوٹتا اور بکھرتا دیکھنے والے اینکروں، نام نہاد سیاستدانوں اور دانشوروں کی سوئی اس بات پر اٹک جاتی ہے کہ بلوچستان کے حالات مشرقی پاکستان سے بھی بدتر ہیں اور آزاد بلوچستان کی صورت میں ایک اور بنگلہ دیش پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں گرنے والا ہے۔

اللہ ان اینکروں، دانشوروں اور سیاستدانوں کی ہر خواہش پر عذاب نازل کرے یا پھر انہیں حقیقت کا سامنا کرنے کی توفیق دے کہ وہ سچ بولیں اور سچ لکھیں۔ تاکہ عوام الناس اصل حقائق سے واقف ہو سکیں۔ جناب حامد میر نے اپنے ایک شو میں نسل در نسل مسلم لیگی خواجہ آصف سے زور دے کر کہلوایا کہ پنجابی فوج بلوچوں کی نسل کشی کر رہی ہے۔ جناب میر صاحب کے دل میں فوج اور آئی ایس آئی

کے خلاف نفرت ان کے ہر پروگرام میں کسی نہ کسی صورت سامنے آجاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان میں کوئی فوجی آپریشن نہیں ہو رہا، وہاں جو بھی کاروائی ہو رہی ہے وہ ایف سی کر رہی ہے۔ اگر جناب حامد میر اور خواجہ آصف ایف سی کی تنظیم پر توجہ دیں تو ایف سی فوج نہیں بلکہ ایک نیم فوجی تنظیم ہے جو صوبائی حکومت کے ماتحت کام کرتی ہے۔ ایف سی وزارت داخلہ اور وزیر اعلیٰ کی طرف سے دیئے گئے احکامات کی پابند ہے اور بلوچستان کا وزیر اعلی کبھی پنجابی نہیں ہوتا۔ ایف سی کے جوان بھی صوبے کے ہی باشندے ہوتے ہیں اور اکثریت پٹھانوں کی ہوتی ہے۔ پٹھانوں کے بعد ڈیرہ غازی خان، میانوالی، بھکر سے تعلق رکھنے والے بلوچ بھی ایف سی میں بھرتی ہوتے ہیں مگر ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ایف سی کے افسر پاک فوج سے لئے جاتے ہیں اور ترجیح پشتو، ہندکو اور سرائیکی بولنے والے افسران کو دی جاتی ہے جس کی وجہ ٹروپس کے ساتھ کمیونیکیشن اور بارڈر کے دوسری جانب بولی جانے والی زبان جو کہ پشتو ہی ہے کی سدھ بدھ رکھنا ہوتی ہے۔ ایف سی کا بنیادی کام پاک افغان بارڈر کی حفاظت اور صوبے میں امن و امان قائم رکھنا ہے جسکے احکامات صوبائی حکومت دیتی ہے۔

ان ٹی وی اینکرز کے دل میں فوج اور آئی ایس آئی کی ناپسندیدگی کی معقول وجوہات ہو سکتی ہیں مگر انہیں ہر بات دلیل اور شواہد کے ساتھ کرنی چاہیے۔

اگر ایف سی بلوچستان میں کچھ غلط کر رہی ہے تو اس کا ذمہ وہاں کے وزیر اعلی، گورنر اور ملک کے وزیر داخلہ کے سر ہے فوج کے نہیں۔ یہ کہنا اور خواجہ آصف سے فتویٰ حاصل کرنا کہ پنجابی فوج بلوچوں پر ظلم کر رہی ہے نہ سچ ہے اور نہ ہی حقیقت۔ جناب حامد میر کے اس پروگرام کے بعد بلوچستان میں بسنے والے کتنے پنجابی قتل ہوئے؟ ان کی جائیدادیں چھین لی گئیں یا پھر جلا دی گئیں۔ اس پر حامد میر کبھی پروگرام نہیں کریں گے اور نہ ہی ان لوگوں کو اپنے شو میں مدعو کرکے ان کی بھپتا عوام کے سامنے رکھیں گے۔

بلوچستان میں آج جو ہو رہا ہے اس کی منصوبہ بندی بہت پہلے سے ہو چکی تھی جس کی نشاندہی جنرل قیوم نے اپنے سلسلہ وار کالموں میں کی مگر کسی نے دھیان نہ دیا۔ اگر یہ ٹی وی ایکٹرز چاہیں تو جنرل عبدالقیوم کو اپنے شو میں مدعو کریں تاکہ قوم کو پتہ چلے کہ امن کی آشا کا اصل روپ کیا ہے اور ان امن کے گیت میں پاکستان کی بربادی کا کیا پیغام چھپا ہوا ہے۔ اگر جناب اکبر بگٹی کا سانحہ نہ بھی ہوتا تو بلوچستان میں ہلچل ضرور ہوتی اور اسے کوئی دوسرا رنگ دے دیا جاتا۔

حکومت نئے صوبے بنانے، عدلیہ سے بگاڑ پیدا کرنے کے علاوہ پٹرول اور گیس کی من مانی قیمتیں وصولنے اور ٹی وی شوز کے ذریعے عدلیہ پر پھبتیاں کسنے کے

علاوہ کچھ کر رہی ہے تو کرپشن کو قانونی تحفظ فراہم کر رہی ہے۔اور اب اس کو قانونی تحفظ احتساب بل کی صورت میں دیا جارہا ہے۔ اپوزیشن حکومتی کاروائیوں پر خاموشی میں ہی آفیت سمجھتی ہے یا پھر کوئی بھونڈا بیان داغ کرکچھ عرصہ کے لئے آرام فرماتی ہے۔ میڈیا اس کھیل کا ریفری ہونے کے علاوہ بگاڑ کو مزید بگاڑنے کا سبب بنتا ہے اور دانشور اینکر مال کی مناسبت سے مزاح پیش کرتے ہیں۔

باخبر بے خبرے

جناب غازی صلاح الدین ایک سینئر صحافی اور تجزیہ نگار انگریزی میں لکھتے ہیں۔ظاہر ہے کہ جب لکھتے انگریزی میں تو سوچتے بھی انگریزی ہی میں ہونگے۔جب دیسی آدمی انگریزی میں سوچتااور لکھتا ہے تووہ صرف انگریزی نمائندگی کرتا ہے اور جب انگریزی لکھتا ہے تو صرف انگریزی ہی لکھتا ہے۔دیسی اور بدیسی انگریزی دانو کا فائدہ یہ ہے کہ دونوں ہی دیسی لوگوں کی سوچ اور سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے جناب صلاح اُلدین نے اپنے کالم میں لکھا کہ وہ کچھ روز پشاور میں قیام پذیر ہوئے اور انھیں اسلامیہ کالج اور پشاور یونیورسٹی کے طلباء سے ملنے کا موقع ملا۔غازی صاحب لکھتے ہیں کہ انھیں یہ جان کے حیرت ہوئی کہ پختون طلباء دخترپاکستان ملالہ یوسفزائی کو نہ صرف ناپسند کرتے ہیں بلکہ اس پر تنقید بھی کرتے ہیں۔

جناب غازی صلاح الدین جیسا باخبر اور سینئیر صحافی بھی بے خبر نکلا۔انھیں چاہیے تھاکہ پشاور قیام سے پہلے وہ کسی دیسی اور اصلی پٹھان سے مل لیتے اورپٹھانوں کی روایات اور رسومات کی خبر لے لیتے۔غازی صاحب کا کالم پڑھ کرہم بے صبرے ہو گئے اور کراچی کمپنی جاکرایک اسی سالہ اصلی اور

دیسی یوسفزئی پٹھان بابے کو جا پکڑا۔ باباجی نہ صرف عالم دین تھے بلکہ پکے اور کھرے انسان اور مادی آلائشوں سے مکمل پاک اور صاف تھے۔ جناب غازی صلاح الدین کی طرح مجھے بھی حیرت ہوئی جب ملالہ یوسفزائی کا نام لیتے ہی باباجی نے لگاتار پانچ چھ برسٹ مارے۔ باباجی کی بمباری کا حدف حامد میر، پاکستانی اور مغربی میڈیا اور ملک بھر کے سیاسی اور غیر سیاسی قائدین اور دانشوری کے دعویدار دیسی اور ولائیتی مخلوق تھی۔ باباجی نے مختلف ٹیلیویژن چینلوں پر دانشوری اور تجزیہ نگاری کرنے والے ریٹائرڈ فوجیوں اور خاص کر دو ریٹائرڈ ایئر وائس مارشلوں پر کرپٹ بمبنگ کی اور اُنھیں ایئر مارشل کے بجائے کورٹ مارشل اور فیلڈ مارشل کہتے رہے۔ باباجی نے کہا کہ ان افسروں، صحافیوں اور خود ساختہ دانشوروں کو بولو کہ وہ ہماری تاریخ پڑھیں ہمیں تجاویز نہ دیں۔

موسم کچھ خوشگوار ہوا تو باباجی نے فرمایا کہ پشاور کے طلباء نے جس ناراضگی کا اظہار کیا وہ درست ہے۔ اور سوات کی بچیوں نے جو کچھ ادارے کے نام کے بدلنے پر کیا وہ بھی سب درست ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ حامد میر کی نظر سارے سوات میں صرف ملالہ پر ہی کیوں پڑی۔ یہ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہی ہوا ہے اور اسکرپٹ میں اور بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔ جس کی خبر اس ملک کی عوام کو نہیں۔ ملالہ نے حامد میر کے مائیک پر صرف یہ کہا تھا کہ اسکا سکول کھلنا

چاہیئے وہ پڑھنا چاہتی ہے۔کیا باقی سواتی بچوں نے کبھی کہا ہے کہ سکول بند ہونے چاہیئے اور وہ پڑھنا نہیں چاہتی ؟ڈماڈولہ میں ڈرون حملے میں شہید ہونے والے تین سو بچے بھی طالبعلم تھے اور مدرسے میں پڑھ رہے تھے۔ان کا جرم یہ تھا کہ وہ قرآن و حدیث اور فقاء کے طالبعلم تھے۔وزیرستان میں شہید ہونے والے بچے بھی پڑھنا چاہتے تھے مگر مار دیئے گئے۔حامد میر اور اس کے ہمنواء ان سیکڑوں بچوں کے گھروں میں کیوں نہیں جاتے اور ان کے ماں باپ سے کیوں نہیں پوچھتے کہ اُن کے جگر گوشے پڑھ لکھ کر کیا بننا چاہتے تھے ؟ پاکستان میں اور خاص کر خیبر پختونخواہ میں ایسا کوئی مدرسہ نہیں جہاں دینی تعلیم کے ساتھ کمپیوٹر اور دیگر علوم کی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔کیا ملالہ نے چندہ جمع کر کے کوئی تعلیمی سکول یا پھر معذور اور یتیم بچوں کیلیئے کوئی ادارہ کھولا تھا۔صرف حامد میر کے پروگرام میں یہ کہنا کہ میں پڑھنا چاہتی ہوں میرا اسکول کھولو۔بڑا کارنامہ ہے؟ تو یہ ہر بچے کی خواہش ہے مگر وہ حامد میر کے پروگراموں میں نہیں آ سکتے۔حامد میر اور دیگر لشکروں کو بولو کہ ایسا بچہ لاؤ جو کہتا ہو کہ میں نہیں پڑھنا چاہتا میرا اسکول بند کردو۔ایسے بچے بڑے۔بڑے جاگیرداروں ، سمگلروں ،کارخانہ داروں، سیاستدانوں اور نو دولتیوں کے تو ہو سکتے ہیں عوام کے نہیں۔ان لوگوں کے بچوں کو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔انگریزی ، اردو اور مقامی زبانیں انہیں ویسے ہی آتی ہیں چونکہ وہ زیادہ وقت یورپ اور امریکہ میں گزارتے ہیں۔اُن کی جگہ پروفیسر اور

سرکاری سکولوں کے اُستاد امتحان دیکر اُنھیں ڈگریاں لے دیتے ہیں۔ سینٹ کی سیٹیں فروخت ہوتی ہیں جو یہ لوگ خرید کر سینٹر اور وزیر بن جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ انتخابی حلقے اور ووٹرز بھی خرید لیتے ہیں۔ جب ڈگری سے لے کر وزارت اور پبلسٹی کیلئے اینکر اور صحافی ہی نہیں پورے کے پورے پروگرام اور چینل خریدے جا سکتے ہیں تو پھر پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔

باباجی نے کہا پہلے تم اپنا بیان درست کرو۔ ملالہ یوسفزائی ایسے ہی ہے جیسے بلاول بھٹوزرداری۔ شجرہ اور نسل باپ سے چلتا ہے ماں سے نہیں۔ ملالہ ضیاء الدین تو ٹھیک ہے مگر ملالہ یوسفزائی درست نہیں۔ تم سب لوگ بے خبرے ہو۔ یہ لوگ افغانستان میں ملاں اور قاضی کہلاتے تھے۔ سوات میں اس خاندان کے دو آدمی مشہور ہوئے جن میں ایک عالم دین اور دوسرے مجذوب فقیر تھے۔ عالم دین کی شادی سوات کے علاقہ شانگلہ پار کے ایک دینی، علمی و ادبی گھرانے میں ہوئی۔ یہ گھرانہ خالص یوسفزائی ہے جنکا صدیوں سے کسی دوسرے قبیلے سے رشتہ ناطہ نہیں ہوا۔ ملالہ کے خاندان کے بزرگ جن کی تاریخ ملالہ کے والد ضیاء الدین کے پڑ داداتک جاتی ہے۔ ملاں، قاضی اور میاں کہلواتے تھے۔ جبکہ ضیاء الدین کی اپنی تاریخ بھی ہے۔ میاں ضیاء الدین عوامی نیشنل پارٹی کے عقیدت مند اور جانثار سپاہی ہیں۔ میاں ضیاء الدین پڑھے لکھے سرخ پوش ہیں اور زمانہ طالب علمی میں پرجوش تقریروں کی وجہ سے مشہور تھے جو زیادہ تر

پاکستان، قائداعظم اور تحریک آزادی پاکستان کی مخالفت میں ہوتی تھیں۔ ایک میاں ضیاء الدین ہی نہیں بلکہ سارے سرخ پوش ایسی ہی تقریریں کرتے تھے۔ان کا ایک اپنا مشن، منشور اور مقصد تھا اور آج بھی ہے۔ گو کہ اے این پی آج کل مشرب بے پاکستا ن ہے مگر یہ سب اقتدار کا کھیل اور امریکہ بہادر کا حکم ہے۔ اے این پی اور ایم کیو ایم کراچی میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور قومی اسمبلی میں اتحادی ہیں۔ ویسے تو وہ سندھ اسمبلی میں بھی دشمن نہیں ہیں جبکہ کالا باغ ڈیم پر ہم خیال اور ہم آواز بھی ہیں۔ میاں ضیاء الدین حامد میر سے کئی منزلیں آگے ہیں۔ اب پتہ نہیں کہ میاں ضیاء الدین اور حامد میر میں کتنا مشترک ہے۔ خیالات ،اقدار یا مفاد۔۔۔؟ کچھ بھی ہو ملالہ ضیاء الدین ایک معصوم اور مظلوم بچی ہے جسکے سر پر بہت بڑا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔کیا یہ معصوم بچی یہ بوجھ اُٹھا پائے گی اسکا فیصلہ وقت کرے گا۔ پشاور یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج کے طالبعلم حقیقت جانتے ہیں کہ ملالہ کے باپ نے نہ صرف اے این پی سے اپنی وابستگی اور حامد میر سے اپنی دوستی کو کیش کروایا ہے بلکہ اپنی معصوم بیٹی کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ملالہ کی شہرت ،ذہانت، علم دوستی، جرات وبیباکی کے گیت گانے والے یہ جانتے ہیں کہ جس چیز کا وہ پرچار کر رہے ہیں وہ حقیقت نہیں۔پہلے حامد میر سے ملاقات کرنا، پھر پروگرام میں آنا اور کچھ عرصہ بعد بی بی سی کو خط لکھنے کی کہانی کا سامنے آنا اور گل مکئی کے نام سے ڈائری لکھنا اور پھر حملہ ہونا ایک ترتیب وار کہانی

ہے جسے میڈیا والے ہی ہضم کر سکتے ہیں سرحد والے نہیں۔ملالہ کے منظر عام پر آنے اور پھر سلسلہ وار انکشافات اور حملے کا لب لباب فوج کو وزیرستان کی آگ میں جھونکنا اور بھارت کو مشرقی سرحدوں پر من مانی کیلئے کھلا چھوڑنا ہے۔میڈیا، سرکاری مشینری اور مغربی ممالک کا ایک نقطے پر متفق ہونا اور پھر وہ بھی ایک ایسے ایشو پر جسکی بنیاد خطرے کی علامت ہے۔ملالہ سے منسوب بی بی سی کو لکھے جانے والے خطوط میں لکھا گیا تھا آج تک سامنے نہیں آیا اور نہ ہی بی بی سی اور حامد میر نے وہ خطوط کسی کو دکھائے ہیں۔اگر ان خطوط میں یہی لکھا ہے کہ میرا اسکول کھول دو میں پڑھنا چاہتی ہوں تو یہ فقرہ کچرا چننے والا بچہ بھی کہتا ہے، مگر وہ میڈیا پر نہیں آسکتا اور نہ ہی وہ کسی حکمران سیاسی جماعت کے لیڈر کا بچہ ہوتا ہے۔ملالہ کی پبلیسٹی کے کئی رخ ہیں۔اس میں پاکستان کی عظمت اور شہرت کا کوئی بھی پہلو نہیں۔ملالہ سے منسوب خطوط اور ڈائیری کا موازنہ لیڈی فلونیشا کی ڈائیری سے کیا جاسکتا ہے۔اس ڈائیری میں انگریزی خاتون نے کابل کے حالات روزانہ کی بنیاد پر لکھے کہ وہاں مقیم انگریزی فوج کو کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔لیڈی فلونیشا سیلز میچور عورت تھی۔اسکا واقعات پر مبنی ڈائیری لکھنا حقیقت کی ترجمانی ہے جبکہ اس انداز کی ڈائیری کا ملالہ جیسی نوخیز اور معصوم بچی سے منسوب کرنا کسی طور درست نہیں۔ملالہ نے اگر سوات کے حالات سے کسی کو آگاہ ہی کرنا تھا تو وہ پاکستان کے صدر، وزیرا

عظم ،اپنے والد کی جماعت کے وزیر اعلیٰ ،آرمی چیف یا پھر چیف جسٹس کو خط لکھتی اسے بی بی سی کی راہ کس نے دکھائی؟اگر ملالہ اتنی ہی باخبر تھی تو اسے پتہ ہونا چاہیئے تھا کہ بی بی سی نے ہمیشہ ہی پاکستان اور اسلام مخالف پراپیگنڈہ کیا ہے۔یہ ادارہ ہمیشہ سے بھارت اور اسرائیل نواز رہا ہے۔اگر ملالہ کے خطوط بی بی سی کو ملتے تھے تو تب بی بی سی نے ان خطوط پر کوئی پروگرام کیوں نہیں کیا؟اور حامد میر کے پروگرام کا انتظار کیوں کیا؟ملالہ کے خطوط سے صاف ظاہر ہے کہ جو کوئی خطوط لکھتا تھا اسے پاکستان کے کسی بھی ادارے پر اعتبار نہ تھا اور وہ پاکستان کو بدنام کرنا چاہتا تھا کہ پاکستان میں سب کچھ غیر محفوظ ہے اور عوام کو کسی ادارے پر بھروسہ نہیں۔

اس سے پہلے کہ باباجی مزید انکشافات کرتے میں نے رخصت چاہی اور گھر کو چل دیا۔کالم نگاروں اور اینکرز سے درخواست ہے کہ اسلام آباد کی سبزی منڈی میں ہری پور، حضرو، چارسدہ، مردان، نوشہرہ اور سوات سے بہت سے بابے پھل اور سبزیاں بیچنے آتے ہیں۔ صبح سویرے پھل اور سبزیاں بیچ کر یہ لوگ کراچی کمپنی سے سودہ سلف خرید تے ہیں اور شام سے پہلے واپس چلے جاتے ہیں۔ان سبزی فروشوں میں بہت سے بابے اور جوان حافظ قرآن، عالم دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔یہ لوگ صحافیوں اور دانشوروں سے زیادہ باخبر اور اپنے کلچر اور ثقافت سے جڑے ہوتے ہیں۔اگر آپ غازی صلاح الدین کی طرح پختون کلچر اور

روایات کو سمجھے بغیر پشاور یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج کے طلباء سے ملیں گے تو آپ کو مایوسی ہو گی۔ باخبر پاکستانی میڈیا کے بے خبروں کی کچھ اور بھی باتیں ابھی کرنا باقی ہیں انشاللہ اگلی تحریر میں ضرور شامل کرنے کی کوشش کروں گا۔

(باخبر بے خبرے (پارٹ 2

ہمارے ہاں بے خبری کی وجہ سے بے صبری بھی ہے۔ جھنڈا، سرکاری گاڑی، گھر اور سیکیورٹی گارڈ ضرورت کا حصہ بن گئے ہیں۔ چند دن پہلے کسی بے صبرے نے جناب حامد میر کی گاڑی میں شائد بم لگا دیا جسکی تفصیل بتانے کیلئے حامد میر کے پروگرام میں ایک ائیر وائس مارشل اور کچھ ریٹائیرڈ فوجی افسران کو مدعو کر لیا گیا۔ ٹیلیوژن پر بم ڈسپوز کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا کہ ایک اہلکار بلٹ پروف جیکٹ پہنے گاڑی کے قریب کھڑا ہے۔ اور دیگر لوگ بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر قریب ہی موجود ہیں۔ ایک سپاہی گاڑی کے نیچے جاتا ہے اور بم والا شاپر اتار کر لے آتا ہے۔ اس کے بعد باقی کارروائی کیلئے مائیک جناب وزیر داخلہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جناب حامد میر کو مبارک ہو کہ بم پھٹ نہ سکا حالانکہ ان کے مطابق یہ بم انتہائی مہلک تھا۔ اللہ ہم سب کو جملہ اقسام کے بموں سے محفوظ رکھے (آمین)۔ بعض اوقات بے خبریاں، بدبختیاں بن جاتی ہیں۔ اور انسان بے خبری میں بہت کچھ لٹا دیتا ہے۔

۔۔"ہوشاں وچ بنائے سن اولٹے وچ بے خبری، توڑ نہ چڑھدے لارے جھگڑے چوٹے نال بے صبری"

جو کچھ انسان با ہوش و ہواس بناتا ہے وہ کبھی کبھی بے خبری کی نظر ہو جاتا ہے۔ جیسے سیسے بے خبرے تیرا لٹیا شہر بھمبور'' ۔ سوہنی نے بے خبری میں کچا کھڑا اٹھایا اور'' عشق کی موج میں سرشار چناب کی لہروں میں کھو گئی مرزا بے خبر سویا رہا اور صاحبا ں کے بھائی سر پر آن پہنچے ۔ رانجھا ہیر کے ڈیرے پر بے خبر نہ سوتا تو ہیر کے عشق میں ناکام نہ ہوتا۔ عشق و محبت کی ناکام داستانیں ہوں یا سیاسی غفلتوں اور بربادیوں کی کہا نیاں۔ ملٹری بلنڈر ہوں یا ناکام حکمرانوں کی حشر سامانیاں ہر ناکامی، بربادی اور تبا ہی کا سبب بے خبری ہی کا نتیجہ رہا ہے۔ آج کے دور میں پاکستان کا سب سے با خبر انسان ہمارا وزیر داخلہ ہے جبکہ قوم بے خبری اور بے صبری کے دلدل میں پھنس چکی ہے۔ میڈیا کا کام قوم کو با خبر رکھنا اور بربادیوں سے بچانا ہوتا ہے مگر ہمارے ہاں میڈیا پر حاوی چند افراد نے قوم کو یرغمال بنا لیا اور اپنے سٹوڈیوز کو سیاسی اکھاڑے میں بدل دیا۔ سیاستدانوں اور سرکاری افسروں نے قوم کی قسمت سنوارنے کے بجائے اپنی بد اعمالیوں کا دفاع کرنے کیلئے میڈیا کو اپنا معاون بنا کر ملکی معیشت پر کھل کر ہاتھ صاف کیا۔ سیاستدانوں نے میڈیا پر گالم گلوچ، بیہودہ گفتگو سے لیکر فوج اور عدلیہ کی تذلیل کا کوئی موقع ضائع نہ کیا اور اس بیہودگی کا اہتمام ہمارے محترم سینئیر صحافی حضرا ت اور دانشور اینکرز نے کیا۔ رہی سہی کسر ملک ریاض نے نکالی اور ایک ہی وار میں صحافت کے بلند

میناروں کو زمین بوس کر دیا۔

وہ کالم نگار اور دانشور جو شہید صحافی حضرات کی قربانیوں کو ملک ریاض برانڈ صحافیوں سے منسلک کرتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنے آپ کو باخبر کریں اور حقیقت کی عینک لگا کر صحافت اور ضیافت کو الگ الگ زاویوں سے دیکھیں۔ شہید صحافی حضرات میدان صحافت کے عظیم اور جا نثار سپاہی تھے۔ سپاہی میدان عمل میں شہید ہو تا ہے یا پھر غازی بن کر لوٹتا ہے۔ سپاہی کی زندگی مسلسل جدو جہد کا نام ہے۔ وہ زندگی کے آخری لمحے تک اپنی دھن میں مصروف عمل رہتا ہے کبھی ریٹائیر نہیں ہوتا۔ چشتی مجاہد، ولی بابر اور دیگر شہید صحافی نہ ملک ریاض کی پے رول پر تھے اور نہ کسی سیاسی پارٹی کے وظیفہ خوار، نہ کسی غیر ملکی ایجنسی کے ایجنٹ تھے اور نہ ہی امن کی آشا کے گیت گانے والے فنکار۔ صحافت ان کا پیشہ تھا اور صحافت ہی ان کا جنون تھا، نہ وہ فائیو سٹار ہوٹلوں کے رسیا تھے اور نہ ہی پلاٹوں کی تقسیم میں حصہ داری کے حقدار۔ وہ چھٹیاں گزارنے امریکہ، برطانیہ، فرانس، سوئٹزرلینڈ، دبئ اور تھائی لینڈ نہ جاتے تھے۔ وہ صدر اور وزیر اعظم کے ہر غیر ملکی دورے میں خصوصی صحافتی وفد کا حصہ نہ بنتے تھے اور نہ ہی نزلہ زکام اور بخار کی صورت میں انھیں وزیر مشیر اور اعلیٰ حکام گلدستے اور تحفے بھیجتے تھے۔ وہ سب باخبر تھے اور قوم کو لحہ بالحہ باخبر رکھنے کا

مشن لیکر بموں، میزائیلوں، خود کش بمباروں اور برائیوں کے خلاف اپنا قلم لے کر نکلتے تھے۔وہ شان سے جئے اور شان سے مرے۔ صحافت کے یہ سپاہی لشکر بازی اور دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والے کاروباری ٹولے کا حصہ نہیں اور نہ ہی ان پاکیزہ روحوں کو فتنہ پرداز کاروباری فنکاروں سے ملانا درست ہے۔ صحافت کے درخشندہ ستاروں نے سختیاں برداشت کیں، جیلیں کاٹیں، بیروزگاری اور بدحالی کے دور صبر اور شکر سے گزارے مگر کسی حکومتی کارندے اور نو دولتیے سیٹھ کی چاکری نہ کی۔جناب سکندر خان بلوچ لکھتے ہیں کہ کچھ بے خبر سینیئر صحافیوں نے حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ غدار مجیب الرحمٰن کی پاکستان دشمن بیٹی حسینہ واجد سے معافی مانگ لے۔جناب سکندر خان بلوچ نے مشرقی پاکستان کے حالات کا عمیق جائزہ لیاہے اور پاکستان آرمی کے کردار اور مشکلات ترتیب وار بیان کیں ہیں۔انھیں تجزیہ نگاروں اور صحافتی لبادے میں ملبوس بھارتی وظیفہ خوروں نے بمبئی حملہ کیس کے ڈرامے کے فوراًبعد حکومت کو مشورہ دینا شروع کر دیا تھا کہ ڈی جی آئی ایس آئی کو فوراً بھارت بھجوایا جائے۔اس ڈرامے کے زندہ بچ جانے والے واحد کردار اجمل قصاب کا ذکر آتے ہی یہ صحافتی ٹولہ اجمل قصاب کا گھر ڈھونڈنے میں سرگرم عمل ہوا اور بھارتی منصوبہ سازوں کی خواہش کے مطابق اجمل قصاب کا کھُرا اٹھا کر اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگانے والوں کے سامنے سرخرو ہوا۔لگتا ہے کہ کچھ سینئر صحافی اور ان کے شاگرد بے خبری کے کیپسول میں بند ہوس کے پوجاری بن گئے

ہیں اور انھیں ملک و قوم اور فوج جو اس کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی محافظ ہے کی عزت کا ذرا بھر احساس نہیں۔ حسینہ سے معافی مانگنا وطن سے غداری کے مترادف ہے۔ بے خبر صحافیوں سے گزارش ہے کہ وہ جناب سکندر خان بلوچ کی تحریر اور حوالہ جات پڑھیں اور اپنی سمت درست کریں۔

برعکس کردہ ملکِ تہدید و بیم ، کہ چرا باشید بر زداں رحیم ؟ عشوا شان را از چہ و باور کنید، یا چرا از االیشان قبول زر کیند

شیخ السلام اور گوجر خان پلان

شیخ الا اسلام علامہ طاہر القادری کی آمد نے کئیں سیا سی مندروں کی گھنٹیاں بجوا دیں اور سیا سی ڈرامے کے سبھی کرداروں کو ایک ہی وقت میں ایک ہی سٹیج پر ایک ہی ڈائیلاگ بولنے پر مجبور کر دیا۔ جمہوریت کے سٹاک مارکیٹ شیئر ہولڈرز نے اپنے اپنے بھی کھاتے بغلوں میں داب کر اور بے ادبی کے نل کھول کر باہم جمہوریت اشنا ن کا کچھ ایسا اہتمام کیا کہ میکاولی اور چانکیہ کی روحیں بھی تڑپ اُٹھیں۔ پی پی، ن لیگ، ق لیگ ،ف لیگ سے لے کر الف تا بڑی اور چھوٹی یے، لیگ تک سب کو قادری ہواؤں نے متاثر کیا اور ان کے تنخواہ دار کالم نگاروں نے جگراتا کاٹ کر شیخ الا اسلام پر چاروں اطراف سے یورش کی۔ سیکولر اور سیا سی جماعتیں تو پریشانی میں مبتلا ہو ئیں سو ہوئیں مگر مولانا فضل الرحمٰن اور جماعت اسلامی سمیت دیگر مذہبی سیا سی جما عتیں بھی پریشانی کے عالم میں سیکولر نظریات کی حامل جماعتوں کی ہم بولی بن گئیں ۔سیا سی جماعت مذہبی ہو یا روشن خیال سیکولر سب کے مفادات یکساں ہوتے ہیں۔ ایم کیو ایم نے قادری صاحب کے اجتماع میں بھرپور شرکت کی اور تحریک انصاف نے شیخ الا اسلام کے منصوبے اور ارادے کو اپنائیت دیگر خوش گلوئی کا اظہار کیا۔

شیخ الا اسلام کے مخالفین کا کہنا ہے کہ شیخ کے انقلاب کی عمر تین ماہ ہے وہ اپنا جوش خطابت نکال کر واپس کینڈا چلے جائینگے۔اگر آئے تو ایسا سوا گت ہو گا کہ باقی زندگی زخم ملتے گزرے گی،کچھ دانشوروں کا فرمان ہے کہ قادری صاحب مغربی اور امریکی انٹیلیجنس ایجنسیوں کے کہنے پر پاکستان آئے ہیں تا کہ الیکشن ملتوی کر وا کر پسوڑی ڈالیں اور واپس لوٹ جائیں۔ایک اور طبقے کا خیال ہے کہ تبدیلی صرف ووٹ کے ذریعے ہی ممکن ہے جمہوریت میں ہی ملک کی بقا ہے۔ایک صاحبہ نے ٹیلی ویژن پر قادری صاحب پر پھبتیاں کسیں اور کوسنے دیئے اور آخر میں کہا کہ ہمیں قادری سے کوئی ڈر نہیں یہ وقتی ابال ہے وہ چودہ تاریخ سے پہلے ہی ملک چھوڑ جائیں گے۔قادری صاحب کے آنے سے کچھ تبدیلی آئے یا نہ آئے مگر ایک بڑی تبدیلی جو سیاسی بزنس میں آئی ہے وہ سب جماعتوں کا قادری صاحب کے خلاف یکجہتی کا اظہار ہے۔

کہتے ہیں کہ کسی گاؤں میں بہت سے لوگوں نے چوری،چکاری،غنڈہ گردی اور بیہودگی سمیت ہر نوع و اقسام کی برائیاں اپنالیں اور شرفا کا جینا محال کر دیا۔گاؤں کے شرفا کو پتا چلا کہ چند میل دور کے گاؤں میں ایک انتہائی دلیر آدمی رہتا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔گاؤں والوں نے اس گھبرو جوان کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیااور ایک روز اُسے اپنے گاؤں بلایا کہ وہ اس کے نڈر پن کا مشاہدہ کر سکیں۔ گھبرو گاؤں

کے باہر آیا تو کچھ لوگ اس کے استقبال کے لیے پہنچ گئے اور اسے لیکر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ چند قدم چلے تھے کہ گلی سے ایک بیل آتا دکھائی دیا تو گھبرونے گلی سے نکل کر دوسری جانب منہ کر لیا۔ میزبانوں نے پوچھا بھائی آپ تو کسی چیز سے نہیں ڈرتے یہ آپ نے کیا کیا۔ نوجوان بولا مجھے بیل کا ڈر نہیں صرف اُس کے سینگوں سے کچھ احتیاط کی ہے۔اس طرح گاؤں تک پہنچتے پہنچتے نڈر آدمی نے کتے، بلی، چوہے سے لے کر بکری اور بھیڑ تک ہر چیز سے احتیاط کی۔

یہی حال ہماری سیاسی جماعتوں کا ہے۔ کوئی پوچھے اے دانشمندوں اگر آپ کو قادری صاحب سے کوئی خوف نہیں تو پھر واویلا کیسا۔ ٹیلیویژن اینکرز کے سامنے بیٹھ کر بڑھکیں مارنے اور طعنے دینے کی کیا ضرورت ۔۔۔؟ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ ہر جگہ تھر تھلی مچ گئی ہے یا پھر مچوائی گئی ہے۔ کراچی سے ایک شیر جوان نے کہا مدرسہ اور ملک چلانے میں فرق ہے شائد اُن کا اشارہ مولانا فضل الرحمٰن کی طرف تھا چونکہ مولانا کی پارٹی کے اتحاد و برکات سے بننے والی بلوچستان حکومت آگے چل رہی ہے اور نہ ہی پیچھے ہٹ رہی ہے۔اس طرح مشرفی جمہوریت کے پنج سالے میں سابق صوبہ سرحد کی اسلامی حکومت کے زیر اثر دہشت گردی کی فصل پکتی رہی مگر جمہوریت کے دلدادہ علماء کرام نے اس طرف دھیان ہی نہ دیا۔ فضل اللہ اور صوفی محمد کو رہا کر دیا اور سوات میں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ دو صوبوں میں مولانا

کی حکومت تھی جسکے ہر ممبر کا تعلق مدرسے سے ہی تھا جبکہ مرکز میں قائد حزب اختلاف بھی مولانا خود ہی تھے۔یوں دیکھا جائے تو مشرف حکومت کی تمام ناکامیوں اور عوام دشمن کاروائیوں میں مولانا کی جماعت کا حصہ تھا جسکا خمیازہ اب پاکستانی عوام بھگت رہے ہیں ۔یہی حال جماعت اسلامی کا بھی ہے۔ایک میٹھے بھائی کے مطابق جماعت اسلامی کے 45 ہزار مدرسے اور سکول ہیں جو کہ قابل فخر بات ہے۔اگر ملک میں موجود شیعہ، سنی،بریلوی ،دیوبندی،اہل حدیث اور دیگر مذہبی جماعتوں کے مدارس کو دیکھا جائے تو جماعت اسلامی کے مدرسے اور تعلیمی ادارے دیگر اداروں کی نسبت زیادہ منظم اور ماڈرن ہیں جہاں دینی تعلیم کے علاوہ دیگر سائنسی علوم بھی دی جاتی ہے۔اسی طرح اگر منہاج القرآن کے تعلیمی اداروں کو دیکھا جائے تو دُنیا بھر میں ان سے جدید اور ہر لحاظ سے سائنٹیفک ادارہ کوئی بھی نہیں۔ منہاج القرآن ایک مدرسہ نہیں بلکہ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں پر مشتمل ایک سلسلہ ہے۔ جہاں ہزاروں طالبعلم تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ان طلباء میں وہ بھی شامل ہیں جو اپنے طور پر تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے مگر منہاج القرآن ان کی تعلم، صحت اور خوراک کے علاوہ دیگر اخراجات برداشت کرتا ہے۔بہت سے طالبعلم اسکالرشپ پر بیرون ملک تعلم کے لیے بھی جاتے ہیں اور جدید علوم سے بہرہ ور ہو کر ملک و قوم کی خدمت کرتے ہیں ۔

ہمارے وہ لیڈر جنہیں جمہوری زکام لگا ہوا ہے حقیقت میں جمہوریت کی آڑ میں جبر کا نظام نافذ کیئے ہوئے ہیں اور عوام کو جمہوریت کے نام پر لوٹ رہے ہیں۔ یہ کہاں کی جمہوریت ہے جن کی مداح سرائی کرنے والے جاگیر دار، سمگلر، بھتہ خور، کارخانہ دار اور قبضہ مافیا کے سرغنہ ہر روز سات ارب کی کرپشن کر رہے ہیں کیا یہ جمہوریت ہے اور اس لوٹ مار، لاقانونیت اور کرپشن کا نام ااستحکام اور عوام کی خدمت ہے۔ ساری دُنیا جانتی ہے کہ پاکستان کی معیشت کا دارومدار زراعت پر ہے اور جب تک ملک میں نئے ڈیم نہ بنے گے اور کسانوں کو پانی میسر نہ ہوگا زراعت کا شعبہ بتدریج تباہ ہو جائے گا۔ ایک جیالے جوان وزیر کا بیان ہے کہ پاکستان سیاستدانوں نے بنایا تھا اور وہ ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ کوئی پوچھے کہ اے سیاست کے افلاطون کیا حفاظت کے لیئے ضروری ہے کہ پاکستان کو بنجر و بیابان بنایا جائے۔ موجودہ جمہوریت کے سنہری کارناموں میں ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اے این پی کو راضی رکھنے کے لیے بجلی اور پانی کے سابق وزیر اور موجودہ وزیر اعظم نے عہدہ وزارت سنبھالتے ہی عوام کو جوش خبری سنائی کہ کالا باغ ڈیم نہیں بنے گا چاہے تم ہزار روپے سیر آٹا خریدو یا بچے بیچ کر جیو۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں جمہوریت نے بلیک میلنگ اور وطن دشمن کا روپ دھار لیا ہے۔ جناب اجمل نیازی کے مطابق بھا

رت کالا باغ مخالف پارٹیوں کو سالانہ اربوں روپے دے رہا ہے تاکہ پاکستانی قوم فا
قوں مرے اور تنگدستی اور غربت کے شکنجے میں آکر بھارتی بالادستی قبول کرلے۔وہ
سیاستدان جو ملک بچانے کے دعویدار ہیں۔ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ اس
مسئلے کو حل کرسکیں کیونکہ سندھی قوم پرست اے این پی اورایم کیو کا ووٹ بینک خرا
ب کردیں گے۔ایک طرف ہمارے سے استدان اور مبلغین جمہوریت ڈیموں کی سیا
ست میں اُلجھ کر معیشت کی ریڑھ کی ہڈی زراعت کو تباہ کرنے کی کوشش میں ہیں اور
دوسری طرف بھارت عالمی معاہدوں اور قوانین کی پرواہ کیے بغیر پاکستان کی طرف
آنے والے سبھی دریاؤں پر ڈیم بنا کر پاکستان کو بنجر بنانے کی بھرپور کوشش کررہا
ہے۔

ہمارے وہ سیاستدان جو پاکستان کو بنجر بنانے والے بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھا
نے اور امن کی آشا پر بے تحاشا خرچ کرنے میں مگن ہیں کس منہ سے جمہوریت ،حب
الوطنی اور ملکی سالمیت کی بات کرتے ہیں ۔کیا ملک کا خزانہ لوٹنا،اسمبلیوں میں بیٹھ کر
اپنے لیے مراعات حاصل کرنا،اپنی عیاشیوں اور حفاظت پر قومی خزانے پر ہاتھ صا
ف کرنا، لاقانونیت کو استحکام اور جرم کو مراعات کہنا، عوام کو غربت ، افلاس اور
بیروزگاری کے دلدل میں پھینکنا سیاست اور جمہوریت ہے ؟کیا سرکاری حج ،عمرے اور
درگا

ہوں پر حاضری اسلام کی خدمت ہے؟ اور اگر ہے تو کس فقہ، اصول، فکر اور فلسفے کے تحت ہے؟اس کا جواب بھی کسی اینکر کے سامنے بیٹھ کر دینا چاہئے۔کیا میٹرک پاس دوستوں اور بیلی یاروں کو منافع بخش عہدوں پر لگا کر اربوں روپے کی کرپشن کروانا اور پھر کرپٹ لوٹیروں کو با حفاظت ملک سے بھگا دینا ملکی سالمیت اور بقاء کیلئے ضرو ری ہے؟

جناب مولانا طاہر القادری فکر و نظر کے حامل فلسفی اور دانشور ہیں اور اگر وہ واقعی عملی انقلاب کا مشن لے کر آئے ہیں تو یقینا پاکستانی عوام اُن کی آواز پر لبیک کہیں گے۔جیسا کہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ مولانا کا انقلاب بھی دوسرے انقلابیوں کی طرح بات چیت کی نظر ہو کر زبانی اور بیانی انقلاب میں بدل جائے گا اور حکومت اپنے اندرونی اور بیرونی دوستوں کی مدد سے شیخ السلام کے انقلاب کو لاہور تک ہی محدود رکھے گی۔ایک لنگر گپ یہ بھی ہے کہ ملک ریاض عنقریب شیخ الاسلام سے ملاقات کرکے ان کے ادارے کے لئے خطیر رقم چندہ کرنے والے ہیں اور پھر اس چندے کو مندے کا سودہ بنا کر تشہیر کی جائے گی اور مولانا وضاحتیں دیتے واپس چلے جائیں گے۔

شیخ الا السلام کی آمد اور مستقبل کے منصوبے کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں

لمبی تاریخ نہیں 14 جنوری میں چند روز ہی باقی ہیں اور غریب اور بد حال عوام ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہے ہیں کہ کیا مولانا طاہر القادری گوجر خان تک بھی آتے ہیں یا نہیں۔آج کل اسلام آباد سے زیادہ اہمیت گوجر خان کی ہے چونکہ عسکری، سیاسی اور روحانی قیادت (آستانہ عالیہ جناب پروفیسر رفیق صاحب)اسی خطہ زمین سے ہے۔دیسی دانشوروں کا خیال ہے کہ کسی بھی انقلاب کیلئے گوجر خان کی حدیں کراس کرنا ضروری ہے۔اسلیے آنے والی ہر تبدیلی کا دارومدار گوجر خان منصوبے کی کامیابی پر منحصر ہے۔ گوجر خان کی موجودہ حیثیت ویسی ہی ہے جیسے دہلی کیلئے پانی پت کی تھی۔

گوجر خان کی زمین تاریخ ساز ہے۔یہ علاقہ مارشل ریس کا مسکن ہے جہاں جراتوں کے امین شیر دلیر مجاھد پیدا ہوئے اور وطن کی حفاظت کیلئے تن من کی بازی لگا دی۔ لانس نائیک محفوظ شہید نشان حیدر اور کیپٹن راجہ سرور شہید نشان حیدر کا تعلق اسی سر زمین سے ہے۔اس سرزمین پر بیشمار ولیوں ، شہیدوں ، غازیوں اور جذبہ عشق میں سرشار دین کے خدمتگاروں کے مسکن ومزار ہیں۔اسّی سال پہلے میرے علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر جن کا نام راجہ زمان تھا، انھوں نے بھی گوجر خان کو اہمیت دی اور اپنی سہ حرفی میں گوجر خان کا مخصوص ذکر کیا۔راجہ صاحب نے لکھا کہ ساری دنیا بشمول گوجر خان دیکھی مگر چناں (راجہ صاحب کی محبوبہ) کے بغیر دنیا ویرا

ن ہے راجہ زمان کی دنیا چناں کے بنا ویران تھی اور آج ہمارے جمہوریت پسند سیا
ستدان اسے بھارت دوستی کے عشق میں ویران کرنے جا رہے ہیں۔کیا شیخ الااسلام گو
جر خان کی سرحدیں عبور کرکے اسلام آباد پہنچ پائینگے؟اور پاکستان کو ویران ہونے
سے بچا سکیں گے۔اس کیلئے چودہ تاریخ کا انتظار ہے۔

م۔ ملک پنجاب وچ باہوں پھریاں ،دلی کانگڑہ جھنگ ملتان تکیا، میرپور دریا توں پا
رہویاں کالا مندرہ تے گوجر خان تکیا

کیتے سیر سمندری جہاز اُتے اٹلی ،روم تے عجب انگلستان تکیا، کی پچھنے اُوچ زمان کولوں
وزن چناں دے ملک ویران تکیا

اللہ اس ملک کی حفاظت کرے۔ عوام کو عقل و شعور دے اور بھارت اور مغرب
دوست سیاستدانوں سے اور نام نہاد دانشوروں سے نجات دے (آمین

کیا پھر بکنے کا وقت آگیا ہے۔۔۔؟

پنڈت کلہن کی نوشتہ تاریخ کشمیر تقریباً آٹھ سو سال پہلے منظر عام پر آئی جس میں پا نچ ہزار سال پہلے کی تاریخ راجگان کشمیر کو علمی اور تحقیقی اسلاب کے تحت قلمبند کیا گیا ۔پنڈت کلہن کی راج ترنگنی سنسکرت زبان میں لکھی جانے والی دنیا کی قدیم ترین اور مستند تاریخ ہے جس میں راجگان کشمیر کے بائیس خاندانوں کے عروج وزوال کی وجوہا ت اور راج گیری کے مسائل کے علاوہ عوام الناس کی معاشی، معاشرتی اور مذہبی حالت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔پنڈت کلہن بنیادی طور پر شاعر تھے اور اسی طبع تسلیم کے تحت واقعات کو گہرائی سے دیکھنے اور پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ۔تاریخی حوالوں اور واقعات کے تناظر میں دیکھا جائے تو جس طرح کی رعونت آج کے دور میں کشمیری عوام کے سر پر مسلط ہے اسے کسی بھی صورت قیادت نہیں کہا جا سکتا۔ابن خلدون کے مطابق قوموں کی زندگی تین ادوار پر مشتمل ہوتی ہے۔اول بدوی دور جس میں قبیلے ،برادریاں اور گروہ آپس میں جنگ وجدل اور باہمی چپقلش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بستیاں اُجڑتی اور بنتی ہیں اور ہر طرف بدامنی ،بے چینی اور بد عملی کی ہوائیں صرصراتی ہیں۔باہمی کشت و خون کا سلسلہ تب ہی تھمتا ہے جب طاقتور قبائل اور کمزور قبائل کا خاتمہ کرکے ایک وسیع علاقے پر قابض ہو جاتے

ہیں۔

فلسفے اور تاریخ کے بادشاہ کے مطابق دوسرا دور غزوی کہلاتا ہے جب قبائل قوم کی صو رت میں دیگر علاقوں کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کرکے ریاست کی بنیاد رکھتے ہیں اور تیسرے دور جیسے حفضری دور کہا گیا ہے میں داخل ہو کر ایک آئین اور قانون کے تحت نظام ریاست چلاتے ہیں۔ابن خلدون کے مطابق اقوام کے زوال کی بھی تین ہی وجو ہا ت ہیں۔اول ضعف اشراف،دوئم سپاہ کا تشدد اور سوئم عیش پسندی۔

اگرہم پنڈت کلہن کی تاریخ کے حوالے سے دیکھیں تو قدیم دور جسکا دورانیہ پانچ ہزار سال بیان کیا گیا ہے سے لیکر یوسف شاہ چک کے زوال تک کشمیر کئی بار،بروی، غزوی اور حفضری ادوار سے گزرا مگر کسی بھی دور میں بیرونی تسلط کے زیر نگیں نہ ہوا۔ان ادوار میں بھی کسی نہ کسی صورت اقتدار کشمیری حکمرانوں اور خاندانوں کے ہاتھ رہا جبکہ بیرونی یورش ویلغار کا مقابلہ سب قبائل نے مل کیا اور کبھی بھی ایسی سازش کو پنپنے نہ دیا جو اغیار کو عوام پر مسلط ہونے میں معاون ومددگار بن سکے۔

چک خاندان کی بداعمالیوں اور فرقہ پرستانہ روش نے نہ صرف اس خاندان

کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا بلکہ تاریخ کا رُخ بھی بدل دیا۔ یوسف شاہ چک کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی کشمیر کی غلامی کا آغاز ہوا جو کچھ صدیاں گزرنے کے باوجود اختتام پذیر نہیں ہو سکا۔ مغلوں کے بعد افغان، سکھ، ڈوگرے اور پھر نام نہاد حکمرانیاں جنھیں بھارت اور پاکستان نے کسی نہ کسی صورت آزاد اور غلام کشمیر نامی دو ٹکڑوں پر مسلط کیے رکھا تاکہ آزادی بزنس کے نام پر ہر دو جانب کشمیریوں کو نفسیاتی طور پر غلامی کا عادی اور شخصی لحاظ سے اقتدار کا ایندھن بنا کر ان کی حیثیت کو ختم کر دیا جائے۔ بھارتی اور پاکستانی بیورو کریسی اور جاگیر دارانہ سوچ کی حامل سیاسی جنتا اس عمل میں یکساں کامیاب رہی اور ہر دو جانب عوامی سوچوں اور امنگوں کو زنگ آلود کرنے کے مشن کو آگے بڑھاتی رہی۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی حکمران چانکیائی سیاست اور فلسفے کو کشمیری مسلمانوں پر مسلط کرنے میں کامیاب ہوئے اور ہر دور میں ایک نیا مہرہ سامنے لا کر غلامی کے کھیل جمہوری انداز میں پیش کرتے رہے۔ بھارتی سیاسی دانشوروں نے کشمیر کو اٹوٹ انگ قرار دیا چونکہ وہ جانتے تھے کہ مستقبل میں ہمالیہ اور قراقرم کی چوٹیوں سے بہنے والا پانی ایک ارب سے زیادہ بھارتی باشندوں کے حلق تر کرنے کا واحد وسیلہ بنے گا۔ بھارتی دانشور جانتے تھے کہ پانی ہی زندگی اور بقا ہے اور یہ زندگی کشمیر سے بہنے والے

دریاؤں کے قطروں میں پنہا ہے۔بھارت نے ایک جانب کشمیریوں کے خون سے ہولی کے تہوار کو سرخی دی اور دوسری جانب کبھی شیخ عبداللہ اور اس کے خاندان اور کبھی بخشی غلام محمد ،ساگر اور مفتی خاندانوں کے ذریعے اس ہولی کو جائیز اور جمہوری کہلوا کے دوسری جانب آزاد کشمیر والوں کو پاکستانی بیو loc) (نے کا اہتمام کیا۔ایل او سی روکریٹوں ،نو دولتیوں ،جاگیرداروں ، سمگلروں،ڈاکوؤں اور چور سیاستدانوں نے قائدِاعظم کا یہ قول کہ کشمیر ہماری شہ رُگ ہے کو بھول جانے پر مجبور رکئے رکھا اور آزادی کے بیس کیمپ کو آزادی.بزنس کیمپ میں بدلنے کا انمول گر سکھایا۔شیخ
بخشی،ساگر اور مفتی خاندانوں کی طرح آزاد کشمیر والوں کو بھی کریلدی.تولی چیڑ اور، پھر کچھ دیر بعد کھڑوی خاندانوں کی قیادت مہیا کی گئی تاکہ آزاد کشمیر کے عوام.برادریوں ، قبیلوں اور مسلکی مصلحتوں کا شکار ہو کر مسلط کردہ خاندانوں کی غلامی کو جمہوریت تصور کرتے ہوئے ان کے گھرانوں کی چاکری پر فخر کریں۔
مفادات کی سیاست سے جمہوریت تلاشنا ایسے ہی جیسے ہتھنی کا بکری کا بچہ پیدا کرنا۔دُنیا میں کہیں اور ہو نہ ہو آزاد کشمیر میں یہ سب ہوتا ہے چونکہ یہاں ہتھنیاں افریقہ کے جنگلوں سے نہیں بلکہ انگلینڈ کے سُپر سٹوروں سے امپورٹ کروائی جاتی ہیں۔یہ ہتھنیاں غیرت پروف مٹیریل سے تیار

ہوتی ہیں اور بلیک لیبل پیتی ہیں۔ خصوصیت ان کی یہ ہے کہ جس چیز کا بچہ ان کے پیٹ میں ڈالو اُسے بروقت پیدا کر دیتی ہیں بشرطیکہ اُن کے پیٹ میں لگے ایک پارٹی فنڈ باکس میں آپ پونڈوں اور ڈالروں کے بنڈل ڈالنے کا طریقہ جانتے ہوں۔ جناب طاہر القادری نے فرمایا ہے۔ کہ جمہوریت حکومت بدلنے کا نام نہیں بلکہ حکمرانوں کا مزاج بدلنے کا نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس فرمان پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اجمل نیازی لکھتے ہیں کہ مزاج بدلنے کا اس ملک میں رواج نہیں چونکہ الیکشنوں سے صرف حکمران خاندان بدالتے ہیں۔ بھٹو، میاں، چوہدری ہمراہ الطاف بھائی، مولوینز اینڈ مولیناز کے مزاجوں میں مفادات کے لحاظ سے یکسانیت ہی نہیں بلکہ وہ اکثر ایک دوسرے کا مزاج بھی اپنا لیتے ہیں۔ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے سبھی بیمار ذہنوں کو کشمیری عوام اور مسئلہ کشمیر سے الرجی ہے اور ملکر اس کی دوا تلاشنے کی جستجو میں ہیں۔

عمران خان سے لیکر مولانہ فضل الرحمٰن تک سبھی سیاست دانوں نے بھارت کی کشمیر پر بالادستی کو قبول کر لیا ہے اور وہ جناب زرداری کی قیادت اور کشمیر کا جنازہ پڑھنے پر تیار ہیں۔ حالیہ دنوں میں بیرسٹر سلطان محمود چوہدری کا دورہ مقبوضہ کشمیر اور بعد میں سردار عتیق، سردار یعقوب اور بیرسٹر سلطان کی سردار سکندر حیات سے ملاقات نے کئی شکوک کو

جنم دیا ہے جنگی کڑیاں تقسیم کشمیر کے کسی خاموش فارمولے پر متفق ہونے پر ملتی ہیں۔ کھڑوی اور چیڑوی خاندانوں کی سیاست کسی سے ڈھکی چھپی نہیں مگر کریلوں خاندان کا تقسیم کشمیر فارمولے پر متفق ہونا اور اہل کشمیر کو بیک ڈور ڈپلومیسی کے ڈیلروں کے ہاتھوں بیچنا ایک نیا پن اور آزادی بزنس کا نیا روپ ہے۔ جہاں تک آزاد کشمیر کے عوام کا تعلق ہے تو وہ برادری ازم کے نشے میں مویشی اور گھاس چوروں کو بھی وزیراعظم یا صدر بنانے سے گریز نہ کرینگے۔ ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ کے مطابق کشمیری پچھلے ستر (70) سالوں سے بدوی دور میں ہی جی رہے ہیں۔ کشمیری قوم کی خاص کر اہلیان آزاد کشمیر کی بدقسمتی کہ سردار ابراہیم خان، چوہدری غلام عباس اور جناب کے ایچ خورشید جیسی مدبر، حوصلہ منداور باشعور قیادت ان کی رہنمائی نہ کر سکیں اور سردار عبدالقیوم اپنے بیٹے کی نفسیات سمجھنے سے عاری رہے اور اسکی خواہشات کے آگے سر تسلیم خم کرلیا۔ اگر سردار سکندر نے بھی خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا اور سردار عبدالقیوم والی روش اختیار کرلی تو ان کے بیٹوں پر سردار عتیق ہی نہیں بلکہ کوئی تیسرے درجے کا ٹن سیاستدان ہی ہاتھ صاف کرلے گا۔ سردار سکندر حیات کو چاہیئے کہ وہ ان ملاقاتوں سے عوام کو باخبر کریں ورنہ یہ تصور کرلیا جائے گا کہ کھڑوی اور چیڑوی گھرانوں کے ساتھ ساتھ کریلوں خاندان بھی بیک ڈور ڈیلروں کے ہاتھوں بک چکا ہے اور اہلیان کشمیر کو ایک بار پھر

بیچنے کا وقت آگیا ہے۔

ابن خلدون کے بیان کردہ اسباب زوال اقوام پر نظر ڈالی جائے تو آزاد کشمیر کی اشرافیہ کھٹروی، چیڑوی اور کریلوں خاندانوں کے علاوہ انسانی سمگلروں، بدعنوانوں، بیوپاریوں، ٹھیکیداروں، لٹیروں، لکڑا سمگلروں، منی چینجروں، منی لانڈروں اور اب پاؤنڈ اور ڈالر مافیا پر مشتمل ہے۔ جس معاشرے اور ریاست میں اشرافیہ کا فقدان ہو وہاں زوال کیسا؟ یوں دیکھا جائے تو آزاد کشمیر ایک انوکھی ریاست ہے جو فلسفہ تاریخ وریاست کے بابا اول ابن خلدون کی سوچ سے بھی باہر ہے۔ آزاد کشمیر میں سپاہ کی جگہ سیاستدانوں کے کزن پٹواریوں اور تھانیداروں نے لے رکھی ہے۔ جسکا صدر (انور) پاس کھڑے ہو کر تنقید کرنیوالے صحافیوں پر تشدد کرواتا ہے۔ اس ریاست کے دوسرے حصے یعنی مقبوضہ کشمیر میں بھارتی سپاہ نے جنرل انور کا روپ دھار رکھا ہے اور اھلیان کشمیر پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ جب کہ امن کی آشا کے گن گانے والے اور بھارت کو پسندیدہ ترین ملک قرار دینے والے حالیہ دنوں میں کرکٹ ڈپلومیسی کے بعد بھارت کی ہٹ دھرمی اور سرحدوں پر ننگی جارحیت کو بھی ملحوظ خاطر لانے کی جسرت کریں گے؟ مگر نہیں کیوں کہ اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتی جو خود بکنے اور لٹنے کی منتظر ہو، اور جو خود کو بیوپاریوں کے سپرد کردے۔ ابن خلدون کی بیان کردہ تیسری

وجہ عیش پسندی میں تو آزاد کشمیر کے نام نہاد سیاستدان اور ٹن اشرافیہ نے قابل رشک ترقی کی ہے اور کرپشن کی کمائی پر عیش پسندی کے نئے اور انوکھے ریکارڈ قائم کیے ہیں اور اب اس عیاشی کو بحال رکھنے کے لئے اصل کشمیر کو بیچنے کا ایک نیا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔

مستقبل کا ہراول دستہ

آنے والا کل کیسا ہوگا ؟ یہ تو رب تعالیٰ کو ہی پتہ ہے۔ہو سکتا ہے جو کل کے لئے حاکم کُل نے لکھ رکھا ہے۔اس میں کچھ تبدیلی کر دے یا پھر سب کچھ ہی بدل دے ! کسی کو کچھ معلوم نہیں۔مادی خداؤں کے دعوے مٹی کے ڈھیر ہوتے ہیں اور خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔اچھا بھلا آدمی پل میں مردہ ہوجاتا ہے۔اور برسوں کا مریض اچھا ہوکر کاروبار زندگی میں مشغول ہوجاتا ہے۔یہ کل کی بات ہے جو ستر کی دھائی کے عزت دار تھے وہ آج کل عزت کو بچانے کی تگ ودو میں ہیں۔اور کئی کمین اعلیٰ عہدوں اور مرتبوں پر براجمان شرفا کی پگڑیاں اچھالنے اور تکبر کا آسمان چھونیں پر اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔وہ لوگ جنہیں جیلوں میں ہونا چاہے تھا وہ حکومتوں کے ایوانوں میں بیٹھے قوم کی تقدیروں سے کھیل رہے ہیں۔اور ملکی خزانہ لوٹ کر بیرون ملک بینک بھر رہے ہیں۔پکوڑہ مچھلی، انڈے، مرغے اور کٹے وچھے بیچنے والے اور چوریاں کرنے والے خاندانوں کے چشم وچراغ سیاسی جماعتوں کے کارندے بن کر اور ملکی خزانے پر ہاتھ صاف کرکے ارب اور کھرب پتی بن گئے ہیں۔اور ایک نئی اشرافیہ نے جنم لیا ہے۔

جناب بلاول بھٹو زرداری نے چیف جسٹس جناب افتخار محمد چوہدری کو طعنہ دیا

کہ بڑے قاضی کو سموسے پکوڑے والوں کی فکر ہیں۔ جبکہ میری ماں کے قاتل دھند دناتے پھر رہے ہیں۔ جناب بلاول زرداری نے صحیح اور سچ کہا ہے۔ اگر جناب چیف جسٹس ان سموسے اور پکوڑے والوں پر گرفت نہیں کرینگے تو یہ پکوڑافروش اشرافیہ اس ملک کو پکوڑوں کے بھاؤں بیچ دے گی۔ جناب بلاول شاید اخبار پڑھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے اور نہ ہی خبریں سننے کا انھیں کوئی شوق ہے۔ جبکہ انکے ہراول دستے میں ان ہی کی طرح کے شہزادے اور نواب زادے بھرتی ہوے ہیں۔ جن کا شوق گھوڑوں پر رقم لگانا، شکار کھیلنا، مریدوں کو درشن دینا، مریدنیوں سے دل بہلانا، شہزادوں، نواب زادوں، مخدوموں اور محبوبوں سے گپ شپ کرنا ہے۔ یہ لوگ بڑی گاڈیوں میں سفر کرتے ہیں ۔ بڑے بڑے ہوٹلوں اور بڑی بڑی شاندار حویلیوں اور رمحلوں میں قیام کرتے ہیں۔ اور بڑی بڑی محفلوں میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اسلئے انھیں خبریں سننے کی فرصت نہیں ملتی۔ چونکہ ان لوگوں نے مستقبل میں اٹھارہ کروڑ زندہ انسانوں کے مقدر کا بوجھ بھی اٹھانا ہے اس لیے انھیں بُری خبروں سے دور رکھا جاتا ہے تاکہ ان کی نازک طبع پر دک نہ آئے۔

اگر بلاول زرداری واقعی باخبر ہوتے تو انھیں سب سے پہلے اپنی والدہ کے قاتلوں کا پتہ ہونا چاہیے تھا اور وہ چیف جسٹس کے سامنے جا کر ان قاتلوں کا نام لیکر بتاتے کہ یہ میری ماں کے یہ قاتل ہیں ۔ آپ انھیں سزا دیں۔ مگر وہ

یہ نہ کرسکے چونکہ ان کے والد محترم اور وزیر داخلہ جناب رحمان ملک جنھنیں ان قا تلوں کا پتہ ہیں نے آج تک جناب بلاول زرداری کو اسکی خبر ہی نہیں دی۔ ہو سکتا ہے کہ جناب آصف علی زرداری اور جناب رحمان ملک نے بھی اچھا ہی کیا ہو کہ ایک معصوم قائد جسنے آگے چل کے اس قوم کا کل سنوارنا ہے۔اگر آج ہی غم کا بوجھ لے کر بیٹھ گیا۔تو ہمارے کل کا کیا ہوگا۔جناب بلاول زرداری اگر معصوم نہ ہوتے تو انھیں پتہ ہونا چاہیے۔کہ ان پکوڑہ۔ مچھلی ۔ انڈہ مرغی اور بکری فروشوں اور چوروں نے دنیا میں سونے کی دوسری کان پکوڑوں کے بھاؤ فروخت کر دی تھی۔اور انہیں میں سے ایک بیاسی ارب روپے لیکر بھاگ گیا ہے۔جسے پکڑنے کی کسی کو بھی جرات نہیں ہے۔ملک کے سب سے بڑے قاضی نے ہی ہمت کرکے سونے کی کان بچائی۔اور بیاسی ارب کا ڈاکہ ڈالنے والے توقیر صادق کو پکڑنے کا فیصلہ بھی دے چکے ہیں۔مگر بلاول کی ماتحت حکومت اور انتظامیہ کچھ بھی نہیں کر رہی ۔جناب بلاول زرداری سے درخواست ہے کہ فرخت اللہ بابر کی لکھی گئی تقریریں نہ پڑھیں۔بلکہ اپنی والدہ کی طرح اخباروں کا مطالعہ کریں۔تاکہ انھیں اپنی رعایا کے دکھوں کا احوال بھی معلوم ہو۔وہ اپنی جماعت سے مچھلی پکوڑے مرغی انڈہ چوروں کو بھی فارغ کریں۔تو نہ صرف ان کا کل بلکہ ساری قوم کا کل اچھا اور تابناک ہوگا۔وہ اپنے اپ کو کمزور اور مشیروں کا محتاج نہ سمجھیں۔بلکہ عوام کو اپنے قریب کریں۔اور ان کی غربت کا بھی احساس کریں۔اگر آپکے ارگرد پکوڑہ فروش اور مخدوم رہینگے۔ توچیف جسٹس کو بھی فرصت نہیں ملے گی۔کہ وہ

کسی دوسری سمت دیکھ پائے۔

سنا ہے جناب بلاول زرداری نے تاریخ میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہے اگر واقعی ایسا ہے تو اپ نے ابن خلدوم ،ابن رشد،اور امام غزالی بھی پڑھے ہونگے۔ دیو جانسن سے لیکر افلاطون ، روسو، ہیکل ، ٹائن بی، مارکس، لینن کا ذکر تو آپ نے گھر میں ہی سنا ہو گا،چونکہ آپ کی والدہ اور نانا ان مغربی فلسفیوں کے رسیا تھے۔ بزرگ جیالوں سے سنا ہے کہ جناب بھٹو میکاولی کی ''دی پرنس'' اپنے سرہانے رکھتے تھے۔ اور پڑوس میں پنڈت نہرو کی بغل میں چانکیہ کوتیلیہ کی ارتھ شاستر ہوتی تھی۔ اگر آپ کے سلیبس میں پنڈت کلہن ، اقبال، سعدی اور کنفیوشس نہیں تھے۔ تو آپ انھیں بھی پڑھیں تو آپ کو اس دھرتی پر اپنی جڑیں مضبوط کرنے میں مدد ملے گی۔

اگرآپ واقعی اس ملک اور قوم کا کل سنوارنے میں سنجیدہ ہیں توآپ مشیروں کی جھرمٹ سے نکل کر غریبوں اور بدحال لوگوں کی طرف دیکھیں۔ آج اس ملک کے عوام ان دیکھے خوف میں مبتلا اور پوری قوم نفسیاتی الجھاؤ کا شکار ہے۔ ملک میں حکومت برائے نام ہے جبکہ اصل قوت لینڈ مافیا، شوگر مافیا، بجلی و گیس مافیا، ٹیکس مافیا اور کرپشن مافیاکے ہاتھ ہے۔ پولیس اور دیگرانتظامی محکمے بشمول ماتحت عدالتوں کے بے بس ہیں جو کوئی کام کرتا ہے قتل ہوجاتا ہے اور جومافیا

کا حصہ بن جاتا ہے موج کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کوشش میں ہے کہ وہ قانون و آئین حکومت اور ریاست کی پروہ کئے بغیر مافیا جات کی قربت حاصل کرے اور کچھ دن آسانی سے جی لے۔کامران فیصل ، چشتی مجاہد، ولی خان بابر، ملک سعد، صفویت غیور اور مولانا جان محمد بننے کا کیا فائدہ۔مافیا کی قوت کے سامنے اعلیٰ عدلیہ اور میڈیا ایک کمزور مدافعت ہیں جسے ہٹانے کیلئے بھرپور کوششیں ہورہی ہیں۔عدلیہ پر الزام تراشی ججوں کی کردار کشی سے لے کر ان کے فیصلوں کو نہ ماننے اورہٹ درمی دکھانے کا سلسلہ عام ہو چکا ہے۔مگر عدلیہ کسی نہ کسی طرح آئین اور قانون کی پاسداری پرڈٹی ہوئی ہے۔اور نہ صرف اپنے وقار کا تحفظ کررہی ہے بلکہ عوام کو ریلیف دینے کی بھی کوشش میں ہے۔میڈیا چونکہ کمرشلائز ہے اور اپنی ساکھ کے ساتھ ساتھ پیٹ کی فکر میں بھی رہتا ہے اسلئے حکومت اور مافیا کا محتاج ہے۔میڈیا کسی اُصول اور ضابطے کا بھی پابند نہیں ۔یہی وجہ ہے کہ نمبر1 کی دوڑ میں کبھی کبھی آگے دوڑ اور پیچھے چھوڑ کر جاتا ہے۔میڈیا کی ایک یونیورسل فطرت بھی ہے جس کے تحت میڈیا چاہے پرنٹ ہو یا الیکٹرنک اس میں یک رنگی اوریک جہتی ممکن نہیں۔ بہت سے صحافی اور میڈیا مالکان سیاستدانوں، سیاسی جماعتوں، مافیاجات اور غیر ملکی ایجنسیوں اوراداروں کے باقاعدہ تنخواہ دار ہوتے ہیں۔اسلیے وہ ایسی ہی خبریں تلاشتے اور مضامین چھاپتے ہیں جسے اُن کے مالکان کی مرضی اور منشاء ہو۔علاوہ اس کے مسلک، مذہب، فرقہ اور فکر وفلسفہ بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ

بہت سے لشکروں، دانشوروں، صحافیوں اور رپورٹروں نے طوطے، چڑیاں، باز، شکرے، کوئلیں، کبوتر سے لے کر کوے اور کتے تک پال رکھے ہیں۔ اُمید ہے کہ جناب بلاول کو ان سب علوم کی بھی خبر ہو گی۔ کہ یہ سارے چرند پرند پالنے والے صحافیوں اور دانشوروں کی کیا مجبوریاں ہیں۔ اگر بحثیت لیڈر ان مجبوریوں کا خاتمہ کر دیں تو اس قوم کا جتنا سرمایہ ان حرام اور نجس جانوروں پر خرچ ہوتا ہے۔ اسے عوامی فلاح اور بہبود کے بہت سے کام ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ چڑیاں اور کبوتر پالنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں در حقیقت انھوں نے کتے پال رکھے ہیں جو مردار کی بو اٹھاتے ہیں اور مالکوں کو ایسی سازشوں کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے۔ جناب حامد میر نے اپنے ایک انٹرویو میں ایک ایسے ہی چڑی باز کے متعلق کہا تھا کہ شہید محترمہ نے بیرون ملک دورے کے دوران ہوائی جہاز میں ان سے کسی بات کی تصدیق چاہی تو جناب حامد میر نے انہیں سچی اور درست معلومات دیں۔ شہید محترمہ نے چڑی مار کو طلب کیا جو اسی جہاز میں موجود تھا اور اسے حامد میر کے سامنے کہا کہ تم جھوٹے اور نا قابل اعتماد شخص ہو۔ جس شخص کو جناب بلاول کی دانشور ماں جھوٹا اور نا قابل اعتماد قرار دے چکی ہوں اُس پر اُن کی حکومت کا اعتماد معنی خیز ہے۔

جناب بلاول بھٹو زرداری نے اگر واقعی تاریخ اور فلسفہ پڑھا ہے اور سنجیدگی سے مملکت خداداد پاکستان کے اٹھارہ کروڑ باسیوں کا کل سنوارنے کا ارادہ

رکھتے ہیں تو انہیں پتہ ہونا چاہیے کہ تاریخ کا رُخ ہمیشہ ہی جوانوں اور جرات مندوں نے متعین کیا ہے۔ سکندر، بابر، اکبر، تیمور، اشوک، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور کئی دوسرے فاتحین، حکمران بلاول بھٹو زرداری سے بھی کم عمر تھے مگر جب وہ میدان عمل میں اُترے اور فتح و کامرانی کے باب رقم کر گئے۔

بزدل، لالچی، کینہ پرور اور مکار صلاح کار سے جرات منداور باحوصلہ دشمن بہتر ہوتا ہے۔ مانا کہ بلاول بھٹو زرداری کے والد دنیا کے امیر ترین آدمی ہیں اور دنیا کے ہر امیر ملک میں اُن کی جائدادیں خود اُن ممالک کے اُمراء اور روساء سے بھی کئی بڑھ کر ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ایک سچے قائد اور مفلوک الحال قوم کی رہنمائی کی کوالیفیکیشن نہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ شاہی محل میں بیٹھ کر جھونپڑوں میں بسنے والوں کے دکھوں کامداوا کیا جائے اور اُن کا کل شاہی محل کے جھروکے میں بیٹھ کر سنوارا جائے۔ جناب یوسف رضا گیلانی نے جناب بلاول کو غلط پیغام دیا ہے کہ ملتان اور رحیم یار خان کے مخدوم، گیلانی اور سندھ کے نواب، وڈیرے جاگیر دار اور پنجاب کے بڑے زمیندار اُن کے ہراول دستے کے سالار ہونگے۔ انھیں

وڈیروں، جاگیرداوں، چودھریوں، مخدوموں، گیلانیوں، کارخانہ داروں، خان بہادروں اورزمینداروں کے باپ داد سے جناب بھٹو کا ہراول دستہ بنے اور پھر بھٹو کو چھوڑ کر جنرل ضیاء الحق کے ہراول دستے میں شامل ہوگئے۔ ضیا

ء الحق کے بعد یہ دستہ بینڈ باجے سمیت شہید محترمہ کے ہراول دستے میں شامل ہوا اور پھر جناب نواز شریف کے آستانے پر جا پہنچا۔ جناب بلاول کو پتا ہونا چاہیے کہ دولت مندوں اور مفاد پرستوں کا ہراول دستہ در حقیقت فرینچ لیجنڈ کا دستہ ہے جو کرائے پر بھی ملتا ہے۔ اصل ہراول دستہ در حقیقت ستائے ہوئے عوام کا ہے جو جان تو دے دیتا ہے مگر صلہ نہیں مانگتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ مستقبل کے قائدین اپنے ہراول دستے میں مفاد پرستوں کی بجائے جاںنثاران وطن کا چناؤ کریں۔

اہل غرض فرمانبردار ہوتے ہیں

بادشاہ اچانک کسی نے قتل کردیا اور قاتل مفرور ہوگیا۔ ولی عہد نے باپ کی بد اعمالیوں، عیاشیوں اور رعایا دشمن چالاکیوں اور چالبازیوں کا گہرا اثر لیا اور بادشاہ بننے سے انکار کردیا۔ فوجی جرنیلوں، وزیروں، مشیروں، قاضیوں اور دانشوروں کا اجلاس ہوا اور طے پایا کہ اگلا بادشاہ ویسا ہی ہونا چاہیے جیسے پہلا تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ کرپٹ اورظالم بادشاہ کی حکمرانی میں اشرافیہ، انتظامیہ اور نوکرشاہی کی بدعنوانیوں، کرپشن ،لوٹ مار اور عوام دشمن کارروائیوں پر پردہ پڑا رہتا ہے اور عوام کی نظریں صرف بادشاہ کے مظالم پر مرکوز رہتی ہیں۔ اجلاس کے سبھی شرکاء نے باری باری اظہار خیال کیا اور اپنی اپنی کرپٹ کاروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گزرجانے والے بادشاہ سے پہلے ہم محض سرکاری ملازم تھے اور تنخواؤں پر گزارہ کرتے تھے۔ بادشاہ نے خود لوٹ مچائی تو ہمیں بھی اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملا۔ ایک وزیر نے کہا کہ بادشاہ نے خودتو خزانہ خالی نہیں کیا، عوام کو مفلسی کے دلدل میں نہیں دھکیلا بلکہ یہ سب ہمارے ذریعے ہی ہوا ہے اور جوکچھ ہم نے عوام کی جیبوں اور خزانے کی تجوریوں سے نکالا ہے ان کا کچھ حصہ ہی بادشاہ کو پیش کیا ہے۔ ہم اس لوٹ مار میں برابر کے حصہ دار تھے مگر ساری لعنت بادشاہ کے گلے پڑی ہے۔ اچھا ہوا کہ

شہزادہ اپنی پارسائی اور عوام دوستی کی وجہ سے تخت و تاج سے علیحدہ ہوگیا ورنہ اسے قتل کرنا لازم ہو جاتا۔

سپہ سالار نے کہا کہ دیکھو بھائیو! ہم سب ایک ہیں اور ایک ہی رہینگے اسی میں ہماری بھلائی اور بہتری ہے۔ میں عام دیہاتی کسان کا بیٹا ہوں اور جسطرح اس عہدے تک پہنچا ہوں اس میں محض قابلیت کا دخل نہیں، بلکہ بادشاہ سلامت کی مہربانیاں بھی شامل ہیں علاوہ اسکے میرے قبیلے اور علاقے کے اعلیٰ افسران نے بھی میری بہت سی خامیوں پر پردہ ڈالے رکھا اور میری ترقی میں کوئی روڑہ اٹکنے نہ دیا۔ میں نے بھی زندگی بھر یہی کیا اور اپنے علاقے، قبیلے اور دوستوں یاروں کی خامیوں پر پردہ ڈالتا رہا اور اُن کی ترقی کیلیئے راہیں ہموار کرتا رہا۔ آج میں اس عہدے پر ہوں کل میرا ہم زبان، ہم مسلک، ہم خیال یا پھر میرا قریبی اور ہم راز ماتحت اس کرسی پر بیٹھے گا۔ وہ نہ صرف میری خامیوں پر پردہ ڈالے گا بلکہ میری دولت کا بھی محافظ ہوگا۔

داروغہ شہر کی باری آئی تو اس نے سب سے پہلے مقتول بادشاہ کو خراج تحسین پیش کیا اور پھر بولا! مجھ سے بڑھ کر بادشاہ سلامت کو کون جانتا تھا؟ میں نے شہریوں کی کم اور بادشاہ کی زیادہ حفاظت کی۔ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ ملکہ عالیہ جو کہ عوام کے دکھ درد کو سمجھتی تھیں اور ان کی بہتری کیلیے کوشاں

تھیں کو بادشاہ سلامت نے ہی ایک حادثاتی موت کی بھینٹ چڑھایا اور اپنا راستہ صاف کر دیا۔ ملکہ کے حادثاتی قتل میں جو جو شریک جرم تھے، بادشاہ سلامت نے سب کو نوازا اور مالامال کر دیا۔ میری زندگی کو دیکھئے، چند برس پہلے میں معمولی پوزیشن پر تھا اور آج بادشاہ کی مہربانیوں سے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوں۔ میرے بچے دنیا کی بہترین درسگاہوں میں زیر تعلیم ہیں اور دنیا کے امیر ترین ممالک میں اُن کے لئے عالیشان بنگلے اور باغ تیار ہو چکے ہیں۔ ان ممالک کے بینکوں میں، میں نے اتنی دولت جمع کر رکھی ہے کہ آنے والی سات پشتوں کے لئے کافی ہے۔ دوستو میں بادشاہ کا ہمراز تھا اور آپ کا بھی غمگسار ہوں۔ میں بادشاہ کیلئے عیش و عشرت کے سبھی لوازمات مہیا کرتا تھا اور اُس کی سبھی بداعمالیوں کو جانتا ہوں۔ مجھے آپ کے چھپے خزانوں، جائیدادوں اور بداعمالیوں کا بھی پتہ ہے۔ میرے ذمے بادشاہ نے جو کام لگا رکھے تھے اُس میں ایک آپ لوگوں پر نظر رکھنا اور آپ لوگوں کی لوٹ مار کی کمائی کا سراغ لگانا بھی تھا۔ بادشاہ سے صرف ایک غلطی ہو گئی کہ اس نے اپنی اور آپ سب کی بداعمالیوں کے ثبوت اپنے ایک ہمراز دوست کو دے دیئے۔ آپ سب اسے جانتے ہیں کہ وہ کون ہے اور کس حیثیت سے موجودہ حیثیت تک پہنچا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر اس ملک میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ وہ جسے چاہے ادنیٰ سے اعلیٰ عہدے پر لے جائے اور جسے چاہے ذلت و رسوائی کے دلدل میں دھکیل دیے۔ بھائیو! اب بادشاہ تو نہیں رہا مگر بادشاہ گر تو موجود ہے۔ کیوں نہ ہم اسی کی مرضی و منشا جان لیں اور جس شخص کے سر پر اُسکا ہاتھ

ہوا اُسی کا بادشاہ بنالیں۔

داروغہ کی تقریر ختم ہوئی تو وزیر باتدبیر نے اپنا خطاب شروع کیا۔ فرمانے لگے کہ بادشاہ کا قاتل کوئی اور نہیں بلکہ اسکا ہمراز دوست ہے۔ آج تک جتنے امیروں وزیروں، سرکاری اہلکاروں اعلیٰ عہدیداروں کے قتل ہوئے اُس کی منصوبہ بندی اسی، ہمراز کے گھر ہوئی۔ قاتلوں کو رقم اور ہتھیار فراہم کئے گئے اور پھر انھیں باحفاظت دوسرے ملکوں میں بھجوادیا گیا۔ یہ شخص جرائم کا بادشاہ ہے جسکے سامنے ملک کے بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ ہم سب کے راز جانتا ہے اور ہمیں بے عزت وبدنام کرنے کے طریقوں سے بھی واقف ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی اُسکے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ جج، جرنیل، وزیر، مشیر، اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ حکومتی اہلکار، علمائے دین، مفکرین اور منتظمین سبھی پر اس کے احسانات ہیں۔ کچھ اس کی سخاوت کے قائل ہیں اور باقی اس کی دولت اور شہرت کے خوف میں مبتلا ہیں۔ وہ حج وعمرے بھی کرواتا ہے، مسجدیں اور مدرسے بھی بنواتا ہے، غریبوں کیلیے لنگر خانے بھی کھلواتا ہے اور ان کی جیبوں اور جائیدادوں پر بھی ہاتھ صاف کرتا ہے۔ بادشاہ کا ہمراز بادشاہ کا قاتل بھی ہے اور محسن بھی۔ جو شخص بادشاہ بناتا اور بادشاہی گراتا ہے اسکے سامنے ہماری کیا حثیت ہے؟ کہ مشیر خاص نے دیگر مشیروں کیساتھ کھسر پھسر کی اور اُن کی طرف سے اشارہ پاکر اُٹھا اور حاضرین مجلس کے سامنے بولا: میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ

بادشاہ کے ہمراز سے فوراً مشورہ کرلیاجائے اور جس شخص کی طرف میاں ہمراز اشارہ کریں اُسے گدی پر بٹھا دیا جائے۔ سپہ سالار نے مشیر خاص سے اتفاق کیا اور اُٹھ کر میاں ہمراز کے کمرے میں چلاگیا۔ میاں ہمراز کے کمرے میں دوست ملک کا سفیر اور دوست ملک کے بادشاہ کا مشیر بیٹھے تھے۔ میاں ہمراز نے سپہ سالار سے کہا کہ دوستوں کا مشورہ ہے کہ مسٹر کالے، پیلے، ہرے اور جامنی میں سے ایک کو بادشاہ بنادیا جائے۔ سپہ سالار نے جواب دیا کہ یہ چاروں عوام کو قبول نہیں ہونگے اور ہو سکتا ہے کہ ملک میں ہنگامہ ہوجائے۔ میاں ہمراز نے مسکراکر جواب دیا کہ عوام غرض منداور محتاج ہوتی ہے۔ غرض منداور محتاج محکوم ہوتے ہیں حاکم نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان چاروں میں سے کون ہمارے دوستوں اور ساتھیوں کی خدمت کرنے اور اُن کی مرضی کے مطابق حکمرانی کا اہل ہے۔ کالا چھٹا ہوا ڈاکو، سمگلر، نوسرباز، قاتلوں کا سرغنہ اور مافیا کا سرپرست ہے۔ عوام پر اُسکا پہلے سے خوف اور دبدبہ ہے اسلیئے کوئی اسکے خلاف آواز نہیں اُٹھائے گا۔ پیلا جاگیردار، عیاش اور رسہ گیر ہے۔ ملک بھر کے جاگیرداروں، رسہ گیروں اور قبضہ گروپوں سے اُس کے تعلقات ہیں۔ ملک کی سب سے بڑی برادری اُسکی رعایا ہے اور وہ کسی بھی دوسری برادری اور طبقے پر غلبہ حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فوجی جرنیلوں، ججوں، قلمکاروں اور مذہبی حلقوں میں بھی اُس کی عزت ہے اسلیئے وہ بھی موزوں امیدوار ہے۔ ہرا دین کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے مگر اندر سے کالے اور پیلے جیسا ہی ہے۔ داڑھی اور دستار کی وجہ سے دوستوں کو قابل قبول نہیں اسلیئے

کامیاب نہیں رہیگا۔جا منی جرائم کا بادشاہ ہے اور کالے، پیلے اور ہرے والی تمام خصوصیات کا مرتبان ہے مگر وہ میری طرح بادشاہ گر بننا چاہتا ہے بادشاہ نہیں۔

سپہ سالار نے دوست ملک کے مشیر اور سفیر کی طرف دیکھا اور کچھ کہنا چاہا مگر میاں ہمراز نے اشارے سے چپ رہنے کا کہا۔ پھر بولا: دیکھئے میدان میں صرف ایک ہی آدمی ہے اور وہ ہے کالا۔ کالے میں شیر اور لومڑی کی سبھی خصوصیات ہیں۔ وہ بد عہدی پر بھی شرمندہ نہیں ہوتا اور بد عہدی کو کامیابی کا ہتھیار کہتا ہے۔ اسلئے اس سے موزوں شخص اس ملک میں نہیں جو حکمرانی کا حق رکھتا ہو۔ میاں ہمراز نے اپنا فقرہ مکمل کیا تو دوست ملک کے مشیر اور سفیر نے سپہ سالار کو مبارکباد دی اور اپنے ملک اور بادشاہ کی جانب سے نئے بادشاہ کیلئے نیک داعاؤں کا پیغام دیکر ہر طرح کی مدد کا یقین بھی دلایا۔

کالے کی تاج پوشی کا اعلان ہوتے ہی ملک میں جشن منایا جانے لگا۔ سرکاری عمارتوں پر چراغاں ہوا۔ جگہ جگہ پھولوں کے دروازے سجنے لگے۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء نے کالے کے حق میں جلوس اور ریلیاں نکالیں۔ تاجروں، صنعت کاروں اور کارخانہ داروں نے اجلاس منعقد کئے۔ پریس کانفرنس کیں اور کالے کو ملک کی ترقی اور استحکام کی علامت قرار دیا۔ شہروں دیہاتوں اور دیگر اہم مقامات پر کالے کی قدآور تصاویر لگادی گئیں اور شاہی محل کی

نئے سرے سے تزئین وآرائش ہونے لگی۔علماء ومشائخ نے خصوصی دعائیہ تقریبات کاانعقاد کیااورکالے کی طویل العمری اورکامیاب حکمرانی کیلئے دعائیں مانگی گئیں۔گدی نشیں پیروں، متولیوں اور مخدوموں نے نیک تمناؤں کے پیغامات بھیجے اور مریدوں کو حاکم وقت کے ہاتھ مضبوط کرنے کا حکم جاری کیا۔اہل قلم نے کالے کی شان میں طویل مضمون لکھے اورکچھ دانشوروں نے تاریخی حوالوں سے ثابت کردیا کہ کالے کا شجرہ ایران کے بادشاہ دارا سے ملتا ہے۔سکندر نے جب دارا کوشکست دیکراُسکا دارالحکومت تباہ کردیا توشہزادہ سیاہ پوش جو اپنے کالے لباس اور سنہری ٹوپی کی وجہ سے سیاہ پوش کہلاتا تھا جان بچا کرہندوستان پہنچااورپھر گمنامی کی حالت میں مرگیا۔اسی شہزادہ سیاہ پوش جسکا اصل نام کہکاؤس تھاکے بیٹے کہقباد سے دارا کی نسل چلی اوراس خاندان کوہزاروں سال بعد کالے کی صدارت میں ایک بار پھر حکمرانی نصیب ہوئی جو ملکی اور قومی عظمت کا نشان ہے۔سب لوگ جانتے تھے کہ کالامڑھ بلوچاں کا مسلی تھا جسے مقامی زمینداروں نے مخالفین کا قتل کرنے کیلئے استعمال کیا۔کئی سال جیل میں رہامگرزمینداروں نے کسی طرح سزا سے بچا کررہا کروالیا۔بعدمیں کالے نے اپنا گینگ بنالیااورپولیس کی مدد سے بڑی بڑی وارداتیں کرنے لگا۔سب دانشوروں، قلم کاروں اوردیگر طبقات کوپتہ تھاکہ کالے کانام کالاہی ہے مگر میاں ہمرازکے کہنے پراُسکا نام کالے کے بجائے کیمروس لکھنا شروع کردیا۔جس پر شاہی فرمان بھی جاری ہوگیاکہ آئندہ بادشاہ سلامت کوشاہ کیمروس کے نام سے

لکھا اور پکارا جائے چونکہ بادشاہ سلامت کا اصل نام کیمروس ہی تھا۔ تخت نشینی اور تاج پوشی کے فوراً بعد میاں ہمراز نے مڑھ بلوچوں کے پٹواری کو بمعہ ریکارڈ طلب کیا اور بندوبست مال اور مثل حقیقت میں ایک پرت کا اضافہ کرنیکا حکم دیا جس کے تحت شاہ کیمروس کے نام ہزار بیگہ زمین لگوائی گئی جو مغل بادشاہ اکبر نے شاہ کیمروس کے پڑدادا دُلا بھٹی (عبداللہ بھٹی) کے خلاف شاہی فوج کی مدد کے عوض دی تھی۔ اسی طرح موت اور پیدائش کا رجسٹر بھی بدل دیا گیا اور مڑھ بلوچاں کے مسلیوں کی جگہ میلان خانوادے کا اندراج ہوا جن کے بزرگ ایرانی نسل کے تھے۔ یہ سب ہو چکا تو سپہ سالار نے میاں ہمراز سے کہا کہ تم بڑی توپ چیز ہو۔ تم نے کالے، مُسلی کو میلان بنا دیا۔ تمھاری زہنیت اور عقلیت کو داد دیتا ہوں۔ تم واقعی بادشاہ گر ہو۔ تمہاری چالاکی اور پیرکاری نے عوام وخواص پر جادو کر دیا اور ہر طبقہ فکر نے کالے کو شاہ کیمروس تسلیم کرلیاہے۔ نہ کوئی احتجاج ہوا ہے نہ ہڑتال اور ہنگامہ۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ عوام سادہ مزاج اور اہل غرض ہوتے ہیں اور اہل غرض فرمانبردار اور احمق ہوتے ہیں۔اس حالت میں مکار اپنے شکار سے محروم نہیں رہ سکتا۔ عوام کے متعلق میکاولی کا یہ قول بھی درست ہے کہ وہ اچھی چیز کو ناپسند کرتے ہیں چونکہ مختلف المزاج ہوتے ہیں،خطروں سے ڈرتے ہیں ،اسلیئے ہر جابر کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ سپہ سالار نے رخصت لی، میاں ہمراز کو سلیوٹ کیا اور کہا۔ تم میکاولی کے سچے پیروکار ہو۔جب تک تم ہو یہ ملک ترقی نہیں کرسکتا اور نہ ہی عوام کی

حالت بدل سکتی ہے۔

قادری فیکٹر

جناب طاہر القادری کے اسلام آباد مارچ اور دھرنے کے بعد اور دوران بہت کچھ کہا اور لکھا گیا، جس میں لکھنے اور بولنے والوں نے اپنے علم، عقل، فہم و تدبیر کی حدوں سے نکل کر اسکا واویلا کیا جسے بیان کرنا مشکل ہے۔ اس شور و غل میں ٹیلویژن اینکروں اور دانشوروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور بعض نے بدزبانی اور بدکلامی کا بھی مظاہرہ کیا۔ میں نہ تو منہاج القرآن تنظیم کا ممبر ہوں اور نہ ہی جناب طاہر القادری سے ملاقات ہے مگر حقیقت شناس ضرور ہوں۔ وہ دانشور، اینکر، صحافی اور اہل قلم و علم جن کا ذکر کر چکا ہوں ان کا تعلق قادری مخالف فرقوں، مسلکوں اور سیاسی جماعتوں سے ہو سکتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ سارے اصحاب الرائے جناب طاہر القادری کی جن جن خامیاں کو اُجاگر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے وہ سب خامیاں ان اصحاب میں صرف موجود نہیں بلکہ وہ ہر روز اسکا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کی ٹی وی فوٹیج نکلوائی جائیں تو ہر ایک کے سر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بداعمالیوں، بدیانیتوں اور بداخلاقیوں کا بوجھ نکلے گا۔ یہ معاملہ اوروں کو نصیحت خود میاں فصیت والا ہے جس کے زور پر ایک طبقے کی صحافت اور تجارت چلتی ہے۔

قادری صاحب کے مارچ سے پہلے راقم نے اپنے مضمون ''گوجر خان پلان'' میں لکھا تھا کہ چند روز میں ایک ڈیل متوقع ہے اور ملک ریاض ایک بڑی آفر لیکر جناب طاہرالقادری کے پاس جائے گا۔ اگر ڈیل ہو گئی تو اس کے نتیجے میں ایک سکینڈل سامنے آئے گا اور قادری صاحب اسلام آباد کے بجائے واپس کینیڈا روانہ ہو جائینگے۔ میرے الفاظ کے عین مطابق چوھدری برادران ملک ریاض کے ہمراہ پہنچے تو جناب طاہرالقادری نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ اس انکار نے ملک ریاض کے ہمنوا صحافیوں کو آگ بگولا کر دیا چونکہ یہ سب حضرات نئے سکینڈل پر جشن منانے کی مکمل تیاری کر چکے تھے اور اس سکینڈل میں بہت سارے لوگوں کو ملوث کرنے کا سکرپٹ تیار ہو چکا تھا۔

قادری صاحب اسلام آباد ڈی چوک پہنچے اور اپنے فدائین کے ہمراہ کامیاب دھرنا دیکر حکومت کے ساتھ ایک ڈیل کت تحت واپس چلے گئے۔ قادری صاحب کے ڈی چوک تک پہنچنے پر امن رہنے اور پھر ڈیل کے تحت واپس جانے پر بھی بہت سے حلقوں کو مایوسی ہوئی۔ وہ سیاسی رہنما، حکومتی اہلکار اور سیاسی دانشور جو ٹی وی چینلوں پر دعوے کرتے تھے کہ قادری صاحب مہینہ بھر بیٹھے رہیں ہم ان سے بات نہیں کریں گے۔ چونکہ قادری سٹیک ہولڈر نہیں۔ قادری صاحب کی آخری وارننگ پر نان سٹیک ہولڈر کی گردان پڑھنے والوں کا ایک ٹولہ اپنے اتحادیوں سمیت قادری صاحب کے کیبن میں جا پہنچا اور ایک معاہدے کے تحت قادری صاحب کو دھرنا ختم

کرنے پر قائل کرلیا۔ یہ معاہدہ اور دھرنے کا پُرامن اختتام بھی کچھ لوگوں کیلئے مایوسی کا باعث بنا۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ لال مسجد کی طرح کا کوئی ہنگامہ ہو، فوج کو مداخلت کا موقع ملے، پیپلز پارٹی کی حکومت کو آخری دنوں میں شہادت نصیب ہو، حکومتی کرپشن اور دیگر مالیاتی، اخلاقی اور سیاسی بداعمالیوں پر مظلومیت کا ٹھپہ لگے اور ملک ایک اور فتنے اور فساد کی بھینٹ چڑھ جائے۔ مگر یہ نہ ہوسکا اور فتنہ وشر کی اُمید رکھنے والوں کو مایوسی ہوئی۔

اس دھرنے نے جہاں بہت سے اینکروں اور ان کے مداحوں اور اہم مسلکوں کو مایوس کیا وہی بہت سے لوگوں کی ذاتی قابلیت، نفسیاتی اُلجھاؤ اور مسلکی مفادات بھی کھل کر سامنے آ گئے۔ جناب طاہرالقادری کوئی ایسی مخلوق نہیں جن سے توقع کی جائے کہ وہ دنیا کی مادی آلائیشوں سے پاک ایک آیے ڈیل انسان ہیں۔ جناب طاہرالقادری سیاستدان ہیں اوران کا وطیرہ بھی دیگر سیاستدانوں جیسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ پاکستانی علماء میں شمار ہوتے ہیں اور جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی اور دیگر سیاسی مذہبی جماعتوں کا کردار ہمارے سامنے ہے۔ جناب طاہرالقادری وکیل رہے ہیں اور وکلاء حضرات کا کردار بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ وہ ٹی وی اینکر اور دانشور جو جناب طاہرالقادری کا موازنہ آسمانی مخلوق سے کرتے ہیں اگر زمین پر آجائیں اور اپنے اردگرد بیٹھے دانشوروں، صحافیوں، علماء سیاستدانوں، وکیلوں اور دیگر طبقاء پر نظر دوڑائیں تو،

جناب قادری ان سے قدرے بہتر درجے پر ہی نظر آئینگے۔

جناب طاہر القادری کا مسلک روحانیت، تصوف اور فقر والائیت کی تبلیغ کرتا ہے اور اسکا پیروکار ہے۔ جماعت اسلامی، جمیعت علمائے اسلام، جمیعت اہل حدیث، تبلیغی جماعت اور دیگر دینی سیاسی جماعتیں روحانیت اور تصوف کی قائل نہیں اور اس نہ ہی وہ طاہر القادری، فقہ جعفریہ، اہل سنت وجماعت اور بریلوی حضرات سے متفق ہیں۔ راولپنڈی میں جناب نواز شریف نے طاہر القادری کے مقابلے میں جو سیاسی دعوت کی وہ خالصتاً دیو بند مسلک کے ماننے والوں کی تھی۔ اہل سنت (بریلوی) فقر و ولائت کے سبھی سلسلوں کا منبع حضرت علیؓ کی ذات مبارکہ کو مانتے ہیں۔ چونکہ حضورؐ سرور کائنات کی حدیث ہے کہ میں علم کا گھر ہو اور علیؓ اسکا دروازہ۔ اہل فکر و فقر اس حدیث مبارکہ کی تشریح کرتے ہوے اس بات پر متفق ہیں کہ آپ نے جس علم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قرآنی اور روحانی علم ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے کشف المعجوب میں روحانی علوم اور اس کے منبع پر جو کچھ لکھا اس کی تشریح یوں تو بیشمار علمائے حق نے کی مگر انتہائی سادہ اور عالی فہم زبان میں جناب قبلہ نورالدین اولسی کشمیریؒ نے اپنی تصانیف روح البیان، منازل فقر، حقیقت تصوف، علم الفرقان اور سیرت النبی ﷺ میں تصوف وروحانی کے تمام پہلوؤں کی قرآنی اور سائنسی علوم کی روشنی میں بیان کرکے کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔ مشاہدات قلبی اور واردات قلبی علم الفرقان کا

ایک موضوع ہے جسکا بیان اس تحریر میں ممکن ہیں۔جناب طاہرالقادری کی نوعمری کی ایک ویڈیو مختلف چینلوں پر تمسخر کے طور پر دکھلائی جاتی رہی اور اہل سیاست اور صحافت نے جی بھر کر اس ویڈیو پر تنقید کی، تمسخر اُڑایا اور کچھ اہم جید علماء نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔حیرت کی بات یہ کہ ان تمسخر اُڑانے والوں میں سید زادے بھی تھے اور شہزادے بھی۔اس سے بڑھ کر حیرت کی بات یہ ہے کہ فقراء کی گدیوں پر بیٹھے صاحبزادگان، مخدوم اور پیر بھی اس پر خاموش رہے اور کسی قسم کی وضاحت سے گریز کیا۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر جماعت کا ایک علماء و مشائخ کا ونگ بھی ہے جس میں ملک بھر کے گدی نشین اور صاحبزادگان شامل ہیں۔اگر یہ لوگ مشاہدات قلبی کی تھوڑی سے وضاحت کسی ٹیلی ویژن چینل پر یا پھر پریس کانفرنس میں کر دیتے تو تمسخر اُڑانے والوں کو کچھ سوچنے یا پھر سرعام اسے رد کرنے کے ساتھ اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کا موقع ملتا۔

فقر و ولائیت کا علم رکھنے والوں کا بیان ہے کہ مراقبات و مشاہدات میں ناپختگی اور توجہ میں کمی کے باعث خیالات کا دخل ہو سکتا ہے۔اگر خیالات مادی اور سفلی ہوں تو مشاہدات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور طالب کو مرشد کامل کی رہنمائی میں از سر نو تزکیہ، مجاہدہ کی منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔اس سلسلہ میں حضرت مولانا رومیؒ، شمس تبریزؒ سے ملنا اور پھر تزکیہ و مجاہدہ کی منازل طے کرنا بھی ایک واقع ہے۔اسی طرح جو مولانا الیاس سیالکوٹیؒ کا واقعہ بھی ہے جسے

رد کرنا آسان نہیں۔ حضرت شیخ عبداللہ بن شیخ محمد بن عبدالوہابؒ جو وہابی مسلک کے بانی جناب شیخ عبدالوہابؒ کے پوتے ہیں نے حضورؐ کی مختصر سیرت پاک تصنیف فرمائی جسکا اردو ترجمہ جامعہ العلوم الاثریہ جہلم نے شائع کیا۔ سیرت پاک کی اس کتاب میں بھی مختصر دلائل کے ساتھ بہت سے روحانی مسائل کی طرف اشارہ ہے جنکا تعلق مشاہدات اور معجزات سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص کسی علم میں کاملیت کا مرتبہ نہ رکھتا ہو اسے اسپر رائے دینے کا حق نہیں۔ چہ جائیکہ ایک مخالف مکتبہ فکر اور مسلک کے لوگ میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے کسی دوسرے مسلک اور مکتبہ فکر کا نہ صرف تمسخر اُڑائیں بلکہ اُسے مداری کا تماشہ کہیں۔ جناب طاہر القادری نے اپنے جن مشاہدات کا ذکر کیا ہے اسکا تعلق اُن کی اپنی ذات سے ہے۔ جناب طاہر القادری کے مشاہدات روحانی تھے یا عقلی وناسوتی اُسکا ذمہ اُن کی ذات تک محدود ہے۔ جہاں تک روحانی علوم کا تعلق ہے اس سے کسی بھی شخص کا انکار نہیں چہ جائیکہ ایک مسلمان ہونے کا دعویدار عالم، سیاستدان، صحافی، دانشور اور اینکر اُسے مداری کا تماشہ، سیاسی ڈرامہ کہ کر اُسکا تمسخر اُڑائے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ روحانی علوم کا تعلق قادری کے علم سے ہے اور جو کچھ قرآن اور شریعت سے باہر ہے وہ نہ تو دین اور اور نہ ہی روحانیت، تصوف اور فقر ہے۔ قرآن کریم میں حضرت سلمانؑ کے قصے میں واضح لکھا ہے کہ ’’پھر وہ آدمی جس کے پاس کتاب کا علم تھا نے کہا اے سلمانؑ میں پلک جھپکنے سے پہلے ملکہ بلقیس کو تمہارے روبرو پیش کردونگا‘‘ جبکہ اس سے پہلے جن

یا دیو جو بھی ناری مخلوق تھی نے کہا کہ اس سے پہلے کہ تیرا دربار برخاست ہو ملکہ سبا تیرے سامنے لے آؤنگا۔

میں نہیں کہتا کہ جناب طاہرالقادری صاحب ایک مکمل روحانی شخصیت ہیں مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کہ وہ روحانی علوم کے طالب ضرور ہیں اور اس سلسلہ میں اُنکا مطالع بھی وسیع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابتدائی دور میں جب یہ ویڈیو بنی تھی تو آپ کا تزکیہ اس لیول پر تھا کہ آپ کو مشاہدات کی جھلکیاں بھی دکھلائی دیں اور ہو سکتا ہے کہ آپ کے مشاہدات میں خیالات کا دخل زیادہ ہونے کی بنا پر خیالات ہی سے جوابات ملتے رہے ہوں۔ جناب طاہرالقادری کے خیالات، مراقبات و مشاہدات کے حقیقت یا خیالی ہونے سے نہ تو مفاد عامہ کا کوئی مسئلہ پیدا ہوا اور نہ ہی حکومت اور ریاست کے معاملات ڈسٹرب ہوئے۔ نہ تو تبصرہ نگاروں، سیاستدانوں اور اینکروں کا اس فیلڈ کا کوئی تجربہ ہے اور نہ ہی وہ روحانی علوم کے ماہر ہیں۔ محض دوکانداروں اور سیاسی جماعتوں کے مسالک سے ہم خیالی کی بنا پر روحانی علوم کا تمسخر اُڑانا مسخرہ پن تو ہو سکتا ہے مگر صحاف اور فراست نہیں ہو سکتی۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ایبٹ آباد سے جماعت اسلامی سے وابستہ ایک مولانا صاحب لاہور تشریف لے گئے اور جناب مولانا مودودیؒ سے شکائت کی کہ ان

کے علاقہ میں ایک بریلوی مولانا رہتے ہیں اور اہل جماعت کو برا بھلا کہتے ہیں۔ وہ آپ کو یعنی مولانا مودودیؒ کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے فرمایا کہ آپ ان کے جواب میں کیا کہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں بھی سخت جواب دیتا ہوں۔ اس پر امیر جماعت نے حکم دیا کہ آئیندہ آپ ان کی کسی تقریر کا جواب نہیں دینگے اور اجتماع کے بعد مجھ سے ملکر جاینگے۔

اجتماع ختم ہوا تو مولانا نے جناب ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ملاقات کی تو آپ نے کچھ کتابیں، تفسیر قرآن، کپڑوں کا ایک نفیس جوڑا اور دستار بطور تحفہ ایبٹ آباد کے بریلوی مولانا صاحب کیلیئے دیے۔ فرمایا آپ بذات خود میری طرف سے نذرانہ پیش کریں، مولانا صاحب کو میرا سلام عرض کریں اور درخواست کریں کہ وہ مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

اگلے برس جب مولانا صاحب اجتماع میں تشریف لائے تو بریلوی مسلک کے مولانا کا خط بھی ساتھ لائے۔ مولانا نے لکھا تھا کہ مجھے آپ کا تحفہ ملا ہے جسکا مشکور ہوں۔ میں نے آپ کے متعلق جو سنا تھا میرے خیالات اُسی کے مطابق تھے۔ اب آپ کو پڑھا ہے تو خیالات بدل گئے ہیں لہذا ماضی کی غلطیوں پر افسوس ہے۔

حیرت ہے کہ حضرت مولانا مودودیؒ کے پیروکار لشکروں اور صحافیوں کو بھی اپنے رہبر کا خیال نہیں رہا اور وہ محض نمبرون کی دوڑ میں یک طرفہ جنونی جنگ کا حصہ بن گئے۔ حدیث پاک ہے کہ ''تم اُن کے جھوٹے نبیوں کو بُرا بلامت کہو ورنہ وہ تمہارے سچے نبی کے کیخلاف بھی ایسی ہی باتیں کرینگے''۔ میں اس حدیث مبارکہ کا تعلق طاہر القادری سے نہیں جوڑ رہا مگر آپؐ کا ہر قول امت کی رہنمائی اور اخلاقی پاکیزگی کیلئے مشعل راہ ہے۔ چند روز پہلے جس مسلک اور مکتبہ فکر کے علماء اور سیاسی زعماء نے رائے ونڈ جاگیر میں اکٹھ کیا اور جس بات کی تردید کی تھی اس کے دو ہفتوں بعد ہی ان کی اپنی ڈیمانڈ بھی وہی ہو گئی۔ بلکہ دو قدم آگے بڑھ کر انھوں نے الیکشن کمیشن پر عدم اعتماد کیساتھ ساتھ صدر مملکت اور گورنروں کی برخواستگی کا بھی مطالبہ کر دیا۔ طاہر القادری کے ایجنڈے پر بھی یہی کچھ تھا اور اس میں صدر کے بجائے وزیر اعظم اور کابینہ پر عدم اعتماد کا ذکر تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ محض مسلکی تعصب کی بنا پر سیاسی مطالبات میں یکسوئی کیوں پیدا نہیں ہوئی۔ حکومت وقت پر جو اعتراضات طاہر القادری کے ہیں وہی رائے ونڈ اکٹھ والوں کے بھی تھے اور ویسا ہی مطالبہ عمران خان کا بھی تھا مگر حیرت کی بات ہے کہ سب ملکر ان مطالبات کو پیش کرنے پر متفق نہیں۔ سیرت کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جناب وزیر اعظم نے فرمایا کہ آج ہم یعنی سیاستدانوں نے قوم کو فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ شکر ہے انھوں نے یہ بات سچ کہہ دی ورنہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ ہر بات کو ہر تفریق اور برائی

کو فوج کے متھے لگا کر اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ بنا یہ سوچے سمجھے کہ اس سے ہمارے ملک اور افواج کی بیرن دنیا میں بدنامی ہوتی ہے۔ نہ صرف ہمارے قائدین بلکہ ہمارے اینکر اور صحافی دانشور بھی اس میں پیچھے نہیں اور فوج پر تنقید کر کے اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ جبکہ دیگر ممالک اپنے قومی اداروں کی عزت اور مقام کو کبھی بھی یوں بازاروں میں نیلام نہیں کرتے۔ جمہوریت کا حسن تنقید میں ہے مگر یہ تنقید ذاتی اور جماعتی بنیاد پر نہیں بلکہ قومی مفادات کو ملحوظ خاطر رکھ کر ہونی چاہیے۔

پاکستان میں تعلیم کا المیہ

تعلیم ایک سادہ، عام فہم، وسعت آمیز، گہرا اور بلند تر معنی کا حامل لفظ ہے جسے ہر شخص چاہے خواندہ، نیم خواندہ ہو باآسانی سمجھ جاتا ہے، آپ کسی بھی راہ چلتے شخص سے پوچھیں کہ جناب یہ سڑک کدھر جاتی ہے وہ کہے گا مجھے اسکا علم نہیں۔ اگر اُسی شخص کو علم ہوگا تو فوراً جواب دیگا کہ یہ سڑک ایوان صدر کو جاتی ہے۔ اگر وہ اپنے علم کی روشنی میں آپ کی مزید مدد کرنا چاہے تو کہے گا کہ تھوڑا آگے جائیں وہاں ایک سائن بورڈ لگا ہے جس پر سب سڑکوں کے نام اور تیر کے نشان سے سمتیں واضع کی گئی ہیں آپ آسانی سے اپنی منزل پر پہنچ جائیگے۔ دنیا میں ہر شخص کو اپنی منزل پر پہنچنے اور مراد پانے کیلیئے تعلیم کی ضرورت ہے۔ تعلیم علم سکھانے، اُسے عام کرنے اور معاشرے اور ریاست کے ہر فرد کو علم تک رسائی دینے کا نام ہے۔ کرہ ارض پر انسانی پیدائش کے ساتھ ہی رب کائنات نے انسان کی اصلاح کیلیئے علوم کا اجرا کیا اور مخلوق کی تربیت کیلیئے اُن ہی میں سے پیغمبر، ہادی اور مرسل مبعوث فرما کر اُنھیں علم کی روشنی عطا کی۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں آتی جسکی رہنمائی اور تربیت کے لئے خدا نے معلم نہ بھیجے ہوں۔ ان معلّمین کے ذریعے اللہ نے بنی نوح انسان کو وہ سب علوم سکھلائے جن کی معاشرے اور ریاست کے فرد کو ضرورت تھی۔ تاریخ کے مطابق حضرت نوحؑ کی عمر نو سو پچاس سال

ہوئی۔ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان دو ہزار چھ سو چالیس برس کا زمانی فرق ہے اور حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ کے طریقہ سنت پر تھے۔ ان دو جلیل القدر پیغمبروں کے ادوار کے درمیان صرف دو نبی حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ ہوئے جن کی اُمتیں تعلیم یافتہ تھیں۔ کشتی نوحؑ کی حقیقت سے کسی بھی مذہب اور فرقے کے عالم محقق اور اُستاد کو انکار نہیں۔ یہ کشتی تین درجوں پر مشتمل تھی۔ اس کشتی کی لمبائی، ہزار گز اور چوڑائی چار سو گز تھی۔ مقدس آسمانی کتابوں اور تاریخ ادیان کے مطابق اس کشتی کی تعمیر کا طریقہ حضرت جبریل امین نے اللہ کے حکم سے سکھلایا جس پر چار سو گز چوڑے اور چھ سو گز لمبے ایک لاکھ چوبیس ہزار تختے استعمال ہوئے۔ حضرت صالحؑ کی قوم نے آبپاشی کیلئے بہترین نہری نظام وضع کیا اور حضرت ہودؑ کی قوم نے دنیا کا پہلا ڈیم اور جدید سہولیات سے مزین شہر ارم تعمیر کیا۔ تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو انسانی پیدائش کے ساتھ ہی خالق نے علم اور تعلیم کا بھی بندوبست کیا اور انسان کو سہولیات کے لئے بنیادی علوم سکھلائے۔ بنیادی سائنسی اور عمرانی علوم بھی فرشتوں کے ذریعے اور کبھی پیغمبروں اور برگزیدہ بندوں کے ذریعے تعلیم کئے گئے اور پھر بعد کے ادوار میں یہ کام حکومتوں اور حکمرانوں کے سپرد ہوا تاکہ ایک کامیاب معاشرے اور ریاست کے افراد کو علم کے ذریعے معاشرتی آداب سیکھلا کر قانون کے تابع اچھا شہری بنایا جاسکے۔

تاریخ ایسا علم ہے جسکی روشنی میں ہم ماضی کے احوال نہ صرف سمجھ سکتے ہیں بلکہ دیکھ بھی سکتے ہیں۔قرآنی تاریخ ایک ایسی روشنی ہے جس کی موجودگی نے من گھڑت تاریخی حوالوں اور محض قیاس وحکایات اور روایات پر مبنی واقعات کی نہ صرف نفی کی ہے بلکہ بنی نوح انسان کو اپنی سچائی اور پرکھ کی کھلی دعوت بھی دی ہے۔قرآن کریم علوم ظاہریہ اور باطنیہ کا خزانہ ہے جوانسان کو فکری، علمی اور عقلی تحریک دیتا ہے تاکہ انسان اپنے فکر وعمل کو علم کی قوت اور عقلی استدلال کے تحت متحرک کرے اور کرہ ارض پر پھیلے خزانوں سے فیض حاصل کرسکے۔جیساکہ عرض کیاکہ ہزاروں سال پہلے نوحؑ کے چالیس حواریوں کا ایک طویل اور تین منزلہ بحری جہاز بنانا ایک سائنسی کارنامہ ہے جبکہ اُسکے قریبی وقت میں ارم جیسا ماڈرن شہر بسایا ایک معاشرتی ،معاشی اور زرعی علوم کے عام ہونے کی دلیل ہے۔

نزول قرآن سے پہلے عمرانیات کے علم سے کوئی عالم و محقق واقف نہ تھا البتہ عمرانی افکار موجود تھے جنکے پیچھے یونانی فلاسفہ کی سوچ کا عمل تھا۔یونانی فلاسفروں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ افکار محدود جغرافیائی حدود تک اثر رکھتے تھے اور جس دور میں اِن افکار کی تشہیر ہوئی تب تک انسان لامحدود جغرافیائی حدود سے آگے نکل چکا تھا۔عمرانی علوم کا بابا اول ابن خلدون ایک مسلمان محقق فلاسفر اور حکیم تھا جسکا علم عقلی اور مشائداتی تھا۔ابن خلدون کو یونانی فلاسفہ پر ہر لحاظ سے فوقیت حاصل ہے

چونکہ وہ اپنے خیالات اور افکار کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھتا ہے تاکہ عمرانی علوم خدا کی بنائی ہوئی حدود سے نکل معاشرے کے لئے شر و فساد کا باعث نہ بنیں۔ وہ انسان کی تربیت علم، عقل اور اخلاقیت کی روشنی میں کونے کا درس دیتا ہے تاکہ انسانی معاشرہ اعتدال پر رہے۔ ابن خلدون کے مطابق ایک معتدل انسانی معاشرے کیلئے ضروری ہے کہ اسے دینی اور اخلاقی مدار میں رہنے کا پابند بنایا جائے تاکہ عدل و انصاف میں جھول پیدا نہ ہو۔

قرآن اور خلدونیات کو باہم ملا کر دیکھا جائے تو قرآن نوح انسانی کی ہدایت کی پہلی اور آخری کتاب ہے جس میں دین اور دنیا کے تمام تر مسائل پر حتمی اور مدلل بحث کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے ہر علم چاہے اُسکا تعلق سائنس، فلسفے، عمرانیات یا انسانی ناسوتی، مادی اور روحانی علوم سے ہو پر توجہ دینے کی دعوت دی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ زمین کی وسعتوں میں اُترو اور ساتھ توجہ مبذول کراتا ہے کہ سمندروں میں تمہارے فائدے کہ بڑی چیزیں ہیں۔ پھر انسانی سہولیات کیلئے طرح طرح کی سواریوں، پھلوں اور اناج کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن انسانی معاشرتی آداب کا بیان کرتا ہے۔ جس میں ماں باپ اولاد ور ازواج کے حقوق سے لے کر پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں، معذوروں اور جانوروں کے حقوق کی تلقین کرتا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی کے مطابق قرآنی علوم کی روشنی میں مسلمان حکماء و فلاسفر نے ساڑھے تین ہزار علوم دریافت کیئے۔ علامہ جلال الدین سیوطی کی اس تحقیق پر جرمن

محقق ڈائیل ہائنے.برگ نے قرآن کی بنیادی اساس اور ذرائع پر مبنی تین ہزار علوم دریافت ہونے کو تسلیم کیا اور ساتھ ہی اس بات کو بھی حقیقت بیان کیا کہ ہر علم کی روشنی میں بیس مزید علوم دریافت ہوئے۔یہی محقق آگے چل کر لکھتا ہے کہ مسلمان محققین نے دو سو کے قریب نظام علوم دریافت کئے اور ان نظاموں نے مزید بیس علوم کی بنیاد ڈالی۔

فلپ کے ہٹی لکھتا ہے کہ مسلمان حکماء نے ریاضی کے علم کو نقطِ عروج تک پہنچایا جس سے آج ساری دنیا فوائد حاصل کر رہی ہے۔اس طرح علم طب کیلئے درس گاہیں قائم کیں اور عوام الناس کو طبّی سہولیات فراہم کرنے کے لئے ہر سطح پر شفاخانے قائم کئے۔فلپ کے مطابق صرف بغداد شہر میں نو سو سند یافتہ ڈاکٹر موجود تھے جن کے مطب جدید جراحی کی سہولیات سے مزین تھے۔

ڈریپر کے مطابق اہل مغرب نے ہمیشہ منافقت سے کام لیا ور عربوں کی علمی کاوشوں کو اپنا کہہ کر مسلمان حکماء کے احسانات سے روگردانی کی۔ڈریپر مزید لکھتا ہے کہ پلی،پیئے،لیور اور رسی سے لیکر رصد گاہیں اور لیبارٹریاں سبھی عربوں کی ایجادات ہیں۔عربوں سے دنیا کا نقشہ بنایا،چاند گرہن کے اوقات متعین کئے اور ستاروں کی حرکات اور موسموں کے تغیر و تبدل سے لیکر پرندوں کی حرکات پر مفصل کتب تحریر کیں۔قرآن نے انسانی شعور کو جلا بخشی اور اُسے علم و

حکمت کے خزانے تلاشنے کی تحریک دی۔ دنیا میں سب سے پہلی یونیورسٹیاں بغداد، ثمرقند، بخارہ اور قرطبہ میں قائم ہوئیں۔ سائنسی تجربات کیلئے لیبارٹریاں اور کتب خانے تعمیر ہوئے جن کی سرپرستی مسلمان بادشاہ اور اُن کی بیگمات کرتی تھیں۔ بغداد میں خلیفہ ہارون الرشید کہ ملکہ زبیدہ کی ذاتی لائبریری میں چھ لاکھ کتابیں اور قرطبہ کی پبلک لائبریری میں چار لاکھ کتابیں تھیں جس کا کیٹلاگ چوالیس جلدوں پر مشتمل تھا۔ بغداد کی صرف ایک گلی میں کتابوں کی دوسو دکانیں تھیں اور ہر مدرسے کے ساتھ مسجد اور لائبریری کی تعمیر شاہی حکم میں شامل تھا۔

پنڈت نہرو نے اپنی کتاب Glimpses of World History میں لکھا ہے کہ عربوں سے پہلے مصر، چین اور ہندوستان میں کسی بھی جگہ کوئی سائنسی علم نہ تھا۔ عربوں نے سائنسی علوم کی بنیاد ڈالی جنکی بناپر وہ جدید سائنس کے باپ کہلانے کے حقدار ہیں۔ کیرن آرم سٹرونگ نے اپنی تحقیق پر مبنی ایک ڈاکومنٹری فلم دکھلا کر اہل مغرب کے علمی تعصب پر گہری چوٹ لگائی ہے۔ کرن کہتی ہیں کہ اہل مغرب پر عربوں اور مسلمانوں کے بڑے احسانات ہیں۔ آج جتنی جدید سہولایات اور سائنسی علوم سے اہل مغرب فیض یاب ہورہے ہیں ان کی بنیاد عربوں نے رکھی۔ کیا کوئی سائنس دان

اور محقق ابن الہیثم، بو علی سینا، البیرونی، الخوارزمی، الجواہری، الفارابی، ابوالنصر منصور، جابر بن حیان سمیت سینکڑوں مسلمان اور خاص کر عرب سائنس دانوں کے وضع کردہ بنیادی علوم سے ہٹ کر کچھ نیا ایجاد کر سکتا ہے۔ تعصب اور بخل کے سیاہ پردے ہٹا کر اور سچائی کا دامن تھام کر جواب ہو گا کہ نہیں؟ آج دنیا بھر میں جتنی بھی سائنسی ایجادات ہیں اُسکا بنیادی نظریہ مسلمان سائنس دانوں نے ہی وضع کیا اور اہل مغرب کی طرح اُسے گھر کی لونڈی بنانے کی بجائے عام انسانوں تک پھیلایا۔ تاریخ، فلسفے اور عمرانیات پر مسلمان اور عرب مفکروں کی اجارہ داری ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ ابن رُشد اور ابن خلدون کے فکر و فلسفہ کی حیثیت کم کرنے پر جتنا مغربی محققین نے زور لگایا ان کی حیثیت اور مرتبہ اُسی قدر بلند ہوا۔

دیکھنا یہ ہے کہ علم و فکر کے عظیم خزانوں کے امین عرب اور دنیا بھر میں پھیلے مسلمان خاص کر اہل پاکستان اسقدر مفلس، تہی دست، اغیار کے محتاج اور محکوم کیوں ہیں۔ اس حقیقت کی وجوہات پر غور کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں خاص کر پاکستانیوں کی علمی، معاشی، سیاسی اور اقتصادی ابتری کا ذمہ دار کون ہے۔ عوام یا حکمران یا پھر دونوں؟

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ علم کے بغیر کوئی فرد، معاشرہ اور ریاست

ذاتی اور اجتماعی حیثیت سے ترقی نہیں کر سکتی۔ اگر معاشرے اور ریاست میں کچھ لوگ یا گروہ لوٹ مار، کرپشن، سمگلنگ اور دوسرے ہتھ کنڈوں کے ذریعے عوام الناس اور حکومتی خزانے پر نقب لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور دولت کے انبار لگا کر ان پر ترقی کی تختی نصب کر دیتے ہیں تو یہ محض ایک فریب ہے ترقی نہیں۔

اس بات میں شک نہیں کہ آج پاکستان شدید معاشی دباؤ میں ہے۔ دہشت گردی کی فصل ہمارے حکمرانوں نے خود بوئی جسے کاٹنے کے طریقے دوسرے سے پوچھ رہے ہیں۔ سیاستدانوں نے متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ کالاباغ ڈیم نہیں بنے گا چاہے سارا ملک اندھیرے میں ڈوب جائے، زمینیں بنجر ہو جائیں، فیکٹریاں اور کارخانے بند ہو جائیں، عوام بیروزگاری اور مفلسی سے تنگ آ کر بچے فروخت کریں، اپنی عزتوں اور عصمتوں کو نیلام کریں، خودکشیاں کریں یا پھر دہشت گردوں کو خودکش بمبار فراہم کر کے اپنا پیٹ بھریں۔

جس معاشرے اور ریاست کے عوام روٹی کو ترس رہے ہوں اور خواص لندن، پیرس اوسلو، ٹورنٹو اور دبئی میں عالیشان محل تعمیر کرنے کی فکر میں ہوں اُس معاشرے، اور ریاست میں تعلیم کی بات کرنا مذاق کے سوا کچھ نہیں۔ 1947ء میں پاکستان آزاد ہوا تو پشاور میں تین، راولپنڈی اور کراچی میں پانچ اور لاہور میں تین انگلش میڈیم سکول تھے جنہیں عیسائی مشنری ادارے چلاتے تھے۔

آج پاکستان بھر میں درجنوں پرائیویٹ یونیورسٹیاں، کالج اور ہزاروں سکول ہیں مگر معیار تعلیم انتہائی پست اور واجبی ہے۔ اچھے اور معیاری تعلیمی اداروں پر امراء اور نودولتوی کی اجارہ دارئی ہے جبکہ سیاستدانوں، جرنیلوں، معروف صحافیوں، ججوں، سیکرٹریوں سمیت کارخانہ داروں، بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے بچے بیرون ملک رہتے اور پڑھتے ہیں۔ سرکاری تعلیمی اداروں کا کوئی پرسان حال نہیں اور نہ ہی کسی قسم کا ڈسپلن ہے۔ حکومت نے ہائیر ایجوکیشن کمیشن کا اس لئے برباد کیا چونکہ اس ادارے نے سیاستدانوں کی جعلی ڈگریوں کا سراغ لگایا۔

ملک بھر میں گھوسٹ سکولوں کی بھرمار ہے جنکا بجٹ باقاعدگی کیساتھ جاری ہوتا ہے اور اُستادوں کو تنخواہیں بھی ملتی ہیں۔ ہمارے سیاسی حکمرانوں نے قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبروں اور سینیٹروں کو کروڑوں روپے تعلیمی فنڈ کی مد میں دیے اور قوم کے ان لیڈروں اور قانون سازوں نے اپنے مال مویشیوں کے باڑے، ڈیرے، اپنے تحفظ کیلئے پالے گئے رسہ گیروں، مفروروں اور ڈاکوؤں کیلئے بڑی بڑی قلعہ نما حویلیاں اور باغات کے گرد پختہ چاردیواریاں تعمیر کیں اور اُن پر سکولوں کے بورڈ لگادیے۔ قوم کے ان نمائندوں اور جمہوریت کے علمبرداروں نے اپنے ٹاؤٹوں اور منشیوں کو ٹیچر بھرتی کرلیا جنہیں سرکاری خزانے سے تنخواہیں اور دیگر مراعات مل رہی ہیں۔ سرکاری سکولوں اور دینی مدارس

میں طلباء پر تشدد کرنا اور مشقت لینا تعلیمی روایات کا حصہ ہے۔

1970ء تک سارے پاکستان میں ایک ہی تعلیمی نصاب رائج تھا۔ سرحد میں پشتو، بنگال اور سندھ میں مقامی زبانیں بھی سلیبس کا حصہ تھیں تا کہ نئی پود اپنے مقامی کلچر وروایات سے واقف رہے۔ 1971ء کے بعد مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا تو سندھ بلوچستان اور سرحد میں قوم پرست سیاسی جماعتوں نے سب سے پہلے تعلیمی نصاب کو نشانہ بنایا اور مقامی زبانوں میں تعلیمی سلیبس بنانے پر ہنگامے اور ہڑتالیں کیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مقامی زبانوں میں قوم کو تعلیم دینے والے سارے قوم پرست جاگیردار، بڑے زمیندار، قبائلی سردار اور کارخانہ دار تھے جن کے اپنے بچے بیرون ملک پڑھتے ہیں۔ ان لوگوں کو پتہ ہے کہ عوام کو جدید تعلیمی نظام کے تحت معیاری تعلیم دنیا اُنھیں اپنے شکنجے سے آزاد کرنے کے مترادف ہے۔ ایک سندھی زبان میں ایف ایس سی کرنے والے طالب علم اور انگریزی زبان میں سائنس کے مضامین پڑھنے والے طالب علم میں زمین اور آسمان کا فرق، سندھی زبان میں ایف ایس سی کرنیوالے طالب علم کو کسی میڈیکل کالج یا انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا چونکہ میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبے میں جن الفاظ اور اصطلاحات کا ذکر ہوتا ہے اُسکا سندھی، پنجابی، بلوچی یا پشتو زبان میں متبادل ہی نہیں۔ دوسری جانب بنگلادیش میں بنگلہ بطور زبان اور پڑھائی جاتی ہے مگر انگریزی تعلیم ہر سطح پر لازمی ہے۔ وہ

لوگ جو روسی، جرمن، چینی، جاپانی اور فرانسیسی زبانوں کا حوالہ دیتے ہیں اُنھیں شائد پتہ نہیں کہ ان مما لک نے سائنس، ادب اور عمرانیات کی کتابیں لکھیں، دوسرے مما لک سے کتب منگوا کر اُنکے تراجم شائع کروائے اور اپنی ریسرچ لیبارٹریوں میں جدید آلات پر سائنسی علوم کے تجربات کیے اور اپنے نظام تعلیم کو ہر سطح پر مربوط اور مضبوط بنایا۔ ہمارے ہاں ہر حکومت آتے ہی تعلیمی نصاب بدل کر اپنے پسندیدہ لکھاریوں کو نوازنے کے لئے اُن کی لکھی ہوئی چربہ کتابیں نصاب کا حصہ بنالیتی ہے اور حکومت کے رخصت ہونے پر نئی حکمت نئی کتابیں متعارف کروادیتی ہے۔پڑھا لکھا پنجاب، دانش سکول اور لیپ ٹاپ سکیموں پر اربوں روپے خرچ ہوئے مگر گورنمنٹ مڈل سکول چکوال کی بچیاں آج بھی استعمال شدہ بوریوں پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتی ہیں۔پڑھا لکھا پنجاب ہو یا دانش سکول مقصد مال کمانا، دوستوں یاروں کو فائدہ پہنچانا اور سستی شہرت حاصل کرنا ہے۔اگر خادم اعلیٰ پنجاب دانش سکولوں کے بجائے سرکاری سکولوں کو ماڈل سکولوں میں بدل دیتے تو پانچ سالوں میں پنجاب کے ہر گاؤں اور محلے میں ایک جدید سہولیات سے مزین سکول ہوتا جہاں عوام کے بچے معیاری تعلیم حاصل کرتے اگر ایسا ہوتا تو سرکار کے چہیتے ٹھیکیداروں کا کیا بنتا، دانش سکولوں کی تعمیر و تزئین پر اربوں روپے خرچ ہوئے اور یاروں اور دوستوں نے کروڑوں کمائے۔ایسا ہی حال پڑھے لکھے پنجاب کا ہو جسکا مقصد

کتابوں اور کاپیوں پر پرویز الٰہی کی تصاویر چھاپنا اور علم کو سیاسی اشتہار میں بدلنا تھا۔پاکستانی سیاستدانوں اور حکمرانوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ عوام کو ہر حال میں ناخواندہ اور نیم خواندہ رکھنا ہے۔معیاری تعلیمی اداروں کی فیسیں ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہیں جبکہ ڈاکٹر اور انجنئیر بننے کیلئے پچاس لاکھ درکار ہیں۔ مہنگائی کا یہ حال ہے کہ ملک کی ستر فیصد آبادی دو وقت کی روٹی پیدا کرنے سے عاجز ہے۔اجناس پیدا کرنیوالی زمینوں کے مالک بڑے زمیندار، جاگیردار اور قبائلی سردار ہیں۔ چینی، آٹا، گھی، چاول اور دیگر انسانی ضروریات بشمول پولٹری اور ڈیری کی صنعت پر بھی اپنے لوگوں کی اجارہ داری۔ایک طرف یہ طبقہ اٹھارہ کروڑ پاکستانیوں کی روزی روٹی کے ذرائع پر قابض ہے تو دوسری طرف یہی ٹولہ صوبائی و قومی اسمبلیوں اور سینیٹ میں بیٹھ کر اپنے غلاموں کی نمائندگی کا حق ادا کرتا ہے۔

نسٹ، لمز، بیکن ہاؤس، سٹی سکولز، روٹس اور ایجوکیٹرز جیسے معیاری تعلیمی اداروں کے مالکان بھی کسی نہ کسی صورت بااثر اداروں اور شخصیات سے منسلک ہیں جہاں عام آدمی کی رسائی ممکن نہیں۔دیہاتوں میں پھیلے سرکاری سکول بنیادی سہولیات سے محروم ہیں جبکہ شہروں میں قائم تعلیمی اداروں پر سیاست کی گرفت ہے۔استادوں کے تبادلے اور طلباء کے داخلے میرٹ کے بجائے سفارش پر ہوتے ہیں امتحانات میں نقل اور جعلی اسناد اور ڈگریوں کا بازار سجا ہے جہاں ہر مضمون

پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی دستیاب ہے۔آزاد کشمیر کے ایک وزیر کو شائد اپنے تعلیمی بورڈ پر اعتماد نہ تھا کہ موصوف نے کراچی بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا جس میں سندھی زبان میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ موصوف کی قابلیت کا یہ حال ہے کہ سندھی زبان میں اردو بھی نہیں بول سکتے مگر سندھی ادب کے ماہر تصور کئے جاتے ہیں ۔آزاد کشمیر کے موجودہ وزیر تعلیم نے وزارت کا حلف اٹھاتے ہی اپنی مخالف برادریوں کے اُستادوں کو دوردراز علاقوں میں تبدیل کر دیا تاکہ یہ لوگ دور دراز پہاڑی علاقوں میں جانے سے قاصر رہیں اور اُنھیں نوکری سے برخاست کیا جا سکے۔

جس ملک میں اُستاد کی توہین اور علم کی تحقیر ہو وہاں ترقی اور خوشحالی کا تصور ہی محال ہے۔جس طرح علم کی روشنی پھیلانے کیلئے تعلیمی اداروں اور معیاری تعلیمی نظام کی ضرورت ہے اِسی طرح طالب علم کی اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے۔ علامہ مشرقی نے ملکہ برطانیہ سے ملاقات پر سوال کیا کہ ہر روز کئی اعلیٰ شخصیات آپ سے ملنے آتی ہیں کیا آپ بھی کسی کو ملنے جاتی ہیں ملکہ نے کہا کہ ہاں میں اپنے اُستادوں سے ملنے اُن کے گھروں پر جاتی ہوں جو مجھ پر فرض ہے۔ہمارے ہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی فقدان ہے۔ یہاں بوڑھے اُستادوں کی ٹانگیں توڑدی جاتی ہیں وہ پینشین کیلئے دفتروں کے دھکے کھاتے ہیں اور جو سروس میں ہیں وہ سیاستدانوں اور سکول مالکان کے ذاتی ملازم تصور

کئے جاتے ہیں۔۔برنارڈشا کہتا ہے کہ تعلیم کیلیے سکول،کالج اوریونیورسٹیاں قائم کرنا جس قدر ضروری ہے اسی قدر والدین اوراستادوں کاتربیت یافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔
تربیت کے بغیر تعلیم ایسے ہی ہے جیسے ذائقے کے بغیر خوشنما پھل۔اس لیے آنے والے انتخابات میں اپنے نمائندے چنتے وقت اپنی آنے والی نسل کی تعلیمی ضروریات کو بھی مدنظر رکھیں نہ کہ ذاتی اور وقتی مفادات کی خاطر اپنے ظمیر کو بیچ دیں۔

الیکشن کے بعد

صدر مملکت، وزیر اعظم اور آرمی چیف نے پانچ سالہ جمہوری دور کے خاتمے پر اطمنان کا اظہار کیا جبکہ چیف جسٹس آف پاکستان اور چیف آف آرمی سٹاف اس سے پہلے بھی جمہوری عمل کے تکمیل ہونے پر خوشی کا اظہار کر چکے ہیں۔ شیخ رشید نے بیماری کی حالت میں مبشر لقمان کے پروگرام میں شرکت کی اور نہ صرف صدر، وزیر اعظم، آرمی چیف اور جناب چیف جسٹس کو بلکہ چوہدریوں اور میاں برادران کو بھی مبارک باد دی کہ آپ سب اس ملک کی تباہی اور عوام کی بیخ کنی کے ذمہ دار ہیں۔ شیخ جی کا فرمان تھا کہ اگر میاں برادران صحیح اور سیاسی اپوزیشن کرتے تو ملک جس تباہی کا شکار ہوا شاید نہ ہوتا۔

گزرے ہوئے خوبصورت جمہوری دور میں ملک اندھیروں میں ڈوبا رہا عوام بجلی، پانی اور گیس کی سہولیات سے محروم رہے، سٹیل مل پی آئی اے اور ریلوے کے ادارے دیوالیہ ہوگئے۔ جعلی ڈگریوں اور بیرون ملک شہریت کے حامل اسمبلی ممبروں اور سینیٹروں نے خوب مال کمایا اور حکومت نے عدالتی فیصلوں کا تمسخر اڑایا اور احکامات کی پرواکیئے بغیر اپنی اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ ملکی صنعتیں تباہ ہو گئیں، ملک قرضوں کے بوجھ تلے دب گیا اور غربت، مہنگائی، بیماری، بھوک

اور بد امنی نے عوام کا بھرکس نکال دیا، جسم فروشی، منشیات فروشی، ذخیرہ اندوزی اور سمگلنگ جیسے گھناؤنے دھندے عروج پر رہے جسکی پشت پناہی میں عوام کی محافظ پولیس ملوث رہی۔ وزیر خارجہ اور وزیر خزانہ سمیت گورنر اسٹیٹ بنک بدلتے رہے جبکہ وزیر داخلہ ملکہ معظم کا وفادار، وائسرائے کی طرح پورے پانچ سال تک پاکستان پر حکومت کرتا رہا۔ ملک جلتا رہا، ملک چین کی بانسری بجاتا رہا اور ٹیلیوژن اینکروں کا جھتہ محفلیں سجاتا رہا۔ سیاسی جماعتوں سے وابستہ صحافی اور کالم نگار قصیدے اور نوحے لکھتے رہے عوام لٹتے اور پٹتے رہے۔ روحیں تڑپتی رہیں، جسم بکتے رہے، گھر جلتے رہے اور پاکستان کھپتا رہا، میاں صاحبان کی خاموشی، کائرہ کی بھڑکیں، صدر صاحب کی بھڑکیں چیف جسٹس اور آرمی چیف کی نصیحتیں مرتے، لٹتے ارو بکنے عوام کے کسی کام نہ آئیں۔ جمہور لٹ گئے، نظام پٹ گیا مگر جمہوریت کامیاب ہو گئی۔ سادہ لوح اور قریب المرگ لوگوں کو صدر، وزیر اعظم اور آرمی چیف نے مبارک دی مگر حیرت ہے کہ مرتے مرتے عوام نے یہ مبارک بھی قبول کر لی۔ رحمٰن ملک نے اعلان کیا ہے کہ آرمی چیف کو فیلڈ مارشل کا عہدہ دیا جائے۔ ہم نے کب انکار کیا ہے ؟ دے دو ! اگر رحمٰن ملک کو ہلال امتیاز اور ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری مل سکتی ہے تو چیف صاحب کو فیلڈ مارشل بنانے میں کیا حرج ہے۔ اگر سندھ اسمبلی کے ممبران اور وزیر اعلیٰ کو تاحیات سہولیات مل سکتی ہیں اور قائد اعظمؒ سے منسوب اداروں کو جناب بھٹو سے منسوب کیا جاسکتا ہے تو ایک عدد فیلڈ مارشل بنانے میں کیا حرج

ہے۔اگر ہلال پاکستان اور ہلال امتیاز ٹوکریوں کے حساب سے آئینی کمیٹی کے ممبران اور نوکرشاہی کے کارندوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں تو ایک فیلڈ مارشل بنانے سے کونسا نقصان ہوگا؟ اب پتہ نہیں کہ اندر کی بات ہے؟ یہ آئیڈیا ملک کا ہے یہ ملک الموت کا؟ ہوسکتا ہے کہ جناب زرداری نے فیلر فائیر کروایا ہوتا کہ فوج اور عوام کا ری ایکشن دیکھا جائے۔اگر حکومت چاہتی تو اسکا فیصلہ 16 مارچ کو سپیشل چھٹی کے دن کر سکتی تھی مگر ایسا نہ ہوا اور ملک کا بیان 17 مارچ کو آیا۔ بہر حال اس بیان کی بھی اہمیت ہے جسکا فیصلہ اب الیکشن کے بعد ہی ہوگا۔

عوام کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہوچکا اور خوب ہوا۔الیکشن کے بعد کیا ہوگا وہ بھی ضرور ہوگا اور اس سے بھی بُرا ہوگا۔ عوام ووٹ دیں نہ دیں الیکشن ہونگے مگر اس بار NRO کا مطلب ہے سیکرٹ گورننگ پلان۔اس SGPکے تحت ہونگے۔SGP کے تحت نہیں بلکہ ہوا تھا مگر طریقہ واردات ذرا مختلف NROگیم کے پلیئر بھی وہی ہیں جن کے درمیان اور تنظیم میں کچھ ردوبدل ہے۔ فوج پھر غیر جانبدار رہے گی اور فوجی ائر شایا برقرار رہے گا۔جناب افتخار چوہدری کی ریٹائرمنٹ کے بعد از خود نوٹس لینے کی رفتار کم ہو جائے گی جبکہ ماتحت عدلیہ اور انتظامیہ میں کرپشن کا گراف مزید بلند ہوگا۔بڑے بڑے مقدمات جو بڑے اور بُرے لوگوں کے خلاف قائم ہیں یونہی لٹکے رہینگے اور کسی کے خلاف فیصلہ ہو بھی گیا تو جناب صدر نہ

صرف سزائیں ختم کر دینگے بلکہ با عزت بری بھی کر دینگے۔اسطرح کی روایت پہلے قائم ہوچکتی ہے جب رحمٰن ملک کی صدر صاحب نے نہ صرف سزا معاف کی بلکہ بھگوڑے پن کو چھیٹوں میں بدل کر پنشن بھی دے دی۔

عدلیہ کے فیصلوں پر اب آنے والی حکومت بھی عمل نہیں کرے گی جبکہ عام اور غریب آدمی پر عدلیہ کی گرفت مزید سخت ہوجائے گی۔سیاسی جماعتیں اپنے ورکروں اور ہر سطح کے لیڈروں کا دفاع کرینگی جس کی وجہ سے لاقانونیت بڑھے گی۔قبضہ گروپ اور دیگر مافیا جات کی پوزیشن مستحکم ہوگی جو کہ ملک گیر تشدد، مہنگائی، عدم تحفظ اور فرقہ واریت کو نقطہ عروج تک لے جائیگی۔پولیس مافیا کی مددگار اور عام آدمی کیلئے خوف کی علامت بن جائے گی اور انصاف نام کی کوئی چیز اس ملک میں نہیں رہے گی۔لوگ

عدالتوں، کچہریوں اور انتظامیہ پر عوام اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے مافیا اور علاقائی غنڈوں کے رحم و کرم پر بھروسہ کرینگے۔آنے والے الیکشن کے نتیجے میں کسی ایک جماعت کی حکومت نہیں بنے گی اسلئے ہر بڑی جماعت اے این پی، ایم کیو ایم، ق لیگ اور جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمٰن کے سہارے کی محتاج ہوگی۔وزارتوں کی بندر بانٹ پہلے سے بھی زیادہ ہوگی اور ایک مفلوج اور ڈانواں ڈول حکومت پھر پانچ سال گزارے گی۔جماعت اسلامی اور تحریک انصاف کیا کرینگی یہ بھی ایک سوال ہے جسکا کوئی جواب نہیں پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت بنی تو کار کردگی پچھلے پانچ

سالوں سے بھی بدتر ہوگی بچا کھچا ملک مزید برباد ہوگا اور بچے ہوئے ادارے برباد ہو کر غیر ملکی کمپنیوں کے ہاتھوں فروخت ہوجائیں گے۔ بحریہ ٹاؤن جیسے اداروں کو کھلی چھٹی ملے گی اور بچی کھچی سرکاری زمینوں، شاملاتوں اور جنگلات کے ساتھ ساتھ عام آدمی کی پانچ دس کنال زمین بھی ہڑپ ہوجائے گی۔ پراپرٹی مافیہ کا اشتراک بڑھے گا اور غیر ملکی کمپنیوں کی شمولیت سے قبضہ گروپ نا قابل گرفت ہو کر عدالتی احکامات کی پروا نہیں کرینگے۔ پولیس ناکوں پر عوام سے بے عزت اور بے توقیر ہونگے اور پولیس کے سامنے اپنی جیبیں الٹ کر جان بچائینگے۔ با اثر شخصیات کی چٹ کے بغیر پولیس رپورٹ نہیں لکھے گی۔ چٹ کی فیس بھی بھاری ہوگی۔ مہنگائی اور غربت پر لوگ لکھنا اور بولنا چھوڑ دینگے اور عوام پھر بھی ایک زرداری سب پر بھاری اور اگلی باری کا نعرہ لگائینگے۔

ن لیگ کی حکومت بننے کی صورت میں خواجہ آصف، سعد رفیق، حنیف عباسی اور رانا ثناء اللہ اپنی توپوں کا رخ فوج کی طرف کرینگے جنھیں میاں نواز شریف کی بھرپور حمایت حاصل ہوگی۔ حکومتی بمباری سے فوج اور ن لیگ کا ٹکراؤ ہوگا جو کسی حادثے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ میاں نواز شریف سیکرٹ گورننگ پلان کے تحت زرداری حکومت کی پالیسیاں برقرار رکھنے کے پابند ہونگے جبکہ میاں شہباز شریف انکی مخالفت کرینگے۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں میں سے ایک میاں کی چھٹی

ہوجائے یا میاں ہاؤس تقسیم ہوجائے۔روحانیت کے طالب علموں کا خیال ہے کہ میاں نواز شریف اب اقتدار میں نہیں آئینگے اور ملک کسی بڑے حادثے کی صورت میں کسی ایسی قوت کے زیر اثر چلا جائے گا جو اس کی تعمیر و ترقی ایک نئے انداز اور نئے طریقہ کار سے کرے گی۔

آنے والے دور میں فوجی جرنیل تذبذب کا شکار رہینگے اور نئے جرنیل نئے چیلنجوں کا سامنا کرنے سے گریزاں رہینگے۔تذبذب اور ٹھہراؤ کی صورت میں بیرونی مداخلت بڑھے گی اور سیاسی لیڈر مداخلت کاروں کے ایجنٹ بن جائینگے۔روپے کی قدر 1980ء کے افغانی کے برابر ہوگی اور سمگلنگ کو تقریباً قانونی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔حکومت جیالی بنے یا متوالی ہر دو صورتوں میں قومی خزانہ خالی ہوجائے گا اور سرکاری ملازمین کو شائد تنخواہیں بھی نہ مل پائیں گی۔ یہ نقشہ حتمی نہیں بلکہ خفیہ حکمرانی کے منصوبے سے اخذ ہونے والے نتائج کا خاکہ ہے جس میں اہم رول امریکہ،برطانیہ، سعودی عرب اور امارات کا ہے۔زرداری حکومت نے ایران اور امارات سے قربت رکھی چونکہ امارات نے این آر او میں کلیدی رول ادا کیا تھا اور پیپلز پارٹی کا اصل ہیڈ کوارٹر بھی دبئ میں ہے۔ن لیگ کے حق میں فیصلے کی صورت میں امارات کا اثر کم اور سعودی عرب کا زیادہ ہوگا جس کی وجہ سے امارات کی کچھ ریاستوں اور ایران کے ساتھ تعلقات متاثر ہونگے۔ خارجہ پالیسی میں تبدیلی ممکن ہی نہیں جبکہ میاں

.برادران بھارت دوستی کے حق میں ہیں۔ اگر میاں .برادران نے بھارت کیساتھ تعلق قائم کیا تو آزاد کشمیر میں ن لیگ ختم ہوجائے گی اور سردار عتیق اور میاں .برادران کے تعلقات بحال ہوجائینگے۔ مقبوضہ کشمیر کے حالات بدتر ہونگے اور بھارت تحریک آزادی کو کچلنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ بھارت کے ساتھ دوستی کی صورت میں مسئلہ کشمیر پیچیدگی کا شکار ہوگا اور پاکستانی معیشت .برباد ہوکر بھارتی رحم و کرم پر چلی جائے گی۔ افغانستان پر امریکہ اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرے گا اور کسی نہ کسی صورت وہاں موجود رہے گا۔ بھارت، اسرائیل اور امریکہ افغانستان میں کوئی نئی چال چلیں گے جس سے پاکستان .براہ راست متاثر ہوگا پاک چین تعلقات میں بھی جمود رہے گا چونکہ میاں .برادران کا رجحان مغرب، امریکہ اور مڈل ایسٹ کی جانب رہیگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میاں .برادران پہلی ہی فرصت میں بھارت کو پسندیدہ ترین ملک قرار دے دیں اگر یہ نہ ہوا تو یہ کام زرداری صاحب کرینگے کیونکہ سکرپٹ میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ پاکستان کو کسی نہ کسی صورت بھارت کی بالادستی قبول کروائی جانی ہے۔ قدرت کو کیا منظور ہے اور آسمانی فیصلے کیا ہونگے یہ رب کو ہی پتہ ہے۔ ہوسکتا ہے سب کچھ پل بھر میں چکنا چور ہوجائے یا پھر وہ لوگ اور حکومتیں جو منصوبے بنارہی ہیں خود ہی نہ رہیں۔ حادثات، آفات اور عذاب پہ نہ امریکہ کا کنٹرول ہے اور نہ ہی زرداریوں، بٹوں اور حواجوں کا۔ روحانی اور

ناسوتی قوتوں کے اپنے اپنے طریقے ہیں جبکہ ٹکراؤ کی صورت میں ناری اور ناسوتی قوتیں ہمیشہ ہی شکست خوردہ ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں۔

اس ملک میں اچھے، بااصول اور باکردار لوگوں کی کمی نہیں مگر عوام کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک اچھے، باکردار، بااصول اور عالم شخص کے پاس وسیع بنگلے، غنڈے، قبضہ گروپ کے سرغنے، کلاشنکوف بردار کن ٹٹے، بڑی قیمتی گاڑیاں، بیرون ملک جائیدادیں اور بھاری فیسوں والے اعلیٰ قانون دانوں اور ماہرین کی ٹیمیں نہیں ہوتیں۔ کوئی ایس ایم ظفر، بابر اعوان، وسیم سجاد، عاصمہ جہانگیر، اعتزاز احسن، ملک قوم، حفیظ پیرزادہ اور حامد خان ہمہ وقت ان کے کیسوں کی پیروی کیلئے بیتاب نہیں ہوتا۔ عوام کو ایسا لیڈر چاہیے جو ان کا بُرکس نکالے، ذلت ورسوائی کا سامان مہیا کرے، اپنے در پر ناک رگڑوائے، ان کے بچوں کو جاہل اور اجڈ رکھے، انھیں بینظیر انکم سپورٹ اور بیت المال سے خیرات دے اور ان کی عزت نفس کا جنازہ نکال کر ان سے ووٹ بھی لے۔ الیکشن کے بعد ایسے ہی لوگ حکومت کرنے آئینگے بلکہ انھیں میں سے آئینگے جو ابھی گئے ہیں چونکہ یہ جمہور کی ڈیمانڈ ہے

مر مر اک بناون شیشہ تے مار وٹہ اک پن دے
دنیا اتے تھوڑے ہوندے قدر شناس سخن دے

آسان الیکشن کا کامیاب نسخہ

ایک خبر کے مطابق پاکستان کے قبائلی علاقوں، کوئٹہ اور کراچی کے کچھ حصوں میں الیکشن کے مسائل پیش آ رہے ہیں۔ امید واروں کو خطرہ ہے کہ ان کے ووٹر اور سپوٹر دہشت گردی کا نشانہ بن سکتے ہیں اور خود امیدواروں کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ ان علاقوں میں جلسے جلوس یا پھر کارنر میٹنگ کرکے اپنے ووٹروں کے سامنے اپنے منشور رکھیں۔

ووٹروں سے رابطہ، جلسے جلوس اور منشور ایک رسمی بات ہے جسکے ذریعے امیدوار ووٹروں پر دھاک بٹھاتے اور اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے ایجنٹ اور گماشتے لوگوں کو جبری ان جلسے جلوسوں میں شامل کرتے ہیں اور امیدواروں سے جو مستقبل کے وزیر مشیر ہوتے ہیں سے داد وصول کرتے ہیں۔ ان جلسوں جلوسوں میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اوّل مزدور، مزارے اور پیروں، فقیروں، گدی نشینوں اور مخدوموں کے مرید۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جنکا تعلق امیدوار کی برادری سے ہوتا ہے۔ جلسے جلوس اور میٹنگ وغیرہ میں نہ جانے سے خاندانوں اور برادریوں کے اندر اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، رشتے ٹوٹ جاتے ہیں، کاروبار اور گھر تباہ ہو جاتے ہیں اور نوبت قتل اور اغواء تک جا پہنچتی

ہے۔ تیسری قسم پارٹی ورکروں اور نظریاتی ووٹروں کی ہوتی ہے جنکی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔

قبائلی علاقوں کا نام ہی قبائلی ہے ورنہ سارا پاکستان ہی قبائلی علاقہ ہے۔ لوگ برادریوں قبیلوں، فرقوں، لسانی طبقوں اور علاقائی رسموں میں بٹے ہوئے ہیں اور مجبوراً ووٹ، دیگر غنڈہ عناصر اور جبر کا دوسرا نام ہے جسکی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ پاکستان اور ملحقہ علاقے جنھیں آزاد کشمیر کہا جاتا ہے میں ہر انتخابی حلقہ ایک الگ حکومت اور ریاست ہے۔ جمہوری جبر کی صورت میں ممبر قومی وصوبائی اسمبلی، سنیٹر اور ممبر قانون ساز اسمبلی حلقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ پٹواری ان کی مرضی سے زمینوں کے ریکارڈ بدل کر مالک کو مزارعہ اور مزارعے کو مالک بنادیتے ہیں۔ سو سالہ ریکارڈ غائب کر دیتے ہیں اور زمین کی ہیت بدل کر لوگوں کو سیاستدان کے قدموں پر جھکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تھانے دار اور عدالتی کارندے شریف خاندانوں اور افراد پر ایسے ایسے مقدمے قائم کرتے ہیں کہ عدالتیں اور جج بھی سزا دینے کے علاوہ مظلوم کی فریاد سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ اعلیٰ عدلیہ میں اپنی مرضی کے جج تعینات کروائے جاتے ہیں جو ماتحت عدلیہ کو بھی کنٹرول کرتے ہیں اور سیاستدانوں کی ہر خواہش کی تکمیل کے لیے معاون اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ پولیس اور ضلعی انتظامیہ جن میں کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور تحصیلدار وغیرہ شامل ہیں ہمہ وقت

سیاستدانوں کی ٹیلیفون کالز کے منتظر رہتے ہیں۔ قتل جیسے مقدمات کی ایف آئی آر سیاستدانوں یا پھر ان کے ایجنٹوں سے پوچھ کر درج کی جاتی ہیں اور ان کی مرضی کے مطابق ہی تفتیش اور فیصلے سنائے جاتے ہیں۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں زندہ رہنے کے لیے سیاستدانوں، سیاسی گھرانوں اور ان کے ایجنٹوں کی غلامی ضروری ہے۔ آجکل پاکستان میں الیکشن کا غوغہ ہے مگر سب کو پتہ ہے کہ این آر او کے تحت کس کس جماعت نے بندر بانٹ کرنی ہے اور بچے کچے خزانے اور وسائل کو کس طرح لوٹنا ہے۔ آنے والوں نے جانے والوں کو ایگزٹ روٹ فراہم کرنا ہے اور ان کا کھایا پیا قومی مفاد میں ہضم کروانا ہے۔ اب یہ بھی طے ہے کہ کوئی سیاسی حکومت کسی دوسرے سیاستدان کے جرائم اور کرپشن کو نہ چھیڑے گی اور حکومت اور اپوزیشن ملکر کھاؤ اور مٹی پاؤ فارمولے پر کام چلائیں گی۔

پاکستان میں الیکشن کمیشن کا ریکارڈ اور فہرستیں کبھی درست نہیں ہوتیں مگر برادریوں کی لسٹیں اور فرقوں کے رجسٹر ہمیشہ اپ ٹوڈیٹ ہوتے ہیں۔ پاکستان میں شمال سے شروع کریں تو شمالی علاقوں میں شیعہ، سنی، نور بخشی اور اسماعیلی فرقوں کے سبھی افراد رجسٹرڈ ہیں اور ہر فرقے کے پاس موت، پیدائش، زن و مرد کا ریکارڈ موجود ہے۔ انتخابات ہوں یا انتشار ہر شخص کو اپنے قائد اور لیڈر کے حکم کے مطابق حصہ ڈالنا ہوتا ہے۔

اسماعیلیہ فرقے کے لوگ دنیا میں جہاں بھی ہیں اور جس حال میں ہیں ان کے قائدین کو سب کی خبر ہے۔ اسماعیلیہ

یعنی آغا خان فاؤ ڈیشن دنیا کی چند ایسی ویلفیئر سوسائیٹیوں میں شمار ہوتی ہے جو اپنے ہم عقیدہ لوگوں کی پیدائش سے لیکر موت تک خیال رکھتی ہے اور ہر طرح کی مدد اور دیکھ بھال بھی کرتی ہے۔ شمالی علاقوں میں جلسے جلوس نمائیشی ہیں اصل بات لیڈر کا حکم ہے اور عوام اس حکم کی تعمیل میں ووٹ ڈالتے ہیں۔

پاکستان میں شیخ ، اعوان ، قریشی ، ہاشمی ، گجر ، سید اور سدھن (سدوزائی) اقوام بھی رجسٹرڈ ہیں اور ان کی تنظیموں کے دفاتر میں انکا ریکاڈ اپ ٹوڈیٹ رکھا جاتا ہے۔ لاہور میں اعوان سوسائیٹی اور پشاور میں امین کالونی میں اعوانوں اور اسماعیلیہ قبیلے اور فرقے کے علاوہ کوئی دوسرا قبیلہ فرقہ رہائیش پذیر نہیں ہوسکتا۔ جس ملک میں قبیلے ، برادریاں اور فرقے رجسٹرڈ ہوں اور ایک حکم ، عصبیت اور ڈسپلن کے پابند ہوں وہاں الیکشن پر اخراجات کا ڈھونگ سمجھ نہیں آتا۔ سندھ میں گدی نشین پیر ، مخدوم ، جاگیر دار ، نواب ، وڈیرے ایک طبقہ ہیں اور بہت سوں کی باہم رشتہ داریاں بھی ہیں۔

اندرون سندھ دوسرا طبقہ مزارعین ، مریدین اور ہاریوں کا ہے۔ یہ لوگ طبقے کے جدی پشتی غلام اور رجسٹرڈ ووٹر ہیں جو بڑے سائیں کی کسی صورت حکم عدولی نہیں کر سکتے ۔ سندھ کے شہر وں میں ایم کیوایم اور اے این پی کے علاوہ جماعت اسلامی اور سنی اتحاد بھی سر گرم عمل ہے مگر اصل قوت ایم کیو ایم اور اے این پی کے پاس ہے۔

دونوں بڑی قوتوں کے ووٹر رجسٹرڈ اور حکم کے تابع ہیں اور اس حکم کی بجاآوری میں ان کی زندگی، کاروبار، عزت وآبرو کی ضمانت ہے۔ بلوچستان پہلے سے تین حصوں میں تقسیم ہے۔ ساراوان اور جھالاوان کے نوابین اور سرداروں کا اثر کسی صورت ختم نہیں ہوسکتا اور سیاسی جماعتیں ان ہی کی مرضی کے امیدوار میدان میں اتارتی ہیں ۔ پشتون ایریا میں صرف پشتون ہی جیت کر آتا چاہئے اسکا تعلق پختون خواہ ملی پارٹی سے ہو یا جمعیت علماء اسلام سے۔ پختون بلٹ میں کوئی بلوچ آباد نہیں ہو سکتا اور نہ بلوچ علاقوں سے پشتون امیدوار سامنے آتا ہے۔ پنجاب میں رجسٹرڈ برادریوں کے علاوہ کاروباری طبقے، پیر، مخدوم، جاگیردار اور ریٹائیرڈ بیوروکریٹ سیاسی وزن رکھتے ہیں۔ خیبر پی کے میں رجسٹرڈ برادریوں کے علاوہ تقریباً آدھی افغان آبادی نے ووٹر لسٹوں میں نام درج کروا رکھا ہے اور انہیں مختلف قبائل اور سیاسی پارٹیوں کی حمائت حاصل ہے۔ دستوخیل، ہزار بنر اور مہمند قبائل نے پاکستانی شہریت اور نادرہ کے کارڈ بھی بنوا رکھے ہیں ۔ ان قبائل پر جناب شیرپاؤ کی وزارت داخلہ مہربان رہی اور وطن عزیز کو لاکھوں نئے پاکستانی عطا کردیئے۔ آزاد کشمیر میں ہونے والے انتخابات اور پیپلز پارٹی کی کامیابی کا سہرا جناب قمر زمان کاہرہ اور منظور وٹو کے سر ہے۔ آزاد کشمیر کے لوگ کاہرہ پلان اور وٹو ایکشن کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ آزاد کشمیر کے بعض حلقوں میں ووٹروں کی کل تعداد اگر چالیس ہزار تھی تو پیپلز پارٹی کے امیدواروں کو تقریباً چالیس ہزار یا اسکے قریب

قریب ہی ووٹ ملے جبکہ مختلف امیدواروں کو بھی پچیس تیس ہزار ووٹ ملے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کل ووٹوں کی تعداد ساٹھ ہزار بن جاتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ رجسٹرڈ ووٹوں کے علاوہ بیس ہزار ووٹ کہاں سے آئے؟

ان ڈھونگ انتخابات کے بعد ٹی وی کے ایک پروگرام کے میزبان نے کاہراہ.برادری کے ایک کامیاب امیدوار سے سوال کیا کہ جناب لگتا ہے آپ کے حلقے میں پچھلے پانچ سالوں میں نہ کوئی مرا ہے نہ پیدا ہوا ہے، نہ باہر نوکری پر گیا ہے اور نہ بیمار ہوا ہے چونکہ جتنے رجسٹرڈ ووٹ آپ کے حلقے میں تھے وہ آپ کو ملے ہیں۔ موصوف نے ڈھٹائی سے کہا جناب یہ میری.برادری کا مجھ پر اعتبار ہے۔ پھر سوال ہوا کہ آپ کے مخالف امیدوار کو بھی آپ کے قریب قریب ہی ووٹ ملے ہیں۔اسطرح ووٹوں کی تعداد پچاس فیصد سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ اگر مخالف فریق کے ووٹوں کو رجسٹرڈ ووٹوں کے تناسب سے درست تسلیم کیا جائے تو آپکے لیے صرف پانچ ہزار ووٹ بچتے ہیں۔ اسپر امیدوار نے فرمایا جناب یہ میری.برادری کا مجھ پر اعتماد ہے۔ اس طرح اسی.برادری کے ایک اور امیدوار کو بارڈر ایریا کے حلقے میں کھڑا کیا گیا جو کہ اس امیدوار کا آبائی حلقہ نہیں تھا۔ اس امیدوار کو بھی ریکارڈ ووٹ ملے اور کاہرہ.برادری نے ہر جانب فتح کے جھنڈے گاڑھ دیئے۔ قمر زمان کاہرہ میر باز کیھتران کے بعد دوسرے وزیر.برائے غلامان کشمیر ہیں جو اپنی.برادری اور پارٹی کے علاوہ دیگر سیاستدانوں

کے لیے توھین آمیز اور دھمکی آمیز رویہ رکھتے تھے۔ آپ نے آزاد کشمیر کے وزیر اعظم کو دھمکی دی کہ میں تمہیں وزیر امور کشمیر بن کر دیکھاؤ نگا اس کے علاوہ انکا دفتر .برادری آفس کا کام کرتا تھا یا پھر پیپلز پارٹی والوں کو ان تک رسائی حاصل تھی ۔ آزاد کشمیر میں کاہرہ پلان کے تحت ہونے والے انتخابات میں خود چیف الیکشن کمشنر کا ووٹ بھی جعلی کاسٹ ہوا۔ دھاندلی اس انتہا کی ہوئی کہ سابق وزیر اعظم جناب سردار عتیق احمد خان نے پریس کو بیان جاری کیا کہ چیف الیکشن کمشنر کو اس دھاندلی کے جرم میں ہر حلقے میں لے جا کر پھانسی دی جائے۔

جسطرح جناب کاہرہ نے اپنی .برادری کی خدمت کی ہے اب .برادری پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسکا بدلہ چکائے۔ اب تیس لاکھ رجسٹرڈ کشمیری اور اتنے ہی غیر رجسٹرڈ اور حسب ضرورت مردہ ووٹر پاکستان آکر ووٹ ڈالینگے اور کاہرہ پلان کا دوسرا حصہ مکمل ہوگا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے اربوں روپے کا بیل آؤ ٹ پیکج پہلے ہی آزاد حکومت کو دیا جا چکا ہے جبکہ پاؤ نڈ اور ڈالر مافیا بھی اس کار خیر میں حصہ لے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اگر سارے کام مافیا جات نے کرنے ہیں ،.برادریوں ، قبیلوں ،لسانی اور علاقائی گروپوں کے علاوہ فرقوں اور مسلکوں کے تحت ووٹ ڈالے جانے ہیں اور ہر کام ایک حکم ، ایک تعصب اور جبر کے تحت ہونا ہے تو پھر الیکشن کا ڈھونگ رچا کر سرکاری خزانے سے اربوں روپے

خرچنے اور عام آدمی کی جیب کاٹنے کا کیا فائدہ ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ جناب قمر زمان کاہرہ اور منظور وٹو کے کشمیر فارمولے کو حکومتی سطح پر سٹڈی کیا جائے اور ہر برادری، قبیلے، فرقے، مسلک، زبان اور علاقے کے ان افراد پر حکومت بنائی جائے جو ان قبیلوں، فرقوں، مسلکوں، زبانوں اور علاقوں کے عوام پر کنٹرول رکھتے ہیں اور جن کی مرضی سے عوام جیتے اور مرتے ہیں۔

دیہاتوں میں بولی جانے والی بولیاں بڑی ہی با معنی ہوتی ہیں مگر دیہات کے لوگ نہ ان پر عمل کرتے ہیں اور نہ ہی یہ بولیاں بولنے سے باز آتے ہیں۔ اگر دیہات کے لوگ عقل و فہم سے بھرپور ان فقرات کی تماثیل پر عمل کرتے تو کوئی چوہدری، ملک ،راجہ اور خان کے ووٹوں سے الیکشن جیت کر نوٹ نہ کماتا اور نہ ہی وہ استحقاق کے گھمنڈ اور پروٹوکول کی آڑ میں تکبر کی آخری حد کو چھوتا دیہاتی عوام کو فریب دینے میں کامیاب ہوتا۔

اگر دیہات میں کسی کا جرم کسی دوسرے کے سر تھوپ دیا جائے تو دیہات کی عورتیں فوراً بول اٹھتیں ہیں ”ہائے اللہ جی خصم کرے نانی تے چٹی دھوترے نوں“یعنی کرے کوئی اور بھرے کوئی اسی طرح اگر کوئی شخص حرام کی کمائی پر عیش کرے تو کہا جاتا ہے ”چوراں نے کپڑے تے ڈانگاں نے گز“۔ چور جب لوٹ کا مال تقسیم کرتے ہیں تو گز یا میٹر سے نہیں بلکہ ڈانگوں (چھڑی) سے پیمائش کرتے ہیں۔ ہماری سیاست میں دیہاتی ضرب المثل کے کئی نمونے موجود ہیں مگر سیاستدان اسطرف متوجہ نہیں ہوتے۔ دیہاتوں میں بچے کی پیدائش کے بعد نام رکھنے کا مرحلہ آتا ہے تو اکثر لوگ علمائے کرام، مولوی صاحبان یا پھر اپنے پیرو مرشد سے رابطہ کرتے ہیں تاکہ وہ ایسا نام تجویز کریں جو برکت کا باعث ہو۔ لڑکوں

کے نام اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں سے چنے جاتے ہیں یا پھر پیغمبروں اور رسولوں کے ناموں پر نام تجویز کیئے جاتے جاتے ہیں۔ علمائے کرام کا کہنا ہے کہ رحمٰن، رحیم اور قیوم نام نہ رکھا جائے تو بہتر ہے چونکہ یہ اوصاف صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہیں۔ کوئی انسان رحیم، رحمان اور قیوم نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ نام رکھنے ہی ہوں تو عبد الرحیم، عبد الرحمٰن اور عبدالقیوم نام رکھے جائیں اور پھر احتیاط کے ساتھ انھیں اس طرح لکھا اور پکارا جائے۔ ہمارے معاشرے میں اکثر نام بگاڑے جاتے ہیں یا پھر ایسے ناموں کے حامل اشخاص اپنی کوتاہ اندیشیوں اور کم فہمیوں کی بنا پر بد نام ہو کر عوام الناس کے فیض و غصب کے نشانے پر آ جاتے ہیں۔ لوگ ان کے ناموں کو بگاڑتے اور نام لیکر گالیاں دیتے ہیں۔ ایسے ناموں کے حامل اشخاص پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی خصلت کی مناسبت سے نام بدل لیں اور اپنے گناہوں میں اضافہ نہ کریں۔ ہمارے اہل علم بھی اکثر جاہلیت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے ناول
نگار، ادیب، دانشور، شاعر اور ڈرامہ نگار اپنی تحریروں میں فضل الرحمٰن یا فضل دین کو فضلو بابا لکھتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ لکھنے سے بھی یہ لوگ اکثر عاری رہتے ہیں اور اللہ میاں لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ میاں لگانے والوں میں اکثریت پنجابی اہل علم و قلم کی ہے چونکہ پنجاب میں ہر پیسے والا میاں کہلواتا ہے۔ ان میاں صاحبان کی ذات، قوم یا قبیلہ کیا ہوتا ہے اسکا کسی کو علم نہیں ہوتا مگر کاروبار اور ظاہری چمک دمک والے صاحبان میاں ضرور بن جاتے ہیں۔

اب جناب عبدالرحمٰن ملک کو ہی لیں۔ہمارے ہاں ان کی برادری والے کھوکھر کہواتے ہیں جبکہ پاکستان میں ملک کا اضافہ اعوانوں کے نام کے ساتھ ہوتا ہے۔جناب عبد الرحمان اعوان تو نہیں مگر ملک ضرور ہیں جس پر محترمہ فردوس عاشق اعوان نے بھی کبھی اعتراض نہیں کیا۔جناب عبدالرحمٰن کا نام عامر لیاقت نے تبدیل کیا ہے جبکہ جناب زرداری صاحب کے کاغذات میں وہ رحمٰن ملک ہی ہیں۔ملک صاحب نے اپنے پانچ سالہ اقتدار میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے اسکی وجہ سے وہ انتہائی ناپسندیدہ شخصیت قرار پائے ہیں اور عوام الناس انکا نام سنتے ہی ان پر لعن طعن ہی نہیں کرتے بلکہ ڈیزی کٹر قسم کی کاٹ دار گالیاں بھی سناتے ہیں کسی دور میں کامریڈ نجیب اللہ افغانستان کے وزیر داخلہ اور خاد کے چیف ہوتے تھے۔ان کی عادات بھی ہمارے ملک صاحب سے ملتی جلتی تھیں جس بنا پر لوگ ان کا چہرہ دیکھتے ہی مرگ بہ نجیب اور مادر سوختہ یا پدر سوختہ کہہ کر ٹیلی وژن بند کر دیتے تھے ڈاکٹر نجیب کو عوامی نفرت کا احوال معلوم ہوا تو خار حرکت میں آ گئی۔ہر سکول میں خار کا ایک ایجنٹ بیٹھ گیا جو صبح سویرے افغان بچو ں سے پوچھتا کہ جب کامریڈ نجیب کی تصویر ٹیلوژن پر نظر آتی ہے تو تمھارے والدین کیا کہتے ہیں معصوم بچے بتا دیتے کہ وہ نجیب پر لعنت بھیجتے ہیں اور گالیاں دے کر ٹیلی وژن بند کر دیتے ہیں بس پھر ماں باپ کی شامت آ جاتی اور اکثر بل چرخی جیل یا پھر نظارت خانہ پہنچ جاتے۔جناب زرداری کو چاہئے کہ وہ ڈاکٹر ملک کا نام بھی بدل دیں چونکہ رحمٰن صرف اللہ کی صفت ہے جبکہ اللہ کی مخلوق پر ظلم کرنے والا شخص الٰہی صفات کا حامل نہیں ہو سکتا۔کہتے ہیں کہ ملک امیر محمد خان کے دور گورنری میں اعوانوں کے علاوہ کوئی

دوسری قوم ملک کا اضافی حصہ نام کے ساتھ نہ لگاتا تھا۔ کیمبل پور، جہلم اور میانوالی کے اعوان دو نمبری ملکوں کو پہچان جاتے تھے اور ایسے ملکوں کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ حیرت ہے کہ ملک امیر محمد خان کے پوتے ملک عماد پیپلز پارٹی میں بھی ہیں اور عبد الرحمٰن ملک کے دوست بھی ہیں۔ حیرت ناک بات یہ بھی ہے کہ ملک امیر محمد خان نے برطانیہ اور امریکہ میں بھی اپنا شملہ اونچا رکھا۔ ملکہ برطانیہ اور امریکی صدر کے سامنے بیٹھ کر سنت طریقے سے ہاتھ دھو کر کھانا کھایا۔ امریکی صدر نے پوچھا کہ جناب پاکستان میں کتے کیا کھاتے ہیں تو ملک امیر محمد نے کہا چکن چپس، چونکہ اسوقت امریکی صدر چکن چپس کھا رہا تھا۔ اپنے بیرونی دوروں میں ملک امیر محمد خان نے ملکہ برطانیہ اور امریکی صدر کی بیوی کے علاوہ کسی گوری کو ہاتھ نہ ملایا جبکہ ان کا پوتا انجلینا جولی کے قدموں میں ڈھیر ہوگیا۔

کہتے ہیں کہ اولاد صدقہ جاریہ ہے۔ اولاد کے اچھے کام والدین کی بخشش کا وسیلہ بنتے ہیں مگر ہماری اشرافیہ اس سے مبرا ہے۔ جنرل پرویز نے اپنی کتاب ''ان دی لائن آف فائیر'' میں لکھا ہے کہ ان کے والد سید مشرف وزارت داخلہ میں اکاؤنٹنٹ تھے جبکہ میڈیا اور حکومت نے بیچارے سید مشرف کو جنرل مشرف بنا دیا ہے۔ جنرل پرویز کو چاہیئے کہ وہ ایک پریس کانفرنس کریں یا پھر اخبار میں اشتہار دیں کہ وہ جنرل مشرف نہیں بلکہ پرویز ہیں۔ عوام کو جو کچھ کہنا ہے وہ مجھے جنرل پرویز کو کہیں اور میرے والد مرحوم سید مشرف کو معاف کریں۔ میں اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا خود ذمہ دار ہوں جبکہ

میرے مرحوم والد کو خواہ مخواہ جنرل بنا کر رگڑا جا رہا ہے۔
جنرل پرویز چونکہ سید زادے ہیں اسلئے انھیں پرویز نام بھی سوٹ نہیں کرتا۔ پرویز اسلامی نام نہیں اور جس ایرانی بادشاہ نے حضور ﷺ کا خط پھاڑ کر پھینک دیا تھا اسکا نام بھی پرویز ہی تھا اگر جنرل پرویز واقعی سید ہیں تو وہ دشمن رسول ﷺ کا نام کیوں اٹھائے پھرتے ہیں البتہ ان کے مشاغل پرویزی ہی ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ انکا نام اسی مناسبت سے رکھا گیا ہو پرویز کا مطلب فاتح ہے چونکہ ایرانی نام ہے۔ زمانہ قدیم میں جب کوئی بادشاہ تخت کیان پر بیٹھتا تو اسے پرویز یعنی فتح کرنیوالے کے لقب سے نوازا جاتا۔ جنرل پرویز نہ تو کیانی ہیں اور نہ ہی فاتح بلکہ وہ اخلاقی لحاظ سے ایک شکست خودہ شخصیت کے حامل ریٹائرڈ جرنیل ہیں جنکی جرنیلی نے اٹھارہ کروڑ مسلمانوں کو بھی شکست خودہ کر دیا۔ سکندر نے تخت کیان کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور کیانی جرنیل اور شہزادے میدان جنگ میں مارے گئے مگر سکندر کے ساتھ این آر او کا ڈرامہ رچا کر یونان میں کوئی محل نہ بنایا اور نہ ہی یونانیوں کے سامنے جھکے۔
جنرل اشفاق پرویز کیانی کو پرویز نام اچھا لگتا ہے چونکہ وہ کیانی بھی ہیں اور فاتح سوات بھی جہاں طالبان کے لبادے میں ساری دنیا کے دہشت گرد سکندر کے راستے پر چلتے پاکستان پر حملہ آور ہوئے اور پھر جنرل کیانی کے ہاتھوں شکست کھا کر نیست و نابود ہوگئے۔ جنرل کیانی آج بھی عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں اور ساری

قوم کی مدد و حمایت کے ساتھ اپنے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ وہ اخبارات، رسائل اور ٹیلیویژن اینکر جو جنرل مشرف کی واپسی پر طرح طرح کے کالم اور خبریں شائع کر رہے ہیں اور مختلف چینلوں پر جنرل مشرف کو اچھا یا برا کہہ رہے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ مشرف کے بجائے اپنی توپوں کا رخ جنرل پرویز کی طرف رکھیں اور بیچارے مرحوم سید مشرف کو معاف کر دیں۔ انکا قصور اتنا ہی تھا کہ ان کے گھر جنرل پرویز پیدا ہوا جو ان کے لئے اجر و ثواب کا باعث نہ بن سکا۔

راجپوتوں والی کوئی بات؟

ہر خاندان اور قبیلے کے کچھ اوصاف ہوتے ہیں جس بنا پر قبیلہ، خاندان یا برادری پہچانی جاتی ہے۔جوں جوں وقت گزرتا ہے حالات بدل جاتے ہیں اور خاندانی اور قبائلی عصبیت میں بھی کمی آجاتی ہے۔وہ لوگ جو عصبیت کے قائل ہوتے ہیں وہ اپنی روایات سے جڑے رہتے ہیں جس بنا پر انھیں نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔مادیت کا غلبہ،اخلاقیات میں گراوٹ، ہوس و لالچ میں اضافہ اور دیگر قبائل میں شادیاں، خاندانی، قبائلی اور علاقائی عصبیت میں بھی کمی کا باعث بنتی ہیں۔ موجودہ افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقے جنھیں فاٹا کہا جاتا ہے کبھی خراسان کہلاتے تھے۔ان علاقوں میں بسنے والوں کی خصوصیت میں مہمان نوازی، عورت کی عزت ارو بچوں کی حفاظت شامل تھی۔قبائل ایک دوسرے کی عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہ اٹھاتے تھے اور دنیا کے کسی کونے سے اجنبی شخص ان کے علاقہ میں داخل ہو جائے اسے مہمان تصور کیا جاتا تھا۔مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ اوصاف ختم ہوگئے اور آجکل ان علاقوں سے گزرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔عورتیں اور بچے اغواء کرائے جاتے ہیں اور اغواء کار انھیں فروخت کردیتے ہیں۔

تاریخ کے مطابق عرب قبائل وحشی اور خونخوار تھے۔اسلام کی روشنی کے باوجود

عرب میں جہالت کے اندھیرے چھائے رہے اور بدو قبائل نے بردہ فروش اور ڈاکہ زنی کی روایات کو قائم رکھا۔یہی حال پاکستان کے شمالی علاقوں اور چترال کا تھا۔عرب قبائل، حیران منندہ اور مہتران چترال مسافروں اور قافلوں کے علاوہ حجاج کرائم اور زائرین کو بھی لوٹتے اور قتل کرتے تھے۔عربوں کا احوال ابن خلدون نے اپنے شہرہ آفاق مقدمہ میں درج کیا ہے جبکہ معنزہ اور چترال کا ذکر مشہور مورخ اور سکالر پیٹر ہوپ کرک نے اپنی تصنیف گریٹ گیم بائی سیکرٹ سروس ان ہائی ایشیاء میں کیا ہے۔مصنف کے مطابق میر آف ہنزہ کی آمدنی کا بڑا ذریعہ قافلوں کو لوٹنا تھا جبکہ والئی چترال اپنی ہی ریاست سے خوبصورت لڑکوں کو اغواء کروا کر خیوا کے سرداروں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا حالات بدلے تو ہنزہ کا میئر اور چترال کا میئر بے حیثیت ہو گئے جبکہ بہاولپور کے نواز اور سوات کے والی کو عدل و انصاف اور رعایا پروری کے صلے میں آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔پروفیسر نذیر احمد تعشنز ،راجہ خضر اقبال،کبیر خان،یوسف صراف عارف شاہد، صغیر قمر،وجاہت مسعود بلوچ،پٹھان، سندھی اور پنجابی گوانوں، خاندانوں، گوتوں، برادیروں اور قبیلوں کی اپنی اپنی تاریخ،روایات اوراقدار ہیں جنکا ذکر تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ سر لیفیپل گرفن نے پنجاب کی ذاتوں اور گھروں پر نایات تحقیق کی ہے جبکہ سر چارلس ن نیپئیر اور الگزنڈر برن نے سنڈی قبائل پر بھرپور تحقیق کی ہے۔برن نے اپنی کتاب "ٹریول ان ٹو بخارا" میں دلکش انکشافات کیے ہیں برن کے مطابق سندھی عوام انتہائی تابعدار

اور مظلوم قوم تھے اور خورص بے انتہا ظالم، متکبر اور بے انصاف طبقات پر مشتمل تھے سندھ میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔اور والیان ریاست ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے ایک بات جس پر برن حیرت زدہ تاھ وہ یہ تھی کہ سوارے امیر اور والی ملکہ معظم سے وفاداری حتیٰ کہ غلام کی حدتک دستی کے متمنی تھے برن لکھتا ہے کہ ان لوگوں کو پتہ ہی نہ تھا کہ میں برٹش سروے اتھلیٹمنٹ کا ایک معمولی کپتان ہوں اور برٹش انڈین پولیٹکل سروس کا ملازم ہوں میرا کام دریائے سندھ کی ریکی کرنا اور ہندوستان کے سب سے بڑے مہاراجہ اور طاقتور حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار تک رسائی حاصل کرنا تھا۔

دنیا میں سب سے زیادہ تحقیقی کام کشمیری اقوام پر ہوتا ہے اس سلسلہ کی سب سے بڑی تحقیق پنڈت کلہن کی ہے جو مشہور زمانہ تاریخ راج ترنگی کے مصنف ہیں یہ تحقیق زمانہ قبل از مسیح کی ہے جسے دنیا کو کوئی مورخ چیلنج نہیں کر سکا۔ کشمیری اقوام اور قبائل پر سات سو سے زیادہ مورخین نے کتابیں لکھیں جن میں محمد دین فوق مصنف تواریخ اقوام کشمیر اور تاریخ اقوام پونچھ، مولوی حشمت اللہ، مولانا محمد حسین آزاد دہلوی، سر والٹر لارنس، سر لیبل گرفن، پنڈت دیناناتھ مدن، پنڈت راجانک رتن کنٹھ، ٹھاکر کاہن سنگھ، خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری، ظہور الدین بٹ، صائم صدیقی، اعجاز احمد فاروقی، ڈاکٹر بشیر چوہدری، انور ایوب راجہ، پریم ناتھ ہزار، ڈاکٹر صابر آنافی، ایوب صابر، شیخ نوید اسلم، پروفیسر محمد عارف خان، سعید سعد، پوفیسر رفیق، جی ایم

میر، ندیم انجم، محمد فضل شوق، محب الحسن، ثریا خورشید اور مولانا ایم اے خان جنگ بازار قابل ذکر ہیں۔ محمد دین فوق کی اپنی تصنیفات میں 25 ہزار قبیلوں، خاندانوں اور گھرانوں کے تاریخی و تہذیبی، سیاسی، علمی، ادبی، حربی اور کسبی واقعات اور حقائق لکھے ہیں جو شائد ہی کسی تاریخ دان اور محقق کے احاطہ قلم کا کرشمہ ہو۔ بہت سے مصنفین ایسے بھی ہیں جنہوں نے کسی ایک ہی ذات، گوت،، برادری یا قبیلے پر تحقیق کی اور ان کی عصبیت، حکمرانی اور دیگر اوصاف کو قلمبند کیا۔ اسطرح کی کتب اور تحقیق پر مبنی تواریخ اکثر کمزور بنیاردوں پر اٹھائی جاتی ہیں اور مصنفین اپنی کمزور دلیوں کی پختگی کیلئے قرآنی آیات اور احادیث سے واقعات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنا شمبرہ اصحاب رسول ﷺ یا پھر کسی ولی یا پیغمبر سے جوڑ لیتے ہیں اس طرح کی تحقیقات میں سرفہرست تاریخ شاہان گجر ہے جسکے مصنف ابو البرکات مولوی عبدالمالک ہیں اس طرح کی تاریخی کتابوں میں تاریخ افغانستان بحوالہ تاریخ سدزوئی ہے جسکے مصنف ڈاکٹر عاشق درانی ہیں اس تاریخ اور آزاد کشمیر کے سدھنوں کی نوشتہ تواریخ کی کتب میں کئی حوالوں سے فرق ہے۔ جاٹوں، ارائیوں، راجپوتوں، اعوانوں اور دیگر اقوام پر بھی سینکڑوں تحقیقی رسالے اور کتب لکھی گئیں جن پر سر لیبل گرفن اور محمد دین فوق نے شدید تنقید کرتے ہوئے ان کی صحت پر اعتراضات کیے ہیں محمد دین فوق لکھتے ہیں کہ ہندو اکابرین کا شکوہ ہے کہ مسلمان رہتے تو ہندوستان میں ہیں مگر اپنی ذاتوں اور

گھرانوں کو عربوں سے ملاتے ہیں اگر انکا شمبرہ کسی عرب سے نہ ملے تو تیموریوں، ترکیوں، منگولوں، اور افغانوں سے ضرور ملاتے ہیں سر لیبل گرفن کی ایسان پنجاب کا ذکر کرتے ہوئے فوق لکھتے ہیں کہ ہر مسلمان خاندان کی کوشش ہوتی ہے کہ انکا شمبرہ حضرت عباس یا کسی نامور صحابی سے جوڑا جائے۔ گرفن لکھتا ہے کہ پنجاب کا ایک نامور گھرانہ مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانہ تک غیر سید تھا۔ 1840 کے بعد یہ گھرانہ امیر اور جاگیر دار ہو گیا تو سید بخاری مشہور ہوا۔ گرفن نے ایک اور پنجابی گھرانے کے متعلق لکھا ہے کہ پہلے ہندو تھے پھر مسلمان ہوئے اور انگریزی دور کے آغاز میں کچھ اعوان اور سید ہو گئے اصل وجہ انگریز کی وفاداری کے سلسلے میں ملنے والی وسیع زمینیں اور انعامات تھے رسالہ القریش کے مصنف محمد علی رونق لکھتے ہیں کہ محض زمینوں کے حصول اور فوجی بھرتی کے لالچ میں پشاور اور گردو نواح کے قریشی پٹھان ہوئے گئے ہیں تاریخ شاہان گجر کے مصنف نے لکھا ہے کہ زمینوں کی الاٹمنٹ، فوجی نوکریاں اور اعزازات کے لالچ میں لوگوں نے قبیلے اور ذاتیں بدل لیں۔مزاروں اور خانقاہوں کو جاگیریں ملنے لگیں تو لوگ ہاشمی، قریشی اور سید ہو گئے

حسب و نسب

تاریخ کے مطابق سیدوں، اعوانوں، ہاشمیوں اور قریشیوں کے علاوہ اہل حرفہ اور دیگر گوتوں اور ذاتوں کی بڑی تعداد راجپوت بن گئی چونکہ فوجی نوکریاں اور

عہدوں کیلئے راجپوت اقوام کو ترجیح دی جاری تھی۔ تاریخی تحقیق کے مطابق ہر قوم اور قبیلہ اپنے اوصاف سے پہچانا جاتا ہے سید بے علم، ظالم کنجوس بد کلام، بدزبان اور بداعمال نہیں ہو سکتا اسی طرح دیگر اقوام اور قبائل کے خصائل ہیں جنہیں قومی اور قبائلی عصبیت کہا جاتا ہے۔ راجپوت قبائل قبائل شامل ہیں ڈٹ جانے اور مرجانے کے اوصاف والے قبائل کو انگریز نے مارشل ریس کا نام دیا الگزنڈر برن کے متعلق پیٹر دھوپ کرک کی بیٹی کیتھلین ہوپ کرک اور ولیم ڈیلریمپل لکھتے ہیں کہ وہ بیشمار خوبیوں کا مالک تھا مگر ایک عام ائیرش یعنی فٹ کانسٹیبل کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنی قابلیت، ذہانت اور علم کی بنا پر انو چے ہم عصر اور اعلیٰ حسب و نسب کے گوروں پر فوقیت حاصل کی اور ترقی یاب ہوا۔ انگریز ہندوستان میں ہی مارشل ریس کا قائل نہ تھا بلکہ اپنے ہاں بھی اس امتیاز کا حامی تھا۔ برن نے تاج برطانیہ کی جو خدمت بجا لائیں وہ غیر معلمولی تھیں مگر پھر بھی وہ برطانیہ میں راجہ، چوہدری، ملک، خان، نواب، وڈیرہ اور میاں نہ بن سکا۔

نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا
ککر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

حیرت کی بات ہے کہ پاکستان کی قومی و صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ میں گدش نشین، پیر، سیدزادے، جاگیر دار، نواب، خان ذادے، بڑے زمیندار، قبائلی

سردار، راجپوت، گجر، جٹ، ارائیں اور رئیساں اعوان موجود ہیں جن میں سے اکثر کے کردار پر دھبے لگے ہیں۔ یہ لوگ کرپشن، بد عہدی، رشوت خوری، قومی خزانے سے چوری سے لیکر اقربا پروری، عوام دشمنی اور بد اخلاقی جیسے جرائم کے مرتکب ہیں مگر ملکی آئین و قانون کی نظر میں معتبر اور مقدس ہیں۔ سر الیگزینڈر برن نے پنجابی اور سندھی عوام کی جو حالت 1833ء میں لکھی آج بھی عوام کی حالت ویسی ہی ہے اسی طرح بلوچستان اور سرحد کے متعلق جو کچھ ینگ ہاسبنڈ، پیٹر ہوپ کرک اور ڈیورنڈ نے لکھا عوام کی اآ فتاد میں فرق نہیں آیا۔

قائد اعظمؒ بانی پاکستان بوہانہ راجپوت تھے جنکا گھرانہ کسی دور میں ساہیوال سے ہجرت کر کے حیدر آباد چلا گیا۔ بھٹو خاندان کے بارے میں رائے متضاد ہے۔ ارائیں بھٹوؤں کو سندھ کے ارائیں لکھتے ہیں جبکہ کچھ مصنفین نے بھٹو خاندان راجپوت لکھا ہے۔ اس طرح سکھ دور میں جہلم کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے فیصلے کے مطابق ڈار، بٹ اور سلہریا اقوام راجپوت ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ میاں نواز شریف کا گوانہ بٹ خاندان سے تعلق رکھتا ہے دیکھا جائے تو جناب ذوالفقار علی بھٹو میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو میں راجپوتی اوصاف قدر سے مشترک ہیں۔ تینوں میں مذ پر اڑ جانے، نقصان کی پرواہ کیئے بغیر ڈٹ جانے، اپنی بات منوانے اور خطرات مول لینے کی عادت ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ قائد اعظمؒ کو ان تینوں پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ ڈٹ جاتے تھے اور

اپنی بات بھی منواتے تھے مگر عقلی، علمی اور قانونی دلائل کا سہارا لیتے تھے وہ خطرات کو مول لیتے تھے اور پھر اسکا رخ اپنے دشمن کی طرف پھیر دیتے تھے۔ قائد اعظمؒ کے بعد مستند راجپوت جناب وزیر اعظم راجہ پرویز اشرف ہیں مگر بد قسمتی سے موصوف میں ایک بھی راجپوتی وصف نہیں، کرپشن، لوٹ مار، اقرباء پروری اور جی حضوری کے جو ریکارڈ آپ نے قائم کیئے وہ شائد ہی کوئی توڑ سکے۔ وعدہ خلافی اور بد عہدی بھی آپ کے سیاسی ریکارڈ کا حصہ ہے 37 ارب روپیہ جس دیدہ دلیری سے آپ نے قومی خزانے سے نکالا اسکا حساب بھی شائد کوئی لے۔ اگر 37 ارب گوجر خان پر ہی خرچ ہوا ہے تو اسکا سروے بھی ہونا چاہیے جبکہ قانون کے مطابق وزیر اعظم کو یہ رقم سارے پاکستان کے دور دراز اور غیر ترقی یافتہ علاقوں کے عوام پر خرچ کرنا تھی۔ وزیر اعظم کے حلقے کا تنا ہی حق تھا جتنا ملک کے دیگر حلقوں کا۔

جناب پرویز اشرف جسطرح جناب صدر کے سامنے اداس بیٹھتے ہیں لگتا نہیں کہ وہ وزیر اعظم ہیں۔ حالیہ دورہ اجمیر شریف میں وہ سارے خاندان کو ساتھ لے گئے اور رقم سرکاری خزانے سے خرچ کی جو کہ کرپشن ہی کے زمرے میں آتی ہے۔ اسی طرح آپکا دورہ انگلستان تھا جسکا حساب شائد الیکشن کمیشن بھی نہ لے۔ اجمیر شریف کا دورہ حاضری کے نہیں بلکہ جگ ہنسائی کے زمرے میں آتا ہے۔ درگاہ کے متولی نے آپ کے استقبال سے معذرت کر لی اور بھارتی حکومت نے بھی سرد مہری

دکھلائی۔ڈمی اور نمائشی وزیر خارجہ سلمان خورشید نے مجبوری کے عالم میں چہرے پر ناگواری کے تاثرات کے ساتھ ہاتھ ملایا تو پرویز اشریف صاحب نے بیچارے سمان خورشید کا ہاتھ جنجھوڑ جھنجوڑ کر اور خوشامدانہ مسکراہٹیں بکھیر کر ایسا تاثر دیا جیسے وہ امریکہ کے صدر سے مل رہے ہوں۔پرویز اشرف اپنی راجپوتی کا نہ سہی کم از کم راجپوتانے کا ہی احساس کر لیتے۔مگر کیا کہا جائے موصوف کو راجپوتانے میں بھی راجپوتی جوش نہ آیا۔اگر متولی نے آنے سے منع کیا تھا تو آپ اسے سخت جواب دیتے کہ میاں تمہارا شیخ میرے علی ہجویری کی منظوری سے شیخ الہند بنا تھا۔تم دہلی دربار کی دال کھاؤ میں داتا کے دربار پر پلاؤ کھانے جا رہا ہوں۔

بڑنگ کا قصبہ گجرات اور بھمبر کی سرحد پر ہے جو کسی دور میں گجرات ہی کا حصہ تھا۔بڑنگ میں اکثریت چب راجپوتوں کی ہے جنکا پیشہ سپہ گری تھا جس بنا پر آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔چونکہ زمینوں سے زیادہ فصلیں نہیں آتی تھیں اسلیئے چبتوں نے حکومت پنجاب کو مالیہ دینے سے انکار کر دیا۔مالیہ وصولی کے وقت گجرات پولس چب سرداروں کو گرفتار کرکے عدالت میں پیش کرتی تو سردار مالیہ دینے کے حامی بھر لیتے مگر واپس جا کر انکار کر دیتے۔تنگ آکر انگریز نے حکم دیا کہ چب سرداروں کو عدالت میں پیش کرنے سے پہلے بڑنگ سے مٹی لا کر عدالت میں اس جگہ پھیلا دی جائے جہاں یہ لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔بڑنگ کی مٹی پر

کھڑے ہوئے سرداروں سے جج نے پوچھا آپ لوگ مالیہ دو گئے تو سب نے یک زبان ہو کر کہا نہیں دینگے۔جج نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ یہ بڑنگ کی مٹی اور راجپوتی خون کا جوش ہے جسے ختم نہیں کیا جاسکتا اسلئے بہتر ہو گا کہ بڑنگ کے قصبے کو ریاست جموں و کشمیر میں شامل کر دیا جائے چونکہ وہاں کا حاکم بھی راجپوت ہے۔جہاں تک گوجر خان اور پوٹھوہار کے خطے کا تعلق ہے تو اس میں بھی راجپوتوں کی اکثریت ہے اور دوسری اقوام میں بھی مارشل ریس کی کثرت ہے مگر جناب پرویز اشرف کا بیٹا ہی سٹائل ہے۔

وڑھ تمبے دی کڑوی ہوندی سڑیں پتراں سڑیں بیاں
جہی ڈھی ما محمد او ہو جہاں ڈھیاں دیاں

راجہ صاحب کوئی تو راجپوتی والی بات ہو کہ آپ کا نام بھی بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح،جناب ذوالفقار علی بھٹو، محترمہ بے نظیر بھٹواور میاں یا بٹ.برادران کی لسٹ میں شامل کیا جائے ؟ اور اب عوام نے جس طرح آپ کو.بری طرح رد کیا امید ہے اب آپ کو اپنی حیثیت کا اندازہ تو ہو گیا ہو گا؟

میاں صاحب احتیاط لازم ہے

محترم عرفان صدیقی میاں صاحبان سے کتنی قربت رکھتے ہیں اسکا ہمیں پتہ نہیں مگر ان کی کالمانہ کاروائیوں اور ٹاک شوز میں میاں.برادران کی خوش بیانیوں سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ جناب عطاالحق قاسمی کو مداح سرائی کے میدان میں ہرانے ہی والے ہیں۔جناب قاسمی کی فیلڈ صحافیانہ تو ہے مگر مہتانہ مختلف ہے وہ یورپ اور مشرق بعید میں سفارتکاری کرنا اپنی صحت اور مزاج کے عین موافق سمجھتے ہیں جبکہ جناب عرفان صدیقی کیلئے سعودی عرب یا پھر کوئی خلیجی ریاست بہتر چوائس ہوگا۔میاں صاحبان آجکل سیفما کی لپیٹ میں بھی ہیں اور امتیاز عالم جناب عرفان صدیقی اورجناب قاسمی پر بازی لینے کیلئے بازیوں پر بازیاں لگا رہے ہے۔میاں صاحبان کے بیانات اور خواہشات سے لگتا ہے کہ امتیاز عالم اور نجم سیھٹی سکول آف تھاٹ بہت جلد میاں .برادران کے زوال کا باعث بن جائے گا اور یہ لوگ نہ صرف میاں.برادران بلکہ ملک کیلئے کسی نئے بحران کا انتظام کردینگے۔

میاں نواز شریف نے الیکشن جیتتے ہی ایک بے تکا اور بے مقصد بیان دیا ہے جس سے نہ صرف ان کے غریب اور مڈل کلاس ووٹروں کو دھچکا لگا ہے بلکہ اٹھارہ

کروڑ پاکستانیوں کو حیرانگی ہوئی ہے۔میاں صاحب کے اس بیان سے شاہد عاصمہ جہانگیر، نجم سیٹھی، الطاف بھائی، امتیاز عالم اور امن کی آشا والوں کو تو خوشی ہوئی ہوگی مگر عام پاکستانی کو دکھ پہنچا ہے، میاں نواز شریف نے کہا کہ وہ جلد بھارت کا دورہ کرینگے چاہیے بھارت دعوت دے یا نہ دے۔میاں صاحب کو کچھ عوامی جذبات کا بھی احساس ہونا چاہیئے تھا کہ پاکستانی عوام بھارتی جبر، ہٹ دھرمی، پاکستان دشمنی پر کیا سوچ رکھتے ہیں؟الیکشن جیتنے کے بعد اس بیان کے پیچھے کیا چھپا ہے؟ میاں صاحب کو پاکستانیوں کو بتانا پڑے گا۔میاں صاحب نے یہ بیان کس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے دیا اسکی وضاحت بھی ضروری ہے چونکہ یہ بیان پاکستانی عوام کے جذبات کی توہین کے مترادف ہے۔میاں صاحب کے پچھلے دور میں بھی بھارت نوازی کا رنگ چڑہنا شروع ہوا تو قدرت نے ان سے اقتدار چھین لیا اور انھیں ملک سے ہی نکلنا پڑا۔بھارت جسطرح پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے شاہد میاں صاحب کو اسکا احساس ہی نہیں بلوچستان اور فاٹا میں ہونے والی دہشت گردی میں بھارت کے چوبیس کونسل خانے ملوث ہیں جو دہشت گردوں اور بلوچ لبریشن آرمی کو تربیت ہی نہیں بلکہ اسلحہ، گولہ بارود اور مالی وسائل بھی مہیا کرتے ہیں۔اگر میاں صاحبان کو جناب عرفان صدیقی، عطاالحق قاسمی، نجم سیٹھی اور امتیاز عالم سے کچھ فرصت ملے تو وہ اپنی ہی پارٹی کے ٹکٹ نادہندہ جناب جنرل عبدالقیوم سے ملکر ان کے ان کالموں پر تھوڑی سی بریفنگ لے لیں جو جنرل صاحب نے پوری تحقیق کے بعد اخبارات میں شائع کیئے۔ان

کالموں میں جنرل عبدالقیوم نے بھارتی انٹیلیجنس ایجنسی کی کارستانیوں، بلوچستان میں فراری کیمپوں کے قیام اور کے جی بی کی مدد سے بلوچستان کو پاکستان سے الگ کرنے کا جو منصوبہ بنایا اسکی مکمل تفصیل درج ہے۔اسی سلسلہ کی ایک کوشش جناب کرنل سکندر خان بلوچ نے بھی کی۔ مگر ہمارے سیاستدانوں کو ریلوے، پی آئی اے، سٹیل ملز،اوبی آئی فنڈ لوٹنے بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینے کے حربے سوچنے اور امن کی آشا کے چکروں سے ہی فرصت نہ ملی اور نہ ہی کسی نے اسطرف دھیان دیا۔

ایک اور دانشور اور محب وطن پاکستانی جناب ڈاکٹر اصغر علی کوثر وڑائچ اور پروفیسر نعیم قاسم نے بھی بھارت کی کشمیر پالیسی پر کھل کر لکھا جبکہ خبرناک کے میزبان جناب آفتاب اقبال نے اپنے ایک پروگرام کا بڑا حصہ بھارت کی اس منصوبہ بندی کیلئے مختص کیا جسکے ذریعے وہ کشمیر سے آنے والے سبھی دریاؤں کا رخ موڑ کر پاکستان کو بنجر بنانے کے پروگرام پر ہنگامی بنیادوں پر کام کر رہا ہے۔بھارت کی ایک ڈویژن فوج اور کئی جرنیل اور اعلیٰ سرکاری افسر افغانستان میں ورکروں اور انجینئروں کے بھیس میں بیٹھے پاکستان کیخلاف عمل پیرا ہیں۔بھارت افغانستان میں بیٹھ کر ویسا ہی کام کر رہا ہے جو 1970ء میں بھارتیوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کیلئے کیا تھا۔

اس بار بھارتیوں کا ہدف صوبہ سرحد موجودہ خیبر پختونخواہ، بلوچستان اور کراچی ہیں۔افغانستان کا حکمران حامد کارزائی بھارتیوں سے بڑھ کر بھارت نواز ہے جبکہ کے پی کے میں اے این پی اور بلوچستان میں بی ایل اے بھارتی مقاصد کیلئے کام کر رہے ہیں۔سینیئر کالم نگار اور دانشور جناب اجمل نیازی نے کالا باغ مخالف قوتوں کا نام لیکر لکھا ہے کہ اے این پی سمیت کون کونسے پاکستانی رہنما اور سیاسی گروپ بھارت سے اربوں روپیہ لیکر کالا باغ ڈیم کی مخالفت کرتے ہیں۔بھارت کو لاکھوں افغان مہاجروں کی صورت میں ہزاروں ایجنٹ بھی دستیاب ہیں جو پاکستان مخالف کاروائیوں میں ملوث ہیں۔میاں صاحب کو چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے اقوام متحدہ،امریکہ،یورپی یونین،چین اور اسلامی ممالک سے بات کرکے افغانوں کو واپس بھیجیں ورنہ ترقی اور تبدیلی محض کھوکھلا نعرہ بن جائے گا اور میاں صاحب کے بلند و بانگ دعوے ریت کا مینار بنکر رہ جائیگے۔پشاور میں کئی ایکڑوں پر پھیلی کارخانو مارکیٹ دنیا کا سب سے بڑا سمنگلنگ کا اڈہ ہے۔جہاں افغان تاجروں، سمگلروں اور افغان وار لارڈز کے ایجنٹوں کی اجارہ رادی ہے۔کارخانو مارکیٹ پاکستان کا ہی نہیں بلکہ ایشیاء کا سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے مگر پاکستان کے بندوبستی علاقے میں ہونے کے باوجود اس تجارتی مرکز سے حکومت کو ایک روپیہ بھی ٹیکس کی مد میں نہیں ملتا۔البتہ صوبہ پختونخواہ کے حکمران، سیاستدان اور نوکر شاہی کے اعلیٰ عہدیداران روزانہ کی بنیادوں پر نوٹوں اور ڈالروں کی بوریاں وصول کرتے

ہیں۔کیا میاں صاحب کو ان کے باخبر صحافی برادران اور بھارت نوازی کا درس دینے والے مشیران نے کبھی اس طرف بھی توجہ دلوائی ہے کہ پاکستانی معیشت کو دیمک کی طرح چاٹنے والا یہ تجارتی مرکز بھی پاکستان کی سرزمین پر موجود ہے جسے ٹیکس کے دائرہ میں لانے سے سارا صوبہ خوشحال ہو سکتا ہے۔میاں صاحب کے خیر خواہ ایک دانشور نے الیکشن کے دوسرے روز یعنی 12 مئی کو ایک ٹیلیوژن شو میں فرمایا کہ جلا وطنی کے بعد میاں نواز شریف بدل گئے ہیں۔اَب وہ باہم مشورے سے سارے کام کرتے ہیں نہ کہ پہلے کی طرح یکطرفہ حکم جاری کرتے ہیں۔صاحب یہ بھول گئے کہ جلا وطنی کے بعد میاں صاحب حکمران نہیں تھے بلکہ ان پابندیوں کی ذد میں تھے جن کے تحت وہ واپس وطن تشریف لائے تھے۔وہ جونہی ان پابندیوں کی دیوار سے نکلے ہیں انہوں نے وہی روش اختیار کر لی ہے جس کے وہ عادی ہیں۔کارگل اور بمبئی بم دھماکوں پر بھارت کی خوشنودی کیلیئے اور بھارت کو مطمئین کرنے کیلیئے کمیشن بنانا غلامانہ ذہن کی عکاسی ہے جبکہ بھارتی وزیراعظم کو تقریب حلف برداری میں دعوت دینا ثناﷲ شہید اور شہدائے کشمیر کے خون سے بے وفائی ہے۔الیکشن جیتنے کے بعد میاں صاحبان کچھ ایسا تاثر دے رہے ہیں جیسے یہ الیکشن پاکستان میں نہیں بلکہ جالندھر،،امرتسر یا پھر لدھانہ میں ہوا ہے۔میاں صاحبان نے اگر حکمرانی کرنی ہے تو ان کیلیئے ان خوش آمدی دانشوروں، مشیروں اور مولانا فضل الرحمٰن جیسے اتحادیوں سے پرہیز کرنا ہوگا ورنہ اس بار بھی وہ جیتی ہوئی بازی ہار جائیگے۔میاں صاحب کے

بھارت جانے سے ان کے اور ان کے بھارتی دوستوں اور چند لاہوری تاجروں کے تعلقات تو بہتر ہوجائیگے مگر بحیثیت مجموعی پاکستانی غیرت، معیشت اور خود مختاری کو شدید نقصان پہنچے گا۔ میاں برادران کی بھارت نوازی سے کشمیر کاز کو شدید نقصان ہوگا اور ملک میں دہشت گردی بھی بڑھے گی۔ میاں صاحبان کے بیانات سے لگتا ہے کہ ملکی سلامتی کے اداروں پر عدم اطمنان کا اظہار کررہے ہیں اور تخت نشینی کے فوراً بعد کسی نئے بحران کی ابتدا کرنیوالے ہیں۔ بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینے اور بھارتیوں کو فری ہینڈ دینے سے اس ملک کا جو حشر ہوگا اسکا اندازہ شاہد امن کی آشا کے ٹھیکداروں اور میاں صاحبان کے مشیروں، دانشوروں اور صلاح کاروں کو نہیں۔

میاں صاحب اور بھارت کے مشترکہ دوست دانشور وہی ہیں جنھوں نے بمبئ بم دھماکوں کے بعد ایڑی چوٹی کا ذور لگایا تھا کہ وزیر اعظم گیلانی کسی نہ کسی طرح ڈی جی آئی ایس آئی کو بھارت جانیکا حکم جاری کردے۔ انھوں نے اس بات کا اظہار ٹیلیوژن پروگراموں میں بھی کیا اور کچھ اسطرح کا تاثر دیا کہ اگر ڈی جی آئی ایس بھارت نہ گئے تو خدانہ کرے بھارت پاکستان کو چند لمحوں میں کھا جائے گا۔ اس قسم کے دانشوروں اور بھارت نواز ٹیم نے پاکستان کے خلاف گہری چال چلی تھی جو ناکام ہوگئی۔ اگر وزیر اعظمگیلانی میاں صاحب کی طرح سوچے سمجھے بغیر کسی حکم نامے پر دستخط کردیتے تو یقیناً فوج اس کی مخالفت کرتی

اور ملک کے اندر ایک نیا بحران پیدا ہو جاتا اگر کسی ایسے غلامانہ حکم کے تابع ڈی جی آئی ایس آئی بھارت چلے جاتے تو بھارت پاکستان کی اس قدر درگت بناتا کہ پاکستانی قوم مر کر بھی اس حزیمت سے نجات حاصل نہ کر پاتی ۔ ایسے دانشور اور اسکے بھارت نواز گروپ کی دہری چال اور پاکستان مخالف سازش سے ملک ، فوج، قوم اور آئی ایس آئی کو خدا نے بچالیا مگر اب امتیاز عالم اور امن کی آشا کے ٹھیکیداروں کو میاں صاحبان کی صورت میں ایک آسان حدف مل گیا ہے۔ شائد یہ کارستانی بھی ان ہی کی تھی کہ میاں صاحبان نے عبوری حکومت کیلئے عاصمہ جہانگیر کا نام تجویز کیا اور پھر امتیاز عالم کے یار اور غم خوار نجم سیٹھی کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ عاصمہ جہانگیر وہ ذات شریفہ ہیں جو کہ تحریک آزادی کشمیر کی مخالفت کرنے سری نگر جا پہنچی اور ہمیشہ اس تحریک کا مذاق اڑایا موصوفہ کو فوج، عدلیہ اور آئی ایس آئی جیسے وطن محافظ ادارے سے خدا واسطے کا بیر ہے دنیا بھر میں کہیں مرغی مر جائے تو محترمہ کو اس میں بھی آئی ایس آئی ملوث نظر آتی ہے نجم سیٹھی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے ہی ملک کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور اپنی فوج کے خلاف لڑتے رہے جس کے صلے میں انہیں پنجاب کی وزارت اعلیٰ سونپی گئی دیکھا جائے تو امتیاز اعالم ، عاصمہ جہانگیر، امن کی آشا کے شیدائیوں اور نجم سیٹھی کی نسبت جنرل پرویز مشرف کی خامیاں کم ہیں جنرل پرویز کے جرائم میں بھی میاں صاحبان برابر کے حصے دار ہیں اگر میاں صاحبان فوج کے مروجہ سسٹم کو نہ چھیڑتے اور

چوہدری نثار اور دیگر صلاح کاروں کے کہنے پر جنرل مشرف کو نیچے سے اٹھا کر اوپر نہ لاتے تو نہ وہ جلا وطن ہوتے نہ کارگل ہوتا، نہ ہی این آر او کی شکل میں پاکستان پر نحوست کے بادل برستے۔ آج ملک جس حال میں ہے اس کی بنیاد میاں صاحبان نے رکھی تھی میاں صاحبان اپنے جشن تاج پوشی میں من موہن سنگھ کے بجائے بھارتیوں کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والے سپاہی کو دعوت دیں۔ وہ کارگل اور دہشت گردی کی جنگ میں شہید ہونے والے وطن کے محافظوں کے بچوں کو دعوت دیں جن کے پیارے بھارتی کونسل خانوں کی پھیلائی ہوئی آگ کے آگے شیلڈ بن گئے تاکہ اہل پاکستان دہشت گردی کی اس آگ سے محفوظ رہ سکیں۔

بقول جناب عرفان صدیقی! اگر میاں صاحبان واقعی بدل گئے ہیں تو بھارت کی خوشنودی کیلئے غیر ضروری بیانات سے اجتناب کریں اور اپنی سابقہ غلطیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فوج کے سسٹم اور روایات کا احترام کریں وہ اپنے دوستوں اور مداح سراؤں کو قومی خزانے سے نوازنے کی بجائے اپنے ذاتی خزانے سے بخششیں، تحفے اور نذرانے دیں لیپ ٹاپ، سستی روٹی اور پیلی ٹیکسی جیسے منصوبوں پر خزانہ نہ لٹائیں بلکہ ایسے موثر اور دیرپا منصوبے بنائیں جس سے ملک مضبوط اور قوم خوشحال ہو۔ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی صورت میں ریوڑیاں نہ بانٹیں اور نہ ہی دانش سکولوں پر مزید سرمایہ ضائع کریں ملک میں موجود تعلیمی نظام کو درست کریں تاکہ عام آدمی کا بچہ بھی سکول میں پڑھ

سکے۔ ریلوے پی آئی اے اور سٹیل ملز پر توجہ دیں اور اس طرح کے اداروں کو سب سے پہلے بہتر اور منافع بخش بنائیں ملک بھر میں بلدیاتی انتخابات کروا کر عوام کو ترقی کی شکل دکھائیں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو صوابدیدی فنڈز دیکر قومی خزانے کو نالیوں میں نہ بہائیں سعودی عرب جیسے دوست اور چین جیسے ہمدرد پڑوسی کی مدد سے معیشت کی حالت درست کریں اور وزیروں مشیروں کی فوج کو کرپشن پر نہ لگائے۔ ملک میں بہتری کا اور بجلی بحران سے نکلنے کا سو دن کا جہاں آپ پلان دے رہے ہیں۔ وہاں اگر آپ اسمبلی میں اپنے پہلے خطاب میں یہ اعلان بھی کردیں کہ پہلے سو دن کوئی اسمبلی ممبر تنخواہ نہیں لے گا اور تمام وزیر مشیر بشمول وزیر اعظم ان سو دنوں میں گاڑیوں میں فیول اور اپنے تمام سرکاری اور غیر سرکاری دورے ملکی یا غیر ملکی ان کے اخراجات اپنی جیب سے کرے گا اس کمائی سے جو گزشتہ کئیں سالوں سے اکٹھے کرنے میں لگے ہیں ۔اور اس پیسے کو ملکی قرض اتارنے اور بجلی بحران کے حل کے لئے استعمال کریں تو عوام کو آپ کی اور آپ کی ٹیم کی نیک نیتی نظر آئی گی۔ عدالتی فیصلوں کا احترام کریں، اور نیب جیسے ادارے کی سمت درست کریں توقیر صادق جیسے ڈاکٹروں کو قانونی کے شکنجے میں لائے اور لوٹ مار کرنے والوں کو محفوظ رستہ دیکر مصنوئی قومی یکجہتی اور سستی شہرت حاصل نہ کریں۔ بھارت سے محبت، بھارت کے ظلم اور بربریت کا شکار ہونے والوں سے نفرت کے مترادف ہوگا۔ ہوسکے تو شہید ثنااللہ کی قبروں پر پھولوں کی چادر کیلئے احسن اقبال اور خواجہ آصف ہی کو

بجھوادیں۔یاد رکھیں عوام آپ کے وعدوں کی طرف دیکھ رہی ہے اور آپ بھارت کے عشق میں مبتلا ہے اس یکطرفہ عشق کے پیچھے کیا راز ہے ؟جناب عرفان صدیقی اور عطالحق قاسمی بہتر جانتے ہے عام آدمی کا خیال ہے کے یہ امن کی آشا والوں کی چال اور سیفما کے سانپ کی سازش ہو سکتی ہے۔

(سپاں دے پتر متر نہیں بن دے پاویں چلیاں دودھ پلایئے ھو۔۔۔)

مجرم کون

ثناء اللہ پاکستانی کو جموں جل میں کلہاڑوں کے وار کرکے شہید کر دیا گیا۔ ثناء اللہ بھارت کیوں گیا تھا اور اسے کس جرم میں سزا ہوئی تھی اسکا احوال ابھی سامنے نہیں آیا۔ بھارت میں پھنس جانے والے پاکستانیوں کے جرائم عموماً معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں جن میں سمندری حدود کی خلاف ورزی کرنیوالے ماہی گیر، غلطی سے بارڈر کراس کرنیوالے کسان، مزدور، دیہاتی یا پھر بھارت یاترا کرنیوالے شوقین۔ پاک بھارت سرحد پر دونوں جانب آبادی ہے اور دونوں جانب کے کسانوں کے کھیت ہیں اور ایک دوسرے کا حال احوال بھی پوچھ لیتے ہیں۔ بھارت نے پاکستان کی سرحد پر آہنی باڑ لگا رکھی ہے جو کہ کئی کلومیٹر بھارتی علاقے کے اندر ہے جبکہ بھارتی کسانوں کی زمینیں اس باڑ سے باہر پاکستانی سرحد کے قریب زیرو پوائنٹ پر ہیں۔

پاک بھارت سرحد بھی ایک المیہ ہے کہ یہ سرحد جغرافیائی اصولوں کے منافی بنائی گئی ہے جس کی وجہ سے آئے روز بھارتی خفیہ ایجنسیاں کسانوں کے بھیس میں پاکستانیوں کا شکار کرتی رہتی ہیں۔ باؤنڈری کمیشن قائم ہوا تو پنجاب کے بڑے زمیندار اور جاگیرداروں نے اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پٹواریوں کے نقشوں کے مطابق دونوں ممالک کی سرحدوں کا تعین کیا تاکہ ان کی زمینوں اور مزارعے محفوظ رہیں اور آنیوالے دور میں ان کے خاندان پاکستان پر

حکمرانی کرتے رہیں۔ باؤنڈری کمیشن کے ابتدائی فیصلے کے مطابق تقسیم اضلاع کی صورت میں ہونی تھی تاکہ مسلم میجارٹی کے اضلاع پاکستان اور ہندو میجارٹی اضلاع بھارت میں شامل ہو سکیں۔ اگر تقسیم کے اس منصوبے کو تسلیم کر لیا جاتا تو گرداسپور کی تحصیل پاکستان کے حصے میں آتی اور بھارت کو کشمیر میں داخل ہونے کا راستہ نہ ملتا۔ پنجاب کے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں جن میں سر فہرست دولتانے اور ممدوٹ شامل تھے نے ساز باز کے ذریعے پہلے اکثریتی اضلاع کی تجویز رد کروائی اور پھر تحصیل کی حدود کو بھی رد کروا کر پٹوار خانوں کے تحت عملدرآمد کو یقینی بنوایا۔ پنجاب کے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کی بدنیتی خود ان کے کام بھی نہ آئی اور سلیمانکی کے سامنے ستلج پار کا سارا علاقہ بھارت میں چلا گیا۔ اس بدنیتی اور خود غرضی کے نتیجے میں گرداسپور اور شکرگڑھ کے علاقے بھی بھارت کو مل گئے اور بھارت کو پنجابی زمینداروں نے کشمیر تحفے میں پیش کر دیا۔ مشہور کشمیری مصنف اور محقق جناب جی ایم میر نے اپنی تصنیف کشمیر تقسیم ہند کا ادھورا ایجنڈا اور کشمیر کی جغرافیائی حدود میں اس سازش پر مفصل روشنی ڈالی ہے حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو کشمیریوں کی غلامی اور جبر کے اصل ذمہ دار پنجابی جاگیردار، سیاستدان اور بڑے زمیندار ہیں۔

پٹوار خانوں کی تقسیم کا بھارت بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے جبکہ پنجاب کا

کسان فصل کی بیجائی اور کٹائی کے مواقع پر بھارتیوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ بھارتی سیکورٹی اور انٹیلی جنس کے کارندے ہر روز مختلف مقامات پر اپنے کسانوں کیلئے باڑ پر لگے گیٹ کھولتے ہیں اور پھر شام سے پہلے اپنے کسانوں کو باڑ کے اندر لیجا کر گیٹ بند کر دیتے ہیں۔ بھارتی کسانوں کے ساتھ بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے کارندے پاکستانی کسانوں کے بچوں کو بھی اغواء کر لیتے ہیں اور اسی آڑ میں اپنے دہشت گردوں، جاسوسوں اور سمگلروں کو بھی پاکستان میں دھکیل دیتے ہیں۔ چونکہ بہت سا بھارتی علاقہ آہنی باڑ کے باہر بھی ہے جہاں بھارتی ایجنٹ راتوں کو زمین پر کام کے لئے آنیوالے پاکستانی کسانوں کو اچک لیتے ہیں اور انھیں جاسوس، دہشت گرد اور پتہ نہیں کیا کیا بنا کر سزائیں دیتے ہیں۔ ان غریب کسانوں اور مزدوروں پر ہونے والے ظلم کے ذمہ دار بھی وہ خود غرض جاگیر دار اور زمین دار ہیں جن کی ہوس و حرص کی وجہ سے آج نہتے اور معصوم پاکستانی بھارتی درندگی اور بربریت کا شکار ہو رہے ہیں۔

پاکستانی میڈیا خاص کر امن کی آشا کے عاشقوں کے پاس بھارتی
سیاستدانوں، فنکاروں، اداکاروں اور پاکستان دشمن غداروں کے شہر سے موجود
ہیں۔ انھیں ٹیگور، دلجیت سنگھ سے لیکر راجیش کھنہ تک کے جنم اور مرن دن یاد ہیں
جسپر وہ باقاعدہ خوش اور افسردگی کا اظہار کرتے ہیں مگر انھیں بھارتی جیلوں میں بند
پاکستانیوں کا بلکل پتہ نہیں اور نہ ہی کرزائی کے دوست سلیم

صافی نے کبھی افغانستان کی جیلوں میں پڑے ہزاروں پاکستانیوں کی رہائی پر کوئی جرگہ کیا ہے۔ظاہر ہے کہ بھارت اور افغانستان کے عقوبت خانوں میں سڑنے والوں میں کوئی جمیعت علمائے اسلام، اے این پی یا پھر ایم کیو ایم کا ووٹر، سپورٹر، ہمدرد اور غم گسار نہیں۔اول تو بھارتی اور افغان، جمیعت، اے این پی اور ایم کیو ایم والوں پر ہاتھ ہی نہیں اٹھاتے اور اگر ایسا ہو جائے تو معذرت کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔میڈیا والوں کو بھارتی جاسوس اور دہشت گرد سربجیت سنگھ سے جتنا انس تھا اسکا عشر عیشر بھی ثناء اللہ کیلئے سامنے نہیں آیا۔بھارت اور افغان جیلوں اور عقوبت خانوں میں پڑے پاکستانی مزدور، کسان اور غلطی سے بارڈر پار چلے جانیوالے غریب لوگ ہیں جو نہ زرداری صاحب کے اور نہ ہی عمران خان اور جناب نواز شریف کے ہمدرد ہیں۔ان کیلئے پاکستانی جاگیرداروں کی غلامی اور بھارتی اور افغانستان کی جیلوں کی قید اور تشدد کی زندگی ایک جیسی ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا پاکستانی میڈیا جسے سربجیت سنگھ کا غم لگائے جا رہا تھا کے ضمیر پر ثناء اللہ اور دوسرے قیدیوں پر ہونے والے ظلم کا کوئی اثر نہیں؟سرکاری دانشوروں اور لفافہ صحافیوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ میڈیا قوم کی آواز ہے۔مگر بد قسمتی سے ہمارا میڈیا بھارتی میڈیا کا ہم آواز ہے جسے پاکستانیوں پر ہونے والے ظلم و ستم کا کچھ احساس نہیں۔

بھارتی میڈیا نے تسلیم کیا ہے کہ سربجیت سنگھ جسکا اصل نام کچھ اور تھا

بھارتی خفیہ ایجنسی کا میجر تھا جسے قید کے دوران کرنل کے عہدے پر ترقییاب کیا گیا۔یہی وجہ تھی کہ اسکی آخری رسوم پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ادا کی گئی اور ملکی اور قومی سطح پر اسکا سوگ منایا گیا۔شائد یہ بات جنرل پرویز مشرف کو بھی پتہ تھی۔جس نے جان کر سربجیت کی سزا پر عمل درآمد روک دیا تھا۔چودہ پاکستانیوں کے قاتل سے نرمی برتنا قومی جرم ہے جسکی سزا بھی جنرل مشرف کو ملنی چاہیئے۔صدرزرداری نے بھی اس قومی مجرم ، قاتل،دہشت گرد اور جاسوس سے ہمدردانہ رویہ قائم رکھا اور اپنے وزیر قانون کو سربجیت سے ملنے جیل بھجوایا۔میڈیا کو چاہیئے کہ وہ فاروق نائیک سے پوچھے کہ وہ سربجیت کیلئے کیا پیغام لیکر گیا تھے۔کیا کبھی کوئی بھارتی وزیر ایسا کریگا؟اگر کریگا تو وہ بھارت کا وزیر نہ رہے گا بلکہ دنیا میں ہی نہ رہے گا۔یہ اعزاز بھی ہمارے سیاستدانوں، حکمرانوں اور وزیروں کو ہے کہ وہ پاکستان کے جھنڈے کی توہین کرتے ہوئے جھنڈا بردار گاڑیوں پر بیٹھ کر بھارتی جاسوسوں،دہشت گردوں اور پاکستان کی عزت اور سلامتی کو نقصان پہنچانے والوں کو جیلوں میں جاکر ملتے ہیں اور رہا کروا کر گھروں تک چھوڑنے جاتے ہیں۔

بھارتی صدر ابو الکلام نے افضل گرو کی سزائے موت پر دستخط کرنے پر کچھ دیر کر دی تو بھارتی پارلیمنٹ میں ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔اپوزیشن لیڈر نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ صدر جمہوریہ کے بال بہت لمبے ہوگئے ہیں۔اور

اسکی آنکھوں پر پڑے رہے ہیں جسکی وجہ سے اسے نظر نہیں آتا۔حکومت کو چاہیئے کہ صدر کے بال کٹوا دے تاکہ وہ افضل گرو کی سزائے موت کے پروانے پر دستخط کرے۔ سربجیت سنگھ کی موت بھی ایک ڈرامے کی وجہ سے ہوئی۔ منصوبے کے مطابق سربجیت کو بتایا گیا تھا کہ وہ پاکستان اور پاکستانیوں کو دوسرے قیدیوں کی موجودگی میں گالیاں دے جسپر قیدی اسکی ہلکی پھلکی پٹائی لگائینگے۔اس ہلکی مالش کے بعد اسے ہسپتال داخل کرکے بڑا ڈرامہ کیا جائے گا اور آخر بھارتی وزیر اعظم کی درخواست انسانی ہمدردی کا ڈھونگ رچا کر بھارت بھجوا دیا جائے گا۔لگتا ہے کہ قیدیوں کو اس سلسلے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا اور نہ ان کو اس سودے بازی میں شامل کیا گیا۔قیدیوں نے جذبہ حب الوطنی کے جوش میں سربجیت کو ضرورت سے زیادہ ڈوز دی جو اسکی موت اور پاکستان کی بدنامی کا باعث بن گئی چونکہ قیدیوں کی حفاظت بہر حال حکومت کی ذمہ داری تھی۔حکومت پاکستان، صدر مملکت اور صدر مشرف نے عدالتی حکم پر کیوں تاخیر کی اور قانون کے مطابق سربجیت کو سزا نہ دیکر پاکستان کی عدالتوں،آئین اور قانون کا مذاق کیوں بنایا،اسکے لیے وہ قوم کو جوابدیں ورنہ یہ جرم بھی ان کے سر ہے۔

بندے کا کیا ہے؟

عام رواج ہے کہ کسی کی موت پر سہارہ دینے والے جا کر حاضرین سے ہاتھ ملاتے ہیں اور پھر کچھ دیر خاموشی کے بعد ہاتھ اٹھا کر کہتے ہیں کہ دعا مانگیں۔ اکثر یہ دعا بھی خاموش ہی ہوتی ہے اور حاضرین ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھتے رہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی جلدی سے منہ پر ہاتھ پھیر کر اس رسم کو اختتام پذیر کرے۔ منہ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اکثر کہا جاتا کہ جی بندے کا کیا ہے بس سب نے ٹر جانا ہے کوئی آگے اور کوئی پیچھے۔ پھر مرحوم کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں، چائے پانی کا دور چلتا ہے اور محفل برخاست ہوتی ہے۔ بزرگوں سے پتہ چلا ہے کہ تقسیم سے پہلے ہندو اور سکھ بھی مسلمانوں سے باقاعدہ تعزیت کرتے تھے۔ جنازے کے ساتھ بھی چلتے تھے اور نماز جنازہ کے وقت الگ ہو کر کھڑے رہتے تھے۔ بعض ہندو گھرانے خشک راشن اور زندہ بکرے بھی ماتم والوں کے گھر پہنچاتے تھے تاکہ تعزیت کے لئے آنے والوں کی روٹی کا مرحومین کے لواحقین پر بوجھ نہ پڑے۔ ایسا ہی برتاؤ مسلمانوں کا بھی تھا۔ مرنے والے کا کریا کرم کرنے کیلئے مسلمان خشک لکڑی، گھی، تیل اور دوسری اشیاء شمشان گھاٹ چھوڑ آتے اور رسومات کے وقت وہاں سے ہٹ جاتے۔ یہ رواداری اور بھائی چارہ 1947ء سے پہلے تھا جسکا علم ہمارے نوجوان اینکروں، جذباتی صحافیوں اور کرائے پر دستیاب دانشوروں کو نہیں۔

راجیش کھنہ مشہور بھارتی اداکار اور مسلمان دشمن ہندو تھا۔ راجیش کھنہ اور منوج کمار اسقدر متعصب اور کٹر ہندو تھے کہ انھوں نے فلمی دنیا میں ایک تنظیم بنائی جو مسلمان اداکاروں، گلوکاروں اور فنکاروں کی حوصلہ شکنی کرتی اور ان کی تذلیل کے لئے نت نئے حربے استعمال کرتی۔ راجیش کھنہ اور منوج کمار نے محمد رفیع کے گانوں کا بائیکاٹ کیا اور وہ کسی ایسی فلم میں کام نہ کرتے تھے جس میں محمد رفیع کا کوئی گیت شامل ہو۔ راجیش کھنہ مرا تو پتہ چلا کہ کھنہ کے رشتہ داروں سے پاکستان بھرا پڑا ہے۔ ایک مشہور ٹیلیویژن چینل کی نیوز کاسٹر پر کھنہ کی موت کا ایسا بھوت سوار ہوا کہ وہ خود بھوتنی بن گئی اور ہواس کھو بیٹھی۔ کھنے کی موت پر وہ اسقدر ہواس باختہ ہوئی کہ جذبات میں الفاظ کا خیال بھی بھول گئی۔ موصوفہ بار بار بھارت میں مقیم اپنے نمائندے کو لائن پر لیکر پوچھتی کہ راجیش کھنہ کا جنازہ کب ہوگا اور اسے کہاں دفنایا جائے گا۔ خاتون نیوز کاسٹر کے اس بیہودہ اور جاہلانہ سوال پر بھارتی نمائندہ جواب دیتا کہ کھنہ کے داماد کی آمد پر فیصلہ ہوگا کہ مرنے والے کا کریا کرم کہاں اور کتنے بجے ہوگا۔ ہندو نمائندے نے جان بوجھ کر بات کو کلیئر نہ کی تاکہ پاکستانی اور مسلمان نام کی حامل لنکر کا دنیا بھر میں مذاق اڑے اور لوگ پاکستانی صحافیوں پر تھو تھو کریں۔ ہر منٹ بعد محترمہ یہی سوال کرتی کہ ان کا جنازہ کتنے بجے ہوگا اور کہاں دفنایا جائے گا۔ ہندو نمائندہ پھر کہتا

کہ اکشے کمار کی آمد پر فیصلہ ہوگا کہ کتنے بجے انھیں شمشان گھاٹ لیجایا جائے اور وہیں پر ان کا کریا کرم ہوگا۔ حیرت کی بات کہ اس مشہور چینل کے کسی سینئر نمائندے کارندے، اینکر یا صحافی نے اپنی جیالی کو نہ روکا کہ بی بی ہندو کو جلاتے ہیں دفناتے نہیں، اور نہ ہی جنازہ ہوتا ہے۔

پاکستان کا مائیہ ناز سپوت اور ہیرو جسکی بہادری، جرات دلیری، وطن سے محبت اور دین اسلام سے عشق کی حد تک لگاؤ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں اور جس کی جرات اور دلیری کی دشمن بھی تعریف کرتے ہیں جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو کسی چینل کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ غازی ایم ایم عالم پر کوئی خصوصی پروگرام کرتا اور اسے خراج تحسین پیش کرنے کی جرات کرتا۔ ظاہر ہے کہ امن کی آشا کے شیدائیوں اور مجیب الرحمٰن کی بیٹی سے تمغہ غدارت وصولنے والوں میں ایسی جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک ایسے غازی مرد پر کوئی پروگرام نشر کریں جس سے بھارت اور اسرائیل ناراض ہو جائیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب پاکستانی شاہین ایم ایم عالم اردن اور شام کی فضاؤ ں میں اڑان لیتا تو جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس اسرائیلی ہوا باز خوف سے اپنے جہازوں کا رخ موڑ لیتے اور پرواز کا لیول نیچے کر لیتے۔

جس غازی مرد کی موجودگی ہی دشمن کیلئے خوف کا باعث ہو اسکا نام لینے کیلئے

بھی زبان پاک ہونا شرط ہے۔وہ لوگ جو راجیش کھنے کا چالیس روزہ سوگ مناتے رہے ہوں ان کی ناپاک زبان پر اسلام کے مجاہد اور مبلغ محمد محمود عالم کا نام کیسے آ سکتا ہے۔ایم ایم عالم نے اپنے ایک انٹرویو میں فرمایا کہ اس روز اگر سو بھارتی جہاز بھی میرے سامنے آتے تو سب کے پر خچے اڑا دیتا۔ایم ایم عالم نے بھارتی طیاروں کو مار کر اپنا ریکارڈ بنایا تھا جو بھارت نوازوں کیلیئے بھی اتنا ہی پریشان کن ہے جتنا بھارتیوں کیلیئے ہے۔اب اگر یہ لوگ ایم ایم عالم کا ذکر کرینگے تو نہ صرف بھارت بلکہ بنگلہ دیش بھی ناراض ہو جائے گا۔اور آئیندہ ڈھاکا اور دہلی کے دعوت نامے،ٹرافیاں،تمغے اور لفافے نہیں ملینگے۔بہرحال بندہ بندہ ہے۔بندے کا کیا آج ہے اور کل نہیں ہوگا۔بندہ بندگی پر آئے تو خدا کا بندہ بن جاتا ہے اور بندگی سے ہٹ جائے تو بھارت سمیت کسی بھی شیطانی طاقت کا نمائندہ اور کارندہ بنکر بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔شرمندگی،درندگی اور نمائندگی ہم آواز ہیں درندہ کبھی شرمندہ نہیں ہوتا اور نمائندہ کبھی بندہ نہیں بنتا۔وہ اس کی بندگی کرتا ہے جسکا وہ نمائندہ ہوتا ہے۔پاکستان میں بیٹھے بھارتی میڈیا کے نمائندے بھارت ہی کے بندے ہیں اور بھارت میں بیٹھے پاکستانی میڈیا کے نمائندے بھارتی ایجنسیوں کے کارندے زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔

ہمارے کچھ چینلوں،اینکروں،اینکرنیوں، صحافیوں، صحافنیوں،دانشوروں اور

دانشورنیوں کو راجیش کھنہ کی موت کا غم نہیں بھولا تھا سربجیت سنگھ بھی مرگیا۔درندہ صفت بھارتیوں کے ایک نمائندے نے شیخ رشید سے سوال کیا کہ سربجیت سنگھ پر ہونے والے ظلم کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔جناب شیخ رشید نے تو اس صحافی کو اچھا جواب دیا مگر وہ شرمندہ نہ ہوا چونکہ وہ جسکا نمائندہ ہے اسکی نمائندگی اسکا دھندہ ہے۔ایسے صحافیوں کو شائد علم نہیں یا پھر عقل ہی نہیں یا پھر دونوں ہی نہیں۔اگر علم اور عقل ان کے قریب سے گزرتی تو انھیں پتہ ہوتا کہ بھارتی پاکستانیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں بھارتی ایجنسیوں کے کارندے پاکستانیوں کی زبانیں کاٹتے ہیں اعضاء کچل کر مفلوج بناتے ہیں، جسم کی ہڈیاں توڑتے ہیں اور کبھی کبھی ان نیم مردہ اور مفلوج جسموں کو پاکستان کے حوالے کرکے پیغام دیتے ہیں کہ ہم انسان نہیں درندے ہیں۔یہ ہمارے سیکولزم کی مثال ہے اور اگر موقع ملا تو تمہاری ساری قوم کے ساتھ یہی سلوک کرینگے ۔آزاد کشمیر رجمنٹ کے سپائی کی کٹی زبان اور ذہنی معذوری ایسی صحافت اور دانشوری کے منہ پر طمانچہ ہے جو بھارتیوں کے گیت گاتے اور امن کی آشا کے راگ الاپتے ہیں۔ایسے دانشوروں کو شرم سے ڈوب مرنا چاہیئے جو بھارتی پیسے، شراب اور دیگر عیاشیوں کے عوض قومی غیرت کا سودا کرتے ہیں کیا بھارتی درندوں کے ان نمائندوں کو کلر سیداں کے شہید سپائی اخلاق احمد کے شہادت بھول گئی ہے کہ انھیں سولہ معصوم اور غریب پاکستانیوں کے قاتل اور دہشت گرد سربجیت سنگھ پر ہونے والا ظلم رات کو سونے نہیں

دیتا۔انسانی ہمدری کا ڈھونگ رچانے والوں کو سمجھوتہ ایکسپریس میں زندہ جلنے والے پاکستانیوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔کیا ان صحافیوں،اینکروں اور چند ٹکوں کے عوض بکنے والے دانشوروں اور انسانی حقوق کے علمبردار کو مقبول بٹ اور افضل گرو یاد نہیں رہے۔کیا کشمیر کو شہ رگ کہنے والے نام نہاد دانشوروں کو کشمیر میں ہونے والے ظلم و ستم کا علم نہیں۔مگر کیا کریں بندہ پھر بندہ ہے بندے کا کیا کبھی درندہ بن جاتا ہے مگر شرمندہ نہیں ہوتا اور کبھی زندہ نظر آتا ہے مگر اندر سے مردہ ہوتا ہے۔میرے خیال میں زرد صحافت کے بعد اب مردہ اور درندہ صحافت کا بھی رواج چل نکلا ہے۔مردہ ضمیر صحافی ہی درندہ صفت اقوام اور ایجنسیوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور شرمندہ نہیں ہوتے۔زندہ پاکستانی قوم کو چاہیے کہاں مردوں کو شمشان گھاٹ تک چھوڑ آئیں تاکہ قوم ان کی درندگی سے بچ جائے۔مشہور چینل کی مشہور نیوز کاسٹر کیلئے اطلاع ہے کہ ہندوؤں،سکھوں اور بدھ مت والوں سمیت کچھ یہودیوں کو بھی جلایا جاتا ہے۔جبکہ پارسیوں کو ٹاور آف سائلنس پر رکھا جاتا ہے۔ویسے ایک مسلمان،پاکستانی دانشور،سفارتکار اور شاعر کو بھی ایران میں جلایا گیا تھا۔وجہ کیا تھی معلوم نہیں،شائد موصوف آتش پرست ہوگئے ہوں یا پھر مرنے کے بعد مشہوری کیلئے وصیت کر دی ہو۔مشہور بھارتی صحافی،دانشور اور مصنف خشونت سنگھ نے بھی وصیت کر چھوڑی ہے کہ مرنے کے بعد اسے جلایا نہ جائے بلکہ دفنایا جائے۔خشونت سنگھ نے اپنی قبر کی جگہ بھی خرید رکھی ہے اسلیے اگر موصوفہ کی

زندگی میں کبھی خشونت سنگھ مرگیا تو وہ اپنے دہلی والے نمائندے سے خشونت کی تدفین کا وقت پوچھ سکتی ہیں۔ خشونت نے بہائی مذہب کے قبرستان میں دفن ہونا ہے جو اسکی وصیعت میں درج ہے جسکا ذکر اس نے اپنی آٹو بائیو گرافی میں لکھا ہے۔ خشونت بوڑھا سردار ہے مگر زندہ دل اور دل پھینک بھی ہے مجھے اس کتاب "سمندر میں تدفین" پسند ہے چونکہ اس تحریر میں میں خشونت نے نہرو خاندان کی اصلیت اور حقیقت پیش کی ہے۔ وہ لوگ خاص کر پاکستانی قلمکار جن پر امن کی آشا کا بھوت سوار ہے اور جو قائدؒ اعظمؒ کا نہرو سے مقابلہ کرتے ہیں، خشونت سنگھ نے سمندر میں تدفین لکھ کر ان کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہے۔ جسے ان دانشوروں کو ایک نظر ضرور پڑھنا چاہیے تا کہ ان کی عقل کے بند خانے کھل سکیں۔

جاوید ہاشمی ایک با عزت سیاستدان

جناب جاوید ہاشمی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے کیا اور بحثیت سٹوڈنٹ اپنی سیاسی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔دیگر مخدومین مولتان کی طرح آپ بھی ضیاء الحق کے دور حکومت میں اقتدار کے ایوانوں تک پہنچے اور پھر پاکستان مسلم لیگ سے وابستہ ہوگئے مگر پوٹھوہار گروپ کے سرپرست اعلیٰ جناب چوہدری نثار نے آپ کی پارٹی وابستگی اور قربانیوں کے علاوہ اعلیٰ سیاسی صلاحیتوں کے باوجود پارٹی قیادت کو آپ کے قریب نہ آنے دیا۔اس میں شک نہیں کہ جاوید ہاشمی نے مسلم لیگ نواز سے اپنی سیاسی وابستگی اور شریف خاندان کیساتھ بے لوث یگانگت اور ہمدردی کی اعلیٰ مثالیں پیش کیں جبکہ شریف.برادران کو بے اقتدار اور بے وطن کرنے کے بنیادی لوازمات جناب چوہدری نثار نے ہی مہیا کیے مگر ہمیشہ کی طرح زیر عتاب جاوید ہاشمی ہی رہے۔شریف برادران جب اٹک قلعے میں بند تھے تو ان کے وزیر مشیر اور حلوے مانڈے کھانے والے دوست یار مشرف کی قربت کے راستے تلاش کر رہے تھے۔جنرل مشرف نے میاں اظہر سے ق لیگ کی بنیاد رکھوائی اور پھر تعمیر کا ٹھیکہ چوہدریوں کو دے دیا چونکہ جسطرح کی لیبر جنرل مشرف کو درکار تھی اسطرح کا تجربہ اور مین پاور میاں اظہر کے پاس نہ تھی۔چوہدری صاحبان اور

جنرل مشرف نے ایک طویل ونگ کھیلی اور پھر دونوں ہی جناب زرداری کے ہاتھوں آؤٹ ہو گئے۔ جنرل مشرف پر میچ فکسنگ کا مقدمہ چل رہا ہے اور چوہدری پھر کسی نئی ٹیم کے انتظار میں ہیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ جنرل مشرف کو آرمی چیف کے عہدے پر تعینات کروانے والوں میں جناب چوہدری نثار کا اہم رول تھا اور ان کے بھائی جنرل افتخار جنرل مشرف کے قریبی ساتھیوں میں شمار تھے۔ جنرل مشرف اور میاں برادران میں چپقلش کا اہتمام بھی چوہدری نثار اور جناب مشاہد حسین سید نے کیا اور جنرل مشرف کو ایک انوکھے اور تضحیک آمیز انداز سے آرمی چیف کے عہدے سے ہٹانے کا پروگرام ترتیب دیا جو نہ صرف میاں نواز شریف کی بے اقتداری بلکہ جلا وطنی کا باعث بن گیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مسلم لیگ کے سارے کھوٹے سکے جنرل مشرف کی ٹکسال میں ڈھلکر کھرے ہو گئے اور یک زبان ہو کر میاں صاحبان کی برائیاں بجانے والے بینڈ کا حصہ بن گئے۔ شیخ رشید کے سگار کا سائیز بڑا اور کوالٹی اچھی ہو گئی۔ زبان کی تراوٹ اور چہرے کا نکھار بھی کھل گیا اور انداز واطوار میں بھی نمایاں تبدیلیاں آگئیں۔ شیخ رشید نے فتویٰ جاری کیا کہ جنرل مشرف کو سید پرویز مشرف لکھا اور پکارا جائے۔ چوہدریوں نے جنرل مشرف کا اور جنرل مشرف نے چوہدریوں کا بھرپور ساتھ دیا اور ایک دوسرے کے خزانے بھرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ میاں اظہر اور اعجاز الحق سے لیکر مشاہد حسین

سید تک ہر کسی نے میاں صاحبان کا ساتھ چھوڑا مگر مخدوم جاوید ہاشمی نے بیگم کلثوم نواز سے ملکر نہ صرف مسلم لیگ نواز کے وجود کو برقرار رکھا بلکہ شریف خاندان کی تکلیفوں اور مشرف حکومت کی طرف سے عائد کردہ سختیوں اور پابندیوں سے بھی پاکستانی عوام اور عالمی میڈیا کو باخبر رکھا۔

جنرل مشرف نے مسلم لیگ (ن) کے سرکردہ لیڈروں پر ظلم ڈھائے، انھیں جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا اور ہر طرح کی تضحیک اور تذلیل کی مگر جناب چوہدری نثار اپنے عالیشان محل میں ہی رہے جسے ہاؤس اریسٹ کا نام دیا گیا تاکہ چوہدری صاحب کا نام غازیوں اور شہیدوں کی فہرست میں شامل کیا جاسکے۔ دوسری جانب جاوید ہاشمی، رانا ثناء اللہ اور خواجہ سعد رفیق سمیت دیگر کارکنوں کے ساتھ عادی مجرموں جیسا سلوک ہوا اور ان پر بے رحمانہ اور ظالمانہ تشدد کیا گیا۔ جناب جاوید ہاشمی پر تشدد کرنے کے بعد انتہائی خستہ اور زخمی حالت میں ان کی بیٹیوں سے ملایا گیا تاکہ باپ کی حالت دیکھ کر بیٹیوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور وہ جنرل مشرف کے ساتھ کوئی ڈیل کرکے اپنے باپ کو رہائی دلا سکیں مگر بہادر باپ کی بہادر بیٹیوں نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی مخدوم جاوید ہاشمی کی باہمت ہمسفر نے اپنے جیون ساتھی کی حالت زار دیکھ کر آنسو بہائے۔ مجھے یقین ہے کہ جنرل مشرف کے اہلکاروں اور ظلم کرنے پر مامور رہنے والے جن افسروں نے جاوید ہاشمی اور ان کے خاندان کی اس ملاقات کی رپورٹ جب بزدل

جنرل کو دی ہوگی تو اسکا حوصلہ ضرور ٹوٹ گیا ہوگا۔ایسی ہی کہانی خواجہ سعد رفیق اور رانا ثناء اللہ کی بھی ہے مگر میاں نواز شریف کے دربار میں جو مرتبہ ومقام رانا صاحب اور خواجہ صاحب کا ہے اسکا عشر عشیر بھی مخدوم جاوید ہاشمی کے حصے میں نہیں آیا۔

جناب جاوید ہاشمی نے مسلم لیگ چھوڑ کر کوئی بے وفائی نہیں کی چونکہ جس گھر میں عزت نہ ہو اسے جلانے سے بہتر ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔گھر مدتوں کی محنت سے بنتے ہیں اور صدیوں تک قائم رہتے ہیں جبکہ مقیم بدلتے رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کے خالق نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ کا خاندان کشمیر سے ہجرت کرکے پٹنہ، بہار اور پھر بنگال پہنچا جہاں آپ کے بزرگوں نے محنت اور لگن سے کام کیا اور اپنی لیاقت کے بل بوتے پر بنگال کے نوابین میں شامل ہوگئے۔نواب سلیم اللہ خان کا لگایا ہوا پودا تناور ہوا تو قائد اعظمؒ نے اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کے سائیہ آفیت میں جمع کرکے مسلمانوں کیلئے ایک الگ وطن کے خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔ قائداعظمؒ کے بعد مسلم لیگ کے حقیقی وارث قائد کے وہ ساتھی تھے جو بغیر کسی لالچ و ہوس کے ہر مشکل میں قائد کے سپاہی بن کر رہے اور مسلم لیگ کو تقسیم ہونے سے بچائے رکھا۔ قائداعظمؒ کی رحلت کے بعد مسلم لیگ پر وہ کھوٹے سکے قابض ہوئے جن کے متعلق قائد نے خود فرمایا تھا کہ جو کچھ دن کی روشنی میں مسلم لیگ کے دفتر

میں ہوتا ہے یہ لوگ رات کی تاریکی میں اسے ماؤنٹ بیٹن کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور پھر گاندھی اور نہروں اسکا توڑ نکالتے ہیں۔

دیکھا جائے تو آج بھی مسلم لیگ کھوٹے سکوں کی دکان ہے جہاں پر کوئی جدی پشتی لیگی بنا اپنی سٹاک مارکیٹ چلا رہا ہے۔اور تو اور اس ملک میں ڈکیٹٹروں نے بھی مسلم لیگ ہی کا سہارا لیا اور دس دس سال تک قائد اعظمؒ کے جانشین بنے رہے۔جس مارکیٹ میں پلاسٹک کے سکے چلتے ہوں وہاں جاوید ہاشمی جیسے کھرے شخص کی کیا وقعت ہو سکتی تھی؟ مگر یہ جاوید ہاشمی کا ہی حوصلہ ہے کہ وہ کئی دہائیوں تک اس مارکیٹ میں ڈٹا رہا اور آخر کار مایوس ہو کر ایک ایسے کھلاڑی کی ٹیم کا حصہ بنا جو سوائے اپنی ذات کے کسی اور کی عزت کرنا ہی نہیں جانتا۔جاوید ہاشمی کا مسلم لیگ چھوڑنا ایک درست اقدام تھا مگر عمران خان کی ٹیم میں جنا ایک فاش غلطی تھی۔جاوید ہاشمی جیسے سنجیدہ اور باوقار سیاستدانوں کیلئے تحریک انصاف کسی طور ایک موزوں اور مناسب پلیٹ فارم نہیں جہاں فیصلوں کا فقدان اور اقرباء پروری کا راج ہے عمران خان نے پارٹی الیکشن کی آڑ میں سنجیدہ اور وفادار لوگوں کو ڈمپ کیا اور نمائشی غریبوں اور محنت کشوں کو ضلعی عہدے دیکر سستی شہرت حاصل کی۔جب الیکشن کا وقت آیا تو پرویز خٹک جیسے ارب پتی سمیت اپنے دوستوں یاروں اور امیر کبیر لوگوں پر ٹکٹ نچھاور کیے جن میں زیادہ تعداد انھی لوگوں کی ہے جو پیپلز پارٹی اور ق

لیگ کے دور میں وزیر مشیر رہے یا پھر ضیاالحق اور پرویز مشرف کے آستانوں پر پھول نچھاور کرتے رہے۔ کوہاٹ کا ٹیلر ماسٹر، ایبٹ آباد کا پینٹر اور لاہور کے سفید پوش لیڈی ڈاکٹر صرف اشتہاروں کی زینت بنے اور اسمبلیوں میں جاگیر داروں، بیورو کریٹوں، سرمایہ داروں اور نوابوں کے بچے گئے۔

جہاں تک جاوید ہاشمی کے بیان کا تعلق ہے تو جناب ہاشمی نے سچ کہا کہ " نواز شریف میرا کل بھی لیڈر تھا اور آج بھی ہے"۔ مگر وہ یہ بھی کہہ دیتے کہ اس لیڈر نے میری قدر نہ کی اور ایک مخصوص اور مفاد پرست ٹولے نے میرے لیڈر کو نفسیاتی طور پر یرغمال بنائے رکھا۔ جناب ہاشمی کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ کاش قائداعظمؒ کا گھر سلامت رہتا اور اس گھر میں قائداعظم کے حقیقی سیاسی جانشین مقیم ہوتے مگر ایسا نہ ہوا اور آج مجھے اپنے لیڈر کے خلاف ایک نمائشی الیکشن لڑنا پڑا۔ جاوید ہاشمی کو یہ بھی کہنا چاہیئے تھا کہ جناب نواز شریف میرے سیاسی لیڈر تھے مگر جناب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ میرے سیاسی اور اخلاقی استاد تھے۔ کل تک جناب نواز شریف میرے سیاسی لیڈر تھے چونکہ میں ان کی پارٹی میں تھا۔ آج وہ اسلیئے لیڈر ہیں کہ قوم ان کی حق میں فیصلہ دیا ہے اور انھیں اپنا لیڈر چنا ہے۔

جیسا کہ کچھ سینئر کالم نگاروں اور دانشوروں نے لکھا ہے کہ عمران خان نے

جناب جاوید ہاشمی کو گھر بلا کر بے عزت کیا ہے اور پھر تحریک انصاف کے گالم گلوچ بریگیڈ نے سوشل میڈیا پر بیہودگی کی بمباری کرکے جناب جاوید ہاشمی کو اپنا بیان واپس لینے پر مجبور کر دیا۔جناب جاوید ہاشمی نے اپنی پریس کانفرنس میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے حلقے کے نوجوانوں نے ان پر پریشر ڈالا ہے اور بیان واپس لینے پر مجبور کیا ہے۔جناب جاوید ہاشمی نے شاید یہ پہلا سیاسی جھوٹ بولا ہے چونکہ ملتان کے لوگ میٹھی زبان اور فقیرانہ اطوار کے وارث ہیں۔وارث شاہ، بہاالدین ذکریاؒ بابافریدؒاورشاہ رکن عالمؒ کی زبان میں گالی تو کجا جھڑک بھی نہیں۔میں چار سال تک پنجاب یونیورسٹی میں رہااور سیاسیات اور ابلاغ عامہ میں ماسٹر کیااور پھر دو سال بہاالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان میں رہااور ایم فل کیا میرے مشاہدے کے مطابق ملتانی اور لاہوری کلچر کے الگ الگ رنگ اور ذائقے ہیں۔ملتان والے اپنے مخدوموں کے دروں پر سر جھکاتے ہیں ان کے سامنے زبان نہیں چلاتے۔یہ ممکن ہے کہ وہ الیکشن میں جاوید ہاشمی کو ووٹ نہ دیں مگر وہ کبھی بھی جاوید ہاشمی جیسے باادب اور بااخلاق شخص کے خلاف زبان نہیں چلائینگے۔جناب ہاشمی سے درخواست ہے کہ وہ عمران خان کی خیراتی سیٹ چھوڑ کر اپنے عوام کے پاس جائیں اور انھیں سچ بتائیں۔مجھے قوی امید ہے کہ درویشوں اور ولیوں کی سرزمین کے وارث نہ صرف جاوید ہاشمی کے سرپر فتح کا تاج رکھیں گے بلکہ سارے ملتان کے لوگ انھیں سرپر بٹھا کر اسمبلی ہال تک چھوڑنے آئینگے۔میں اپنی اس

تحریر کی وساطت سے اھل ملتان سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ اپنے مخدوم کو تحریک انصاف چھوڑنے اور سیٹ سے الگ ہونے پر مجبور کریں اور جن لوگوں نے ان کے لیڈر کو گالیاں دیں، بے عزت کیا ان کے مقابلے میں جاوید ہاشمی کو کامیاب کرکے تکبر اور رعونت کو شکست فاش دیں۔

جناب جاوید ہاشمی کی پریس کانفرنس درحقیقت تکبر کی سیاست اور بیہودہ کلچر کا ماتم تھا جس نے ساری قوم کو دکھی کر دیا۔بہت سے دانشوروں نے اس موضوع پر لکھا اور سبھی کی متفقہ رائے ہے کہ جو سلوک عمران خان نے جاوید ہاشمی کے ساتھ کیا ایسا سلوک شائد جنرل مشرف نے بھی نہ کیا ہو۔مشرف نے ہاشمی صاحب پر ذہنی اور جسمانی تشدد کیا مگر بے عزت نہ کیا۔میاں برادران نے جناب ہاشمی کو انکا جائیز سیاسی مقام نہ دیا مگر کبھی گھر بلا کر برا بھلا نہ کہا۔جناب ہاشمی نے پارٹی لائن سے ہٹ کر بیان دیے مگر انھیں مجرموں کی طرح طلب نہ کیا۔دیکھنا ہے کہ جناب ہاشمی اگلی پریس کانفرنس کب کرتے ہیں اور اپنی عزت کی بحالی کے لئے سچ کب بولتے ہیں؟

آغا شاعر دہلوی کی ناول نگاری

ادب ایک ایسا ساگر ہے جس میں دنیا جہان کے خیالات کے دریا آ کر گرتے ہیں ۔ ان کا سوتا کہیں پھوٹتا ہے ۔ چادر آب کہیں بنتی ہے اور چشمہ کہیں اور جاری ہوتا ہے ۔ اردو ادب ہر دور میں نشیب و فراز سے گزرتا رہا ہے ۔ لیکن ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں نے اس کے لیے نت نئی راہیں ہموار کی ہیں اور ترقی کے راستے پر اسے گامزن کرتے رہے ہیں ۔ اس طرح شاعروں اور افسانے کے ناول کی صنف بھی ان ہی کا وشوں کا نتیجہ ہے ناول کے لغوی معنی Novella کے ہیں جو کہ اطالوی زبان کا لفظ ہے جس طرح افسانے کے بارے میں مختلف ناقدین نے اپنی آرا پیش کی ہیں ۔ اسی طرح اردو ناول میں بھی مختلف ناقدین کی تعریفیں مختلف انداز میں ملتی ہیں ۔ چنانچہ رابن سن کروسو کے غیر فانی مصنف ڈینیل ڈونے اس فن کی بنیاد ڈالتے ہوئے دو چیزوں کا خاص طور سے لحاظ کیا ہے ایک تو یہ کہ قصہ حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ اسے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے ۔ اس لیے کہ اگر قصہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوگا تو جھوٹا ہوگا اور اس کی تصنیف کے ذریعے مصنف جھوٹ بولنے کا عادی ہو جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ

” قصہ بنا کر پیش کرنا بہت.بڑا جرم ہے یہ اس طرح کی دروغ بینی ہے جو آہستہ

میں ایک بہت بڑا سراخ کر دیتی ہے جس کے ذریعے چھوٹ آہستہ آہستہ داخل ہو کر ''ایک عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

فیلڈنگ جو انگریزی ناول کے عناصر اربعہ میں سے ہیں یوں رقم طراز ہیں

''ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے۔ ''

یعنی اس کے نزدیک المیہ کہانی ناول کے موضوع سے باہر ہے۔ اس طرح چرڈسن کے اس نقطۂ نظر کو رد کرتا ہے کہ کہانی کی غرض نیکی اور اخلاق کا سدھارنا ہے۔ فیلڈنگ اسے ہنسنے اور ہنسانے کا ذریعہ سمجھتا ہے اس لئے وہ اس میں طربیہ کی شرط لگا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعریف بھی نا مکمل ہے۔اس کا ایک ہم عصر اسمولٹ اس نئے فن کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے جس میں ایک مقررہ پلاٹ کو وضح کرنے کے ''لیے زندگی کے کردار مختلف جماعتوں کے ساتھ رکھ کر مختلف پہلوؤں سے دکھائے جاتے ''ہیں۔

یہ تعریف بھی ناکافی ہے اس لیے کہ اس میں سارا زور پلاٹ پر ہے۔ چنانچہ انگلستان کی ایک مشہور ادبیہ کلارا ایوز اس فن کی تعریف یوں کرتی ہیں۔

ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرے کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں لکھی جائے۔"

پروفیسر بیکر نے ناول کے لیے چار شرطیں لازم کر دیں۔ قصہ ہو، نثر میں ہو، زندگی کی تصویر ہواور اس میں ربط ویک رنگی ہو یعنی یہ قصہ نہ صرف نثر میں لکھا گیا ہو بلکہ حقیقت پر مبنی ہو اور کسی خاص نقطۂ نظر یا مقصد کو بھی پیش کرتا ہو۔ حقیقت میں ناول وہ صنف ہے جو حقیقت کی عکاسی کرتا ہو۔ زندگی کی سچائی کو بیان کرتا ہو۔ صنف ناول نے کئی رنگ بدلے ہیں۔ کبھی اس نے رومانی شکل اختیار کی تو کھی تاریخی ناول کی، کبھی عصری ناول کی تو کبھی رزمیہ وسیاحتی، کبھی اسراری اور کبھی نفسیاتی ناول کی۔ غرض یہ مختلف رنگ اختیار کرتا رہااور دور حاضر تک اردو ناول کے ذخیرے کو مالامال کرتا رہا۔

ناول کے فن کو مکمل کرنے کے لیے جن اجزاء کا ہوناضروری ہے ان میں قصہ، پلاٹ، کردار، مکالمہ، مناظر فطرت، زمان و مکاں، نظریہ حیات اور اسلوب بیان کو اہمیت حاصل ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی جز کم ہو توایسا ناول مکمل ناول نہیں کہلائے گا۔

اردو میں ناول کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ صنف ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ جب بھی کوئی ناول نویس لکھتا ہے تو وہ کوئی نئی دنیا اپنی خواہش کے مطابق نہیں بناتا بلکہ وہ ہماری ہی دنیا سے بحث کرتا ہے وہ وہی چیزیں پیش کرتا ہے جن کا ہماری زندگی سے تعلق ہوتا ہے۔ یعنی کہ جس میں دکھ ہو سکھ بھی ہو جنگ بھی ہو صلح بھی ہو موت بھی پیدائش بھی۔ ناول نگار نہ صرف تخلیل میں پرواز کرتا ہے بلکہ اس کے قصے کی بنیاد روزمزہ کی زندگی پر استوار ہوتی ہے۔ کردار بھی ہمارے جیسے گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں۔

ناول ادب کی اہم صنف ہے جو بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی ہماری زندگی کی مختلف گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دیتی ہے۔ 1 ناول انگری لفظ ہے انگریزی ادب کے ساتھ ہمارے یہاں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا ہے۔ 2 ناول میں پرانے قصوں، افسانوں اور داستانوں کے برعکس انسانی زندگی کا قصہ ہوتا ہے اس لئے اسے موجودہ عہد کا رزمیہ بھی کہا جاتا ہے۔ 3 انگریزی زبان میں ناول کا آغاز اٹھارہویں صدی میں ہو چکا تھا مگر اردو میں اس کا وجود انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہی ممکن ہو سکا۔ مولوی نذیر احمد کی ناول ”مراۃ العروس“ کو اردو کا پہلا ناول مانا جاتا ہے جس کی تصنف 1860ء میں ہوئی تھی اردو ناول نگاری کا فن آج اپنے بام عروج پر پہنچ چکا ہے۔ اردو میں کئی ایسے ناول عالم وجود میں آچکے ہیں جنہیں بقائے دوام حاصل ہوچکا ہے

اور انہیں دنیا کے بہترین ناولوں کی صف میں فخر سے رکھا جا سکتا ہے۔ اردو ناول کے فن کو جہاں شرر، سرشار، نذیر احمد اور پریم چند نے پروان چڑھایا وہیں آغا شاعر دہلوی نے بھی اس صنف میں اپنا خون جگر صرف کیا۔ اگرچہ آغا شاعر نے اور لوگوں کے مقابلے بہت بعد میں اس میدان میں قدم رکھا پھر بھی ناول کے ارتقاء میں ان کا تعاون فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ تعاون قابل ستائش ہی نہیں بلکہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

آغا شاعر نے بیسویں صدی کے آغاز میں ناول نگاری شروع کی۔ انہوں نے فن اور موضوع دونوں اعتبار سے اس صنف کو مالامال کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں فنی دسترس کا احساس بھی ہوتا ہے اور مقصدیت بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں خاندانی نزاع کے بنیادی مسائل کو پیش کیا ہے وہ اپنے ناولوں کے ذریعہ تعلیم و تربیت نیز سماجی اخلاقی اور معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے ان کے یہاں میں سماج کا جاہل ہونا ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر سماج تعلیم یافتہ ہوگا تو عام لوگ کامیاب زندگی گذار سکیں گے اس کے علاوہ انہوں نے سماج کی کہنہ فرسودہ رسم و رواج کی طرف بھی ذہن کو مبذول کرایا ہے کہ اکثر اس کا انجام پریشان کن اور جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنے ناول کے ذریعہ سماج کے اندر خانگی ذمہ داریوں کے احساس کو جگانے کی کوشش کی ہے اور زبردستی شادی کے خطرناک نتائج کو اجاگر

کرتے ہوئے تعلیم و تربیت پر کافی زور دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق تعلیم یافتہ سماج اپنے معاشرہ کی گندگی کو اپنے عقل و شعور کے ذریعہ ختم کر سکتا ہے اور اپنی زندگی کو خوشگوار بھی بنا سکتا ہے۔

آغا شاعر دہلوی کے ناولوں میں نئے زمانے اور نئے تقاضے کی پکار سنائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی حقیقت پسندی اور فنکارانہ روش کا آغاز بھی ان کے ناولوں میں ماحول کا صحیح مشاہدہ اور اس مشاہدہ کا منطقی تجزیہ اور پھر ان دونوں کے ساتھ غور و فکر بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں گھریلو زندگی اور اس کے مسائل اور گھر کی چہار دیواری سے باہر گلی کوچوں، بازاروں، شاہراہوں میں گونجنے والے نعروں کو بھی پیش کیا ہے۔اس صنف میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے ان کے یہاں خالی خولی جذبات نگاری نہیں ملتی بلکہ ان کے خیالات فکر کے تابع نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں اپنے رجحانات و میلانات اور فلسفہ حیات کا عکس پیش کیا ہے۔ آغا شاعر کے کردار میں جو نفسیات اور تجزیاتی جھلک ملتی ہے وہ اپنے آپ میں مثال ہے۔ ماحول کا اثر انسان کی زندگی پر کیسے پڑتا ہے اسے انہوں نے اپنے ناولوں میں بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ اس لئے آغا شاعر کے ناولوں کو اردو میں جس حد تک نظر انداز کیا گیا ہے غالباً اس حد تک نہیں کرنا چاہئے تھا۔

آغا شاعر اپنے دور کے نمایاں ناول نگار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں متوسط طبقہ میں پروان چڑھنے والے لڑکے اور لڑکی کی محبت، نفسیاتی جذباتی زندگی اور وہ ماحول جس میں کہ وہ پروان چڑھتے ہیں۔ اس قدر تکمیل کے ساتھ اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان کی ناول نگاری اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل کرلیتی ہے۔ ان کے یہاں اخلاقی تقاضے اور قدامت پسندی کا سراغ ملتا ہے۔ اس طرح مشرق پسندی کے اعتبار سے آغا شاعر کو اردو ناول نگاری میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

آغا شاعر کے ناولوں میں ہندستانی رنگ نمایاں ہے وہ انگریزی ادب سے بخوبی واقف تھے اس لئے ان کے ناولوں میں مغربی تکنیک اور انداز فکر کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ ان کے ناول مشرقی حسن کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں انہوں نے فرد کی زندگی اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کو موضوع بنایا ہے۔ آغا شاعر نے اردو ناول نگاری کے کینوس کو وسیع کیا اور اس سلسلے میں ان کی اہمیت مسلم ہے۔ موصوف اردو ناول کی دنیا میں ایک بے باک اور باغی ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ان کے ناول خاندانی ٹکراو، بغض، کینہ، کشیدگی اور سماجی روایت سے بغاوت کے حامل ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ دہلی کے روایتی ماحول اور متوسط طبقہ کے معاشرہ میں ایسے اختلافات کے موضوعات پر انہوں نے کھل کر نشترزنی کی ہے کہ کبھی کبھی ان کی بے باکی حد کو پار کر جاتی ہے۔ لیکن

اکثر و بیشتر وہ حق گوئی سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں زیادہ تر اخلاقی اصلاح بھائی چارگی، اخوت و مروت کے پہلو نمایاں ہیں مگر ان کے ناولوں میں جنس کا پہلو بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس کی مثال ان کے ناول ''ہیرے کی کنی'' ہے اور ہو بھی کیوں نہیں کیا عورت اور مرد کے درمیان جنس ایک فطری جذبہ نہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان کہ بعد انسان شادی کرتا ہے یہ انسان کی چوتھی اور اہم ضرورت ہے۔ پھر اتنے اہم موضوع کو کیوں نظر انداز کر دیا جائے اس طرح آغا شاعر صاحب بیسویں صدی کے مقبول ترین ناول نگاروں کی صف میں کھڑے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ بیسویں صدی کے سماج کے بیشتر مسائل پر بڑی چابک دستی سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے ناولوں میں موضوع اور فن دونوں کا تنوع ملتا ہے انہیں کرداری نگاری کا بھی بڑا سلیقہ آتا ہے۔ ان کے ناولوں میں انسان کے نازک احساسات و جذبات پیچیدگی اور الجھاو کی زد میں ہے ان کے علاوہ موجودہ دور میں آغا شاعر کہ بعد بہت سے نام ہیں جو اردو ناول نگاری کے افق پر ستاروں کی مانند اپنی بھرپور چمک دمک کے ساتھ موجود ہیں۔

غرض یہ کہ ناول نگاری اور ناول نگاروں کا ایک کارواں سا نظر آتا ہے جو اپنی منزل کی جانب بڑی تیزی سے رواں دواں ہے ان ناولوں میں عہد حاضر کی منتشر اور مضطرب زندگی کے احوال کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا خواب بھی پنہاں ہے۔ اس میں حسن اخلاق اور حسن عمل پر بھی زور دیا گیا ہے اور بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی کا درس بھی ملتا ہے جو موجودہ دور کے

ناول کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ ان ناول نگاروں نے موضوعات کی رنگا رنگی اور وسعت کے ساتھ ساتھ اردو ناول کو دلچسپی اور دلنشینی سے بھی ہم کنار کیا ہے۔ اردو ادب کے مشہور ناقد وقار عظیم نے بھی اس کی حمایت کی ہے۔

آغا شاعر دہلوی کی ناول نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ ایوان اردو شمارہ 5 ستمبر 2002 صفحہ 32 پر یوں رقم طراز ہیں۔

آغا صاحب کے ناولوں میں نثر نگاری دلکش اور معتدل ہے موسم کی مرقع کشی" فردوس گوش و نظر ہے۔ بیانات ضروری اور مختصر ہیں، مکالمے فطری، دلچسپ، بر محل اور برجستہ ہیں۔ ناول میں ڈرامائی انداز کافی ہے۔ عشق وہی رسمی ہے لیکن قصے میں واقعیت کم تخلیقیت زیادہ ہے۔

:ڈاکٹر سہیل بخاری آغا شاعر کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہیں کہ

ان کی زبان ٹکسالی، پاکیزہ، شستہ اور رنگین ہے۔ اس پر روز مرہ محاورے خصوصاً " بیگماتی زبان پر بڑی قدرت ہے"۔ شاعر صاحب نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی اپنا " سکہ جما لیا۔ تمثیل نگاری اور ڈرامہ نگاری میں مقبول زمانہ کہلائے

غرضیکہ فن ، مواد، موضوع، اور اسلوب ہر اعتبار سے آغا شاعر کی ناول نگاری نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ ناقابل فراموش بھی ہے جسے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ انہوں نے مسلمانوں کی نااتفاقی اور نزاع، خستہ حالت، غفلت پر مبنی" ارمان" اور ناہید جیسے عمدہ ناول لکھے اور" ہیرے کی کنی" شعور کے رو پر مبنی تخلیق کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں اسلامی سوسائٹی ، خاندان کی اندرونی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کے ناولوں میں کردار صفات کے مطابق ہوتے ہیں۔ آغا شاعر یوں تو اردو ادب کی مختلف اصناف میں مہارت رکھتے ہیں مگر سب سے پہلے وہ ناول نگار ہیں۔ اخلاقی اصلاح تعلیم اخوت و مروت ان کے ناول کی بنیاد ہیں۔ ان کے یہاں کردار نگاری اور پلاٹ کی بہتات ہے۔ مکالمے دلچسپ دل کش اور موزوں ہیں۔ آغا شاعر قومی اصلاح کے بہت بڑے حامی تھے۔ ان کے ناول بیسویں صدی عیسوی میں عورت اور مرد دونوں طبقوں میں بے حد مقبول ہوئے جن کا اچھا اخلاقی اثر پڑا۔ آغا شاعر کی تحریروں میں روزمرہ محاورے کی صفائی اور زبان کے دلکشی ملتی ہے۔ آغا شاعر کی زبان دلفریب اور پر کشش ہے ان کا اپنا الگ رنگ ہے اور وہ اسی رنگ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ناول نگاروں میں آغا شاعر منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ویسے ناقدین نے موصوف کو سرے سے نظر انداز کر کے ناانصافی کی ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ اردو ادب میں نفسیاتی ناول کے ارتقاء کو سمجھے تو بغیر اس ایک قدم ابھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یوں تو انہوں نے کل پانچ ناول لکھے ہیں۔ ایک" طلسمی بدلہ"

انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ ''نقلی تاجدار'' ہیرے کی کنی '' ارمان''اور ناہید طبع زاد ناول ہیں۔ جو ناول کے فن پر مکمل اترتے ہیں اور اردو ناول میں مقبول بھی ہیں۔اس بات کی صراحت یوسف سرمست نے بھی اپنی تصنیف بیسویں صدی میں اردوناول صفحہ 98 کے چوتھے سطر میں کی ہے یہاں یکے بعد دیگرے ان کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

''ارمان ''

آغا شاعر دہلوی کا ناول '' ارمان'' اردو ناول کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں دو کردار '' جولی'' اور ناصر کی سچی محبت کو آغا شاعر نے پیش کیا ہے۔ گرچہ '' ارمان'' دوسرے دور کا ناول ہے مگر فنی لوازمات کے اعتبار سے اپنے آپ میں مکمل ہے۔آغا شاعر کے ناولوں کی خشت اول ہے جسے آغا شاعر نے اپنی باریک بینی نکتہ رسی اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کے سبب '' ارمان'' اپنے اصل سے کئی گنا پر لطف اور پر تاثیر ہو گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس ناول کو اردو میں نفسیاتی ناول کے اعتبار سے اولین درجہ حاصل ہے۔''ارمان'' آغا شاعر کا پہلا ناول ہے جو 1900ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔اس کا رنگ حد درجہ رومانی ہے جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ یہ ناول نفسیات بشری پر مبنی ہے۔پلاٹ کردار نگاری، مکالمے، زبان وادب ہر لحاظ سے دلچسپ اور مقصدی ناول ہے جس کا موضوع ایک خاندانی نزاع کا غمناک

اور دردناک نتیجہ ہے۔ ناول '' ارمان'' میں آغا شاعر نے یہ ذہن نشین کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ خاندان کے ہر فرد کو متحد ہونا چاہئے۔ ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کی جائے۔ والدین اپنی اولاد کی مجبوریوں کو سمجھیں۔ اس کے لیے والدین کو بغض، کینہ، حسد سے دور رہ کر اپنا کردار مثالی بنانا چاہئے۔

ناول '' ارمان'' بائیس مختلف ابواب پر منقسم ہے ہر باب کا تسلسل دوسرے باب سے ہے۔ ہر باب کا اختتام کسی نہ کسی نتیجہ اور انجام پر ہوتا ہے۔ اس ناول میں آغا شاعر نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی ہندوستانی مسلم گھرانوں کی روایت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس زمانہ میں مسلم سماج میں جو رسم رواج عقیدت، مذہبی، سیاسی، اقتصادی، معاشی عیش و عشرت۔ خاندانی نزاع انانیت غیروں سے دوستی۔ اپنوں سے بیر اور خصوصاً مخلوط خاندان کے اندرونی انتشار اور آپسی رنجشوں کو بڑی چابک دستی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں خاندانی نزاع پر بڑی اچھی کشمکش ملتی ہے ۔ پہلے باب کا خلاصہ اس طرح ہے۔

ڈپٹی کمشنر بہادر جنگ نواب بہت بڑے شرفا میں ہیں۔ خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ اپنی پر مسرت زندگی مع اہل و عیال کے گذارتے ہیں ان کی دو اولاد میں پروفیسر مظہر اور خورشید عالم ہیں۔ مظہر اعلی تعلیم حاصل کرکے پروفیسر

ہوئے اور خورشید پرانی دلی کی روایت کے مطابق علم سے نا آشنارہ جاتے ہیں۔ دونوں بھائی شادی شدہ ہیں۔ پروفیسر مظہر کی بیوی کا نا حیدری خانم ہے بیٹے کا نام ناصر احمد، محسن وغیرہ ہے۔اس کے بر عکس خورشید کی بیوی کا نام امراؤ بیگم اور ایک حورچہرہ بیٹی جوئی ہے۔ ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیگم اپنے وارثوں کے ساتھ کافی خوش ہیں مگر یہی دارالسرور جہاں خورشید کشمکش حیات میں مبتلا ہے۔کچھ دنوں بعد کمشنر کا انتقال ہو جاتا ہے اور خورشید کس وجہ سے قید و بند کی زندگی گذارنے لگتا ہے اس کی بیوی مغموم رہا کرتی ہے۔ جوئی اپنے تمام رشتہ داروں کے درمیان باپ کی غیر موجودگی میں مفلوک الحال رہا کرتی ہے اس بر عکس پروفیسر اپنے اہل عیال کے ساتھ پر مسرت زندگی گذارتا ہے۔

اس طرح آغا شاعر نے پہلے باب میں پرانی دہلی گھریلو مسائل کو بے باکی سے بیان کیا ہے جس میں کمشنر اور ان کی بیگم کے حالات اور دونوں بیٹوں کا احوال بیان کیا ہے جیسا کہ ناول کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بیٹا تو کافی خوش ہے۔ دوسرا قید وبند میں اور ان کی بیگم اور بچے مصیبت میں دن گذارتے ہیں۔ پھر یہ نیک صالح عورت امراؤ بیگم خدا پر بھروسہ کرتی ہے اور اپنے خاوند کو یاد کرکے خدا کا شکر ادا کرتی ہے جس کی تصدیق مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ہائے جس طرح گذاری ہے ہمیں جانتے ہیں

کہاں ڈھونڈوں تجھے اے ناز اٹھانے والے

بحر حال یہ شعر امراؤ بیگم کی مصیبت پر صادق آتا ہے۔البتہ اس کشمکش اور آشوب زدہ ماحول میں مظہر کا لڑکا ناصر اور خورشید کی بیٹی ''جوئی'' رشتہ کے چچازاد بھائی بہن ہونے کی حیثیت سے بہت میل جول کے ساتھ کھیلتے ہیں دوسرے باب میں صبح کی منظر کشی کی گئی ہے۔ کوئل کوکتی ہے باد صبا جھوم جھوم کر چلتی ہے دل و دماغ کو فرحت بخشتی ہے۔پھولوں کے مسکان اور کلیوں کے چٹخنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ نمازی صبح کے فرائض سے فارغ ہو کر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ سبھی کی زبان خدا کے ورد میں رطب اللسان ہے اور ایک گلشن ہے جو سرسبز اور شاداب ہے اس کے درمیان لوگوں کو سکون حاصل کرنے کے لئے چوکی دراز ہے اس موسم میں ناصر اور جوئی بھی ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ جوئی کی عمر گیارہ اور ناصر کی تیرہ سال ہے اس دل گدگدانے والے موسم میں دونوں کے محبت کی ابتدا ہوتی ہے سبھی باتوں باتوں میں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں پھر گھومنے لگتے ہیں تو کبھی تبخت پر جاکر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جیسا کہ آغا شاعر نے دونوں کی محبت کے بارے میں مندرجہ ذیل شعر کہا ہے۔

وہ تاڑ گئے اب تو خبر چھپ نہیں سکتی
کمبخت محبت کی نظر چھپ نہیں سکتی

غرضیکہ دونوں باغ میں ٹہلتے اور پھول توڑتے ہیں اور پھر جوئی ناصر سے واپس کے لئے اجازت چاہتی ہے اور کہتی ہے " میں گھر جارہی ہوں ورنہ پریشانی ہوگی " ناصر روکتا ہے اور کہتا ہے " کیا بے رخی ہے تم جارہی ہوں" جوئی جواب دیتی ہے۔
مجھے اب گھر جانے دو دیر ہوجاتی ہے تو ماں مارتی ہے اور وہ رونے لگتی ہے ناصر اس کی کلائی پکڑ کر کپڑا اٹھا کر مار کا نشان دیکھتا ہے اور نشان کو اپنے ہونٹوں سے چومتا ہے اس موقع پر آغا شاعر کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ کریں ۔

آستین ہٹکے.برق چمکی ہے
کیا کلائی ہے کیا کلائی ہے

ان نشانوں کو دیکھ کر ناصر آہ وزاری کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے تمہاری ماں تم پر ظلم وستم کر رہی ہے آخر کیوں ۔ میرے بھی تو ماں باپ ہیں۔ جوئی کہتی ہے تم امیر ہو میں غریب ہوں تم پر سب کا سایہ ہے اور میں لاوارث ہوں ۔ یہ سن کر ناصر کانپ جاتا ہے اور جوئی کے لئے اس کے دل میں محبت کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ جوئی اس طرح دل دکھانے والی بات نہ کرو۔ تمہاری

بات سن کو میں کانپ سا جاتا ہوں اور جوئی وہی پرانی بات دہراتی ہے۔ تم میرے ساتھ کیوں کھیلتے ہو میں تو ایک لاوارث لڑکی ہوں تم امیر باپ کے بیٹے ہو تمہارا ہمارا کیا ساتھ اور جوئی رونے لگتی ہے اور گھر کی طرف چل دیتی ہے۔ ناصر اس کا پیچھا کرتا ہے اور خوش آمدانہ لہجہ میں کہتا ہے کہ جوئی تم ناراض مت ہو چچا کوئی چھ ماہ میں آنے والے ہیں تمہارے لئے اچھے کپڑے اور سامان لائینگے اس جگہ آغا شاعر نے دونوں کی طفلانہ محبت کو بڑی چابک دستی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جب جوئی ناصر سے خوب متاثر ہوتی ہے تو وہ خوش ہو کر ناصر سے لپٹ جاتی ہے اور پھر دونوں پھول تو رنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ایک بھونرا جوئی کو ستانے لگتا ہے اور ناصر کہیں چھپ کر سب کچھ دیکھتا رہتا ہے جب جوئی پریشان ہو جاتی ہے تو ناصر کو آواز دیتی ہے۔ ناصر جوئی کو اپنے بازو میں بھر لیتا ہے اور بھونرے سے کہتا ہے '' مان جا بھونرے مان جا '' ۔جوئی پھولوں کی مالا بنا کر ناصر کے گلے میں ڈال دیتی ہے اور دونوں اپنے گھر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ پھر تیسرے باب میں آغا شاعر نے کشتر کی پر مسرت زندگی کو پیش کیا ہے۔.برسات کا موسم ہے عالی شان محل رؤسا لوگ ہیں۔ ساون کا مہینہ ہے لوگ رنگ رلیاں منا رہے ہیں عیش و مستی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہاں ناول نگار نے گلی قاسم جان کی رنگا رنگی کو دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بوڑھے جوان، عورت مرد سب مستیاں لے رہے ہیں وہیں ناصر اور جوئی اور ان کے والدین اپنے آبائی گھر میں نمایاں نظر آرہے ہیں۔ بیگم کشتر گاؤ

تکیہ لگائے پلنگ پر دراز ہیں چند بیبیاں ۔۔۔۔۔ ان کی خدمت میں یک ساعت غفلت نہیں برتتی اور چند قصہ کہانیاں کہتی ہیں ۔ موسمی ہوائیں چل رہی ہیں غضب کی چہل پہل ہے ۔ یہاں ہر طرح کی بیبیاں گور نمکین جوان لڑکی دوشیزہ، لال گلابی، سرمئی کلک رہنری رنگت برنگت کے دوپٹے اوڑھے ہوئے ملبوس گل اندام نمایاں نظر آرہی ہیں۔ کچھ ضعیفہ عورتیں سفید پوش مختلف قسم کی ترکاریاں چھیل رہی ہیں ۔ دوسری طرف میٹھی ٹکیاں سموسے گلگلے تلے جارہے ہیں ۔ دستر خوان میں لوازمات قرینے سے سجے ہوئے ہیں ۔ مہمانوں کو رسوم کے مطابق ہاتھ دھلائے جارہے ہیں لوگ کھانا تناول فرما کر کمشنر کے ممنون ہورہے ہیں ۔ کمشنر کا گھر ہر دن عید اور رات شب برات ہے۔ اس جگہ ہی ناصر اور جوئی اپنے والدین ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے ۔ اس ہماہمی میں ناصر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اپنی ماں کو آڑو پیش کرتا ہے ماں ناصر کو کوستی ہے کہ تم نے اپنے کپڑے گندے کرلئے ۔ ناصر کی بہن ذکیہ بھی کوستی ہے اور کپڑے دھونے کی تلقین کرتی ہے ۔ ناصر اپنے کپڑے دھولیتا ہے اور آڑو تقسیم ہونے لگتے ہیں ۔ حیدری خانم اپنے حصہ کے آڑو جوئی کو دے دیتی ہے اس پر ذکیہ الجھ جاتی ہے اور کہتی ہے کہ جوئی کو ایک زیادہ ملا ہے ۔ ناصر جوئی کی حمایت کرتے ہیں ۔ جوئی ایک آڑو ذکیہ کو دیتی ہے اس پر ذکیہ جھلاتی ہے اور امراو بیگم جوئی کو ڈانٹتی ہے ۔ جوئی شرمندہ ہوتی ہے ناصر جوئی کی حمایت کرتا ہے تو امراو بیگم ناصر کو ڈانٹتی ہے اور کہتی ہے کہ تم کون ہوتے ہو

جوئی کی حمایت کرنے والے ادھر حیدری خانم ناصر کو ڈانٹتی ہے اور ناصر ماں کے ڈر سے باہر چلا جاتا ہے اور جوئی بے زبان گھٹ گھٹ کر خون کے آنسو پیتی ہے۔ ذکیہ مزے سے آڑو چھیل کر کھاتی ہے۔ جوئی اور ناصر ایک دوسرے کے درد میں غرق ہیں اس موقع پر آغا شاعر نے ایک شعر میں دونوں کی ہمدردی ظاہر کی ہے۔

درد مندوں کو فقط اشارہ ہی کافی ہے
آہ کی ٹھیس لگی آبلہ دل ٹوٹا

جوئی ماں کے ڈر سے دور سے جنگل میں گھومتی ہے جہاں ناصر سے ملاقات ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر محبت کا دم بھرتے ہیں ناصر کہتا ہے کہ تم یہاں گھوم رہی ہو میں تیری فرقت میں گھٹا جارہا ہوں۔ دونوں کوئل کی میٹھی آواز کو یکسوئی سے سنتے ہیں اور اس میں محو ہو جاتے ہیں چوتھے باب میں خورشید قید سے رہا ہو کر پرائیوٹ نوکری کرتا ہے اور خوشیوں اور شادمانیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اس کی عکاسی مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

دنبالہ ان کی تند نگاہی میں آگیا
کھنچ کر کماں سے تیر گواہی میں آگیا

دیکھتے ہی دیکھتے بیگم کمشنر کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس کے اقرباء ماتم کرتے ہیں۔ حیدری بیگم اور مظہر دکھاوے کا واویلا مچاتے ہیں بہ نسبت خورشید

اور امراؤ بیگم کے۔ دونوں فریق میں نفرت کا جذبہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔

پانچویں باب میں ناصر اور جوئی کی محبت بام عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے بیقرار اور بیتاب رہتے ہیں۔ دونوں کی بیباکی دیکھ کر دونوں پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے اور دونوں چہار دیواری کے اندر ایک دوسرے سے الگ قید و بند کی زندگی گذارتے ہیں۔ ایک دن جوئی سیر کو جاتی ہے وہاں ناصر بھی آجاتا ہے۔ دونوں کی ملاقات تنہائی میں ہوتی ہے دونوں آپس میں خوب باتیں کرتے ہیں۔ جوئی بھائی کے خوف سے درخت کی اوٹ میں چھپ جاتی ہے۔ ناصر اس کا آنچل پکڑ کر کھینچتا ہے کہ اس وقت احمد اور مقبول آجاتے ہیں اور ناصر واپس بھاگ جاتا ہے۔ چھٹے باب میں احمد ناصر اور جوئی کے متعلق سب کچھ ماں سے بتلا دیتا ہے۔ امراو بیگم اسے کوستی ہے اور سخت پابندی لگا دیتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے لئے پریشان ہوتے ہیں اس طرح ان کے عشق کا پردہ فاش ہو جاتا ہے اور ساتواں باب شروع ہو جاتا ہے !

کیا تصور ہے واہ رے تصویر
اتر آئی ہیں دل میں یار کی آنکھیں
یاں پہ لب لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں

واں ایک خاموشی تیری سب کے جواب میں

آٹھویں باب کی شروعات کچھ اس طرح کی ہے۔ دونوں قید و بند میں پریشان ہیں اس کی نشاندہی جوئی کی اس گنگناہٹ سے ہوتی ہے۔

'' چپ رہ دل ناصر ناصر نہ کیا کر ''

نویں باب میں کشمیری دروازہ کا منظر ہے ناصر کالج میں پڑھتا ہے جہاں اس کے جگری دوست محسن سے ملاقات ہوتی ہے اور محسن ناصر سے ہم کلام ہوتے ہوئے یہ شعر پڑھتا ہے۔

شباب آنے نہ پایا کہ عشق نے مارا
ہمیں بہار کے لالے پڑے خزاں کیسی

دسویں باب میں مظہر اور حیدری بیگم اپنے فرزندار جمند کے بارے میں سوچتے ہیں کہ کس طرح اس کو اس راہ سے ہٹایا جائے تاکہ انٹرنس پاس کرلے آخر یہ بات طے پاتی ہے کہ والدین نے مکان میرے نام کر دیا ہے اس میں خورشید کا کوئی حق نہیں اس طرح خورشید کو اس مکان سے بے دخل کر دیتا ہے۔ گیارہویں باب میں مظہر اپنے بیٹے کو جادو ٹونے سے بچانے کے لئے ایک پیر صاحب کے پاس لے جاتا ہے اس کے ساتھ اس کی اہلیہ بھی ہوتی ہے وہاں پیر صاحب ان کے ملازم اور

دیگرمدعاخواں سے بات ہوتی ہے اور حیدری خانم تعویز لے کر لوٹتی ہے۔ بارہویں باب میں مظہر کسی عشق کا ذکر ہے اور پھر ناصر جوئی کو خط لکھتا ہے اور جوئی رو رو کر آخری سلام کے ساتھ معزرت خواہ ہوتی ہے۔ تیرہویں باب میں ناصر اور جوئی کی شادی کی بات ہوتی ہے مگر ناصر اس شادی سے انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جب میں خود کفیل ہو جاؤں گا پھر شادی کروں گا۔

یہاں آغا شاعر سے بھول ہو گئی ہے کہ جو لڑکا اپنی معشوق کی جدائی میں اپنی جان دے دیتا ہے اس کو قبل اس کے شادی سے انکار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس سے ناصر کے کردار میں فتور پیدا ہو گیا ہے۔ جو عاشق اپنی معشوق کے بچھڑ جانے سے خود کشی کر سکتا ہے وہ اپنی معشوق سے شادی سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔ صرف اس بنیاد پر کہ خود کفیل بن جاؤں جبکہ لڑکی کے کردار کو آغا شاعر نے بڑی دلکشی سے پیش کیا ہے جب ناصر خود کشی کر لیتا ہے تو جوئی اپنا گلا کاٹ کر اس سے ہم آغوش ہو جاتی ہے جس پر تھوڑی دیر کے لیے یقین کرنا ممکن نہیں مگر یہاں معاشقہ کا بیان ہے جوئی کے دل میں سچی محبت رہی ہو ممکن ہے والدین کی وجہ سے چھپا رکھی ہو مگر جس سے تجاوز کرنے پر وہ بیباکی کے ساتھ اس محبت کا اعلان کرتی ہے اور نتیجتاً خود کشی کر لیتی ہے۔

اس طرح جوئی بے وفائی کے باوجود باوفا ثابت ہوتی ہے مگر ناصر پیہم وفا کے

راستے پر گامزن رہ کر بھی شادی سے انکار کرنے پر بے وفا ثابت ہوتا ہے۔ یہاں آغا شاعر نے فن اور تکنیک کو بالائے طاق رکھکر جذبات سے کام لیا ہے۔

بہر کیف ناصر شادی سے انکار کرتا ہے۔امراؤ بیگم اور حیدری خانم میں جھڑپ ہوتی ہے اور اختلاف زور پکڑتا جاتا ہے چودھویں باب میں خورشید مقدمہ ہار کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ دوسری جگہ منتقل ہوجاتا ہے۔ ناصر کی عمر اٹھارہ اور جوئی کی سولہ ہے اس بات میں آغا شاعر نے پرانی دلی کے پر فضا ماحول رنگینی کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں رسم و رواج کے طور طریقہ غرضیکہ زندگی کے تمام شعبہ کی عکاسی کی ہے۔ مظہر اور حیدری خانم نے اطمینان کا سانس لیا مگر کہاں بلا تو اب آرہی ہے۔ ناصر آشق نا مراد جو جوئی سے ملنے کی تاک میں تھا۔ ناصر اپنے دوست محسن کے گھر جاتا ہے جو لالہ پیارے لال کا کرایہ دار تھا اس کے گھر کی چھت کے ذریعہ جوئی تک پہونچتا ہے جوئی اپنے بام پر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ پندرہویں باب میں مظہر ناصر کو اعلی تعلیم کی ترغیب دیتا ہے۔ سولہویں باب میں ناصر کے اوپر ظلم و تشدد کا ذکر ہے اس کی ذہنی کیفیت کی عکاسی آغا شاعر کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

گرے پڑتے ہیں پہلے سایہ سے
کچھ عجب اپنا حال ہے اب تو

ناصر کی والدین تین دن کے سفر سے واپس آتے ہیں اور بیٹے کے احوال سنکر ماں باپ کی محبت عود کر آتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے پھر سبھی لوگ ناصر سے لپٹ جاتے ہیں۔ادھر خورشید اور جوئی کی منگنی بلی ماران کے ڈاکٹر اولاد علی کے صاحب زادے محمود علی سے ہو جاتی ہے۔یہاں آغا شاعر نے فتح پوری ، بلی ماران، چاندنی چوک ساتھ ہی دریبہ کلاں، کوچہ بلاقی بیگم کا بہت دل کش منظر کھینچتا ہے اس طرح اس باب میں شادی کی بات پکی ہو جاتی ہے۔ مگر جوئی بہت پژمردہ ہے اس کے برعکس ناصر اٹھارہویں باب میں اپنے والدین سے نالاں ہے۔ وہ جوئی سے شادی کے لیے باپ کو خط لکھ کر ماں کے ذریعہ بھجواتا ہے۔ مظہر کالج سے واپس آتے ہیں تو سارا ماجرا حیدری خانم سناتی ہے ۔ مظہر صاحب کہتے ہیں جوئی کی شادی طے پا گئی ہے جو کم ذات ہے گھر میں ڈومنیاں اور ہجڑے ناچتے ہیں۔ اچھا ہوا میرا لڑکا بچ گیا۔ ناصر کا خط پڑھ کر بہت آبدیدہ ہوتا ہے۔ اپنی اہلیہ سے منشی گل باز گی بیٹی کے متعلق بات کرنا ہے حیدری خانم کہتی ہے کہ لڑکا کسی حال میں تیار نہیں ہے۔ ناصر صرف جوئی سے شادی کرے گا۔ورنہ اس نے اپنی رائے لکھ دی ہے۔ مظہر چارو ناچار اپنے بھائی خورشید کو منسوب کے بارے میں خط لکھتا ہے۔ انیسویں باب میں خورشید اس رشتہ کو منظور کرلیتا ہے اور ایک مقرر تاریخ کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس تاریخ تک میں انتظار کروں گا۔ اتنے میں خورشید کو تار ملتا ہے کہ مہاراجہ بیکانیر نے یاد کیا ہے وہ وہاں کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ بیسویں باب میں

جوئی کی حرما نصیبی مجبوری، اضطرابی بے چینی کو بڑے درد بھرے انداز میں پیش کیا گیاہے۔ وہ صرف ناصر کی یاد میں بے ہوش پڑی رہتی ہے۔ اکیسویں باب میں مظہر کو خورشید کا خط ملتا ہے کہ تو اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ دیکھو اچھا ہوا اب لڑکے پر پابندی لگا دو کہ کہیں جانے نہ پائے۔ جوئی کی شادی فلاں تاریخ کو ہو جائے گی پھر سب کچھ بھول جائیگا۔ ناصر پر پابندی لگ جاتی ہے مقررہ تاریخ ٹل جانے سے جوئی کی شادی محمود علی مڈل فیل سے ہو گئی۔ اس بات ناصر کو صدمہ پہنچتا ہے اور وہ اپنے والدین سے شکایت کرتا ہے کہ آپ وعدہ کر رکھا تھا کہ تیری شادی صرف جوئی سے ہو گی مگر ناصر کے والد کی مکاری دیکھئے کہ اس نے اس سے لا علمی ظاہر کی۔ آخر کچھ دن تو ناصر نے خوب رو رو کر جی ہلکان کیا اور گھر کے سارے افراد کو خوب بہ دعائیں دیں کہ تم لوگوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا پھر ایک دن وہ عاشق انتقال کر گیا۔ جب ناصر کے انتقال پر ملال کی خبر جوئی کو ملی تو جوئی نے بیباکی کے ساتھ سسرال اور دنیا والوں کو ٹھکرا کر اپنی سچی محبت کی گواہی دینے ناصر کی میت تک پہنچتی ہے اور خنجر سے اپنے حلقوم کاٹ کر ناصر سے ہمیشہ کے لئے مل جاتی ہے۔

اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ ناصر اور جوئی کی محبت سچی تھی اگر اس دنیا میں نہیں تو عالم برزخ میں دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے۔ آغا شاعر کے اس ناول کے انجام سے ذہن شوق لکھنوی کی مثنوی زہر عشق اور میر کی مثنوی شعلہ عشق کی

طرف جاتا ہے کہ دونوں مثنویوں کا انجام بھی اس طرح کا ہے۔

ناصر جوئی، امراؤ بیگم، حیدری خانم، مظہر ناول ”ارمان“ کے مرکزی کردار ہیں جن کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے اس کے علاوہ خورشید احمد، محسن منیر ذکیہ وغیرہ معاون کردار ہیں جو وقتاً فوقتاً بہ قدر ضرورت نمودار ہوتے ہیں۔اس ناول میں ایک پورے خاندان کو جگہ دی گئی ہے۔ جتنا اثر ناصر اور جوئی کے کردار پڑتا ہے اتنا کسی پر نہیں اس صورت میں ہم ناصر کو ہیرو اور جوئی کو ہیروئین کہہ سکتے ہیں۔ جوئی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ جیسا کہ ناصر نے بغاوت کرکے انانیت کی دیوار توڑ دی۔ جوئی سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے والدین اور رسم ورواج کی پابندی فرض سمجھ کر کرتی ہے۔ ایک طرف جوئی کا کردار اہم ثابت ہوتا ہے کہ جہاں وہ اپنے والدین کی عزت رکھ لیتی ہے تو دوسری طرف محبت کی خاطر بغاوت نہ کرکے اپنے کردار کو کمزور بناتی ہے جوئی کے لئے یہ ممکن نہ تھا اس لئے کہ وہ مجبور تھی وہ جوئی کہ کردار سے آغا شاعر نے بیسویں صدی کے مسلمانوں کی مشرقی روایت کو زندہ رکھا ہے کہ لڑکا اپنے رومانس کی خاطر بغاوت کر سکتا ہے مگر ایک مشرقی خاتون ایسا نہیں کر سکتی۔

دوسرا کردار مظہر کا ہے جو اپنے عہد کا نمائندہ ہے وہ ہر وقت اپنی بلندی پر

رہنے والا انسان ہے اس کا ذہن نیچے آنے کو تیار نہیں ہے۔ اپنے متکبرانہ مزاج کی وجہ سے خون کو خون نہیں سمجھتا اپنی انا کی خاص بھائی کو تباہی کے راستے پر چلاتا ہے اور بیٹے کے جذبات کو ٹھیس لگا کر لقبمہ اجل کا مزہ چکھا دیتا ہے۔ اس کے کردار میں مکاری عیاری، دغابازی بھری پڑی ہے۔ مظہر کا کردار ناول کو جلا تو بخشتا ہے مگر تنقیدی نقط نگاہ سے ذلیل اور بدمزہ کردار ہے۔

ناصر کا کردار جوئی کے کردار کے برعکس بے حد اہم اور نمایاں ہے جو ناول کے اوراق میں درخشندہ ستارے کی مانند چمک رہا ہے۔ مگر ناصر کا کردار بھی ایک جگہ کمزور پر تا دکھائی دیتا ہے کہ اس نے شادی سے صرف اس لئے نکار کیا کہ وہ خود کفیل نہیں تھا۔ یہ غدر سچے عاشق کے لئے جائز نہیں۔ ناصر کا باپ اس کے حال سے متاثر ہو گیا تھا اگر ناصر شادی کر لیتا تو مظہر ہو حال میں اس کی کفالت برداشت کر سکتا تھا۔ چند دن دقت ہوتی مگر اس کے بعد حالات سازگار ہوتے چونکہ ناصر کی ماں اس شادی کے لئے من و عن تیار تھی۔ یہ سچ ہے کہ عورت کے سامنے مرد کو جھکنا ہی پرتا ہے۔ ناصر کی ماں اس کی حمایت کرتیں۔ حالات سازگار ہوتے اور ناصر بھی تو روزی کمانے کے لئے کچھ کر سکتا تھا۔ تنقیدی نقط نگاہ سے ناصر کا کردار بھی کچھ ڈھیلا ڈھالا ہے مگر جہاں وہ زہر کھالیتا ہے تو دنیا میں اپنا مقام بناتا ہے۔ اس کے برعکس حیدری خانم کا

کردار شروع سے آخر تک صاف ہے۔ جیسا کہ ناول کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حیدری خانم امراؤبیگم کے تعلقات ہمیشہ سازگار رہے ہیں۔ مگر ایک جگہ جہاں ناصر آٹرو لیکر نمودار ہوتا ہے۔ اس جگہ ناصر کی اپنی بہن سے جھڑپ ہو جاتی ہے مگر جوئی کے ساتھ اس کا رویہ مناسب ہے اور اپنا آٹرو جوئی کو دے دیتی ہے دوسری جگہ امراؤبیگم اور حیدری خانم کے درمیان شادی کی بات ہوتی ہے تو حیدری اپنے بیٹے کی نالائقی پر امراؤبیگم سے الجھ جاتی ہے اور ناصر کا تعلق جوئی سے ختم کرنے کے لیے تعویز لیتی ہے۔ اس طرح خانم کا کردار بھی نقص سے پاک نہیں ہے لیکن موہم سا نقص ہے جو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس طرح خانم کا کردار بھی نمایاں ہے امراؤبیگم کا کردار بھی شروع سے معصوم اور سادہ نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر جب ہم تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو دونوں کا کردار اس میں جہاں باہمی رقابت ہی نہیں بلکہ مروت، محبت ملتی ہے اس طرح خورشید کا کردار اہمیت کا حامل ہے کہ مظہر نے مقدمہ کرکے زمین سے بے دخل کر دیا شادی کا پیغام دے کر بھی دغا کیا سب کچھ خورشید نے.برداشت کیا صرف اتنا کہہ سکا کہ بھائی ہے اس طرح اس نے انسانیت کا ثبوت دیا۔ بقیہ سبھی کردار ناول کی طوالت کے لئے ضمنی طور پر دئے گئے ہیں۔

ارمان ایک نفسیاتی ناول ہے اس کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے جو آغا شاعر کی زرف نگاہی کی پیداوار ہے۔ آغا شاعر کی سب سے.بڑی خوبی یہ ہے کہ ان تحریروں

میں اس سماج کی عکاسی ہے۔ انہوں نے اپنے دور پر بھی زبردست طنز کیا ہے۔ آغا شاعر کا ناول ''ارمان'' دلچسپی اور دلکشی بھی رکھتا ہے ان کے اس ناول میں چند چھوٹے کردار کے علاوہ سارے کردار شروع سے ناول سے ناول کے صفحات پر ہمارے سامنے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں ہم اس کی ذہنیت اور شخصیت سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔ جیسے حیدری خانم ایک معاون کردار بھی حیدری کے کردار سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ناول '' ارمان'' میں جذبات نگاری کی بہتات ہے جس کی بنیاد نفسیات انسانی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغا شاعر کی ناول نگاری کو رومانی کہا گیا ہے منظر کشی اس ناول کا زیور ہے جو واقعات و کردار سے قریب تر معلوم ہوتی ہے جس میں حسن و عشق کا دریا تلاطم خیز ہے۔

جس طرح شرر ناول کے ذریعہ تاریخ کے حوالے سے اسلام کی عظمت کو بروئے کار لائے ہیں اور راشد الخیری نے مشرقی روایات کو قائم رکھنے کی جستجو کی ہے اسی طرح آغا شاعر نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اس عہد کے مسلمانوں کی رومانی معاشرتی اور نفسیاتی زندگی پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل موصوف کا یہ رجحان مغربی تہذیب و تمدن کی یلغار سے محافظت کے حوالے سے وجود میں آیا تھا۔ انہوں نے ناول '' ارمان'' کے ذریعہ وہی کام انجام دیا جس کی تلقین اکبر الہ آبادی کی شاعری میں ملتی ہے اس ناول سے آغا شاعر نے مشرقی تہذیب کی مستحکم حمایت کی ہے۔ انسانی شعور کی رو کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ

یہ ناول فن اور تکنیک کے اعتبار سے مکمل اور مستحکم ہے۔ '' ارمان'' کے مطالعہ سے فلسفہ حیات کا پتہ چلتا ہے کہ۔ وہ تعلیم یافتہ سماج کی بنیاد ڈالا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے وہ تعلیم نسواں کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ماں کا گود ہی بچوں کا اولین مدرسہ ہوتا ہے۔ اس کے متعلق والگ اور وارن نے کہا ہے '' خاندان ہی انسان کی زندگی کے بارے میں سارے تصورات کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغا شاعر نے ایک خاندان کے نزاع کو روحانی پیار میں پیش کیا ہے۔ جس میں آغا شاعر نے دکھایا ہے کہ والدین کی بے توجہی اور نفرت کے سبب کئی معصوم جانیں ضائع ہو سکتی ہیں۔

اس ناول میں مظہر کے کردار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ مسلم ضرور ہے مگر اس کے خیالات مغربی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناصر کی شادی جوئی سے نہیں ہونے دیتا۔ اس مغربی رنگ کی بنا پر بھائی سے نفرت کرتا ہے۔ اس طرح مظہر کا کردار آغاز سے اختتام تک مغرب پرستی کا نمائندہ بن گیا ہے۔ کبھی سفر میں ہے تو کبھی کالج یونی ورسٹی میں کبھی شرفا کی مجلس میں نظر آتے ہیں اس طرح آغا شاعر کا ناول '' ارمان'' مشرقی پائداری اور قدامت پسندی کی حمایت اور مغرب پرستی سے انحراف کا آئینہ دار ہے اس کے علاوہ جتنے بھی کردار ہیں سبھی کردار مشرقی پائداری کی اچھی مثال ہیں اس طرح آغا شاعر کے ناول اپنی طرز میں کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ یہ ناول ان کو خوب شہرت بخشتی ہے۔

آغا شاعر جس کی اہتمام اور شدومد سے ارمان اور نفسیات کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ ناول '' ارمان'' میں پوری طرح رواں دواں ہے۔ اپنی انا کی خاصر جو لوگ معصوموں کی قربانی دیتے ہیں اس کے خطرناک انجام کو آغا شاعر نے ناول '' ارمان'' میں خوبصورت پیرائے میں پیش کر دیا ہے۔ انا کے ہجاری والدین کے درمیان کشمکش کی چکی میں دو معصوم پھول کس طرح پستے ہیں مگر انہیں اس کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ پھول ٹہنی سے بچھڑ کر خاک کے دامن میں سما جاتا ہے۔ انہیں باتوں پر ناول کا پورا پلاٹ گردش کر رہا ہے۔

ناول '' ارمان'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آغا شاعر مشرق کے دلدادہ تھے ہی مگر ساتھ ہی وہ مغربی تہذیب کی رنگارنگی سے اپنی ضرورت کی چیز حاصل کرنے میں گریز نہیں کرتے تھے ان کا ناول '' ارمان'' مشرقیت پر مبنی ہے مگر مغربیت کا رنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے جیسے مظہر کا کردار جو پوری طرح مغرب پرست ہے اور پھر اپنے اندر آغا شاعر نے مشرق اور مغرب کی خصوصیات کو پرو دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا شاعر رومانی تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ مگر اس کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔
آغا شاعر نے 1903ء میں '' ارمان'' کے علاوہ ہیرے کی کنی اور دیگر ناول لکھے۔

ان کے ناول اردو ناول کی ترقی میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ارمان میں خاندانی نزع اور افراد کی کشمکش کو بڑی چالاکی سے قلمبند کیا گیا ہے۔ فرد اور سماج میں جو آویزش ہوتی ہے اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ دونوں کی کشمکش سے اس تہذیبی امتزاج کا نقشہ سامنے آتا ہے جو بیسویں صدی کے پہلے سے ہی ہندوستان میں زور پکڑ رہا تھا۔ جس طرح ناصر کا کردار بدلتے ہوئے معاشرہ کا شکار ہے جیسا کہ مشہور ہے بیسویں صدی میں جسم و روح مادیت اور روحانیت کی کشمکش میں عام انسان کا اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے ۔ اس طرح اس عہد میں معاشرے کی تبدیلی سے فرد کی نفسیات پر جو اثرات پڑے اس کو ارمان میں بڑی فنکارانہ خوبیوں سے پیش کیا گیا۔ مقصد کے بارے میں کانٹ نے بھی ضروری اور اہم بتایا ہے یہ اور بات ہے کہ فن مقصدیت کا شکار ہو جاتا ہے مگر ناول میں مقصد کا ہونا فن کا نقصان نہیں کسی مقصد یا نظریہ کے بغیر کسی فن پارہ کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اس بارے میں ارتھر کو سلو کا یوں کہنا ہے۔ ہم کو فن کی مقصدیت کے متعلق کوئی اقتباس نہیں رکھنا چاہیئے کیوں کہ فن کے پیچھے کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور ہوتا ہے۔

ارمان مقصدی ناول ہے یہ اور بات ہے کہ ناول نگاروں کی نظر سے دور طاق نسیاں کی زینت بنا رہا ہے اس کا کردار اور پلاٹ اس نوعیت کا ہے کہ خود قاری اس سے نتیجہ اخد کرلیتا ہے کہ اس رول کی اہم ترین خصوصیت کرداروں کی

نفسیاتی پیشکش ہے۔ فوسٹر نے کہا ہے کہ " پوشیدہ جذبات کو پیش کرنا ناول نویس کا عظیم کام ہے ۔

ڈیوڈ سیل نے کہا ہے " انسانی فطرت سے مکمل آگہی ظاہر کرنا ناول نویس کا کام ہے۔ 9 انسانی فطرت اور نفسیات سے آگہی آغا شاعر کے یہاں بھی ملتی ہے جیسا کہ اس عہد کے دوسرے ناول نویسوں کے یہاں بھی۔ ایسا اس لئے ہوا ہے کہ آغا شاعر نے انسانی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ انگریزی منطق، ادب فلسفہ تاریخ غرض ہر شعبہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ ارمان میں کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ شروع سے آخر تک موجود ہے۔ فرائڈ نے کہا ہے کہ "فنکار تصور کی دنیا میں اس لئے محو ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقی دنیا میں اپنی خواہشات کی تسکین نہیں کر سکتا۔ 10 اور یہی چیز ارمان میں پیش کی گئی ہے اس طرح ناولوں میں کرداروں کی خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مگر ناول ارمان کا ہیرو منزل مقصود تک نہیں پہنچ پاتا ہے وہ جذبات و خواہشات دبا لیتا ہے۔ جو فرائیڈ کے متعلق صرف الم سے بچنے کے لئے دب جاتی ہے۔ 11 اس لئے کہ اس کو برقرار رکھنے سے سماجی قوت اسے تکلیف پہنچا سکتی ہے۔ اس لئے ایسی خواہش رد کر دی جاتی ہے۔ 12 مگر یہ لاشعور میں باقی رہتی ہے

اس ناول میں جوئی ناصر کی فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیتی ہے جبکہ ناصر کے لاشعور میں فطری خواہش پنہاں ہے اس کے برخلاف جوئی ناصر کی موت کی خبر سنتی ہے تو غیر شعوری طور پر اپنی محبت کا انکشاف کر دیتی ہے اس طرح آغا شاعر نے بالکلیہ نفسیاتی اسباب ظاہر کئے ہیں دونوں ہی خوش گوار زندگی گذارتے تھے مگر دونوں ذہنی مریض تھے کہ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو جانا چاہتے تھے جس کا پودہ بچپن میں ہی لگ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یونگ نے کہا ہے کہ " ہر مرد ایک عورت کی تمنا رکھتا ہے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لاشعور میں چھپی اس عورت کو تخیلی طور پر کسی وقت بھی جسمانی صورت دی جا سکتی ہے۔12 اس طرح ناصر نے بھی جوئی کو اپنے تصور میں بسا لیا تھا۔ یہ تصویر جوئی کی طرح تھی تو دل دے دینا لازمی امر تھا جیسا کہ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے پر جان چھڑک رہے تھے اس لئے جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو جذباتی ہو کر ملتے ہیں۔ یونگ کا قول ہے کہ والدین اپنی اولاد کو ایسی زندگی گذارنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جس کو وہ خود حاصل کرنا چاہتے تھے مگر نہ کر پائے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت زیادہ اخلاق پر زور دینے والے ماں باپ کے بچے غیر اخلاقی حرکتوں میں منہمک ہو جاتے ہیں یا پھر اس کے برعکس ہوتا ہے۔13 مظہر کی سخت گیری نے ناصر کے کردار میں یہی بات پیدا کر دی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ ساری بندشوں اور قیود کو توڑ کر آزاد ہو جانا چاہتا ہے اور اپنی نفسیاتی حالات کے ساتھ جوئی کی یاد میں محو رہتا ہے ساتھ ہی یہاں ایک اور

اہم واقعہ پیش آتا ہے کہ جوئی کی ماں ناصر کو یہ کہکر کوستی ہے کہ جوئی کون ہے تمہاری جو اس کی حمایت کرتے ہو۔ جو ناصر کو گراں گذرتا ہے۔ اس طرح آغا شاعر نے مخلوط خاندان کے ایک اہم نفسیاتی پہلو کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

آغا شاعر نے اس ناول میں جگہ جگہ نفسیاتی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور زندگی کی حقیقت شعارانہ عکاس کی ہے جیسا کہ سہیل بخاری نے ناول ارمان کے متعلق لکھا ہے۔ ارمان بھی ایک رومانی ناول ہے جس میں ایک خاندان کے نزاع کے المناک نتائج ’’ دکھائے گئے ہیں ۔اس ناول میں بڑی چابک دستی سے متوسط طبقہ کی خانگی معاشرت کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ مصنف نے جس اہتمام کے ساتھ دو معصوم دلوں میں محبت کا بیج ہویا ہے اور جس نفسیاتی انداز میں ان کی عمر کے ساتھ ساتھ اس ننھے سے پودے کو پروان چھڑھایا ہے وہ تاثیر درد او کسک میں آپ اپنی مثال ہے اول الذکر ناول کی جملہ خوبیوں کے علاوہ اس میں آغا شاعر کی حقیقت نگاری کا بھی کمال نظر آتا ہے۔ یہ ناول اپنی معصوم رومان کی دلکش آغاز اور فطری انجام لطیف و بلیغ کتابوں نفسیاتی اشاروں حقیقی مرقع کشی۔ واقعیت نگاری ڈرامائی انداز بیان اور کرداری ارتقاء اور پرتا ثیر مکالموں اعلی انشا پرداری کے باعث اردو ادب کا ایک نادر شاہکار ہے۔13

''ہیرے کی کنی''

ناول ''ہیرے کی کنی'' اردو ناول نگاری میں آغا شاعر کا وہ قیمتی سرمایہ ہے جس پر انسانی فلسفہ حیات کی بنیاد ہے۔ اس ناول کا پلاٹ ایک سولہ سالہ لڑکی کی نازیبا حرکت اور جنسی خواہشات کی لذت پر مبنی ہے اور نواب جہانگیر احمد کی نازیبا حرکات پر بھی اس ناول کی نوعیت دلکش اور دلفریب ہے۔ ناول کہ مطالعہ سے قاری کا دل و دماغ خوش رنگ ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق آغا شاعر نے لکھا ہے کہ ہیرے کی کنی ایک ایسا ناول ہے جس میں بیسویں صدی کی حکومت ہند کے ولی عہد کی ناشائستہ حرکات اور رومانس کو دلچسپ بنا کر پیش کیا گیا ہے ناول ہیرے کی کنی انیس باب پر مبنی ہے۔ ہر باب کا ربط و تسلسل ایک دوسرے سے یکساں اور قریب ہے۔ ساتھ ہی مفصل اور متعین نصب العین بھی اس میں کثرت سے نظر آتا ہے۔ ہیرے کی کنی میں جس ماحول کی عکاسی کی گئ ہے اس کا نصب لعین ہندوستانی حکومت کے ولی عہد کی نازیبا حرکات غیر ذمہ دار اور نا عاقبت اندیشی ہے جس کی آگ میں پوری ریاست جل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغا شاعر کا ناول ہیرے کی کنی جس میں بیسویں صدی کے اوائل ہندوستانی روایت، رسم ورواج، حکومت سیاست کا رنگ سماجی، معاشی سیاسی تعلیمی، مذہبی اقتصادی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں آغا شاعر نے دلی کے قدیم تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ ادنٰی اعلی کی سوسائٹی امرا'' روئسا'' کی محل سراؤں، گلی کوچوں بازاروں کی رنگ بر نگی زندگی کی مرقع کشی بڑے دلکش انداز میں کی گئ ہے۔

نواب جہاں گیر اور سلطانہ بیگم ناول کے مخصوص کردار ہیں جو ررومان کا مرکز ہے۔ دلی کی پرانی معاشرتی اور لاابالی پن فضا کا پروردہ ہے دوسری طرف دہلی کے نوابین کی مصاحبین کا نمائندہ ہے۔ دوسرے نمبر کا کردار کبریٰ کا ہے۔جس کی بنیاد بے وفائی پر ہے ۔مگر نواب جہانگیر دار ہوس کا شکار ہونے کی وجہ سے کبریٰ کو دل وجان سے چاہتا ہے اور پھر آخر میں کبریٰ کے بے وفائی بے حد شرمندہ ہوتا ہے اور پریشان رہنے لگتا ہے کہ سلطانہ بیگم جو کہ بچہ ایاز بن کر نواب کی خدمت میں آتی ہے وہ نواب کو صداقت پر مبنی زندگی گذارنے کی تلقین کرتی ہے اور اسے درس دیتی ہے کہ انسان کا فلسفہ حیات کیا ہے اور اس کے پیچھے خدا کی مرضی کیا ہے اس کو سمجھے اور اسکے مطابق زندگی گذارئے دنیا تو فرضی ہے۔ابدی زندگی تو عالم برزخ ہے اس کا سامان حیار کرو اسطرح سلطانہ بیگم کو بھی اس ناول کا اہم کردار مانا جاسکتا ہے جو مختلف حرب وضرب میں ماہر ہے سچا عاشق اور باغی دوشیزہ ہے حسین صحت مند ہے۔ سچائی کا ثبوت فراہم کرنا اس کا شغل ہے مجموعی طورسے ناول '' ہیرے کی کنی'' فنی اعتبار سے بڑے پایہ کی چیز ہے یہ اور بات ہے کہ اس میں رومان کا پہلو زیادہ ہے۔ مگرامراؤ سے لے کر غرباتک کی زندگی کا آئینہ دار ہے جو بیسویں صدی کی ٹھاٹھ باٹھ پر محیط ہے۔ یہاں ہیرے کی کنی کے پلاٹ کو مختصر طور پر قلم بند کرتاہوں اس سے ناول کی نوعیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

پہلے باب میں ناول نگار نے ایک سولہ سالہ لڑکی حمیدن کو پیش کیا ہے جو اپنی ماں کی بنائی میٹھی ٹکیا کھا رہی ہے اور اپنے عاشق کے متعلق سوچتی ہے اور والدین کو کوستی ہے کہ یہ لوگ میری شادی نہیں کراتے ۔ اس جگہ حمیدن جذبات کی حد کو پار کر گئی ہے۔ آغا شاعر نفسیات کہ ماہر نظر آتے ہیں اس عالم میں لڑکی کھانے پینے سے بے بہرہ ہے وہ ہمیشہ اپنے الجھن کے بارے میں سوچتی ہے کہ کہیں ہمارے پیار کو پڑوسی کی نظر نہ لگ جائے ۔ اچھن ایک سپاہی ہے جو حمیدن کا عاشق ہے جو روزانہ چھپ کر اس سے ملتا ہے مگر حمیدن چوری کی ملاقات سے گریز کرتی ہے ۔ وہ تو شادی کرنا چاہتی ہے شادی کی تکمیل نہ ہونے پر اپنے والدین کو کوستی ہے ۔ نازیبا الفاظ استعمال کرتی ہے اور خواہ مخواہ احساس کم تری کا شکار ہو کر پڑوس سے نفرت کرتی ہے اس باب میں ناول نگار نے لڑکی کے جذبات کو وسعت نظر سے پیش کیا ہے ۔ اس ناول میں فنی تکنیک کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے جس کی مثال باب اول میں ملتی ہے ۔ ساتھ ہی بیسویں صدی کے معاشرت کو بر قرار رکھنے کے لیے ایک سولہ سالہ لڑکی اس طرح کی بات سوچتی ہے جو اپنے جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے سب کچھ کر گذرنے کو تیار ہے ۔ اس لڑکی کا باغیانہ پن ظاہر ہوتا ہے یہی آغا شاعر کی خوبی ہے کہ وہ جس عہد کی بات کرتے ہیں اس کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں ۔

اس باب میں ناول نگار نے نواب جاگیر دار کے کردار کو پیش کیا ہے جو دہلی کے

جلیل القدر نواب کا لڑکا ہے جس کا حسن یوسف ثانی اور عدل نوسیرواں جیسا ہے وہ شروع سے ہی کبریٰ سے عشق کرتا ہے۔ والد کی زندگی تک اظہار نہ کر سکا والد کے رخصت ہوتے ہی پہلا حکم صادر کیا وہ کبریٰ سے شادی کے متعلق تھااس پر وزرا میں چہ مگوئیاں ہوتی ہے اس کی ماں نے اپنے خاندان کی عزت کا حوالہ دیکر سمجھایا مگر نواب نہ سمجھ سکا۔ سبھی نے عزت خاندان و وقار کا حوالہ دیا مگر بے سود لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا ملاحظہ ہو۔

گرچہ بد نامیست نزد عاقلاں

مالے خواہم ننگ و نام را

چنانچہ شادی کی تجویز ہوتی ہے طے شدہ تاریخ سے قبل ایک بڑی رقم خزانہ عامرہ میں سے پر بھو مالی کو نذر کیا جاتا ہے تا کہ اپنی برادری کے لوگوں کی آو بھگت کر سکے اس طرح جہاں گیر اور کیسری کی شادی ہو جاتی ہے۔

یہاں آغا شاعر نواب اوباشی کو بیان کرتے ہیں جو اپنے والد کے انتقال کے بعد کر رہاہے اس وجہ سے حکومت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور مزید یہ بھی بتانا چاہاہے کہ اگر کوئی ادنی لڑکی کو اپنانا چاہے تو اس کا کیا طریقہ تھا۔ لڑکے کی طرف سے بارات نہیں جاتی تھی بلکہ لڑکی کے والد اپنے ہاتھوں سے بیٹی کا ڈولا پہنچاتے تھے۔ ساتھ ہی انسانی جذبات کی تحلیل نفسی بھر

پورا انداز سے کی ہے کہ انسان کا دل کسی پر بھی آ سکتا ہے۔ مقولہ مشہور ہے۔

دل نہ مانے اچھوت ذات

پیاس نہ مانے دھوبی گھاٹ

آغا شاعر نے بیسویں صدی کے نوابوں بادشاہوں کے کارناموں کو دکھلایا ہے جس سے ان لوگوں کی نجی زندگی سامنے آتی ہے۔

تیسرے باب میں ریاست بھوپال کا منظر ہے جس کے ولی عہد کو بھی کچھ اس طرح کا مزاج ورثہ میں ملا ہے وہاں محفل سجی سے رقص و سرود کا دور دورہ ہے یا یوں کہا جائے کہ عیاشی کا سامان موجود ہے بھوپالی رسم و رواج کے مطلق شاہجہاں پوری، عربی، فارسی ترکی لکھنوی وغیرہ اہم بڑے بڑے فلسفی تشریف رکھتے ہیں جہاں جہانگیر بھی مہمان خصوصی میں شامل ہے۔ شاہزادہ بھوپال جلوہ افروز ہوتے ہیں لوگ مودب اور خاموش ہیں ایک نوجوان موسم کو مد نظر رکھتے ہوئے گرمی کو گفتگو کا موضوع بناتا ہے جس کی بنیاد فلسفہ پر ہے۔ لفظ گرمی سے گفتگو کا موضوع نقط زبان بن جاتا ہے وہ اس طرح کے ایک لکھنوی فرماتے ہیں ” ہم سے کوئی گرم ہو کر آیا کرے گا دنیا ہمارا لوہا مانے ہوئے ہے۔

دعوی زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے

اظہار بوئے مشک غزالاں کے سامنے

اس کے بر عکس جو ایک دہلی والے تھے ان کو بُرا لگا فوراً فقرہ چست کیا۔

زبان لکھنؤ دہلی سے اچھی

ہماری بلی اور میاؤں ہمیں سے

اس طرح زبان کا مسئلہ ختم ہوتا ہے تو زر کا مسئلہ آتا ہے۔ زر کے توسط سے بڑے بڑے عربی فارسی داں طرح طرح کی مثال سامنے لاتے ہیں اور زر کو دنیا کی سب سے بڑی چیز ثابت کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ تشبیہہ، استعارہ، مجاز مرسل۔ یعنی علم و عروض علم بلاغت کا پورا پورا سہارا لیتا ہے مگر اس کا انداز تجاہل عارفانہ ایک دوسرے کے ساتھ نوک جھونک یعنی بحث سے ایک دوسرے کو زیر کرنا ہوتا ہے انہیں باتوں پر تیسرے باب کا اختتام ہوتا ہے سب اپنے وطن کو کوچ کرتے ہیں۔

چوتھا باب جہاں گیر دار کا بھوپال سے واپسی پر لکھا گیا ہے نواب موصوف شان و شوکت سے گھوڑے کی سواری پر واپس ہو رہے ہیں۔ راستہ میں سلطانہ بیگم کا محل ہے جو اپنے محل سے دیکھتی ہے اور سوچتی ہے کہ یہی ماہتاب ہے جس کی گود میں کیسری مالن مچلتی ہے کاش یہ مجھے نصیب ہوتا یہی لڑکی سلطانہ ناول کی کامیابی کا راز ہے اچانک گھوڑے کا رکاب ٹوٹنے سے جہاں گیر حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ آغا شاعر نے نواب کی واپسی شام چھ بجے بتلایا ہے۔ دلی والے نواب

کی شان و شوکت گھوڑے کی تعریف پر کھارت کا شباب جنگل جھاڑی چرند وپرند کی آواز سرسبز پھولوں کی وادی دونو نواب کی دوستی جہانگیر کو مکمل گھوڑ سوار اور سلطانہ کی اضطراری کیفیت کو اتنا دلکش بنا کر پیش کیا ہے کہ منظر نگاری کا ہل باندھ دیا ہے۔ آغا شاعر کے اندر وہ صلاحیت موجود ہے کہ ایک جملہ کو کئی طرح سے کہہ سکتے ہیں۔ دلی کی ٹکسالی زبان پر مہارت ہے اردو تو گھر کی لونڈی تھی ہی۔

پانچویں باب میں احاطہ قلعہ معلّیٰ میں نظام احمد خان یعنی سلطانہ بیگم کے چچا کا عالیشان مکان ہے۔ جہانگیر مدعو ہے سلطانہ جہانگیر اور کیسری کے بارے میں سوچتی ہے کہ ایک مالن نے کیا مقام پایا ہے اور نواب کی تعریف میں شعر کہتی ہے۔

چشم بد دور ہیں کس درجہ میں پیاری آنکھیں
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تمہاری آنکھیں

یہ دوشیزہ سلطانہ بیگم اپنے والدین کی لاڈلی اور اکلوتی دختر نیک اختر ہے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے اپنے چچا کے دامن عاطفت میں اپنی جائداد کے ساتھ آزادی کی زندگی بسر کر رہی ہے وہ دنیا کے ہر ہر علم وفن کی ماہر ہے، حسن مجسم،اخلاق کا پیکر دور اندیشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔شام ہوتے ہی

تقریب ختم ہو جاتی ہے سبھی محو آرام ہیں۔ سلطانہ بیگم جو نواب پر فریفتہ ہے یہ سوچ رہی ہے کہ کس طرح میر ملاقات نواب سے ہو جائے اور نواب صاحب کی جوانی کو لوٹ لیا جائے۔ مگر وضع داری کا خیال کر کے درد قلب میں مبتلا ہو کر یہ شعر پڑھتی ہے

۔

سر میرا دیوانگی سے ہے یہاں دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کم خواب ہے

آخر سرہانے جا کر ایک بیش بہا انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر پہنا رہی تھی کہ نازک کلائی کی لوازمات سے نواب لطف اندوز ہو رہا تھا اور پھر بیدار ہو جاتا ہے۔ سلطانہ آدھی انگلی میں انگوٹھی چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے اور نواب جو کچھ دیکھا اس کا شاعر اس شعر میں ہے ۔

سہ چوری بدمست آں نگارے
بد شاخ صندلیں پیچید ہمارے

چھٹے باب میں کیسری بن سنور کر اس طرح بیٹھی ہے کہ جنت کی حور دھوکہ کھا جائے اس کے حسن اور آرائش کو شعری پیکر میں یوں ڈھالا ہے ۔

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو

طلب ہوتا ہے شانہ آئینے کو یاد کرتے ہیں

جہانگیر کمرہ میں داخل ہو کر کیسری سے پیار و محبت کی بات کرتے ہیں کیسری دیہاتی زبان استعمال کرتی ہے تو نواب اصلاح زبان کی تاکید کرتے ہیں اچانک کیسری کی نگاہ انگوٹھی پر پڑتی ہے وہ فریفتہ ہو جاتی ہے تو نواب انگوٹھی کیسری کی انگلی میں ڈال دیتے ہیں اور نواب آہ بھرتے آہ ملیح ہے تو صبیح ہے ۔

لگاویں کیوں نہ ایسی جنس پر ہم جان شریں کو
نمک بھاتا ہے ہم کو سانولی صورت پہ مرتے ہیں

ساتویں باب میں سلطانہ بیگم مردانہ لباس میں جہاں گیر کے دربار میں غلام محمد خان کی سفارش پر نوکری کے لئے داخل ہوتی ہے۔ نواب کو آداب بجالاتی ہے ۔ اپنا نام ایاز بتاتی ہے نواب ہنس کر کہتا ہے مجھے بھی اپنا تخلص محمود رکھنا ہی پڑیگا مگر نواب یہ سمجھ گیا ہے کہ یہ بچہ وہی سلطانہ بیگم ہے۔ آخر کار نواب اپنی بات ختم کرکے شب گذاری کے لئے معذرت خواہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اس وقت میری غیر حاضری کے لیے صبح تک معاف کر دو اور ازراہ کرم اس غریب خانہ پر آرام فرمایئے۔ حسرت اور کنکھیوں سے اس حور کو دیکھتے ہوئے محل کو تشریف لے گئے ۔ آٹھویں باب میں نواب باغ میں جلوہ افروز ہیں یہ باغ باد

شاہوں کا منظور نظر شاہ جہاں آباد سے کوئی تین چار میل دور ہے۔ نواب حوض کے پاس پانی سے کھیل کر لطف لے رہے ہیں۔ وہاں جوگی بچہ ایاز بھی محو گفتگو ہے نواب سچائی جاننے کی کوشش کرتا ہے مگر سلطانہ ہر حال میں اپنے کو ایاز ہی متعارف کراتی ہے اور تجاہل عارفانہ انداز میں بیزار ہو کر کہتی ہے۔

فقہ رہوں یہ نہیں عادت سوال جی نواب شکریہ ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ انداز تکلم قبل اس کے بھی میری کانوں میں گونج چکا ہے اور یہ مصرع ادا کرتا ہے۔

ظالم تیری باتوں میں قیامت کا اثر ہے ! نواب عالم اضطراری میں ایاز کو آغوش میں لئے کر اس کے ہونٹ کو اپنے ہونٹ سے چومتا ہے اور یہ شعر کہتا ہے۔

تمکنت یہ بھی کہے جاتے ہیں کوہ تمکین
نازکی یہ ہے کہ غمزے بھی اٹھائے کوئی

اس طرح نواب اپنی محبت ایاز پر آشکارا کر دیتا ہے اور کہتا ہے میں کیسری سے نفرت کر تا ہوں اور کہتا ہے کہ جہانگیر نہیں تو نہیں مگر محمود زندہ ہے اس لئے تم مجھے چھوڑ کر یا بھول کر مت جاوگے اس جملہ پر آٹھواں باب مکمل

ہوتاہے۔ نویں باب میں کیسری نواب کے گھر میں قدم رکھتے ہی نواب کو اپنے جوبن سے مسحور کرکے ہر چیز پر قبضہ کرلیتی ہے نواب کو باغ عیش میں عیش مناتے ہوئے تین دن ہوتے ہیں اس دن سے کیسری نے بھی عیش ونشاط کی محفل سجا رکھی ہے۔

کیسری نے سکندر خاں کے ساتھ عشق کا چکر چلا رکھا ہے۔ جہاں نواب سیر سپاٹے کو گئے ادھر کیسری بھی سکندر کے ساتھ عشق کرنے لگی ایسے موقع سے کیسری کی آوارہ گردی کو آغا شاعر کے اس شعر کے ذریعہ بیان کیا ہے۔

ہر روزِ عید ہے ہر شب شب برات
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کر

حتی کہ دونوں شراب وکباب میں مست ہو کر بہک بہک کر باتیں کرتے ہیں اور سو سو طرح سے اپنی جوانی ایک دوسرے پر قربان کرتے میں۔ ایک دوسرے سے جدا ہونے سے خوف زدہ ہو کر یہ شعر پڑھتے ہیں۔

ہے وصل میں بھی سحر کا کھٹکا لگا ہوا
جھونکے خزاں کے آتے ہیں فصل بہار میں

اور بڑی مایوسی سے کیسری نوجوان کو دیکھتی ہے کہ نواں بات اختتام کو

پہونچتا ہے اور دسواں باب " ایاز ہے تو جہاں ہے "کی صدا کے ساتھ نمو پذیر ہوتا ہے ۔ نواب صاحب ایاز کو حکم دیتے ہیں کہ کیسری کو بلائے (جب سلطانہ ایاز کے بھیس میں کیسری کو یہ خبر دیتی ہے تو دونوں میں نوک جھونک ہوتی ہے خیر کسی طرح کیسری نواب کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے اور اپنی شوخی سے نواب کو مجبور کرکے ایاز کو نکال دینے کی التجا کرتی ہے نواب اس پر برہم ہوتا ہے اس سے کیسری سہم جاتی ہے مندرجہ شعر پر باب ختم ہوتا ہے۔

خاکساران جہاں رابحقارت منگر

تو چہ داتی کہ درمیں گرد سوارے باشد

گیارہویں باب کا آغا اس طرح ہوتا ہے کہ نواب جہانگیر ایاز اور وزیر نواب حبیب خاں سج دھج کر شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ گھوڑے پر سوار شکار کو جاتے ہیں ۔ راستے میں ایاز اور نواب کے مابین بہت ساری باتیں ہوتی ہیں ۔ ایاز کیسری کی بے وفائی کا بھی ذکر کرتی ہے اس پر نواب کو بدگمانی ہوتی ہے البتہ شکار میں شیر کے خوفناک حملہ سے ایاز نواب کو بچالیتی ہے اور بہادری پر خوش ہو کر رباعی پڑھ کر داد تحسین دیتا ہے بارہویں باب کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ کیسری نے نواب کے ڈانٹنے پر رو رو کر اپنا خون کرلیا ہے۔ نواب کو شکار میں گئے ہوئے تیسرا دن ہے ایک ضعیفہ نازل ہوتی ہے اور کیسری کو بتاتی ہے کہ تمہارا پردہ فاش ہو گیا ہے۔ ایاز نے سارا قصہ نواب کو

تمہاری بے وفائی کا بتا دیا ہے جس کی خبر حبیب خاں وزیر کو بھی ہو گئی ہے تیرہویں باب میں ایک اچکا لڑکا سکندر جاہ بیگ کی انگوٹھی فروخت کرنے جاتا ہے جو نواب کی انگلی سے نکال کر کیسری نے پہن رکھی تھی اس نے سکندر جاہ کو تحفہ میں دی تھی۔ بازار میں مول چند اور اس کی بیوی جئی دئی کے درمیان کافی تکرار ہوتی ہے۔ چودھویں باب میں سکندر جاہ یعنی کیسری کا عاشق ایک ضعیفہ کو اس بات پر معمور کرتا ہے کہ ایاز جہانگیر کا قتل کر دیا جائے۔ اس لئے ضعیفہ سکندر جاہ کے پاس جاتی ہے اور وہ ساری کہانی کہہ سناتی ہے کہ کیسری کا برا حال ہے اس لئے کہ ایاز نے تم دونوں کے عشق کا پردہ نواب کے سامنے فاش کر دیا ہے سکند جاہ ضعیفہ سے کہتا ہے کہ جاو کیسری کو تشفی دو ۔ کھان کھلاؤ اور بے فکر رکھو جوگی بچہ یا نواب جہاں گیر کی اوقات ہی کیا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں کیسری کا بال بانکا نہ ہو گا ضعیفہ کہتی ہے کہ مجھ سے کیسری نے یہ بھی کہا ہے کہ جب تک جہانگیر دار کو یا ایاز کو قتل نہ کروگے تو میں زہر کھالوں گی۔ سکندر جاہ کہتا ہے تم جاو اور سکندر جاہ نے جہانگیر کے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

پندرہویں باب میں جئے دئی ایک اوباش عورت ہے جو بنیا مول چند کی بیوی ہے سید خاں سپاہی یعنی حمید کا باپ جہانگیر دار کی نوکری کرتا ہے جو کیسری کا پہریدار ہے۔ رات کوئی ڈیرھ بجے کا عمل ہے سید خان جمعراتی دروازہ کی طرف

سے آواز لگاتے ہوئے معشوقہ سے ملنے جاتا ہے وہاں جیٔ دئی اور سید خان میں بات چیت پیار ومحبت کی ہوتی ہے۔ جیٔ دئی وہی انگوٹھی دکھاتی ہے جس کو اس نے مسلمان چوراچکے سے خریدا ہے واپس گھر لوٹ کر انگوٹھی اپنی بیوی کو دیتا ہے مگر اس کی بیٹی حمیدن ضد کرکے ماں سے لے لیتی ہے اور عاشق اچھن کو تحفہ میں دے دیتی ہے جو نواب جہانگیر کا سپاہی ہے۔ سولہویں باب کا آغاز شام کا منظر چرند وپرند کا شوروغل کارخانوں کی آوازیں چمنی کا دھواں چھوٹے چھوٹے باغ کے مناظر سے شروع ہوتا ہے یہاں نواب صدیق حسن خاں صاحب کا مقبرہ ہے اس وقت اس مقبرہ کے رو.برو دو سوار آپس میں باتیں کرتے جارہے ہیں یہ نواب جہانگیر اور ایاز کی گفتگو تھی۔اچانک سکندر جاہ موقع پاکر حملہ کرتا ہے اور پہلے ہی وار میں جہانگیر دار گھائل ہو جاتا ہے۔ نواب کا یہ حال دیکھتے ہیں ایاز تاب نہیں لاسکا اپنا ریوالور نکال کر سکندر جاہ پر وار کرتا ہے جس سے اس کا بایاں ہاتھ اور گردن جسم سے الگ ہو جاتا ہے۔۔۔ اس شعر پر سولہویں باب کا اختتام ہوتا ہے۔

جان پر کھیل کے عاشق کو بچالیتے ہیں
تم نے دیکھے ہی نہیں ناز ونزاکت والے

سترہویں باب میں تین دن سے پتلی گھر کے پاس ایک لاش پڑی ہے پولس والے تنقیش کر رہے ہیں مگر لاش کی شناخت نہیں کرسکے اس لئے کہ سر ہی غائب ہے جیب سے

ایک کارڈ نکلتا ہے جس سے شناخت کیا گیا کہ سکندر جاہ ہے۔ آخر اس کے بوڑھے ماموں نے اس کی تجہیز و تکفین کر دی اس کے بعد خفیہ پولس والے ان کے وراثوں سے مرحوم کے متعلق پوچھ تاچھ کرتے ہیں یہ بات غلام احمد یعنی سلطانہ بیگم کے چچا کو بھی معلوم ہوئی جو کافی پریشان ہوا کیونکہ وہ ابھی ابھی وارثوں کو صبر کی تلقین کر کے آئے ہیں اور اپنے کمرہ میں گئے یہ کہکر کہ سلطانہ کو میرے پاس بھیج دو اتنے میں سلطانہ گلدستہ لئے شوخی کے ساتھ نازل ہوتی ہے اور مندرجہ ذیل شعر پڑھتی ہے۔

گل گلدستہ کرکے آئی ہے وہ صحن باغ سے
تفریح ٹپکی پڑتی ہے ان کے دماغ سے

غرض مسکراتی ہوئی چچا کے کمرہ میں جاتی ہے دونوں چچا بھتیجی میں بات چیت ہوتی ہے اور اس حال میں واپس ہوتی ہے اپنے کمرہ میں جاکر الماری سے ڈھکا ہوا ایک خوان اور ایک سربند خوانچہ نکالتی ہے اور مسٹنڈی سیاہ فلم عورتوں کو لے کر لیسری کی خدمت میں بھیجدیتی ہے۔ اور سلطانہ خوش و خرم دن گذارتی ہے اٹھارہویں باب میں نواب جہانگیر دار اپنے محل میں ہے اور ایاز کے فراق میں غمگین ہے ایاز اس وقت اس کی مصاحبت سے غائب ہو گیا جب سکندر جاہ کا قتل کر کے اس کا سر حاصل کر لیا اور نواب جہانگیر ہوش میں آیا تو وہ اکیلا تھا مگر اس کے سامنے اس کا دشمن گر کر تڑپ رہا تھا۔ نواب موصوف کو اسی وقت اندازہ

ہو گیا کہ ایاز نے ہی میری جان بچائی ہے سارے درباری نواب کی مزاج پرسی کرتے ہیں جن میں اچھن بھی ہے۔ اچھن خیریت پوچھکر نبض دیکھنے لگتا ہے کہ نواب کی نگاہ انگوٹھی پر پڑ جاتی ہے اور پوچھنے لگتا ہے کہ اچھن یہ انگوٹھی تمہارے پاس کہاں سے آئی ۔ یہ وہی اچھن ہے جس کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے جس پر سولہ سالہ لڑکی حمیدن قربان جاتی ہے اور شادی کے رسم ورواج سے گذر کر اچھن کے ساتھ زندگی گذارنا چاہتی ہے مگر اچھن جہانگیر دار کے یہاں ملازمت کرتا ہے جس کی وجہ سے آزاد کی زندگی گذارنا مشکل ہے۔ اچھن اور حمیدن کے تعلقات ناجائز ہیں مگر نکاح سے بے بہرہ اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ سید خاں سپاہی سے مول چند کی بیوی اور سید خاں کی بیٹی حمیدن اچھن سے عشق فرماتی ہیں جن لوگوں کے دل میں عشق کا دریا طلاطم خیز ہے آغا شاعر کا یہی نکتہ ان کے ناولوں میں نفسیاتی اور رومانی ناول نگاری کا سراغ دیتا ہے۔
انیسویں باب میں نواب صاحب وہ انگوٹھی اچھن کے ہاتھ میں دیکھکر آگ بگولہ ہو جاتے ہیں اور اچھن سے سوال کرتے ہیں کہ سچ بتا تو نے یہ انگوٹھی کہاں سے حاصل کی فوراًاس کو گمشدہ ایاز کا خیال آگیا جس نے اس سے کہا تھا کہ آپ کو اپنی منکوحہ کی پاکدامنی پر کس درجہ یقین ہے۔ اب وہ سوچنے لگا کہ یہ انگوٹھی کیسری کو دی تھی اور اب یہ اچھن کے پاس ہے۔ قبل اس کے یہ بھی معلوم ہوا کہ کیسری بد چلن ہے بس کیا تھا نواب جلال میں آگئے مگر حاضرین

مجلس کا احترام کرتے ہوئے اچھن سے انگوٹھی کے بارے میں نرمی سے پوچھا اچھن نے شرماتے ہوئے کہا کہ یہ انگوٹھی میں نے سید خاں سپاہی کی بیٹی سے حاصل کی ہے اس کے بعد سید خاں کو بلایا جاتا ہے۔ دریافت کرنے پر وہ بتلاتا ہے کہ مجھے یہ انگوٹھی مول چند بنیا کی بیوی نے دی تھی یہ میری بیوی کے پاس تھی ہو سکتا ہے میری بیٹی نے ماں سے ضد کرکے لے لی ہو مگر پیر و مرشد آپ تک کیسے آئی پھر یاد آیا شاہ نے مول چند کے بارے میں معلوم کیا کہ بنیا کون ہے۔ سید خاں نے بتایا کہ مول چند ایک بنیا ہے جس کی بازار میں دکان ہے۔ نواب کے حکم سے دو سپاہی بنیا کو لے کر عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بنیا بتاتا ہے کہ حضور ایک مسلمان چھوکرا جو مفلس تھا بیچنے کو آیا تھا میں نے خرید لی اس کے علاوہ انگوٹھی کی بابت میں اور کچھ نہیں جانتا۔

بیسویں باب میں نواب صاحب اپنے باغ میں بیٹھا انگوٹھی کے متعلق سوچتا ہے کہ ایک انگوٹھی کی وجہ سے کیسری کی بھی جان گئی اور سکندر جاہ کی بھی وہ غمگین ہو جاتا ہے اس عالم میں ان کا ملازم اسے ایک خوشنما لفافہ پیش کرتا ہے جسے کھول کر وہ پڑھنے لگتا ہے ۔

اکیسویں باب میں نواب جہانگیر دار سلطانہ کا خط مزے لے لے کر پڑھ رہے ہیں جس کا پہلا جملہ ہی اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

عید آتی ہے کہ آئی ہے گھڑی ہیرے کی
کیا گلے ملتی ہے اک ایک لڑی ہیر کی

جوگی بچہ کے بچھڑ جانے سے نواب جو خود کشی پر آمادہ تھا خوشی سے باغ باغ ہو گیا اور شاہانہ جوڑے میں ملبوس غلام احمد خان کے یہاں جلوہ افروز ہوا۔ جہاں ان کا شاندار استقبال ہوا اور سلطانہ نے پس پردہ کیسری اور سکندر جاہ کی موت کا ماجرہ سنایا بس اب کیا تھا نواب جو پہلے ہی سے سلطانہ بیگم کے حسن پر ہزار جان سے فریفتہ تھا مگر اس کی جرات ودلبری اور حیرت انگیز کارنامہ دیکھ کر غلامی لکھ دینے پر آمادہ ہو گیا اور فوراً شادی کی تیاری ہوئی اور شادی ہو گئی اور بھوپال میں یہ خبر پھیل گئی کہ نواب جہانگیر دار نے سلطانہ بیگم غلام احمد ان صاحب مقصد خاص کی ایک لائق و فائق تیر دل عدیم المثال بھتیجی سے شادی کر لی اس طرح اس شعر پر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔

بشر کو صبر نہیں ورنہ یہ مثال سچ ہے
کہ چپ کی داد غفور الرحیم دیتا ہے

جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ ’’ ہیرے کی کنی‘‘ منصف کا طبع زاد ناول ہے جو حد درجہ رومانی ہے۔ ویسے اس ناول میں صنفی طور پر بہت سے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں مگر خاص طور سے جہانگیر دار اور سلطانہ کا کردار اہم ہے

اس میں سلطانہ بیگم کے کردار کو اولیت حاصل ہے۔ یہی دونوں کردار ناول کی روح ہے جو پورے ناول کے گرد طواف کرتے ہیں یہ ناول پورے اکیس باب پر مشتمل ہے ہر باب کا اختتام ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اگر کوئی قاری چاہے کے چند باب پڑھ کر کوئی فیصلہ صادر کرے تو یہ ممکن نہیں۔ ناول ہیرے کی کنی میں آغا شاعر نے تسلسل قائم رکھنے کے لئے اپنی غیر معمولی استعداد کا استعمال کیا ہے۔ اس ناول کے تنقیدی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حمیدن اچھن، جئی دئی، مسیت خان ، نواب جہانگیر دار سکندر جاہ سب کے سب عشق کے دلدادہ ہیں جو ہمہ وقت کسی نہ کسی صورت میں عشق کی آگ میں جل رہے ہیں مگر سب کا عشق چوری چوری ہے مکمل آزاد نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم گھرانوں میں بے پردگی نہیں تھی۔ آغا شاعر نے بیسویں صدی کی رسوم کو ملحوظ رکھا ہے اور اس زمانے کی زندگی کا ہر شعبہ سمٹ کر سامنے آجاتا ہے۔ جیسا کہ دوسرے باب میں نواب جہانگیر دار شادی کے لئے تیار ہے اور اس کی ماں خاندان کی وضع داری ختم ہونے کے خوف سے منع کرتی ہے مگر نا اہل بیٹے کی کرتوت پر مجبور ہو کر ماں کیسری کو گھر لاتی ہے۔ یہاں جذبات کو خاص دخل ہے کہ ایک ماں بیٹے کو ہر حال میں قبول کرتی ہے۔ جہاں ذات کے مسئلے پر وزیروں میں چہ مگوئیاں ہوتی ہیں کہ ایک مسلم نواب ہندو لڑکی سے شادی کرتا ہے اس سے سیاست کا خوفناک نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ کہ غریب پر بھومالی کی زبان بند ہے اور وہ اپنی لڑکی کا ڈولا نواب کے یہاں پہنچا دیتا ہے۔ تیسرے باب

میں آغا شاعر نے امیر زادی کی مجلس ناچ گانے اور عیش کے لوازمات کو پیش کیا ہے اور بھوپال کی مجلس عاملہ کی منظر کشی چابک دستی سے کی ہے جس سے ان کی فن پر دسترس کا ثبوت ملتا ہے۔ منظر نگاری میں موصوف کو قدرت ہے چاہے کسی جگہ کی ہو اس کو پر اثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جب ہم ان کی ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی منظر نگاری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں منظر نگاری کر کے آغا شاعر نے منظر نگاری کے باب کا دروازہ کھول دیا ہے اور مکالمہ نگاری کے موتی پرو دیئے ہیں اس ناول کے ہ تنقیدی مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچا جا سکتا ہے کہ نواب صاحب کے گھر کیسری ایک رکھیل کے طور پر رہی ہے اس لئے ناول میں کہیں بھی کلمہ اور عقد پڑھانے کا ذکر نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ نواب صاحب کی ماں نے رسم کے مطابق کیسری کو اٹھا کر دیوان خانہ میں پہونچا دیا اس سے شادی ہونا قطعی ظاہر نہیں ہوتا ہے اس ناول میں بنیا وغیرہ کا کردار صرف ناول کو طول دیتے ہیں اور قصہ کو دلچسپ بنانے کے لئے پیش کیا ہے۔ غلام محمد خاں کا کردار صاف اور سادہ نظر آ رہا ہے۔ جیسا کہ اس نے سلطانہ کو نواب کے گھر نوکری دلا کر سلطانہ بیگم کی مدد کی۔ اس ناول میں آغا شاعر نے خاص طور سے طبقہ اعلی کہ معاشقہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ شرفاً کو گھر میں بھی رنڈیاں ناچتی ہیں جو اپنے آپ کو عزت دار جانتے ہیں مگر انہیں شرفا میں سلطانہ بیگم ایک مرحوم نواب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ناول میں اس کا کردار سب سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے جس کا

ذکراس سے قبل بھی آچکا ہے۔ عزت و شرافت کے ساتھ اس کے دل میں شادی کاجذبہ موجزن ہے جس کی بدولت وہ مختلف قسم کی اذیت اٹھاتی ہے۔ ناول ''ہیرے کی کنی'' کا پورا پلاٹ اسی کے ارد گرد گھومتا ہے اس کے برعکس نواب کا کردار ارتقائی ہے انہوں نے عالم شباب میں نگاہ عشق کا شکار ہو کرایک مالن کو اپناتو لیامگر بعد میں بھید کھلا تو اپنے فیصلے پر کر افسوس بھی کیا اور جب عشق کا نشہ زائل ہوا تو اپنی خاندانی شرفت یاد آنے لگی اور آخر میں نواب کیسری سے کنارہ کش ہو کر جوگی بچہ ایاز یعنی سلطانہ بیگم کی طرف رجوع ہوئے۔

آغا شاعر کچھ اس انداز سے اپنے کرداروں کو ابھارتے ہیں کہ ناول'' ہیرے کی کنی'' شروع ہوتا ہے لفظ'' میں'' سے یہ ایک کنواری لڑکی کا ''میں'' ہے اس کے شعور کی روسے اس کا کردار اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے۔

میں یہ میٹھی ٹکیا جو اماں نے بڑی چاو سے پکائی ہے، کھا تو رہی ہوں لیکن رہ رہ کر تم'' یاد آرہے ہو قسم ہے نوالہ حلق سے نہیں اترتا۔ حیران ہوں کہ ان کی بیچینیوں کا ایک دن کا کیا نتیجہ نکلے گا اچھا میں کہتی ہوں کنوار پنا تو ساری دنیا کا ہوتا آیا ہے یہ خدائی مار ہمارا کنوار پنا کون ناری کا حسن چلا ہے کہ ایک گھڑی نگوری چین سے نہیں کٹتی۔ تو یہ ہے اماں باوا آپ تو

چین کرتے ہیں لیکن ہمیں یوں ہی پچھتوا کرکے بٹھا رکھا ہے کہیں کوئی بات ہی نہیں سمجھ میں آتی ۔14

وہیں آغا شاعر ایک دوسری لڑکی کے کردار کو اس طرح بیان کرتے ہیں

شاید وہ لڑکی ایسی ہی قبول صورت ہو جس پر ایک دیکھنے والے کی نگاہیں قربان ہو " جاتی ہوں پھر تو تعجب نہیں ہے اگر نواب اس پر جان دیتا ہے لیکن ہائے امید میں کہتی ہوں ہر شخص تو قربان ہو جائے جوتی کی نوک سے ہو جائے نواب جہانگیر جیسا بھی تو حسن مجسم ہے خود پھر اس کی بلا کو کیا غرض پڑی تھی جو اس رذیل قوم سے آنکھیں لڑائی توبہ ہے ۔" ح15

اس طرح آغا شاعر کا ناول "ہیرے کی کنی" نہایت دلفریب ہے مکالمے فطری.برا محل اور .بر جستہ ہیں ناول میں ڈرامائی انداز نمایاں ہے۔

" ناہید "

ناہید" بھی آغا شاعر کا اہم ناول ہے جو دو پلاٹوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے پلاٹ میں " ناہید اور جہاندار کے عاشقی کا احوال ہے اور دوسرے پلاٹ جہاندار کی خواہر اور" ناہید کے بھائی منجھو صاحب کے پیار و محبت کا ذکر خیر ہے دونوں دو الگ الگ خاندان کے " افراد ہیں ۔ دونوں خاندانوں میں کشمکش صدیوں سے

اس دور کی روایت کے مطابق چلی آرہی ہے ٹھیک اس طرح جس طرح ''ارمان'' میں ایک ہی خاندان کی خانگی معاشرت کی وجہ سے المناک نتائج وجود میں آتے ہیں اس کے برعکس ''ناہید'' میں دو خاندانوں کے مابین دشمنی کی چنگاری ایک مدت سے بھڑکتی ہے وہ اچانک بہت ہی خوش آئید اور عمدہ تعلقات میں بدل جاتی ہے قصہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ناہید کے گھر آگ لگ جاتی ہے جہاندار ایسے موقع سے بغض و نفرت کو بالائے طاق رکھ کر بہادری اور دلیری سے ''ناہید'' کو بچالیتا ہے اور اس کی صحت یابی کے لئے اپنی ہمشیرہ اختر کے ساتھ زنانہ لباس ذیب تن کرکے سو سو طرح سے ناہید کی تیمارداری کرتا ہے۔ جہاندار ناہید سے محبت کا دم بھرنے لگتا ہے اور ناہید بھی اس کے لئے کمر بستہ ہو جاتی ہے۔ یعنی جہاندار اور ناہید ایک دوسرے کی محبت کے اسیر ہو جاتے ہیں جب دونوں کا راز کھلتا ہے تو ناہید کے والدین اس کو قید میں ڈال دیتے ہیں ہزارہا پابندیاں عاید کردی جاتی ہیں کہ جہاندار سے ملاقات نہ کرے اور نہ اس کا نام لے مگر جب جہاندار کو اس کی خبر ملتی ہے تو وہ ناہید کو اس دوزخ سے آزاد کرانے کی ترکیب سوچتا ہے۔ چونکہ جہاندار کے لئے ناہید سادہ لوح معشوقہ ہے جس کو وہ کھونا نہیں چاہتا اس سے جہاندار کو سچی محبت ہے۔ بحر حال جہاندار کی فریاد باران سے رحمت جوش میں آتی ہے اور ایک دن جہاندار ناہید کو اس کے والدین کے شکنجے سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور دونوں ہم آغوش ہو کر خوب رو رو کر جی ہلکا کرتے ہیں اور اسلامی شرع کے مطابق دونوں ہمیشہ کے لئے

ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں یعنی شادی ہو جاتی ہے مگر کچھ دنوں تک دونوں کو جلا وطن رہنا پڑتا ہے ان دنوں جہاندار ناہید بنارس کانپور، اٹاوہ، آگرہ، دہلی وغیرہ کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اس حرکت کو کچھ لوگ غلط تصور کرتے ہیں مگر نہیں ایسے وقت میں ان کے لئے ایسا کرنا موزوں تھا اس لئے کہ ان دو خاندان میں نفرت و دشمنی کی آگ ایک عرصہ سے بھڑک رہی ہو وہاں معاشرے کے ذریعہ شادی ہو جائے تو یقینی بات ہے کہ تنازعہ اور بڑھے گا اس لحاظ سے جہاندا نے اچھا کیا کہ شادی کے فوراً بعد ناہید کو لے کر شہر سے دور چلا گیا اور خون خرابہ سے دونوں خاندان بچ گئے اور جب دونوں کے والدین مطمئین ہو گئے تو دونوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی دوسرا پلاٹ بھی کچھ اسی طرح کا ہے کہ ادھر جہاندار کی بہن ناہید کے بھائی منجھو پر عاشق ہو جاتی ہے جہاندار اور ناہید کی بہ نسبت ان دونوں کی عاشقی دھیرے دھیرے پروان چڑھتی ہے۔ متعدد بار دونوں ملاقاتیں کرتے ہیں۔ اتنی عروج پر محبت جلی جاتی ہے گویا دو جسم ایک قالب ہوں۔ ابھی تک دونوں چوری چوری ملاقاتیں کرتے ہیں اچانک منجھو شدید طور پر بیمار ہو جاتا ہے اس کی خبر اختر کو ہوتی ہے مگر وہ کیا کر سکتی ہے وہ تو مجبور ہے اس لئے کہ وہ لڑکی ہے اور والدین کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتی ہے پھر خاندانی شرافت بھی مانع ہے اس کے بھائی کے کارنامے سے اس کی خاندان کی شرافت پر آنچ آچکی تھی وہ مزید اس آنچ کو بھڑکانا نہیں چاہتی تھی آخر اس کی عقل میں بھی یہی بات آئی کہ وہ بھی

اپنے بھائی کی طرح مردانہ لباس میں ملبوس ہو کر اختر کی تیمارداری کو جا سکتی ہے اور وہاں پہنچ کر پیہم اختر کی تیمارداری کرتی ہے منجھو جو بیماری سے گھبرا کر زندگی سے عاجز آ چکا ہے خود کشی کے درپے ہو چکا تھا اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے منجھو نے ایک دن زہر پینا چاہا مگر اختر اپنی دور اندیشی اور حکمت سے منجھو کو زہر پینے سے باز رکھتی ہے اور منجھو کو اختر کی بے پناہ محبت کا احساس ہوتا ہے اور وہ سو سو بار ہمدردی اور محبت سے اس پر قربان جاتا ہے اور زمانے سے جو خاندانی مخاصمت چلی آ رہی تھی اس کو آن کی آن میں محبت اخوت و یکجہتی میں تبدیل کر کے نفرت کی دیوار گرا دیتا ہے اس کے بعد اختر کی شادی منجھو اور ناہید کی شادی جہاندار سے ہو جاتی ہے۔ اس ناول میں بھی آغا شاعر نے ہیرے کی کنی کی طرح اعلیٰ طبقہ کی سیرت پیش کی ہیں۔ جیسا کہ ناول ناہید میں اختر منجھو کی عاشق ایک ملازم کی طرح مردانہ لباس میں تیمارداری کرتی ہے یہ مقام بالکل ایسا ہی ہے جیسا ’’ہیرے کی کنی‘‘ میں سلطانہ بیگم جوگی بچہ ایاز بن کر نواب جہانگیر احمد کی مصاحبت میں رہتی ہے ناول ناہید کا کوئی ایک کردار بھی ایسا نہیں جو دیر پا ہو یا دلچسپ ہو یہ بحث اور ہے مگر جب تنقیدی نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو پہلے پلاٹ میں جہاندار اور دوسرے پلاٹ میں اختر کا کردار نمایاں اور خاص اہمیت کا حامل ہے۔

آغا شاعر کا یہ ناول ان کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ دراصل یہ ناول یوپی کے تعلقہ دار خاندان کی تاریخ ہے جس میں اس عہد کی معاشرت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے اس معاشرت پر جہالت کے ساتھ ساتھ جذبات کا رنگ بہت گہرا ہے یہاں تک کہ خاندان کے افراد کے سوچنے کا طریقہ جاہلانا ہے جس میں جذبات کو خاص دخل ہے اس کی مثال ہے کہ آن کی آن میں دشمنی کی دیوار مسمار ہو کر محبت اور رفاقت میں بدل جاتی ہے ناول میں مکالمہ نگاری اور منظر نگاری خاص درجہ رکھتی ہے کسی بھی ناول کی جانچ پرکھ مجموعی طور پر کی جاتی ہے۔ح16۔ اس اعتبار سے بھی ''ناہید'' ایک اچھا ناول ہے جس میں ابتدا سے انتہا تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے ۔اس بات کو سہیل بخاری نے مصنف کے کمال سے تعبیر کیا ہے۔ 17۔اور وارن بیچ نے کہا ہے کہ ہر اچھے ساخت کا ناول اچھا نہیں ہوتا ہے۔ح۔18۔ اور مام روسو کی کو اچھا ناول نگار کہہ کر خراب فنکار ٹھہراتا ہے۔ح19ان تمام ناقدوں نے ناول کے بارے میں جو خیالات پیش کئے ہیں اس کی روشنی میں آغا شاعر کا ناول ناہید ایک ناول ہے اس میں ایک اچھے ناول کے ساتھ ناول کے سارے عناصر موجود ہیں۔ عشق ومحبت تجسس، سنسنی خیزی سراغ رسانی پھر ہیرو، ہیروئین کا ملاپ جیسا کہ ناول کے موضوع سے ہی پتہ چلتا ہے کہ ''ناہید'' ناول کا اہم کردار ہے جو صورت وسیرت میں کامل ہے۔

ایک اچھا ناول نگار داخلی اور خارجی کائنات پر غور کرتا ہے وہ کائینات کہ مدعا کو موضوع بنا کر پیش کرتا ہے جو کہ عام انسانی زندگی کے لئے کارآمد ثابت ہو۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جہاں لاتعداد ناول نگاروں نے مروجہ روایات اور نقطہ نظر کے تحت ناول نگاری میں اپنی شناخت بنائی۔ وہیں آغا شاعر دہلوی نے اپنے چار اہم ناول ارمان ہیرے کی کنی، ناہید اور نقلی تاجدار لکھے اور اردو ناول نگاری میں رومان نفسیات اور سماجیات کو شامل کیا یہ الگ بحث ہے کہ وہ دوسرے درجہ کے ناول نگار ہیں اس سے مجھے اختلاف نہیں لیکن درجہ دوم کے ادیبوں کے بغیر درجہ اول کے مصنفوں کی کوششوں کو سراہنا بھی مشکل کام ہے یوسف سرمست کا خیال ہے کہ آغا شاعر کے ناول ناہید کو اردو کے قدیم ناول نگاری میں جو مقام ملنا تھا وہ تو درکنار غور طلب بات یہ ہے کہ ناقدین اس ناول کا موہوم سا اشارہ بھی ناول پر لکھے جانے والے مضامین میں نہیں کرنے جبکہ ان کے ناول اردو ناول نگاری میں اضافہ کرتے ہیں۔آغا شاعر کے بیشتر ناولوں میں نوجوانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی کی کشمکش کو اپنے ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کی شان و شوکت اس کی ہیروئن کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار سے تیار کیا گیا ہے۔ ناہید کی زندگی کہ نفسیات کو قلم بند کرتے ہوئے آغا شاعر نے جدید نفسیاتی علم کا سہارا لیا اور اس کی روشنی میں اس کے کردار کی تحلیل نفسی کی ہے۔

یہ ناول آغا شاعر کی ناول نگاری کی صلاحیت پر روشنی ڈالتا ہے اور بیسویں صدی کے ناول نگاری کے ان تمام رجحانات کو سامنے لاتا ہے جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ آغا شاعر کے اس ناول کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ پوری سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوتے تو یقینا اردو ناول نگاری میں بہترین اضافہ کرتے پھر ان کے یہ چند ناول اردو ناول نگاری میں اہمیت رکھتے ہیں۔

انہوں نے اپنے ناول '' ناہید'' میں ایک ایک کردار کو نمایاں کرنے میں جس تحلیل نفسی سے کام لیا ہے وہ ان کے اس ناول کو بڑی اہمیت بخشتی ہے۔ جیسا کہ ناقدوں کی رائے ہے کہ ایک اچھا ناول لکھنے والا تخلیقی واقعات میں مواقع پیدا کرکے ایک بصیرت پیدا کرتا ہے۔ یہی بصیرت آغا شاعر کے ناولوں میں ملتی ہے۔ البتہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آغا شاعر کے ناول کے بغیر بیسویں صدی کی ناول کو سمجھنا مشکل ہوگا۔

آغا شاعر نے اپنے ناول میں انسان کے نفسیاتی اور سماجی پہلو کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے اردو ادب کے کسی بھی نقاد کو اختلاف نہیں ہو سکتا اب یہاں تجزیہ کرنا ہے کہ کیا وہ اپنے آپ میں ایک کامل ناول نگار ہو سکتے ہیں کہ نہیں یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن یہ امر مسلم ہے کہ کسی بھی ناول کے

لئے ایسے موضوع کا ہونا ضروری ہے کہ جو کسی بھی سماج معاشرہ اور حکومت کی صحیح تصویر پیش کرکے جس میں ناول نگار کا مزاج، خیالات، نقطہ نظر پنہاں اور اس کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ ہر قاری یا ناقد کسی بھی تخلیقی ورثہ کو اپنے نقطۂ نگاہ سے جانچ پرکھ کرکے اس کی کامیابی کا حکم صادر کرتا ہے۔آغاشاعر کے ناولوں میں کامیابی کے سبھی عناصر موجود ہیں اور اس بنیاد پر یہ رائے پیش کی جاسکتی ہے کہ آغاشاعر اپنے موضوع اور مزاج کے اعتبار سے صف دوم کے ناول نگاروں میں اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول کے موضوعات عام انسانی زندگی سے لیے ہیں اس لئے ان میں قاری کے لئے دلچسپی بھی ہے اور تجسس بھی۔آغاشاعر نے اپنے ناولوں میں فنی اصول کا خاص خیال رکھا ہے اردو ادب کے ناقدوں اور ادیبوں کی رائے حق بہ جانب ہے کہ ایک اچھا ناول نگار ناول تخلیق کرتے وقت فنی اصول کا بہت خیال رکھتا ہے اور ہر ناول نگار فنی آہنگ کو اپنے ناولوں میں اپنے اپنے طور پر مختلف طریقے سے نبھاتے ہیں۔ اس اعتبار سے آغاشاعر اپنے آپ میں مکمل ہیں لیکن یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ آغاشاعر نے اپنے ناولوں میں فن کاری کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

حوالے

۔ادب کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر سلام سندیلوی 1

۔تنقیدی اشارے۔آل احمد سرور 2

۔آج کل نئی دہلی اکتوبر 1986ء3

۔تھیوری آف لٹریچر صفحہ 4101

۔تھیوری آف لٹریچر صفحہ 5251

۔کورسٹ " کوارٹرلی " اپریل، جون 1959ء6

۔کالیکٹڈیٹ پیپرز وولیم فورتھ صفحہ 79

۔کالیکٹڈیٹ پیپرز وولیم فورتھ صفحہ 892

۔کالیکٹڈیٹ پیپرز وولیم فورتھ صفحہ 996

۔کالیکٹڈیٹ پیپرز وولیم فورتھ صفحہ 1095

۔کالیکٹڈیٹ پیپرز وولیم فورتھ صفحہ 11102

۔کانٹری بیوشن ٹوانلاسیکل سائکولوجی صفحہ 12199

۔کانٹری بیوشن ٹوانلاسیکل سائکولوجی صفحہ 13191

۔اردو ناول نگاری صفحہ 14116-115

۔ہیرے کی کنی صفحہ 151

۔ہیرے کی کنی " آغا شاعر صفحہ 16

۔فکشن اینڈ پبلک صفحہ 17213

۔اردو ناول نگاری سہیل بخاری صفحہ 18118

۔دی ناول ان دی سینٹووی صفحہ 19121

۔گریٹ ناولسٹ اینڈ اولس صفحہ 20202

نمبر شمار کتاب کا نام مصنف معلم اشاعت سن اشاعت

آغا شاعر حیات و شاعری مرتبہ مجتبیٰ حسین خاں لاہور 1970ء 1-

اردو ناط کی تاریخ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھنؤ لکھنؤ 1962ء 2-

انگریزی عہد میں ہندوستان عبداللہ یوسف علی الہ آبادی 1936ء 3-

اردو ادب میں رومانی تحریک ڈاکٹر محمد حسن لکھنؤ 1950ء 4-

اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ لاہور 1941ء -5

ادب کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھنؤ 1986ء -6

اردو ناول نگاری سہیل بخاری دہلوی 1972ء -7

اردو نثر کی داستانیں گیان چند جین کراچی 1945ء -8

اردو زبان اور فنی داستان گوئی کلیم الدین احمد پٹنہ -9

اردو کا افسانوی ادب بہار اردو اکیڈمی پٹنہ 1987ء -10

اردو ناول سمت و رفتار سید حیدر علی الہ آباد 1977ء -11

ارمان آغا شاعر قزلباش دہلی 1903ء -12

امراؤ جان ادا مرزا ہادی رسوا دہلی 1958ء -13

ایام عرب عبدالحلیم شرر لکھنؤ 1915ء -14

ایامی ڈپٹی نظیر احمد دہلی 1991ء -15

ابن الوقت۔ مرتبہ سید ڈپٹی نظیر احمد لاہور 1961ء -16

بہار کا اردو ادب ڈاکٹر ارتضٰی کریم دہلی 1986ء -17

بیسویں صدی میں اردو ناول یوسف سرمست حیدرآباد 1973ء -18

پریم چند شخصیت اور کارنامے پروفیسر قمر رئیس دہلی 1987ء -19

ترقی پسند ادب بچاس سالہ سفر پروفیسر قمر رئیس دہلی 1987ء -20

تنقیدی اشارہ آل احمد سرور علی گڑھ 1942ء -21

ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی علی گڑھ 1945ء -22

خمکدہ خیسلم کتب پر نٹرز اینڈ پبلیسرز لیمیٹیڈ کراچی 1976ء 23-

خدائی فوجدار رتن ناتھ شر سار لکھنؤ 1903ء 24-

داستان سے افسانے تک وقار عظیم لاہور 1960ء 25-

ذات شریف مرزا ہادی رسوا لکھنؤ 1921ء 26-

اوبائے صادق ڈپٹی نذیر احمد دہلی 1899ء 27-

سرشار کی ناول نگاری ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کراچی 1961ء 28-

سونیرٔ آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی 1983ء 29-

صبح گلشن مطبوعہ شاہ جہانی بھوپال 15-12 ہجری 30-

عبدالحلیم شرر سحمہ یتار وفن ڈاکٹر شریف احمد دہلی 1989ء 31-

عجائبالقصص تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم دہلی 1987ء 32-

فسانہ آزاد رتن ناتھ سرشار لکھنؤ 1935ء 33-

مقدمہ شعر و شاعری الطاف حسین حالی لاہور 1945ء 34-

میدان عمل منشی چند دہلی 1952ء 35-

مراتہ العروس ڈپٹی نذیر احمد کانپور 1886ء 36-

محمد علی طیب حیات اور تعانیت ڈاکٹر عبدالحہ دہلی 1989ء 37-

ناہید آغا قزلباش دہلی 1903ء 38-

ہندوستان کا اردو ادب ڈاکٹر محمد ذاکر دہلی 1981ء 39-

ہیرے کی کنی آغا شاعر قزلباش دہلی 1903ء 40-

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ قمر رئیس دہلی 41-
بحیثیت ناول نگار
قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم دہلی 42-
انتظار حسین ایک دبستان ڈاکٹر ارتضیٰ کریم دہلی 43-

''رسائل''

چمنستان'' 46-41-1940ء دہلی''
نقد و نظر'' 1942ء آگرہ''
منادی'' 1942ء دہلی''
سیپ'' 1964ء کراچی''
آج کل'' 84-1947ء دہلی''
انجام'' 1964ء کراچی''
شعلہ و شبنم'' 1952ء دہلی''
گوشت'' کواٹر لی 1959ء بمبئی''

BIBILOGRAPHY OF ENGLISH BOOK

1. Aspect lf the Novel - E.M. Forster - 1962 - London.
2. The Art of Novel - Pelhan Edgar - 1933 - New York
3. The Advance of the English Novel - W. Lyon Philips - 1916 - New Yark
4. The Living Novel - Pritchett - 1954 - London
5. Munshi Prem Chanda - Madan Gopal - 1964 - Delhi
6. Modern Novel - Walter Allem - 1964 - New York
7. Collection Papers Vol - IV - Sigmond Frend - 1948 - London
8. Contribution to Analytical Psychology - C.G. Jung, Trasnlated by H.G. and Carry F. Baynes
9. The Novel in the Twelth Century- Joseph Warren - 1932- Beach New York
10. Theory fo Literature - Warren
11. Piction and reading Public
12. Great Novelist and their Novel's
13. Novelist on the Novel - Ed Miriam Allett - 1954 - London

14. The Novel Today - Philip Hinderson - 1936 - London

15. The Rise of the Novel - I am watt - 1957 - London

16. Reading a Novel - Walter Allen -1956 - London

17. The English Novel - I.B. Priestly - 1905 London

18. The Novel and the people - Rolf Fox -1956 - Moscow

19. The story of a Novel - - Thoms Wolf - 1936 - New York

20. The technique of the Novel - Thomars H. Uzzel - 1947 - U.S.A

درندوں کی حکمرانی

کشمیر کی تاریخ میں فاتح حکمرانوں کی درندگی اور کشمیریوں پر ظلم و ستم ڈھائے جانے کی بیشمار مثالوں کے ساتھ کچھ اچھے حکمرانوں کی عوام دوست پالیسیوں اور عوامی مفاد کی کاروائیوں کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ مغلوں، افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں کے علاوہ مقامی اور مسلمان حکمرانوں میں چک خاندان کے آخری فرمانروا یوسف شاہ چک نے فرقہ واریت کا بوجھ سرپر اٹھایا اور دیگر مسلمان فرقوں اور مسالک پر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔یوسف شاہ چک کے سفاکانہ رویے سے تنگ آکر اہلیان کشمیر نے مغل بادشاہ کو کشمیر کش کی دعوت دی جسکے نتیجے میں حضرت زین العابدین بڈھ شاہ کی قائم کردہ مسلمان حکمرانی کا دور ختم ہوگیا اور کشمیری نسل در نسل غلامی کے اندھیروں میں دھکیل دیے گئے۔

مغلوں کے جبر کا دور ختم ہوا تو افغانوں کا ظلم در آیا۔ مغل اور افغان عقیدے کے لحاظ سے تو مسلمان تھے مگر کشمیریوں کے ساتھ درندوں جیسا سلوک کرتے تھے۔افغانوں کے بعد سکھ آئے اور مساجد کو اصطبلوں میں بدل دیا۔حیرت کی بات یہ ہے کہ سکھوں نے جتنے گورنر کشمیر میں تعینات کیئے ان میں اکثریت

مسلمانوں کی تھی جو سکھ حکمرانوں کی خوشنودی کیلئے کشمیریوں پر ستم کے تیر برساتے۔ سکھوں کے بعد ڈوگرہ راج قائم ہوا تو کشمیری مسلمانوں کی حالت بدستور غلامانہ رہی۔ ڈوگرے مقامی حکمران تھے جنھوں نے وقت کے لحاظ سے زر کثیر دیکر کشمیر کا سودا کیا تھا۔ ڈوگروں نے کشمیر کی حکمرانی خریدنے کیلئے ایمن آباد گوجرانوالہ کے ہندو ساہوکاروں نے لاکھوں روپے قرض لیا جسے چکانے کیلئے کشمیری عوام پر بھاری ٹیکس لگائے۔ ٹیکسوں کی بھرمار اور جبری مشقت کی وجہ سے ڈوگروں کو ہمیشہ ہی اپنے عوام کی طرف سے بغاوت کا خطرہ رہتا جسے کچلنے کیلئے انھوں نے پولیس، فوج اور مقامی جاگیرداروں کو وسیع اختیار دیے رکھے تھے۔ جبر و ظلم کے اس دور میں بھی سکھوں اور ڈوگروں کے ادوار میں عدل و انصاف اور رعایا پروری کی کچھ مثالیں ملتی ہیں جس سے انسانی ضمیر کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ بدقسمتی، بے حسی اور درندگی کا موازنہ کیا جائے تو 1947ء کے بعد نام نہاد آزادی کے بیس کیمپ آزاد کشمیر میں جمہوری لبادہ اوڑھنے والے انسان نما درندوں اور پاکستانی سیاسی جماعتوں کے سفاک ایجنٹوں نے جسطرح اپنی ہی ماؤں اور بیٹیوں کی عزتیں لوٹیں اور برادری ازم کو مذہب سمجھ کر اس کی آڑ میں اپنے مخالفین پر ستم ڈھائے اسکی مثال جبر کے کسی بھی دور میں نہیں ملتی۔ آزاد کشمیر میں جتنے قتل، اغوائ، ڈکیتیوں اور زنا کے کیس سامنے آئے اس میں سیاستدان، پولیس، پٹواری اور سیاستدانوں کی برادریوں کے غنڈے جنھیں سیاستدانوں اور حکمرانوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے ملوث پائے

ہیں۔آزاد کشمیر میں سیاست ایک منافع بخش کاروبار ہے جس پر چند پاؤنڈ اور ڈالرمافیا کی بھی مکمل گرفت ہے جو ایک کے بدلے میں دس پاؤنڈ کماتے ہیں۔اس گروپ میں منشیات فروش، لینڈ مافیا اور انسانی سمگلر شامل ہیں جنکا کاروبار بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہے۔آزاد کشمیر کے وزیر مشیر اور حکمران اپنے بیرونی دوروں کے دوران اپنے وفود میں بھاری رقوم لیکر لوگوں کو شامل کرتے ہیں جو ان دوروں سے کبھی واپس نہیں آئے۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسلام آباد میں مقیم برطانوی ہائی کمشنر نے برملا اسکا اظہار بھی کیا کہ آزاد کشمیر کی اہم سیاسی اور سرکاری شخصیات انسانی سمگلنگ کے دھندے میں ملوث ہیں۔آزاد کشمیر کے ایک بڑے سیاسی لیڈر جو کہ اخلاقی لحاظ سے انتہائی پست ہیں کا بیٹا برطانیہ میں منشیات فروشی کے دھندے میں ملوث ہو کر جیل کاٹ چکا ہے جبکہ خاندان کے دیگر نونہال بھی اس پیشے سے منسلک کروڑوں کما رہے
ہیں۔ موصوف خود بھی اسی دھندے سے منسلک رہے اور سیاست کی آڑ میں دیکھتے ہی دیکھتے ارب پتی بن گئے۔آزاد کشمیر کے سیاستدانوں میں دولت مندترین ہونے کا اعزاز تو آپ نے حاصل کر ہی لیا ہے مگراب آنیوالے دور میں وزارت عظمٰی بھی آپ کی منتظر ہے۔

مرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں
جس قوم کی قیادت بد کردار، بد اعمال اور عزت و عقیدت سے عاری اوباشوں کے

ہاتھ ہو اسے آزادی تو کیا غلامی بھی نصیب نہیں ہوتی بلکہ ایسی قوموں پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے جو زلزلے کی صورت میں ایک بار وارننگ دے چکا ہے۔انسانی سمگلنگ میں ملوث دار لحکومت کا داروغہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تو کرپٹ حکمرانوں کا سارا ٹولہ اسکی حمایت میں صف آرا ہو گیا چونکہ اس سے پہلے وہ اپنے ہر دورے میں ہر کرپٹ

سیاستدان اور اعلیٰ افسر کا بندہ سمندر پار پہنچا کر اعلیٰ ایوانوں سے اشیر باد حاصل کرتا رہا تھا کڑوروں روپے اور لاکھوں پاؤنڈ لگا کر ان سیاستدانوں نے داروغہ شہر کو جیل سے تو رہا کرا دیا مگر قدرت کے انتقام سے نہ بچا سکے کشمیر کی تاریخ بہادر اور باجرات حکمرانوں اعلیٰ کردار کے حامل قاضیوں اور منصب داروں کے کارناموں سے مزین ہیں جبکہ ایسے تاریخ کے اوراک پر ایسے وزرائے اعظموں کا ذکر بھی ہے جو نہ تو اپنی سیاہ کاریوں پر شرمندہ ہیں اور نہ ہی ان کی سیاسی جماعتیں۔برادریاں اور آزاد کشمیر کی شرعی عدالتیں ان کے خلاف کوئی ایکشن لینے کی پوزیشن میں ہیں عدالتوں کے جج اور قاضی یہ لوگ خود تعینات کرتے ہیں جبکہ سیاسی جماعتیں انکی ذاتی اور خاندانی ٹریڈ کمپنیاں ہیں یہ کرپٹ اور عیاش سیاسی ٹولہ اپنی اپنی برادریوں کی ضرورت ہے اور برادریوں کا تعصب ان لیڈروں کے دم و قدم سے قائم ہے ایک ہلڑ باز، عیاش اور مار دھاڑ کا ماہر سیاستدان آزاد کشمیر کے ہر حلقے اور برادری کی ضرورت ہے۔ شرافت کی سیاست اور اصولوں کی پاسداری کرنے والے کا آزاد کشمیر کی سماجی زندگی میں مذاق اڑایا جاتا ہے اور ایسے سیاست

دان کو مجاور، اللہ لوک اور ڈرپوک جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے آزاد کشمیر کی سیاست میں بد کرداری، بد اعمالی، انگلینڈ کے کلبوں میں جاکر ہلڑ بازی کرنے والوں کی زیادہ اہمیت ہے جھوٹ، فراڈ اور دھوکہ دہی آزاد کشمیر کی سیاست کی اہم کوالیفکیشن ہے جو لیڈر پٹواریوں، تھانیداروں اور تحصیل داروں سے لیکر سیکرٹریوں کو گالیاں دے، تھپڑ لگائے، قانون شکنی کرے، اسلام آباد میں اپنی وسیع اور محل نما کوٹھیوں میں شراب و شباب کی محفلیں سجائے اور اپنے حلقے میں دہشت اور بربریت پھیلائے وہ آزاد کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کے لئے موزوں امیدوار ہے پھر ایسا درندہ صفت امیدوار دولت، دھونس اور اپنے پاکستانی پروموٹروں کی مدد سے الیکشن جیت کر ممبر اسمبلی، وزیر یا مشیر بن جاتا ہے تو ان کی درندگی کود کر سامنے آجاتی ہے اور اپنے ہی وطن کی بہو، بیٹیوں کی عزتیں لوٹنے، ان پر جسنی تشدد کرنے، انھیں برہنا کرکے سڑکوں اور چوراہوں پر پھینکنے سے نہیں ڈرتا اور پولیس ایسے درندوں کی درندگی کے نشان مٹا دیتی ہے اور صدر ریاست اور وزیر اعظم اپنے وزیروں اور اسمبلی ممبروں کی درندگی پر پردہ ڈالنا فرض اولین سمجھتے ہیں کسی زرداری، نواز شریف، اسفند یار ولی، الطاف حسین، سردار قیوم، منور حسن، عمران خان، عاصمہ جہانگیر، انصار برنی اور مولانا فضل الرحمٰن کی اس طرف نظر نہیں جاتی اور نہ ہی ٹی وی شوز میں درس دینے والے نام نہاد استادوں کو کچھ سنائی دیا، چونکہ عزتیں لوٹنیں والوں کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے اور کشمیر پاکستان کی شاہرگ ہے۔ آزاد کشمیر کی انتظامیہ

اور مقننہ باہم اتفاق سے معاملات دبا دیتی ہے اور مظلوم لڑکی کو پریس کے سامنے لا کر بیان دلوا کر گلو خلاصی کرواتی ہے۔ مزید بدنامی، جان سے مار دینے کی دھمکی اور پیسے کا لالچ شرعی عدالت کے ذریعے زنا بالرضا ثابت کرکے عمر قید کی سزا جیسے ہتھکنڈوں کے سامنے ایک نہتی بے بس غریب اور بے سہارا لڑکی کیا کر سکتی ہے؟ وہ یہی کر سکتی ہے کہ پریس کے سامنے بیان دے کر گوشہ گمنامی سے جا سکتی ہے تاکہ درندوں کا کام جاری رہے۔ درندگی پھیلتی رہے، ہوٹلوں، ہاسٹلوں، گیسٹ ہاؤسوں، ریسٹ ہاؤسوں سمیت کشمیر ہاؤس کی رونقیں بحال رہیں، عزتیں لٹتی رہیں، عصمتیں بکتی رہیں، نوکریوں کے جھانسے میں کشمیر کی بیٹیاں سسکتی رہیں، شراب کی محفلیں چلتی رہیں، جھنڈوں والی گاڑیوں پر دلال بدمست گھومتے اور عزت داروں کے گھروں میں نقب لگاتے رہیں اور اہل پاکستان اس کا تماشا دیکھتے رہیں۔

افسوس صد افسوس کہ آزادی و حرمت کا نعرہ لگانے والوں نے ایوان اقتدار کو بالا خانوں میں بدل دیا اور آزادی کے کھوکھلے نعرے لگانے والوں نے درندروں کا روپ دھار لیا آج کشمیر کی بیٹیوں کی عصمتیں لوٹنے والے بھارتی درندے ہی نہیں بلکہ پاکستانی اشرافیہ کی آنکھوں کے تارے اور سیاسی جماعتوں کے جیالے بھی برابر کے شریک ہیں مقبوضہ کشمیر کا گورنر اور وزیر اعلیٰ کبھی کبھی اس درندگی پر تلملا اٹھتے ہیں اور ان میں اتنی جرات ہے کہ وہ کم از کم بھارتی

فوجیوں کی درندگی پر بیان تو دیتے ہیں آزاد کشمیر کے صدر اور وزیر اعظم میں اتنی بھی اخلاقی جرات اور غیرت ایمانی نہیں کہ وہ اپنے وزیروں کو وزارت سے ہٹا سکیں اپنے عزیزوں کو لگام دے سکیں اور سرکاری افسروں کو سزا دے سکیں آزاد کشمیر کی اعلیٰ عدلیہ صرف کورٹ آف اپیل ہے اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان از خود نوٹس نہیں لے سکتے اس لئے درندہ صفت حکمرانوں اور افسروں کو عدلیہ سے کوئی ڈر نہیں آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتیں پاکستانی سیاسی جماعتوں کی برانچیں ہیں دراصل قوت جناب زرداری، نواز شریف، شجاعت حسین اور الطاف حسین کے پاس ہے جنھیں آزاد کشمیر کی حکومت سے دلچسپی ہے عوام سے نہیں۔ جیسا کہ عرض کیا ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام برادریوں کے خانوں میں بٹے ہوئے ہیں ۔ان کی عزت اور غیرت برادری کی حدود تک محدود ہے۔بقول میاں محمد بخشؒ کے غریب کی کوئی برادری نہیں ہوتی۔ غریب پیدا ہی امیر کی چاکری، غلامی اور سلامی کیلیئے ہوتا ہے۔

لیے دا کی زور محمد نس جاناں یا رونا

پاکستان کو درپیش مسائل میں سرفہرست دہشت گردی، بدحال معیشت، امن وامان کی خرابی، مہنگائی اور بجلی و گیس کی عدم دستیابی ہے سچائی کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ سب مسائل ہمارے حکمرانوں اور سیاستدانوں کے پیدا کردہ ہیں مگر پاکستانی عوام انھیں حکمرانوں اور سیاستدانوں سے خیر کی آس لگائے انھیں بار بار مسند اقتدار پر بٹھاتے ہیں۔ دہشت گردی، معیشت کی تباہی، امن وامان کی خراب حالت اور مہنگائی کا نہ رکنے والا طوفان درحقیقت ایک ہی دریا کی ندیاں ہیں جنکا رخ موڑنے اور اہل پاکستان کو ان کی حشر سامانیوں سے بچانے والا کوئی نہیں۔ اس بات پر تو سبھی متفق ہیں کہ موجودہ دہشت گردی کا مرکز قبائلی علاقے ہیں جہاں پاکستانی طالبان بیٹھے پورے ملک کا نظام تہہ و بالا کیے ہوئے ہیں۔ طالبان، طالبانائیزیشن اور ان کے مقاصد پر مغربی اور پاکستانی صحافیوں سے بہت کچھ لکھا اور ہر ایک نے اپنی اپنی سوچ و سمجھ کے مطابق طالبان کے کردار و عمل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا مگر کسی بھی لکھنے والے نے افغان مہاجرین افغان حکومت بھارت اور امریکہ سمیت مقربی ممالک کے کردار پر کچھ نہیں کہا۔

ظاہر ہے کہ مغربی ممالک سمیت دنیا بھر میں امریکہ کے اتحادی اور باگزار ممالک کے صحافی اور دانشور کسی نہ کسی طریقے اور بہانے سے امریکہ، بھارت

اور ان کے اتحادیوں کے وظیفہ خوار ہیں۔ہمارے بہت سے سینئر صحافی اتنے سینئر تو نہیں مگر دولت مند ضرور ہیں۔یہ دولت کہاں سے آئی ہے اسپر نہ تو از خود نوٹس ہے نہ آڈٹ،احتساب اور نہ ہی کوئی دوسری طرح کا حساب وکتاب ان صحافیوں کے پاس دولت کے اتنے انبار ہیں کہ اسکے لئے ایک کتاب نہیں بلکہ کتاب لکتاب درکار ہے۔شائد میں غلطی پر ہوں مگر میرے نزدیک یہ لوگ نہ تو سینئر صحافی ہیں اور نہی ہی قلمکار۔قلم پکڑنے والے ہاتھ کو زیب نہیں دیتا کہ وہ رشوت کا لفافہ،پرمٹ یا پھر پلاٹ کا آلاٹ نامہ پکڑے اس طرح سینئر صحافی کہلوانے کیلئے ایک طویل تجربے، تحقیق اور مشائدے کا ہونا ضروری ہے۔ہمارے ہاں سینئر صحافی کہلوانے کے حقدار صحافت کے سپہ سالار جناب ڈاکٹر مجید نظامی ہیں دیگر سینئر صحافیوں میں جناب اشر چوہان،جناب اجمل نیازی،جناب اسداللہ غالب،جناب ضیا شاہد،جناب مجیب الرحمٰن شامی،جناب عارف نظامی،جناب عبدالقادر حسین اور ان صاحبان قلم وعلم کے ہمنوا،ہم عمر،ہم تجربہ اور ہم رتبہ وہ دانشور ہیں جنھوں نے اپنے قلم کی عزت عظمت کی بھرپور حفاظت کی اور عزت واحترام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔اس برادری کے بہت سے قلمکار کے خیالات سے تو اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے کردار و عمل پر نقطہ اٹھانا مجال ہے۔آزاد میڈیا نے جسطرح بہت سے پردہ نشینوں کو بے پردکہا اور ان کے اصل شکل وصورت سے عام لوگوں کو بھی متعارف کروایا وہیں صحافت بھی بے نقاب ہوئی اور ڈالروں کے عوض قلم کا سودا کرنیوالوں کے چہرے بھی سامنے آگئے۔آج کے دور میں جو بھی شخص

ٹیلی ویژن دیکھتا ہے موبائل فون استعمال کرتا ہے انٹرنیٹ تک رسائی رکھتا ہے یا پھر اخبار پڑھتا ہے اسے پت اسے پتہ ہے کہ کونسا صحافی ،اینکر، تجزیہ نگار اور مبصر کس سیاسی جماعت، سرکاری ادارے، این جی او، کمرشل ادارے، سیٹھ، نودولیئے سیاستدانوں اور مافیا کا تنخواہ دار اور وظیفہ خوار ہے۔

صحافت کے نام پر کاروبار کرنیوالے اس قبیلے کے ہوس و حرس کی کوئی حد نہیں یہ لوگ غیر ملکی جاسوس اداروں اور حکومتوں کیلیئے بھی کام کرتے ہیں اور ان کے نظریات و خیالات کا نہ صرف پرچار کرتے ہیں بلکہ ان کے گھناؤنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں ان کی بھرپور مدد بھی کرتے ہیں۔ان لوگوں کے بیرون ملک اکاؤنٹ ،ذاتی محلات،کاروبار اور طویل چھٹیوں کے دوران شاہانہ لائف سٹائل کا پرچار ان کے کردار و عمل کا گواہ ہے مگر اس کاروبار سے منسلک احباب کو نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر قانونی ،معاشی اور کاروباری تحفظ حاصل ہے۔ کوئی صحافی یا صحافتی ادارہ ان پر تنقید کی جرات نہیں کرسکتا اور نہ ہی کوئی آواز ان کے گھناؤنے کاروبار کے خلاف اٹھ سکتی ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ جن لوگوں نے مافیا، دہشت گردی، لوٹ مار اور کرپشن کی سیاست کے خلاف آواز اٹھائی وہ صفحہ ہستی سے ہی مٹ گئے۔ ستم ظریفی یہ کہ کٹھن راہوں کے ان مسافروں کا خون باآسانی طالبان کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہےاور ان کی یاد میں چند موم بتیاں جلا کر حقیقت کو فریب میں بدل دیا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صحافت کی عظمت کو دوام بخشنے والے ان جانثاروں کو طالبان نے قتل نہیں

کیا اور نہی ہی یہ قلمکار طالبان کے خلاف لکھتے تھے۔البتہ یہ لوگ دہشت گردی میں ملوث مافیا اور طالبان کی آڑ میں سیاسی اور معاشی دہشت گردی پھیلانے والوں کا کھوج لگانے کی کوشش میں ضرور رہتے تھے۔ یہ لوگ واٹر مافیا، لینڈ مافیا، بجلی گیس مافیا اور آئل مافیا کے سرغنوں اور کارندوں کی کارستانیوں کا کھوج لگاتے لگاتے اپنی زندگی کی بازی ہار گئے مگر حکومت اور عدلیہ نے انھیں طالبان کے کھاتے میں ڈالکر فائلیں بند کردیں۔

آپ کسی بھی اخبار کا مطالعہ کریں یا کوئی بھی ٹیلیوژن چینل دیکھیں آپ کو چار قسم کے موضوع پڑھنے ،دیکھنے اور سننے کو ملینگے۔اول فوج، عدلیہ اور آئی ایس آئی کے خلاف چٹکلے، دبی زبان اور ذو معنی الفاظ میں طعنے اور گالیاں۔دوئم مہنگائی، بجلی ،گیس اور پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ اور عدم دستیابی۔سوئم بھارت نوازی اور کھلی تجارت کے حق میں دلائل اور چہارم دہشت گردی اور امن وامان کا مسئلہ کوئی بھی لکھنے اور بولنے والا تقریباً ایک کروڑ رجسٹرڈ اور آن رجسٹرڈ افغانیوں کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ہی حکومتیں ان کی واپسی میں دلچسپی لیتی ہیں۔اگر افغان مہاجر واپس چلے جائیں تو پاکستان میں سمگلنگ، ٹیکس چوری، دہشت گردی اور مہنگائی کے پچاس فیصد مسائل حل ہو سکتے ہیں اگر لینڈ مافیا اور آئل مافیا پر قانون کی گرفت ہو تو بجلی، گیس اور پٹرول کی قیمتیں نہ صرف کم ہو جائیں گی بلکہ ہر جگہ پٹرول دستیاب بھی ہوگا۔اسی طرح اگر حکومت عدلیہ، فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف ہرزہ رسائی کرنیوالوں کو

لگام دے تو یہ ادارے کھل کر اپنا کام کرینگے اور حالات میں بہتری کے بھی امکانات ہونگے مگر حکومت فی الحال جوہڑ میں مچھلیاں پکڑنے اور من موھن کا من بہلانے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرتی۔ حضرت امیر خسروؒ کا شعر ہے

سلیتے میں میخ نہ رکھیو
لشکر میں شیخ نہ رکھیو

اگر بوری میں میخ رکھ دی جائے تو وہ آہستہ آہستہ نیچے جا کر ایک بڑا سوراخ کر دیتی ہے اور بوری (سلیتے) میں رکھا اناج ضائع ہوجاتا ہے اسطرح لشکر (فوج) اور حکومت میں کاروباری لوگوں کے اثر و رسوخ سے فوج اور حکومت کمزور اور آخر کار ناکام ہوجاتی ہے کہ فوج ملک سے زیادہ ڈی ایچ اے کو بچانے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اسطرح فوج کو پانی ساکھ سے زیادہ ڈی ایچ اے کی ساکھ پیاری ہے خدا جانے یہ کالم نگاروں، ٹیلی وژن اینکروں اور فرمائیشی مہمانوں کا ذاتی مشغلہ ہے یا انھیں فوج کی جانب سے پیش قدمی کا کوئی اشارہ ملا ہے چونکہ فوج نے نہ تو اسکی تردید کی ہے اور نہ ہی تائید کی ہے۔ فی الحال خاموشی نیم رضامندی کا سماں ہے جو کسی طور پر اچھا شگون نہیں۔ جناب فیصل رضا عابدی کا فرمان ہے کہ ڈی ایچ اے غریب فوجیوں کی ویلفیئر کا ادارہ ہے۔ پتہ نہیں عابدی صاحب کو کس نے یہ خبر دی ہے۔ ڈی ایچ اے غریب فوجیوں کا نہیں امیر کبیر جرنیلوں، ارب پتی پراپرڈی ڈیلروں اور کاروباری لوگوں کا ادارہ ہے۔ ڈی

ایچ اے میں غریب فوجی صرف سیکیورٹی گارڈ اور کروڑ پتی رہائشیوں کے ذاتی ملازم ہیں۔غریب فوجیوں کا ادارہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ تھا جہاں غریب اور سفید پوش ریٹائرڈ فوجی اپنی بچت رکھتے تھے اور انھیں ماہانہ کچھ رقم ملک جاتی تھی جس سے انکی دال روٹی چل جاتی تھی۔حال ہی میں یہ ادارہ بھی بند کر دیا گیا ہے اور جن فوجی جوانوں اور ریٹائرڈ افسروں کے کچھ پیسے تا حال جمع ہیں اسپر منافع انتہائی کم کر دیا گیا ہے تاکہ یہ لوگ مایوس ہو کر اپنی بچت نکلوالیں۔ حیرت کی بات ہے کہ جو دانشور اور قانون دان کل تک فوج اور عدلیہ کو برابر حرف تنقید بنائے ہوئے تھے وہ آج ڈی ایچ اے کے غم میں عدلیہ کے خلاف بولتے نہیں تھکتے۔ایک معزز اور سینئر صحافی نے تو یہ تک کہہ دیا کہ ہم مسلسل بھونک رہے ہیں مگر اس پر کسی دوسرے صحافی یا کالم نگار نے کچھ نہیں لکھا حالانکہ یہ توہین صحافت ہے۔ ہماری بد قسمتی کہ آج ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جہاں سچ کی سزا موت اور عدل وانصاف اب قصہ ماضی ہے۔ ملک کی حفاظت کرنے والے اداروں کے خلاف اندرونی اور بیرونی حملہ آور صف آراء ہیں اور عدلیہ کو مسلسل دباؤ میں رکھنے کے نت نئے منصوبے بن رہے ہیں ہر طرف دہشت گردوں اور قسم قسم کے مافیاجات کی حکمرانی ہے اور ہر عزت دار سفید پوش اور رزق حلال کمانے والا مشکل اور کٹھن راہوں کا مسافر ہے۔ صحافت کی کتابوں میں پڑھا تھا اور استادوں نے پڑھایا تھا کہ صحافی غریب اور مظلوم کی آواز اور بے کس وبے بس کی فریاد ہیں۔ صحافی کا قلم ظلم وجبر کے خلاف تلوار جیسا

اثر رکھتا ہے اور وہ ظالم وجابر حکمرانوں کے دلوں پر نشتر کی طرح زخم لگاتا ہے صحافی کٹھن راہوں کا مسافر ہوتا ہے جسے قدم قدم پر مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے آزاد میڈیا اور بیباک اینکروں کی خوش گفتاری اور صحافت کے علمبرداروں کی سیاسی وفاداری نے پہلی بار صحافت میں نئی اصطلاح متعارف کروائی ہے کہ صحافی بھونکتا بھی ہے۔ امید ہے کہ اس اصطلاح پر سینئر صحافی اور سینئر اینکر ضرور لکھیں گے اور بولیں گے اب تو محاورے بھی الٹ گئے ہیں جو گرجتے ہیں وہ برستے بھی ہیں اور جو بھونکتے ہیں وہ کاٹتے بھی ہیں۔ اپنا خیال رکھیئے گا۔ اگر کسی گھر کے گیٹ پر لکھا ہوں کہ کتوں سے ہوشیار رہیں تو مطلب سمجھ جائیں کہ یہاں کتا نہیں کاٹنے والا بندہ رہتا ہے۔

آزاد کشمیر میں برادری جمہوریت

میاں نواز شریف اب تیسری بار پاکستان کے حاکم اعلیٰ بنے ہیں اور اس بار پہلی دو باریوں کی نسبت کچھ انوکھے طور واطوار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ الیکشن تو انہوں نے لاہور سے جیتا مگر لگا یوں کہ وہ جالندھر یا پھر امرتسر کے کسی حلقے سے امیدوار تھے۔ میاں صاحب نے حلف.برداری سے پہلے بھارتی وزیراعظم کو تقریب حلف.برداری میں مدعو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اہل بھارت نے بھی خوب تمسخر اڑایا بلکہ یہاں تک کہا کہ پاکستان ایک بے اہمیت اور بے ہمت ملک ہے۔ اسی دوران افغانستان سے امریکی فوج کے انخلاپر تبصرہ کرتے ہوئے بھارتی شوبوائے سلمان خورشید نے کہا کہ افغانستان پر پاک امریکہ بات چیت کی حدود کا تعین بھارت کریگا جس پر پاکستان اور امریکہ دونوں نے خاموشی اختیار کی جبکہ جناب سرتاج عزیز نے اپنے حالیہ بیان میں کہا کہ لاہور میں ہونے والے واجپائی کیساتھ مذاکرات.برابری کی سطح پر تھے مگر اب پاکستان کی پوزیشن کمزور ہے۔ سرتاج عزیز روپے پیسے کے حسابی ہیں ۔ وہ ہمیشہ ٹیکس لگانے ، عوام کی جیبیں خالی کرنے اور حکمرانوں کی تجوریاں بھرنے کا کام کرتے رہے ہیں۔ وہ نہ سیاستدان ہیں ، نہ سیاسی ورکر ، نہ فوجی جرنیل اور نہ ہی سائنسدان۔ وہ پٹھان تو ہیں مگر انکا آبائی پیشہ ٹھکیداری اور

سرکار کی نوکری ہے جبکہ میاں صاحب نے انہیں محض وفاداری کی بنیاد پر غلط کام پر لگا دیا ہے۔ وزیر خارجہ اور وزارت امور خارجہ کا مشیر کسی دلیر اور بہادر شخص کو لگانا چاہیے تھا جو نہ صرف خارجہ امور کا ماہر ہو بلکہ وہ چانکیہ اور میکاولی کے چیلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بات کرنے کی ہمت اور جرات بھی رکھتا ہو۔ جناب سرتاج عزیز نے کس بنیاد پر یہ بیان دیا ہے اس کی وضاحت میاں صاحب کو کرنی چاہیے ۔ قومیں غیرت ، ہمت اور جرات کی قوت سے زندہ رہتی ہیں نہ کہ دولت اور ظاہری طمطراق کے بل بوتے پر۔ ائیر کنڈیشنڈ کوٹھیوں ، دفتروں اور کاروں کے عادی لوگ اگر اہم عہدوں پر فائیز ہونگے تو پاکستان کے دشمن اسے آسان ھدف سمجھ کر اپنی بات منوانے کے لیے دباؤڈالینگے اور ہوسکتا ہے کہ ایک بہادر اور غیور قوم ایسے مشیروں اور وزیروں کی خواہشات کی بھینٹ بھی چڑھ جائے۔

جناب محمد اسد جنہیں مفکر پاکستان نے تحریک حصول پاکستان کے لیے کام کرنے پر لگایا تو جناب محمد اسد خود حیران تھے کہ پاکستان تو محض ایک آئیڈیا ہے، مسلمان انتشار کا شکار ہیں ، آدھے سے زیادہ لیڈر کانگرس کے سرگرم رکن ہیں اور پنجاب پر انگریزوں کے حمائت یافتگان کی حکومت تو ان حالات میں پاکستان کیسے بنے گا۔ جناب اسد اپنی تصنیف روڈ ٹومکہ میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کے حکم پر میں نے مسلم لیگ کے دفتر میں کام شروع کر دیا اور پھر دیکھتے ہی

دیکھتے حالات بدل گئے اور آخر کار ایک خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ جناب محمد اسد جرنلزم ، سفارتکاری اور سیاحت میں وسیع تجربہ رکھتے تھے مگر اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر پطرس بخاری نے اس عظیم مفکر اور دانشور کے خلاف سازشوں کا ایسا جال بچھایا کہ وہ مایوس ہو کر پاکستان کی فارن سروس ہی نہیں بلکہ پاکستان ہی چھوڑ گئے ۔اب بھی ماحول کچھ ایسا ہی ہے۔ جناب طارق فاطمی ایک علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور سفارتکاری میں بھی وسیع تجربے کے حامل ہیں ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے اور آپ نے بھی جناب ایم ایم عالم کی طرح بنگلہ دیش جانے کے بجائے پاکستان میں رہ کر خدمات سرانجام دینے کا عزم کیا۔ جناب فاطمی کو مشیر برائے امور خارجہ تو لگا دیا گیا مگر ان پر بھی جناب سرتاج عزیز کی صورت میں ایک پطرس بخاری مسلط کر دیا گیا ہے۔ لگتا ہے ہے میاں صاحب کو بھی جناب آصف زرداری نے متاثر کیا ہے جیسے انھیں جیل کے یار اقتدار میں بہت یاد آئے اسی طرح میاں صاحب کو سوائے اپنے گھرانے ، بٹ برادری کے اور دوستوں یاروں کے کسی دوسرے شخص پر اعتماد ہی نہیں ۔

جناب سرتاج عزیز بنکار، معیشت دان اور کاروباری بیک گراونڈ کے آدمی ہیں مگر وزارت خزانہ ان کے سپرد کرنے کے بجائے انہیں سفارتکانے چلانے کا کام دے دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جناب سرتاج عزیز کو خزانے پر بٹھانے کی صورت میں اسحاق ڈار ناراض ہو جاتے اور جسطرح جناب اسحاق ڈار میاں خاندان کی خدمت کر

سکتے ہیں سرتاج عزیز شائد ایسا نہ کرتے۔

سندھ، پنجاب اور کے پی کے میں یکساں نوعیت کی حکومتیں بلکہ برادری جمہوریتیں ہیں۔ سندھ کی وزارت اعلیٰ تو جناب قائم علی شاہ کے پاس ہے مگر وہ جناب اویس ٹپی کے قائم مقام ہیں۔ اصل حکمران جناب ٹپی ہیں جبکہ فائیلوں پر دستخط بڑے شاہ صاحب کرتے ہیں۔ اویس ٹپی بھی سید زادے ہیں اس لیے احتراماً وہ کسی فائل پر دستخط نہیں کرتے یا پھر وہ جو کچھ کرتے ہیں اور کر رہے ہیں اس سے بچنے کے لیے قائم علی شاہ کا قلم استعمال کروا رہے ہیں۔ کل کلاں اگر وہ دستخط کرنے کے جرم میں پکڑے بھی جاتے ہیں تو وہ عمر کے ایسے حصے میں ہیں جہاں انہیں سزا دینے کے لیے آئین میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ جج سزا دینے سے پہلے پوچھے گا کہ اسقدر عمر رسیدہ شخص کو بار بار وزیر اعلیٰ بنانے کی سزا کیوں دی گئی جبکہ اسے زندگی کے آخری آیام میں آرام کرنے، توبہ کرنے اور عبادت کرنے کی ضرورت تھی۔ جناب قائم علی شاہ اور جناب سید اویس ٹپی شائد نہ پکڑے جائیں مگر انہیں ان عہدوں پر ذبردستی بھٹانے والے اس جہاں نہ سہی اگلے جہاں ضرور پکڑے جائیگے۔

پنجاب میں خادم اعلیٰ اور ان کا بیٹا شریک اقتدار ہیں جبکہ تایا ابا مرکز میں وزیر اعظم ہیں۔ اٹک سے خانپور تک راجہ پورس کی ساری ریاست پر جناب شہباز

شریف اور جناب حمزہ شہباز شریف کا اقتدار ہے۔اسلیے اس علاقے میں برادری بلکہ گھریلو جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں ۔ دریائے سندھ کے پار راجہ امبی کی ریاست پر خان اعظم جناب عمران خان کی حکومت ہے اور یہاں پر بھی جناب پرویز خٹک اور ان کے قریبی رشتہ داروں کی حکمرانی ہے۔ کہتے ہیں کہ خٹک اور بنگش دو بھائی تھے ۔جب دونو ں کی اولادیں جوان ہوگئیں اور آبادی بڑھ گئ تو دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ ایک بھائی شہروں میں اور دوسرا بھائی دیہاتوں اور پہاڑوں میں چلا جائے۔ اسطرح خٹک بنجر اور ویران علاقوں میں آباد ہوگئے اور بنگش سرسبز علاقوں پر قابض ہوئے جبکہ حکمرانی کے حقدار یوسف زئی ٹھہرے۔یہ توکتابی باتیں ہیں بلکہ کہاوتیں ہیں مگر پاکستان بننے کے بعد ہر حکومت میں کرک، کوہاٹ اور بنوں کے خٹک سرفہرست رہے۔ خٹکوں ،بنگشوں اور مروتوں میں اچھے منتظم اور سیاستدان بھی ہوئے ہیں مگر اس بار پرویز خٹک کی حکومت کچھ دھکا سٹارٹ ہے۔ فیملی جمہوریت کے باوجود حکومتی کشتی دریائے کابل میں ڈھانواں ڈھول ہے جس کی بنیادی وجہ ملاحوں کے درمیان رسہ کشی ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے تحریک انصاف کی بنیاد ڈالی اور خان اعظم کے ابتدائی دور میں کارکن بنے خان نے انہیں جھنڈی دکھائی اور پرویز خٹک کے سر پر تاج حکمرانی رکھ دیا۔ جناب پرویز خٹک اس سے پہلے کئی بار پگڑیاں بدل چکے ہیں اور صوبہ سرحد کی سبھی سیاسی جماعتوں میں دیہاڑیاں لگا چکے ہیں جسکی بنیادی وجہ ان کے کاروبار کا تحفظ اور ذاتی مفاد رہا ہے۔ خان اعظم نے اپنے اشتہاروں میں جن

درزیوں ، رکشہ ڈرائیوروں، رنگ سازوں اور مزدوروں کی پبلسٹی کی انہیں وہ یکسر بھول کر اپنے کلاس فیلوز اور کاروباری لوگوں کی طرف لے گئے۔ اگر میں خان صاحب کی جماعت میں ہوتا تو خان پر سیاسی بدعہدی، دھوکہ دہی اور سیاسی چالبازی کا مقدمہ درج کرواتا۔ خان نے الیکشن کے اشتہاروں میں جن غریبوں کے نام اور چہرے استعمال کے ان میں سے ایک بھی اسمبلی میں نہیں پہنچا۔ صوبہ بلوچستان میں ڈاکٹر مالک وزیر اعلیٰ ہیں جو کہ بلوچی رسم ورواج کی خلاف ورزی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک سفید پوش ، عزت دار اور کمٹڈ سیاسی ورکر تو ہیں مگر وہ کسی قبیلے کے سردار، شہزادے، نواب زادے اور خانزادے نہیں۔ نہ ہی وہ مفتی، مولوی، حافظ اور علامہ ہیں۔ بلوچستان کے مولوی، مفتی علامہ، حافظ، سردار اور نواب انہیں دل سے وزیراعلیٰ تسلیم نہیں کر رہے اور نہ ہی انتظامیہ ان کے ساتھ کواپریٹ کرتی نظر آتی ہے۔ بلوچستان میں پہلی بار شاہی خانوادوں اور سرداروں کے ہاتھ سے وزارت اعلیٰ نکلی ہے جسے یہ لوگ برداشت نہیں کرینگے اور نہ ہی جناب ڈاکٹر مالک کو کامیاب وزیر اعلیٰ بننے دینگے۔

آزاد کشمیر میں ڈوگروں کے بعد پہلی بار ایک برادری کا اقتدار قائم ہوا ہے جسے پاکستان میں اسی برادری کے حکمرانوں کی مکمل حمائت حاصل ہے۔ آزاد کشمیر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ آزاد کشمیر میں برادری جمہوریت قمرزمان کاہرہ اور منظور وٹو کے ذھن کی اختراع ہے جسے سرحد پولیس کی مدد سے قائم کیا گیا۔ آزاد

کشمیر میں قائم جمہوریت کا جاب کرنیوالوں کو میں کوٹلی آنے کی دعوت دیتاہوں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے نام نہاد جمہوریت کا نظارہ کر سکیں۔ کوٹلی ضلع کی ساری انتظامیہ سینئیر وزیر کی برادری سے تعلق رکھتی ہے اور جن جن لوگوں نے سینئیر وزیر کے خلاف الیکشن لڑایا پھر آئیندہ الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتے تھے انہیں مختلف کمیٹیوں اور کارپوریشنوں کا چیئرمین لگاکر لاکھوں روپے ماہانہ تنخواہ اور مہنگی گاڑیاں دیکرانہیں خرید لیا گیا ہے۔ وزیر حلقہ نمبر 4 تحصیل چڑہوئی سے ایم ایل اے ہیں مگر نادرہ اور تحصیلدار کا دفتر تحصیل ہیڈ کواٹر کے بجائے ایک چھوٹے سے قصبے جرائی وزیر موصوف کے گاؤں میں منتقل کیا گیا ہے۔ میاں نواز شریف نے جمہوریت کے بہترین مفاد میں اپنی ذاتی ملکیت نواز لیگ آزاد کشمیر شاخ کو شاہی فرمان جاری کیا کہ وہ آزاد کشمیر میں قائم برادری جمہوریت کیخلاف عدم اعتماد کی تحریک میں شامل نہ ہوں تاکہ دیگر صوبوں کی طرح آزاد کشمیر میں کاہرہ اور وٹو فارمولے کے تحت بننے والی برادری حکومت قائم رہے۔ لگتا ہے کہ میاں صاحب کشمیر کے معاملات میں دلچسپی ہی نہیں رکھتے اور نہ ہی انہیں مسئلہ کشمیر کے دل سے کوئی سروکار ہے۔ جناب زرداری نے مسند اقتدار پر بیٹھتے ہی اعلان کیا تھا کہ مسئلہ کشمیر کو تیس سال تک منجمند کیا جائے اور پھر موصوف نے اس پر کوئی بیان نہ دیا تاکہ بھارت باآسانی کشمیر میں ڈیم تعمیر کر سکے۔ پرویز مشرف نے بھارت کو لائن آف کنٹرول پر باڑ لگانے کی اجازت دی اور آزاد کشمیر کو مقبوضہ کشمیر سے الگ

کروادیا۔ لگتا ہے کہ میاں صاحب پرویز مشرف اور آصف علی زرداری کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے آئے ہیں اور کچھ جمہوری فنکاروں اور صلاح کاروں کی ہدایت کے مطابق آزاد کشمیر میں برادری جمہوریت کو فروغ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ میاں صاحب نے اقتدار میں آکر آزاد کشمیر میں قائم کرپٹ حکومتی نظام کو جو حوصلہ دیا اس سے آزاد کشمیر کے عوام سخت مایوسی اور بزدلی کا شکار ہوئے ہیں ۔ میاں صاحب کے جن صلاح کاروں نے آزاد کشمیر میں جمہوریت کے فروغ کا منصوبہ بنایا ہے اسپر وہ واقعی قابل صد تحسین ہیں مگر اچھا ہوتا اگر وہ میرپور سے کوٹلی براستہ چڑہوئی ایک مختصر دورہ کرکے وزیر اعظم پاکستان کو مجید حکومت کی ترقیاتی منصوبوں اور خاصکر میرپور کوٹلی روڈ کی خستہ حالت سے بھی آگاہ کرتے ۔ یہ سڑک کالاڈب کے مقام تک وزیر اعظم کے حلقے سے گزرتی ہے اور کالاڈب سے ڈماس تک سینئیر وزیر کے حلقے میں آتی ہے۔ بل ڈماس وزیر تعلیم کا گاؤں ہے اور اس سے آگے ڈونگی تک یہ سڑک نمار استہ وزیر تعلیم کے حلقے میں واقع ہے۔

کیا وزیر اعظم پاکستان ، وزیر داخلہ اور فروغ جمہوریت کے پاسبان چھ کروڑ روپے کے صلاح کار دنیا میں کوئی ایسی مثال ڈھونڈ کر پیش کر سکتے ہیں کہ کسی حکومتی وزیر نے اہم سرکاری دفاتر اپنے گھر میں قائم کیئے ہوں اور وزیر اعظم اسپر خاموش تماشائی ہوں ۔آزاد کشمیر کے سینئیر وزیر کا علاقہ عملاً نو گو (NO

ایریا ہے جہاں کسی .برادری خاصکر راجپوت .برادری کے افراد کا داخلہ ممنوع ہے۔ (GO چڑہوئی کے بعد علاقہ کے دوسرے .بڑے قصبے کالاڈب کی جامع مسجد میں کوئی راجپوت عید اور جمعہ کی نماز نہیں پڑھ سکتااور پچھلے گیارہ سالوں سے یہ مسجد راجپوت .برادری کے لیے ممنوع قرار دی گئی ہے، فلسطین اور کشمیر میں تو مسلمان نماز پڑھتے ہیں مگر کالاڈب میں مسلمان صرف سیئنیر وزیر کی .برادری والے ہیں ۔کیا میاں نواز شریف اور ان کے صلاح کاروں کے پاس کوئی ایسی مثال ہے ۔اگر ہے تو اسے پاکستان اور آزاد کشمیر کے عوام کے سامنے لائیں تاکہ اسے تاریخ کا حصہ بنایا جاسکے۔ سیئنیر وزیر نے تحصیلدار اور نادرہ کا دفتر اپنے گھر کے قریب اس لیے منتقل کیا ہے کہ وہ جعلی شناختی کارڈوں کا اتنا زخیرہ کرلیں کہ آئیندہ الیکشن میں مطلوبہ ووٹ ان کی جیت میں محفوظ ہوں ۔ سیئنیر وزیر کے اس جرم میں رحمان ملک اور چیئرمین نادرہ .برابر کے شریک ہیں جن کے خلاف انکوائیری کرواکر انہیں سزا دینی چاہیے ۔ پچھلے الیکشن سے ایک رات پہلے کوٹلی میں واقع نادرہ آفس ڈی جی نادرہ کے حکم سے کھولا گیا اور ایک ہی رات میں ہزاروں جعلی شناختی کارڈ سرحد پولیس کی حفاظت میں تیار کئے گئے ۔ ڈی جی نادرہ نے یہ جرم رحمان ملک اور قمرزمان کاہرہ کے حکم پر کیا جسے میاں نواز شریف جمہوریت کہتے ہیں ۔ نادرہ اور تحصیلدار کا دفتر تحصیل ہیڈ کوارٹر چڑہوئی سے جرائی منتقل کرنے کا

مقصد جعلی شناختی کارڈوں کا حصول اور راجپوت قبیلے کی زمینوں کا ریکارڈ تبدیل کرنا تھا جو اب تک ہوچکا ہے۔ کوئی راجپوت جرائی جا کر نہ تو شناختی کارڈ بنوا سکتا ہے اور نہ ہی زمینوں کا ریکارڈ دیکھ سکتا ہے۔ آزاد کشمیر کا وزیر اعظم اپنے سینئیر وزیر کے آگے بے بس ہے اور میاں نواز شریف نے اپنے صلاح کاروں کے اشارے پر ایک کرپٹ اور وٹوکاہرہ فارمولے کے تحت پاؤنڈ مافیا کی حکومت کو دنیا کی بہترین جمہوریت قرار دیا ہے۔ میاں صاحب اور ان کے جمہوریت نواز دوستوں کو برادری جمہوریت مبارک ہو مگر یاد رکھیں ظلم کی سیاہ رات طویل تو ہوتی ہے مگر سورج کی ایک کرن اسکی ساری سیاہی مٹا دیتی ہے۔ ایسی سیاہی اور اندھیری میں جو لوگ ظلم و جبر کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اسی ظلمت کدے میں نشان عبرت بھی بن جاتے ہیں۔

آزاد کشمیر میں برادری جمہوریت

میاں نواز شریف اب تیسری بار پاکستان کے حاکم اعلیٰ بنے ہیں اور اس بار پہلی دو باریوں کی نسبت کچھ انوکھے طور واطوار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ الیکشن تو انھوں نے لاہور سے جیتا مگر لگا یوں کہ وہ جالندھر یا پھر امرتسر کے کسی حلقے سے امیدوار تھے۔ میاں صاحب نے حلف.برداری سے پہلے بھارتی وزیراعظم کو تقریب حلف.برداری میں مدعو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اھل بھارت نے بھی خوب تمسخر اڑایا بلکہ یہاں تک کہا کہ پاکستان ایک بے اہمیت اور بے ہمت ملک ہے۔ اسی دوران افغانستان سے امریکی فوج کے انخلاپر تبصرہ کرتے ہوئے بھارتی شوبوائے سلمان خورشید نے کہا کہ افغانستان پر پاک امریکہ بات چیت کی حدود کا تعین بھارت کریگا جس پر پاکستان اور امریکہ دونوں نے خاموشی اختیار کی جبکہ جناب سرتاج عزیز نے اپنے حالیہ بیان میں کہا کہ لاہور میں ہونے والے واجپائی کیساتھ مذاکرات.برابری کی سطح پر تھے مگر اب پاکستان کی پوزیشن کمزور ہے۔ سرتاج عزیز روپے پیسے کے حسابی ہیں ۔ وہ ہمیشہ ٹیکس لگانے ، عوام کی جیبیں خالی کرنے اور حکمرانوں کی تجوریاں بھرنے کا کام کرتے رہے ہیں۔ وہ نہ سیاستدان ہیں ، نہ سیاسی ورکر ، نہ فوجی جرنیل اور نہ ہی سائنسدان۔ وہ پٹھان تو ہیں مگر انکا آبائی پیشہ ٹھکیداری اور سرکار کی نوکری ہے جبکہ میاں صاحب نے

انہیں محض وفاداری کی بنیاد پر غلط کام پر لگا دیا ہے۔ وزیر خارجہ اور وزارت امور خارجہ کا مشیر کسی دلیر اور بہادر شخص کو لگانا چاہیے تھا جو نہ صرف خارجہ امور کا ماہر ہو بلکہ وہ چانکیہ اور میکاولی کے چیلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بات کرنے کی ہمت اور جرات بھی رکھتا ہو۔ جناب سرتاج عزیز نے کس بنیاد پر یہ بیان دیا ہے اس کی وضاحت میاں صاحب کو کرنی چاہیے ۔ قومیں غیرت ، ہمت اور جرات کی قوت سے زندہ رہتی ہیں نہ کہ دولت اور ظاہری طمطراق کے بل بوتے پر۔ ائیر کنڈیشنڈ کوٹھیوں ، دفتروں اور کاروں کے عادی لوگ اگر اہم عہدوں پر فائیز ہونگے تو پاکستان کے دشمن اسے آسان ھدف سمجھ کر اپنی بات منوانے کے لیے دباؤڈالینگے اور ہوسکتا ہے کہ ایک بہادر اور غیور قوم ایسے مشیروں اور وزیروں کی خواہشات کی بھینٹ بھی چڑھ جائے۔

جناب محمد اسد جنھیں مفکر پاکستان نے تحریک حصول پاکستان کے لیے کام کرنے پر لگایا تو جناب محمد اسد خود حیران تھے کہ پاکستان تو محض ایک آئیڈیا ہے، مسلمان انتشار کا شکار ہیں ، آدھے سے زیادہ لیڈر کانگرس کے سرگرم رکن ہیں اور پنجاب پر انگریزوں کے حمائت یافتگان کی حکومت تو ان حالات میں پاکستان کیسے بنے گا۔ جناب اسد اپنی تصنیف روڈ ٹو مکہ میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کے حکم پر میں نے مسلم لیگ کے دفتر میں کام شروع کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے حالات بدل گئے اور آخرکار ایک خواب نے حقیقت کا روپ

دھار لیا۔ جناب محمد اسد جرنلزم، سفارتکاری اور سیاحت میں وسیع تجربہ رکھتے تھے مگر اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر پطرس بخاری نے اس عظیم مفکر اور دانشور کے خلاف سازشوں کا ایسا جال بچھایا کہ وہ مایوس ہو کر پاکستان کی فارن سروس ہی نہیں بلکہ پاکستان ہی چھوڑ گئے ۔ اب بھی ماحول کچھ ایسا ہی ہے۔ جناب طارق فاطمی ایک علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور سفارتکاری میں بھی وسیع تجربے کے حامل ہیں ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے اور آپ نے بھی جناب ایم ایم عالم کی طرح بنگلہ دیش جانے کے بجائے پاکستان میں رہ کر خدمات سرانجام دینے کا عزم کیا۔ جناب فاطمی کو مشیر برائے امور خارجہ تو لگا دیا گیا مگر ان پر بھی جناب سرتاج عزیز کی صورت میں ایک پطرس بخاری مسلط کر دیا گیا ہے۔ لگتا ہے ہے میاں صاحب کو بھی جناب آصف زرداری نے متاثر کیا ہے جیسے انھیں جیل کے یار اقتدار میں بہت یاد آئے اسی طرح میاں صاحب کو سوائے اپنے گھرانے، بٹ برادری کے اور دوستوں یاروں کے کسی دوسرے شخص پر اعتماد ہی نہیں ۔

جناب سرتاج عزیز بنکار، معیشت دان اور کاروباری بیک گراونڈ کے آدمی ہیں مگر وزارت خزانہ ان کے سپرد کرنے کے بجائے انہیں سفارتکانے چلانے کا کام دے دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جناب سرتاج عزیز کو خزانے پر بٹھانے کی صورت میں اسحاق ڈار ناراض ہو جاتے اور جسطرح جناب اسحاق ڈار میاں خاندان کی خدمت کر

سکتے ہیں سرتاج عزیز شائد ایسا نہ کرتے۔

سندھ، پنجاب اور کے پی کے میں یکساں نوعیت کی حکومتیں بلکہ برادری جمہوریتیں ہیں۔ سندھ کی وزارت اعلیٰ تو جناب قائم علی شاہ کے پاس ہے مگر وہ جناب اویس ٹپی کے قائم مقام ہیں۔ اصل حکمران جناب ٹپی ہیں جبکہ فائیلوں پر دستخط بڑے شاہ صاحب کرتے ہیں۔ اویس ٹپی بھی سید زادے ہیں اس لیے احتراماً وہ کسی فائل پر دستخط نہیں کرتے یا پھر وہ جو کچھ کرتے ہیں اور کر رہے ہیں اس سے بچنے کے لیے قائم علی شاہ کا قلم استعمال کروا رہے ہیں۔ کل کلاں اگر وہ دستخط کرنے کے جرم میں پکڑے بھی جاتے ہیں تو وہ عمر کے ایسے حصے میں ہیں جہاں انہیں سزا دینے کے لیے آئین میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ جج سزا دینے سے پہلے پوچھے گا کہ اسقدر عمر رسیدہ شخص کو بار بار وزیراعلیٰ بنانے کی سزا کیوں دی گئی جبکہ اسے زندگی کے آخری آیام میں آرام کرنے، توبہ کرنے اور عبادت کرنے کی ضرورت تھی۔ جناب قائم علی شاہ اور جناب سید اویس ٹپی شائد نہ پکڑے جائیں مگر انہیں ان عہدوں پر ذبردستی بھٹانے والے اس جہاں نہ سہی اگلے جہاں ضرور پکڑے جائیگے۔

پنجاب میں خادم اعلیٰ اور ان کا بیٹا شریک اقتدار ہیں جبکہ تایا ابا مرکز میں وزیراعظم ہیں۔ اٹک سے خانپور تک راجہ پورس کی ساری ریاست پر جناب شہباز

شریف اور جناب حمزہ شہباز شریف کا اقتدار ہے۔اسلیے اس علاقے میں برادری بلکہ گھریلو جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں ۔ دریائے سندھ کے پار راجہ امبی کی ریاست پر خان اعظم جناب عمران خان کی حکومت ہے اور یہاں پر بھی جناب پرویز خٹک اور ان کے قریبی رشتہ داروں کی حکمرانی ہے۔ کہتے ہیں کہ خٹک اور بنگش دو بھائی تھے ۔ جب دونو ں کی اولادیں جوان ہو گئیں اور آبادی بڑھ گئی تو دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ ایک بھائی شہروں میں اور دوسرا بھائی دیہاتوں اور پہاڑوں میں چلا جائے۔ اسطرح خٹک بنجر اور ویران علاقوں میں آباد ہو گئے اور بنگش سرسبز علاقوں پر قابض ہوئے جبکہ حکمرانی کے حقدار یوسف زئی ٹھہرے۔ یہ توکتابی باتیں ہیں بلکہ کہاوتیں ہیں مگر پاکستان بننے کے بعد ہر حکومت میں کرک، کوہاٹ اور بنوں کے خٹک سرفہرست رہے۔ خٹکوں ، بنگشوں اور مروتوں میں اچھے منتظم اور سیاستدان بھی ہوئے ہیں مگر اس بار پرویز خٹک کی حکومت کچھ دھکا سٹارٹ ہے۔ فیملی جمہوریت کے باوجود حکومتی کشتی دریائے کابل میں ڈھانواں ڈھول ہے جس کی بنیادی وجہ ملاحوں کے درمیان رسہ کشی ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے تحریک انصاف کی بنیاد ڈالی اور خان اعظم کے ابتدائی دور میں کارکن بنے خان نے انہیں جھنڈی دکھائی اور پرویز خٹک کے سر پر تاج حکمرانی رکھ دیا۔ جناب پرویز خٹک اس سے پہلے کئی بار پگڑیاں بدل چکے ہیں اور صوبہ سرحد کی سبھی سیاسی جماعتوں میں دیہاڑیاں لگا چکے ہیں جسکی بنیادی وجہ ان کے کاروبار کا تحفظ اور ذاتی مفاد رہا ہے۔ خان اعظم نے اپنے اشتہاروں میں جن

درزیوں ، رکشہ ڈرائیوروں، رنگ سازوں اور مزدوروں کی پبلسٹی کی انہیں وہ یکسر بھول کر اپنے کلاس فیلوز اور کاروباری لوگوں کی طرف لے گئے۔ اگر میں خان صاحب کی جماعت میں ہوتا تو خان پر سیاسی بدعہدی، دھوکہ دہی اور سیاسی چالبازی کا مقدمہ درج کرواتا۔ خان نے الیکشن کے اشتہاروں میں جن غریبوں کے نام اور چہرے استعمال کے ان میں سے ایک بھی اسمبلی میں نہیں پہنچا۔ صوبہ بلوچستان میں ڈاکٹر مالک وزیر اعلیٰ ہیں جو کہ بلوچی رسم ورواج کی خلاف ورزی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک سفید پوش، عزت دار اور کمٹڈ سیاسی ورکر تو ہیں مگر وہ کسی قبیلے کے سردار، شہزادے، نواب ذادے اور خانزادے نہیں۔ نہ ہی وہ مفتی، مولوی، حافظ اور علامہ ہیں۔ بلوچستان کے مولوی، مفتی علامہ، حافظ، سردار اور نواب انہیں دل سے وزیراعلیٰ تسلیم نہیں کر رہے اور نہ ہی انتظامیہ ان کے ساتھ کواپریٹ کرتی نظر آتی ہے۔ بلوچستان میں پہلی بار شاہی خانوادوں اور سرداروں کے ہاتھ سے وزارت اعلیٰ نکلی ہے جسے یہ لوگ.برداشت نہیں کرینگے اور نہ ہی جناب ڈاکٹر مالک کو کامیاب وزیر اعلیٰ بننے دینگے۔

آزاد کشمیر میں ڈوگروں کے بعد پہلی بار ایک.برادری کا اقتدار قائم ہوا ہے جسے پاکستان میں اسی.برادری کے حکمرانوں کی مکمل حمائت حاصل ہے۔ آزاد کشمیر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ آزاد کشمیر میں.برادری جمہوریت قمرزمان کاہرہ اور منظور وٹو کے ذھن کی اختراع ہے جسے سرحد پولیس کی مدد سے قائم کیا گیا۔ آزاد

کشمیر میں قائم جمہوریت کا جاب کرنیوالوں کو میں کوٹلی آنے کی دعوت دیتا ہوں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے نام نہاد جمہوریت کا نظارہ کرسکیں۔ کوٹلی ضلع کی ساری انتظامیہ سینئیر وزیر کی برادری سے تعلق رکھتی ہے اور جن جن لوگوں نے سینئیر وزیر کے خلاف الیکشن لڑا یا پھر آئیندہ الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتے تھے انہیں مختلف کمیٹیوں اور کارپوریشنوں کا چیئرمین لگا کر لاکھوں روپے ماہانہ تنخواہ اور مہنگی گاڑیاں دیکر انہیں خرید لیا گیا ہے۔ وزیر حلقہ نمبر 4 تحصیل چڑہوئی سے ایم ایل اے ہیں مگر نادرہ اور تحصیلدار کا دفتر تحصیل ہیڈ کواٹر کے بجائے ایک چھوٹے سے قصبے جرائی وزیر موصوف کے گاؤں میں منتقل کیا گیا ہے۔ میاں نواز شریف نے جمہوریت کے بہترین مفاد میں اپنی ذاتی ملکیت نواز لیگ آزاد کشمیر شاخ کو شاہی فرمان جاری کیا کہ وہ آزاد کشمیر میں قائم برادری جمہوریت کیخلاف عدم اعتماد کی تحریک میں شامل نہ ہوں تاکہ دیگر صوبوں کی طرح آزاد کشمیر میں کاہرہ اور وٹوفارمولے کے تحت بننے والی برادری حکومت قائم رہے۔ لگتا ہے کہ میاں صاحب کشمیر کے معاملات میں دلچسپی ہی نہیں رکھتے اور نہ ہی انہیں مسلۂ کشمیر کے دل سے کوئی سروکار ہے۔ جناب زرداری نے مسند اقتدار پر بیٹھتے ہی اعلان کیا تھا کہ مسلۂ کشمیر کو تیس سال تک منجمند کیا جائے اور پھر موصوف نے اس پر کوئی بیان نہ دیا تاکہ بھارت باآسانی کشمیر میں ڈیم تعمیر کرسکے۔ پرویز مشرف نے بھارت کو لائن آف کنٹرول پر باڑ لگانے کی اجازت دی اور آزاد کشمیر کو مقبوضہ کشمیر سے الگ

کروادیا۔ لگتا ہے کہ میاں صاحب پرویز مشرف اور آصف علی زرداری کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے آئے ہیں اور کچھ جمہوری فنکاروں اور صلاح کاروں کی ہدایت کے مطابق آزاد کشمیر میں برادری جمہوریت کو فروغ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میاں صاحب نے اقتدار میں آکر آزاد کشمیر میں قائم کرپٹ حکومتی نظام کو جو حوصلہ دیا اس سے آزاد کشمیر کے عوام سخت مایوسی اور بزدلی کا شکار ہوئے ہیں۔ میاں صاحب کے جن صلاح کاروں نے آزاد کشمیر میں جمہوریت کے فروغ کا منصوبہ بنایا ہے اسپر وہ واقعی قابل صد تحسین ہیں مگر اچھا ہوتا اگر وہ میرپور سے کوٹلی براستہ چڑھوئی ایک مختصر دورہ کرکے وزیر اعظم پاکستان کو مجید حکومت کی ترقیاتی منصوبوں اور خاصکر میرپور کوٹلی روڈ کی خستہ حالت سے بھی آگاہ کرتے۔ یہ سڑک کالاڈب کے مقام تک وزیر اعظم کے حلقے سے گزرتی ہے اور کالاڈب سے ڈماس تک سینئیر وزیر کے حلقے میں آتی ہے۔ بل ڈماس وزیر تعلیم کا گاؤں ہے اور اس سے آگے ڈونگی تک یہ سڑک نمار استہ وزیر تعلیم کے حلقے میں واقع ہے۔

کیا وزیر اعظم پاکستان، وزیر داخلہ اور فروغ جمہوریت کے پاسبان چھ کروڑ روپے کے صلاح کار دنیا میں کوئی ایسی مثال ڈھونڈ کر پیش کر سکتے ہیں کہ کسی حکومتی وزیر نے اہم سرکاری دفاتر اپنے گھر میں قائم کیئے ہوں اور وزیر اعظم اسپر خاموش تماشائی ہوں۔ آزاد کشمیر کے سینئیر وزیر کا علاقہ عملاً نوگو (NO

ایریا ہے جہاں کسی.برادری خاصکر راجپوت.برادری کے افراد کا داخلہ ممنوع ہے۔ (GO
چڑہوئی کے بعد علاقہ کے دوسرے.بڑے قصبے کالاڈب کی جامع مسجد میں کوئی راجپوت
عید اور جمعہ کی نماز نہیں پڑھ سکتااور پچھلے گیارہ سالوں سے یہ مسجد راجپوت.برادری
کے لیے ممنوع قرار دی گئی ہے، فلسطین اور کشمیر میں تو مسلمان نماز پڑھتے ہیں مگر
کالاڈب میں مسلمان صرف سپیکر وزیر کی.برادری والے ہیں ۔کیا میاں نواز شریف اور
ان کے صلاح کاروں کے پاس کوئی ایسی مثال ہے ۔اگر ہے تو اسے پاکستان اور آزاد کشمیر
کے عوام کے سامنے لائیں تاکہ اسے تاریخ کا حصہ بنایا جاسکے۔ سپیکر وزیر نے تحصیلدار
اور نادرہ کا دفتر اپنے گھر کے قریب اس لیے منتقل کیا ہے کہ وہ جعلی شناختی کارڈوں کا اتنا
زخیرہ کرلیں کہ آئیندہ الیکشن میں مطلوبہ ووٹ ان کی جیت میں محفوظ ہوں ۔ سپیکر
وزیر کے اس جرم میں رحمان ملک اور چیئرمین نادرہ.برابر کے شریک ہیں جن کے
خلاف انکوائیری کرواکر انہیں سزا دینی چاہیے ۔ پچھلے الیکشن سے ایک رات پہلے کوٹلی
میں واقع نادرہ آفس ڈی جی نادرہ کے حکم سے کھولا گیا اور ایک ہی رات میں ہزاروں
جعلی شناختی کارڈ سرحد پولیس کی حفاظت میں تیار کئے گئے ۔ ڈی جی نادرہ نے یہ جرم
رحمان ملک اور قمرزمان کاہرہ کے حکم پر کیا جسے میاں نواز شریف جمہوریت کہتے ہیں ۔
نادرہ اور تحصیلدار کا دفتر تحصیل ہیڈ کواٹر چڑہوئی سے جرائی منتقل کرنے کا

مقصد جعلی شناختی کارڈوں کا حصول اور راجپوت قبیلے کی زمینوں کا ریکارڈ تبدیل کرنا تھا جو اب تک ہوچکا ہے۔ کوئی راجپوت جرائی جا کر نہ تو شناختی کارڈ بنوا سکتا ہے اور نہ ہی زمینوں کا ریکارڈ دیکھ سکتا ہے۔ آزاد کشمیر کا وزیر اعظم اپنے سینئیر وزیر کے آگے بے بس ہے اور میاں نواز شریف نے اپنے صلاح کاروں کے اشارے پر ایک کرپٹ اور وٹو کا برہ فارمولے کے تحت پاؤنڈ مافیا کی حکومت کو دنیا کی بہترین جمہوریت قرار دیا ہے۔ میاں صاحب اور ان کے جمہوریت نواز دوستوں کو برادری جمہوریت مبارک ہو مگر یاد رکھیں ظلم کی سیاہ رات طویل تو ہوتی ہے مگر سورج کی ایک کرن اسکی ساری سیاہی مٹادیتی ہے۔ ایسی سیاہی اور اندھیری میں جو لوگ ظلم و جبر کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اسی ظلمت کدے میں نشان عبرت بھی بن جاتے ہیں۔

پاکستانی سیاست فریب کا فلسفہ

تاریخ کی قدیم ترین اور مستند کتابوں میں شمار پنڈت کلہن کی راج ترنگنی اور چانکیہ کو تیلیہ کی ارتھ شاستر سر فہرست ہیں۔ارتھ شاستر چانکیہ نیتی پر مبنی طریق حکمرانی کے اصولوں کو وضع کرتی ہے کہ ایک بادشاہ کو دھوکہ دہی،فراڈ،فریب،چکمہ سازی اور چالبازی کے ذریعے عوام کو کسطرح بیوقوف بنانا چاہیئے تاکہ بادشاہ کیلئے کوئی مشکلات پیدانہ کر سکیں چانکیہ عوام کش پالیسیوں اور جبر کی سیاست کا مبلغ ہے۔وہ بادشاؤں کو عیش و عشرت اور عوام کو حکمرانوں کی خدمت کا درس دیتا ہے۔چانکیائی سیاست میں عوام کی حیثیت خدمتگارانہ اور بادشائیوں کی عیارانہ،مکارانہ اور عیاشانہ ہے۔چانکیہ کی فارن پالیسی یا خارجہ حکمت عملی بھی دھوکہ دہی پر مبنی ہے۔وہ کہتا ہے کہ جب پڑوسی کمزور ہو تو اسپر فوراً حملہ کردو اس کے ملک پر قبضہ نہ کرو۔وہاں ایک باجگزار اور اپنی پسند کا حکمران بٹھاؤ تاکہ وہ آپ کی مرضی کے مطابق اپنے عوام کا استحصال کرےEnemy of my enemy is my friendکا فارمولہ بھی چانکیہ ہی کا پیش کردہ ہے وہ کہتا ہے کہ دشمن کے دشمن سے دوستی کرو اور انھیں باہم لڑانے کی سلسل کوشش کرتے رہو۔چانکیہ نفرت کی سیاست کا پیروکار ہے وہ دشمن قوم کی نسل کشی کا قائل ہے تاکہ صدیوں تک مخالف نظریات کی حامل

اقوام میں کوئی لیڈر یا قائد پیدا نہ ہوسکے وہ کہتا ہے کہ جب پڑوسی کے گھر میں آگ لگے تو آپ پر قرض ہے کہ جسقدر اسکے گھر کو لوٹ سکتے ہو لوٹ لو وہ پڑوسی کا گھر لوٹنے کو جرم نہیں بلکہ حق سمجھتا ہے۔

چانکیہ کوتیلیہ کے افکار کو اسکے پیروکار میکاولی نے آگے بڑھایا اور چانکیہ نیتی کے سیاسی اصولوں کو مزید اجاگر کیا۔ میکالی عوام کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ سادہ مزاج اور اہل غرض ہوتے ہیں اور اہل غرض احمق اور فرمانبردار ہوتے ہیں۔ حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ عوام کی غرض مندی اور بیوقوفی سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور انھیں اپنے ہی مسائل میں الجھا کر رکھیں وہ حکمرانوں کو بخل کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عوام سے ان کی دولت چھین لیں اور اسے فوج پر اور اپنی ذات پر خرچ کریں۔ فوج کی مضبوطی ملکی سلامتی اور بادشاہ کی حفاظت حکومتی سلامتی کیلئے ضروری ہے وہ بادشاہ کو بد عہد اور معاملہ فہم ہونے کا درس دیتا ہے۔ میکالی کے مطابق بادشاہ جب عہد توڑے تو اسے قانون کا سہارا لینا چاہیے۔ حکمران کو چاہئے کہ وہ شاطر بد عہد، بے وفا اور بد دیانت ہو مگر اسے اپنی مکارانہ اور سفاکانہ چالیں عوام ہی نہیں بلکہ خواص سے بھی پوشیدہ رکھنی چاہئے۔ بناوٹ کا ماہر حکمران ہمیشہ قائم رہتا ہے اور عوام اسے اپنا ہمدرد و غمگسار سمجھ کر اسپر جان نچھاور کردیتے ہیں۔ میکاولی اپنی دلیل کی تقویت کیلئے سکندر طاؤس کا حوالہ دیتا ہے کہ بد عہدی میں کوئی

شخص اس کے برابر نہ تھا۔ بظاہر وہ جتنا مخلص و محب تھا حقیقت میں اتنا ہی مکار اور عیار بھی تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے مکروفریب میں کامیاب رہا کیونکہ وہ انسانی فطرت سے پوری طرح واقف تھا وہ حکمرانوں کے اوصاف میں مزید لکھتا ہے کہ حکمران کو بظاہر اچھی شہرت کا حامل ہونا چاہئے اسکے لئے بہتر ہے کہ وہ تقویٰ، امانت، انسانی محبت اور اخلاص کا ایسے طریقے سے اظہار کرے کہ عوام اسکے اس ظاہری فعل کو حقیقت تصور کریں اور اسے نجات دھندہ اور عوام دوست سمجھ کر اسکی پوجا کریں۔ میکاولی کا آئیڈیل حکمران لومڑی کی طرح مکار اور شیر کی طرح بہادر ہونا چاہیئے تاکہ عوام پر اسکے جبر اور فتنے کا خوف طاری رہے۔ وطن عزیز کے قیام کے بعد پہلے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح، وزیر اعظم لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرہ، چوہدری محمد علی، حسین شہید سہروردی اور آئی آئی چندریگر کے علاوہ کوئی ایسا نام تاریخ پاکستان کے اوراق پر نہیں جو چانکیہ اور میکاولی کے بیان کردہ حکمرانوں کی صفات سے مبرا ہو۔ سکندر مرزا ایک سازش کے ذریعے ملک کے حکمران بنے اور پھر سازش ہی کے ذریعے ایوب خان نے انھیں اقتدار سے ہٹا کر ملک بدر کر دیا۔ ایوب خان طویل عرصہ تک حکمران رہے اور چاپلوس اور چکمہ ساز سیاستدانوں کا ایک ٹولہ ان کی حکمرانی کی طوالت کا باعث بنا۔ ایوب خان کے دوستوں، رشتہ داروں، بیٹوں اور کابینہ والوں نے ایوبی حکمرانی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور دولت کے انبار لگائے۔ ایوب خان کے بعد ان کے روحانی بیٹے جناب ذوالفقار

علی بھٹو نے نیا پاکستان بنایا تو چاپلوس اور چکمہ ساز قائدین کا ایک ٹولہ ان کے گرد جمع ہوگیا مگر جناب بھٹو میکاولین اور چانکیہ نیتی کے اصولوں سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے اس ٹولے سے تو محفوظ رہے مگر اپنی ہی چالوں کے شکنجے میں آ گئے۔آپ نے 73 کا آئین تو بنایا مگر چند روز کے اندر ہی سات ترجیحات کے ذریعے اس کی اصل شکل بگاڑ دی۔

بھٹو کی شخصیت کا سحر اور میکاولین تعلیمات کا اثر آج تک قائم ہے اور عوام الناس انھیں غریب پرور، نجات دھندہ، آئین ساز، عوام دوست اور مخلص و محب تصور کرتے ہیں۔پاکستان کا کوئی دانشور، تاریخ دان، ماہر آئین و قانون، ماہر امور سیاست جناب بھٹو کی اصل شخصیت پر توجہ نہیں دیتا کہ موصوف نے کسطرح سکندر مرزا کو شیشے میں اتارا اور کابینہ کا حصہ بن گئے۔سکندر مرزا رخصت ہوئے تو آپ نے ایوب خان کو پاکستان کا اتاترک، صلاح الدین ایوبی اور ڈیگال قرار دیا۔آپ نے اپنے خطوط کے ذریعے سکندر مرزا اور ایوب خان کو قائداعظمؒ سے بڑا لیڈر اور محسن پاکستان قرار دیا جسکا ذکر جناب غلام جیلانی اور جناب اثر چوہان اکثر اپنی تحریروں میں کرتے رہتے ہیں۔آپ نے یحییٰ خان کی بھی بھرپور مدد کی اور نئے پاکستان میں انکے کردار کی گنجائش بھی رکھ چھوڑی تھی مگر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اس عہد کو نبھا نہ سکے۔روٹی کپڑا اور مکان جیسا پر کشش نعرہ آج بھی بھٹو ازم کا حصہ ہے اور عوام اسی نعرے کی

امید پر جی رہے ہیں بھٹو صاحب نے اپنے قریب ترین ساتھیوں اور دوستوں کو بھی نہ بخشا اور انکا تمسخر اڑانا اور انکی تذلیل کرنا اپنی سیاسی زندگی کا حصہ بنایا بہت سینئر اور سنجیدہ لکھاری بھٹو صاحب کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہیں۔ بھٹو ازم کے عزائم بھٹو فلسفے کے دو چہرے ہیں۔کہتے ہیں کہ بھٹو مکاولی کی ''دی پرنس'' اپنے سرہانے رکھتے تھے جبکہ نہرو چانکیہ کوتیلیہ کو اپنا روحانی استاد مانتے تھے۔ بھٹو صاحب نے میکاولی کی بیان کردہ خوبیوں میں سے صرف ایک اپنائی وہ ہمیشہ شیر کی طرح حملہ آور ہونے اور مخالفین کو بچھاڑنے میں دیر نہ لگاتے مگر بھٹو نے لومڑی کی طرح مکاری اور فریب کاری کا سہارا نہ لیا اور موت کو گلے لگا لیا۔

محترمہ بینظیر بھٹو کی سیاسی تربیت ان کے والد نے کی تھی اور ان ہی کے اصولوں اور نظریات کو آگے بڑھانے کا ارادہ تو رکھتی تھیں مگر بحثیت ایک مسلمان اور مشرقی عورت کے انھیں اسکا موقع نہ ملا۔ طویل عرصہ جیلوں اور پھر جلا وطنی کے بعد انھیں جو سیاسی ٹیم میسر آئی اس میں زیادہ تعداد جوشیلے جیالوں کی تھی جنھیں سیاست یا تو ورثے میں ملی تھی یا پھر بھٹو ازم کی پکار اور للکار کے صلے میں انھیں اعلیٰ ترین مناصب پر فائز کر دیا گیا۔ فیصل صالح حیات، مخدوم خلیق الزمان اور دوسرے درجنوں گدی نشین صاحبزادگان اور پرانے لیڈروں کے شہزادگان کے علاوہ جہانگیر بدر اور اسی طرح کے بیک گراؤنڈ کے

جوشیلے جیالے بھی راتوں رات منافع بخش وزارتوں اور اسی طرح کے بیک گراؤنڈ کے ورکروں کے علاوہ کسی کی رسائی نہ تھی میر باز خان کیتھران کو وزارت امور کشمیر ملی تو موصوف کے دفتر کے اندر اور باہر سوائے بلوچوں کے کسی دوسرے صوبے یا آزاد کشمیر کے لوگوں کا داخلہ ہی ممکن نہ رہا۔ موصوف اکثر کشمیریوں کو گالیاں دیتے اور اگر کوئی جیالہ بنکر وزارت امور کشمیر کے دروازے پر پہنچ ہی جاتا تو اسے سوائے گالیوں اور تھپڑوں کے کچھ نہ ملتا۔ محترمہ کی شادی بھی ان کی سیاسی اڑان کے راستے میں حائل ہوئی اور جناب آصف زرداری پر شروع دن سے ہی کرپشن اور کمیشن کے الزامات لگنے شروع ہوگئے۔ وزیر داخلہ چوہدری اعتزاز احسن کی بھارت نوازی اور جنرل ریٹائیرڈ شمس الرحمٰن کلو کی بحثیت آئی ایس آئی چیف نے بھی بہت سے سنجیدہ سوالات اٹھائے جس کی وجہ سے نہ صرف ان کی حکومت بد نام ہوئی بلکہ بحثیت وزیر اعظم وہ اپنی ذاتی ٹیم کو بھی کنٹرول نہ کرسکیں اور آخر کار کرپشن کے الزامات پر ان کی حکومت برطرف کردی گئی۔ محترمہ کے بعد میاں نواز شریف وزیر اعظم بنے تو انھیں بھی محترمہ جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ میاں صاحب وزیر اعظم تو بن گئے مگر انھوں نے اس منصب کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ وہ زیادہ دیر کرکٹ کھیلنے ،انواع واقسام کے کھانے پکانے اور کھانے کے مزے لیتے رہے اور ان کے دوست یار، رشتہ دار اور بیورکریٹ حکومت کرتے رہے ۔ میاں برادران کا پہلا دورہ مغل شہزادوں جیسا تھا جو زیادہ دیر چل نہ سکا اور صدر غلام اسحاق جیسے محب وطن اور سلف میڈ

بیوروکریٹ نے میاں صاحبان کو بھی کرپشن اور نا اہلی جیسے شدید الزامات کی بنیاد پر چلتا کیا۔ میاں صاحب کے پہلے دور حکومت میں میاں ریاض محمود کوئی شخص تھے جو وزیراعظم کے کچھ اختیارات استعمال کرتے تھے۔ لاہور آمد پر میاں صاحب کھلی کچہری کا انعقاد کرتے اور اکثر سائلین کو میاں ریاض محمود کی بارگاہ میں ریفر کر دیتے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے نورتن تھے جو اقتدار کی رخصتی کے ساتھ ہی رخصت ہوتے رہے۔

میاں صاحبان کے سابقہ ادوار میں حسین حقانی اور مشاہد حسین سید بھی کرسی بدل بھائی بنے رہے۔ ایک بھائی پیپلز پارٹی اور دوسرا میاں صاحب کے جھروکے میں۔ حیرت کی بات ہے کہ دونوں سید زادے کبھی اکٹھے ایک جماعت میں نہیں رہے اور نہ ہی دونوں نے کبھی حقانیت اور حسینیت کا مظاہرہ کیا۔ حقانی صاحب نے شروع سے ہی ملک دشمنی کا رویہ اپنایا اور آخر کار ملک اور قوم سے غداری کا بدنما داغ لے کر بھگوڑوں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں حقانی نے اس ملک کو کسقدر نقصان پہنچایا فی الحال اس کہانی کے کئی پرت ابھی کھلے نہیں۔ عدلیہ نے اس شخص کو ملک سے کیوں جانے دیا اور حکومت نے اسے اپنی حفاظت میں وزیراعظم ہاؤس میں کیوں چھپائے رکھا اسپر بھی ابھی پردہ ہے۔ رحمٰن ملک اور حقانی کے مشترکہ منصوبوں اور امریکہ کا ان دونوں سے محبت بھی ایک کہانی ہے جسکی حقیقت صرف زرداری صاحب ہی جانتے ہیں۔

مشاہد حسین سید جنرل جہانگیر کرامت کے استعفٰے کے بعد ایک مسکراہٹ بھرا انٹرویو دیا جس میں یہ تاثر دیا گیا کہ وزیر اعظم نواز شریف ایک ایسے حکمران کا نام ہے جس کے آگے آرمی چیف جیسا مضبوط بندہ بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ سکتا ہے مشاہد حسین نے جو کہ نواز شریف کے ایڈوائزر تھے مگر برا وقت آتے ہی کچھ روز ہاؤس اریسٹ کے مزے اڑائے اور پھر مشرف پرپرویز ہو کر ق لیگ کے پلیٹ فارم پر جلوہ افرو ہوگئے۔ مشاہد حسین سید کی اصول پسندی اور چانکیہ نیتی میں فرق کرنا ایک مشکل امر ہے۔ق لیگ کے اعلیٰ سیاسی عہدیدار کی حیثیت سے آپ نے این آر او کے معرض NRO کو ایک NRO وجود میں آنے پر پھر اپنے رخسار کے تل کو مسکراہٹوں سمیت پھڑکایا اور درست سیاسی قدم اور یکجہتی کیلئے خوش کن عمل قرار دیا۔آپ نے پیپلز پارٹی اور ق لیگ کو بھی سیاست اور قربت کے رشتے بحال کرنے میں اپنے تدبر اور حکمت کو استعمال کیا مگر حیران کن بات یہ کہ صدر زرداری اور چوہدریوں کے درمیان ہونے والے NRO سے چند دن پہلے آپ نے لاڑکانہ میں جناب زرداری کی حکومت پر سخت تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کا صرف کرپشن ہی مشن ہے کہ ’’لٹو۔۔تے پھٹو‘‘ میرے سمیت بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ق لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان قائم ہونے والے رشتے پر جناب مشاہد حسین سید اصول پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ق لیگ سے علیحدگی اختیار کرینگے۔جناب مشاہد حسین چند روز پہلے جس پارٹی کو چور ڈاکو اور

لٹیرے قرار دے چکے تھے اب اسی پارٹی کی مداح سرائی ایک سید زادے، دانشور، بااصول سیاستدان اور چوٹی کے صحافی کو کسی طرح زیب نہیں دیتی تھی مگر آپ نے یہاں بھی چانکیہ کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مفادات کو اصولوں پر ترجیح دی۔ آپ پورے طمطراق کیساتھ اپنی سیاسی پوزیشن پر قائم رہے اور جس پارٹی کو لوٹتے پھٹو کہہ رہے تھے اسی کے آگے امریکہ کی سفارت اور کسی بھی قسم کی ٹوٹی پھوٹی وزارت کیلئے لابنگ کرتے رہے۔ حقانی کی سفارتی تنزلی اور محترمہ فردوس عاشق اعوان کے وزارت سے علیحدگی کے بعد بارہا آپ کا نام سفارت اور وزارت کے حقداروں کی فہرست میں آتا رہا مگر آپ کی دال کسی طور پر نہ گلی۔

جناب مشاہد حسین سید اندرون ملک تو کوئی اہم سیاسی کارنامہ سرانجام نہ دے سکے اور نہ ہی ان کی دانشوری سے ملک اور قوم کو کوئی فائدہ ہوا اور اب وہ پاک چائینہ فرینڈ شپ فورم کے سربراہ بنکر شائد اس رشتہ کو بھی بھگاڑنے چلے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک خبر آئی تھی کہ جناب مشاہد حسین کا بیٹا بھی اس میدان میں اتر چکا ہے اور پاک چائینہ فورم کے جلسے میں شرکت کے لئے ڈبل چین کا ٹھپہ لگوانے چین کے سفر پر روانہ ہوگیا ہے جناب مشاہد حسین سید کی پچھلی کارکردگی اور اصول پسندی کو دیکھتے ہوئے ہم عظیم دانشور کنفوشس کے اصولوں پر کاربند چینی قوم کیلئے دعا گو ہیں کہ ان پر میکاولین اور چانکیالن نحوست

کا سائیہ نہ پڑ جائے۔میکاولی اور چانکیہ دونوں ہی بوقت ضرورت اصولوں سے انحراف اور بد عہدی کا درس دیتے ہیں جبکہ ابن خلدون اور ابن رشد راست بازی،اصول پرستی اور ارادے کی پختگی کے ساتھ ساتھ عزم مصمم کے قائل ہیں۔ابن خلدون جگہ جگہ قرآنی حوالوں،احادیث رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کی زندگیوں سے مثالیں پیش کرتا ہے اور حکمرانوں کو اللہ اور رسول ﷺ کے بتلائے ہوئے رہنما اصولوں پر کار بند رہنے کی تلقین کرتا ہے۔بد قسمتی سے ہمارے حکمران،سیاستدان اور سیاسی دانشور اپنی سیاست کو چانکیائی اور میکاولین اصولوں کے تحت چلانے اور عوام کو دھوکہ دینے کے ماہر ہیں کرپشن، میشن، جھوٹ اور فریب ہماری سیاست کا باقاعدہ حصہ ہے اور بد قسمتی سے کوئی بھی سیاستدان، حکمران،سیاسی دانشور اس سے مبرا نہیں۔مذہبی سیاسی جماعتیں اور ان کے قائدین بھی چانکیائی سیاست کے قائل ہیں اور وہ حکومت سازی میں ان بڑی پارٹیوں کے حصہ دار بن جاتے ہیں فریب کاری اور چکمہ سازی کے ذریعے حکمرانی کرتے ہیں مذہبی سیاسی جماعتیں اپنے منشور میں تو اسلام اور مساوات کی باتیں کرتی ہیں مگر حکومت سازی میں وہ ان بڑی جماتوں کا حصہ بن جاتی ہیں جو جمہوریت کی آڑ میں جبر اور ظلم کا نفاذ کرتی ہیں۔ہم نے اپنے آئین میں تو اللہ کی حاکمیت لکھ دیا ہے مگر اللہ کے بنائے ہوئے کسی بھی قانون پر عمل نہیں کرتے۔ہم نے اپنے ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا ہے مگر ہمارے سیاستدان ،سیاسی دانشور اور اب سیاسی تجزیہ نگار صحافی اور ٹیلیویژن اینکر کھل کر اسلام پر تنقید کرتے ہیں اور

اسلام کو ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔مذہبی دانشور کسی ایک نکتے پر متفق نہیں اور وہ ایک دوسرے کو مارنے اور مٹانے کو دین کی خدمت اور جہاد کہتے ہیں وزیر، مشیر اور حکمران جماعتوں کے عہدیدار اپنی برائیوں اور غلطیوں پر نادم ہونے کے بجائے اسے آئین اور قانون کے حوالوں سے درست قرار دیتے ہیں اور بدقسمتی سے آئین اور قانون میں اس بات کی گنجائش مل جاتی ہے کہ کسی
کرپٹ، بددیانت اور بدکردار کو اسکے عمل کی سزا نہیں ملتی۔حالیہ الیکشن میں آئین کی شق نمبر62اور63کا جسطرح ماتحت عدلیہ اور میڈیا نے تمسخر اڑایا اس سے تو بہتر تھا کہ آئین میں لکھ دیا جاتا کہ الیکشن لڑنے کیلئے امیر، کبیر، کرپٹ، بددیانت، لوٹ مار کا ماہر اور اخلاق باختہ ہونا ضروری ہے۔قرآن میں لکھا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی کرو اور انکی بھی پیروی کرو جو تم میں سے اولوالامر ہوں۔اگر تم میں اور اولواالامر میں اختلاف پیدا ہو جائے تو تم اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے رجوع کرو۔یعنی قرآن، حدیث اور سیرت نبوی ﷺ سے رہنمائی حاصل کرو۔یعنی
قرآن، حدیت اور سیرت نبوی ﷺ سے رہنمائی حاصل کرو۔ہمارے ہاں نہ اولوالامر اور نہ ہی عوام قرآن، احادثت رسول ﷺ اور سیرت پاک کی طرف سے رجوع کرتے ہیں حکمران عوام کے پاس آنے سے پہلے امریکہ، برطانیہ، سعودی عرب ارو امارات کے شیخوں سے رجوع کرتے ہیں اور پھر ایک ڈرامہ رچا کر اسے الیکشن کا نام دیا جاتا ہے جو ایک جمہوری بچہ پیدا کرتا ہے جسے حکمران کہا جاتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا نام لیکر اغیار کی پیروی کرتے ہیں اور دھوکہ دہی پر مبنی ایک نظام کو اسلام کا لبادہ پہنا کر خود فریبی کی دنیا میں جی رہے ہیں جب تک ہم اس دھوکے اور فریب کی دنیا میں رہینگے دہشت گردی، بدامنی، غربت جہالت اور بے سکونی ہمارا مقدر رہے گی۔ فیصلہ عوام نے کرنا ہے کہ وہ چانکیائی اور، میکاولین فکر و فلسفے کے تحت ذلیل و خوار ہونا چاہتے ہیں یا پھر اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم کے تابع امن و سکون سے زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں۔

ہیروز آف پاکستان

ایک بڑے اخبار میں خبر آئی ہے کہ امریکہ کا ایک ادارہ گرین کارڈ کیپیٹل پاکستانی نوجوانوں کی میڈیا سے رغبت بڑھانے اور ان کی زندگیوں اور کیریر میں اہم رول ادا کرنے والے ہیروز پر ایک فلم بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دراصل یہ ایک فلمی مقابلہ ہوگا اور ہیروز آف پاکستان 2013 پر بننے والی مختصر دورانیے کی پہلی تین فلمیں امریکہ اور دنیا بھر کے ٹیلیوژن چینلوں پر دیکھائی جائینگی۔ اس مقابلے میں پیش کی جانے والی فلموں کا دورانیہ پانچ منٹ یا پھر اس سے کم ہوگا۔ گرین کیپیٹل امریکہ کے چیف آپریٹنگ آفیسر عباس ہاشمی نے پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں میڈیا کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا کہ انسان کی زندگی میں والدین، دوستوں، اساتذہ، عزیز و اقارب کے علاوہ معاشرے کے کئی افراد ہیروز کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ انہیں آئیڈیل بنا کر اپنی زندگی میں ترجیحات کو اولیت دیتے اور ان کے نقش قدم پر چلکر اپنے مستقبل کی راہ متعین کرتے ہیں۔ عباس ہاشمی کے مطابق فلم بنانے کے لیے پروفیشنل کیمرے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی عمر کی قید ہے۔ کوئی بھی مرد یا عورت اپنی زندگی میں اہم کردار ادا کرنیوالے مرد یا عورت جسے وہ ہیرز تصور کرتا یا کوئی کرتی ہے پر ایک ویڈیو بنا کر پیش کر سکتا یا سکتی ہے۔ مقابلے میں شرکت کے لیے ویڈیو 31 اکتوبر تک پیش کی جا سکتی ہے اور

نتائج کا اعلان ایک جیوری دسمبر میں کرے گی۔

میں اپنی اس تحریر کی وساطت سے امریکن گرین کارڈ کیپیٹل سے گزارش کرونگا کہ فلم کا نام ہیروز آف پاکستان 2013ء کا نام ہیروز آف پاکستان 2013ء تک رکھ دیا جائے اور اس فلم کا دورانیہ کم از کم پندرہ گھنٹے ہو تا کہ دنیا کو ہمارے ہیروز کے متعلق نہ صرف آگاہی ہو بلکہ وہ اس فلم پر ریسرچ کریں اور اپنی یونیورسٹیوں میں ان ہیروز پر لکھی جانے والی کتابیوں اور تحریروں سے اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک اہم اور اچھوتا مضمون تخلیق کرجائیں اس مضمون کے کیا فوائد ہونگے اسپر لیکچرکے لیے ان آئیڈیل شخصیات اور ہیروز کو اپنے اپنے ملکوں میں مدعو کریں اور ان سے فیض حاصل کریں۔

بظاہر لگتا ہے یہ فلم ملالہ یوسفزائی، میاں ضیاالدین، جناب آصف علی زرداری، جناب عبدالرحمٰن ملک ، جناب سید پرویز مشرف، جناب راجہ رینٹل، جناب یوسف رضا گیلانی سے لیکر ہمارے آخری قومی ہیروز جناب زمرد خان اور ملک سکندر تک تین اہم شخصیات کو دنیا میں متعارف کرونے اور انھیں ایوارڈ دینے کیلیے امریکی بنوا رہے ہیں۔

اگر آپ ملالہ پر فلم بنانا چاہتے ہیں تو یہ انتہائی آسان ہے اور ایوارڈ بھی

مل سکتا ہے۔آپ لکھیں میری آئیڈئل شخصیت ملالہ۔ پھر آپ اس میں پاکستان کے معروف اینکر پرسنز کے ان پروگراموں کی جھلکیاں ڈالیں۔ جس میں اینکر پرسن ملالہ سمیت دیگر بچیوں سے ان کے مستقبل لت بارے میں سوالات کر رہا تھا تو ان تمام نے اپنے تباہ حال سکول کی تعمیر کی بات کی اور امن کی خوائش کا زکر کیا مگر قرعہ ملالہ کے نام نکلا جسکا باپ اس لفظ پر ایک محل تعمیر کرنیوالا تھا۔اور آٹھ سالہ معصوم بچی کو اپنی خواہشات کے لیے استعمال کرنیوالا تھا۔

آپ دوسرا سین بھی انھیں ٹی وی شوز میں سے نکال سکتے ہیں جب ملالہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا میرا آئیڈئل اللہ اور آخری نبی اور وجہ تخلیق کائینات حضور پاک ہیں ۔ملالہ نے اپنی باری پر کہا میری آئیڈیل بینظیر بھٹو اور میرے والد محترم ہیں۔ظاہر ہے بچوں کو سوالنامہ پہلے دیا گیا ہوگا اور بچے سوالات کے جواب ذہن میں رکھ کر آئے تھے۔ان میں سے کچھ نے قائدا عظم کو بھی اپنا آئیڈیل کہا مگر وہ سب کسی ایوارڈ کے حقدار نہ بنے۔اس فلم کا اگلا کلپ بی بی سی سے تیار کیا جا سکتا ہے جہاں ملالہ کے والد نے گل مکئ کے عنوان سے ایک ڈائیری لکھی اور ملالہ کے نام سے بی بی سی کو بھوائی۔ گل مکئ سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے اور ادھے منٹ کا کلپ یہاں سے بھی جوڑا جا سکتا ہے۔

ایک مختصر شارٹ وہ بھی ہے جب ملالہ سوات کے کسی سکول میں زمین پر بیٹھ کر بچوں سے گپ شپ کر رہی ہے جیسے بچوں کو تعلیم دینا بتلایا گیا ہے۔ پھر زخمی ہونا، برطانیہ میں خطاب اور مختلف ممالک اور تنظیموں سمیت کی طرف سے UNO پہنچنا اور آخر میں ایوارڈ کی فہرست دکھائی جا سکتی ہے جس میں امن کا نوبل ایوارڈ اور کم سن ترین اور پھر پاکستانی بچی کو ملنا۔ اسطرح یہ فلم مقابلے میں پوزیشن بھی لے گی اور گھر بیٹھے کمپیوٹر کی مدد سے تیار ہو جائے گی۔

جناب آصف علی زرداری کو اپنا آئیڈیل سمجھنے والوں کیلئے بھی آسانی رہے گی پہلی جھلکی اس فلم کے گانے سے لی جا سکتی ہے جہاں صدر محترم وحید مراد کے بچپن کا رول ادا کر رہے ہیں پھر شادی کی چند تصاویر اور جیل جانے اور آنے کے مناظر پاکستان کھپے کا تاریخی نعرہ، وعدہ خلافی کے حق میں فتویٰ کہ سیاسی وعدے قرآن کا لفظ نہیں ہوتے وہ تقریر جس میں فرمایا کہ لوہار کا کیا وژن ہو سکتا ہے، بطور صدر حلف، زرداری اور مخصوص ٹی وی چینل کو دیئے جانے والے تاریخی انٹرویو جس میں ہر سوال کے جواب میں فرمایا کہ آپ کی نظر میں اک زرداری سب پر بھاری اگلی باری پھر ہماری اور ایوان صدر سے گارڈ آف آنر اور رخصتی یہ فلم بھی گھر بیٹھے تیار ہو سکتی ہے اور انعام ملنے کے چانسز بھی ہیں۔

جن لوگوں کے ہیرو جناب زمرد خان ہیں وہ بھی اس مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں یہ فلم انتہائی مختصر وقفے کی ہے۔

پہلا سین۔ ملک سکندر کی بیوی اپنے ہاتھ سے کچھ اشارے کرتی ہے جنکا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اب آ جاؤ، پھر اشارہ کرتی ہے پیچھے سے آ ؤ پھر لوگوں کو ہٹاؤ۔ ایک اشارہ اندر کی طرف ہے اور دوسرا باہر کی طرف، جیسے کہہ رہی ہو پیچھے ذرا پیچھے پھر آگے یا قریب یا آ جاؤ۔ پھر انگلیوں کو دائیرے میں گھماتی ہے جیسے کہہ رہی ہو گر کر اُٹھو تو میرے پیچھے آ جاؤ ہو سکتا ہے کہ ان اشاروں کا کچھ اور مطلب بھی ہو مگر بظاہر یہی لگ رہا ہے۔

زمرد خان آئے، بچوں سے ہاتھ ملایا، ملک سکندر کو بھونڈے طریقے سے پکڑنے کی کوشش کی اور آٹے کی بوری کی طرح ملک سکندر کے پاؤں میں گر گئے۔ ملک سکندر پیچھے ہٹا اور ہوائی فائیرنگ کی چونکہ فلم کے ڈائیریکٹر نے یہی بتایا تھا۔ اگر فلم ڈائیریکٹر کے بغیر ہوتی تو ملک سکندر جناب زمرد خان پر فائیر کرتا اور انکا مقام شہدوں میں نہیں تو غازیوں میں ضرور ہوتا۔

تیسرا سین۔ جناب زمرد خان مشکل سے اُٹھتے ہیں اور سکندر کی بیوی کے پیچھے

چھپنے کی کوشش کرتے ہیں اسی اثنا میں پولیس دوڑتی ہوئی اور فائیر کرتی ہوئی سکندر کی طرف آئی ہے مگر سکندر پولیس والوں پر بھی فائیر نہیں کرتا بلکہ زمین پر فائیر کرکے دونوں ہتھیار زمین پر پھینک دیتا ہے۔

چوتھا سین۔زمرد خان نے ملک سکندر کا بچہ اُٹھایا ہوا ہے زمرد خان ہیلی کاپٹر پر مظفر آباد تشریف لیجاتے ہیں جہاں آزاد کشمیر کا وزیر اعظم انھیں تحفہ شجاعت عطا کرتا ہے جو کہ جعلی اور فرضی ہے چونکہ آزاد کشمیر کا صدر یا وزیر اعظم کوئی ایوارڈ یا اعزاز دینے کا مجاز نہیں وہ صرف نقد پیسے دیتا ہے جو چھ کروڑ تک ہو سکتے ہیں۔دروغ بر گردن راوی مگر شنید ہے کہ وزیر اعظم آزاد کشمیر نے دو صحافیوں کو حکومت بچاؤ مہم میں کامیابی حاصل کرنے پر چھ کروڑ کا لفافہ دیا ہے۔

آخری سین۔زمرد خان جعلی اور فرضی تمغہ لے کر واپس آتے ہیں اور پھر یوم آزادی کی پریڈ میں شرکت کیلیئے بیرون ملک چلے جاتے ہیں اس فلم کے کامنیٹیٹر جناب چوہدری نثار،ہدایات کار اور کہانی نویس نا معلوم اور نا معقول،پروڈیوسر اسلام آباد کے پولیس چیف،ڈائیریکٹر نا آشنا معاونین،اسلام آباد پولیس اور اسلام آباد کے عوام،ڈسٹری بیوٹر اور پبلشر۔۔ معاونین آزاد میڈیا،ساتھی اداکار کنول اور بچے یہ فلم ہٹ ہو سکتی ہے اور انتہائی مختصر دورانیے کی ہے گھر

بیٹھے بنائی جا سکتی ہے۔
جناب عبدالرحمٰن ملک پر مختصر فلم نہیں بن سکتی اور نہ ہی ان کے علاوہ کوئی اداکار ان جیسی ایکٹنگ کر سکتا ہے ان کی فلم صرف ذوالفقار مرزا پروڈیوس کر سکتے ہیں جبکہ کہانی لکھنے کیلئے کئی مصنفین کی خدمات درکار ہونگی۔ضیاالحق دور کی کہانی اعجاز الحق لکھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن ملک ہلال پاکستان کسطرح ان کے والد کے قریب ہوئے اور ایف آئی اے میں نوکری حاصل کی بچپن اور طالب علمی کے زمانے کے واقعات راؤف کلاسرا کے علاوہ اور کوئی کھوجی حاصل نہیں کر سکتا جبکہ بینظیر دوراور بعد کے ادوار پر جناب آفتاب اقبال بھاری معاوضے کے عوض لکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ملک کا ملک سے فرار اور واپسی پر روزنامہ وحدت پشاور کے چیف ایڈیٹر جناب پیر سید ہارون الرشید گیلانی شاہد مفت ہی لکھ دیں جبکہ پشاور ایف آئی اے میں نوکری کے دوران سرانجام دیے گئے کارنامے کرنل ریٹائیرڈ واحد جان سے لکھوائے جا سکتے ہیں۔ملک صاحب کی پھرتیوں پر جناب رانا عبدالباقی بہتر تبصرہ کر سکتے ہیں مگر وہ ایسے کمتر موضوعات پر لکھنے کے عادی نہیں ملک کا پانچ سالہ اقتدار جناب بابر اعوان،جناب فرحت اللہ بابر اور محترمہ فردوس عاشق اعوان سے لکھوایا جا سکتا ہے چونکہ ایوان صدر کے انتہائی اندرونی حالات ان سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔جناب بابر اعوان اگر اپنی آنے والی کتاب کا نام عدالت نامہ رکھیں اور اس میں ایک

باب ملک نامہ کے عنوان سے بھی لکھ دیں تو سکرپٹ کسی حد تک مکمل ہو سکتا ہے یوں تو پچھلے پانچ سال حکومت جناب آصف زرداری کی تھی مگر اس کی سب سے مضبوط اینٹ عبدالرحمٰن ملک تھے۔ وہ لوگ جو جناب آصف علی زرداری کو چالاک، شاطر اور کایاں سیاستدان کہتے ہیں سراسر غلطی پر ہیں۔ جناب عبدالرحمٰن ملک کا جناب آصف زرداری کے دربار میں وہی مقام تھا جو چانکیہ کوتیلہ کا اشوک کے دربار میں تھا۔ بہرحال یہ فلم کسی بھی طرح مختصر دورانیے کی نہیں ہو سکتی۔

جناب یوسف رضا گیلانی اور پرویز اشرف اگر کسی کے آئیڈیل ہیں تو اسے نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ اگر پھر بھی کوئی بضد ہے تو وہ ان پر صرف تین منٹ کی فلم بنا سکتا ہے جس میں ان کی کرپشن کی فہرست، تصویر، ایوان وزیر اعظم میں خوشی خوشی آنا اور شرمندہ شرمندہ جانا ہی کافی ہے۔ گورے اگر تھرڈ ریٹ افسانے کو دنیا کا بہترین افسانہ قرار دیکر اسے ادبی انعام دے سکتے ہیں تو ایسی فلم کو بھی پہلا انعام مل سکتا ہے۔

آزاد کشمیر کے جیالے بھی اس انعامی مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں اور اپنی اپنی برادری کے ٹن وزیروں اور وزیر اعظموں کو بطور آئیڈیل پیش کر سکتے ہیں۔ ان مختصر فلموں کے نام بلیک لیبل سیریز ہو سکتا ہے چونکہ آزاد کشمیر کے سیاستدانوں کی زندگیوں میں بلیک لیبل کا بڑا کردار ہے۔ یہی سمجھ لیں کہ یہ

وہ کھچکی ہوئی گاڑیاں ہیں جو پٹرول کے بجائے بلیک لیبل پر چلتی ہیں اور لفافوں کے سہارے حکومت کرتی ہیں۔ریاست کا اسی فیصد بجٹ حکومتی اخراجات پر صرف ہوتا ہے جس میں کشمیر ہاؤس کے اخراجات اور کابینہ کی عیاشیاں سر فہرست ہیں۔ہوسکتا ہے کہ بیرسٹر، عتیق اور مجید کسی کے آئیڈیل ہوں اگر ایسا ہو تو جیوری انعام دے یا نہ دے حکومت آزاد کشمیر کو چاہیئے کہ وہ ایسے پیش کار کو زمرد خان میڈیل اور جہاد فنڈ سے ایک کروڑ روپیہ سکہ رائج الوقت کے ساتھ حامد کرزئی والی خلعت سے بھی نوازے۔
جناب اویس بھٹی، سابق وزیر اعلیٰ بلوچستان جناب اسلم رئیسانی پر بھی فلم بن سکتی ہے۔میاں برادران اور چوہدری برادران پر فلم بنانے کا فائدہ نہیں چونکہ یہ فلمیں کوالیفائینگ راؤنڈ میں ہی فعل ہوجائیگی۔مولانا فضل الرحمٰن اور جناب منور حسن پر فلم بنانے والا فتوے کی زد میں آجائے گا چونکہ علمائے کرام فلموں اور تصویروں کو اچھا نہیں سمجھتے۔البتہ ان کی کوئی تقریر پیش کی جاسکتی ہے مگر المیہ یہ ہے کہ علمائے کرام آدھا گھنٹہ وارم اپ ہونے اور پھر آدھا گھنٹہ تمہید باندھنے میں لگاتے ہیں۔تقریر چار پانچ گھنٹوں کی ہوتی ہے اور پھر علماء دعا بھی مانگتے ہیں اور اللہ سے عاجزی اور گریہ کے ساتھ اپنی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔وہ ساری امت اور عالم اسلام کا بھی ذکر کرتے ہیں جو گوروں کو بلکل پسند نہیں۔جناب بھائی الطاف حسین پر اول تو فلم بن ہی نہیں

سکتی۔اگر بنے بھی تو اسکے پروڈیوسر اور فنانسر جناب عبدالرحمٰن ملک اور ذوالفقار مرزا ہی ہو سکتے ہیں۔ضروری بات یہ بھی ہے کہ ایسی فلم خطرے سے خالی نہیں ہو سکتی اسلیے اگر کسی کے ذہن میں فلم کا ارادہ ہے تو بھائی باز آ باز آ ، دل کو تھام اور گھر جا۔

جناب عمران خان بھی طویل دورانیے کے سیاسی اداکار ہیں اور ابھی تک ان کی سیاست ان کے کارکنوں اور معاون لیڈروں کی سمجھ سے بھی باہر ہے۔وہ

کھلاڑی، سیاستدان، سماجی کارکن، مصنف، مہم جو، متکبر المزاج حکمران یا پھر مصلح اور مدبر انسان ہیں یا کچھ اور یہ سب سمجھ سے باہر ہے وہ ہٹ دھرمی پر آتے ہیں تو اپنے مرشد کی بھی نہیں مانتے جناب ہارون رشید ہی ان کی شخصیت پر کچھ لکھ سکتے ہیں مگر شفقت محمود جیسا بیورو کریٹ سیاستدان اس کی ونٹگ کرکے اصل مسودے کا حلیہ بگاڑ دے گا۔جناب خان اعظم کی زندگی کے کئی پہلو اور پیچیدہ پرت ہیں جسپر ایک مکمل اور کئی قسطوں پر مشتمل فلم کی ضرورت ہے۔جناب عمران خان پر مختصر فلم بنانا ان کے مزاج کے خلاف ہے اسلیے میں اس فلم ''سونامی خان''،''معافی خان'' اور اب بقول جناب ڈاکٹر اجمل نیازی کے ''شرمناک خان'' کی رائے نہیں دونگا۔

جناب پرویز مشرف پر مختصر دورانیے کی کئی فلمیں بن سکتی ہیں مگر فی الحال

وہ گھریلو قید میں ہیں۔ سنا ہے کہ وہ زیادہ وقت اپنے سوئمنگ پول کے کنارے گزارتے ہیں جہاں وہ سگار، کافی اور دیگر کڑوے کسیلے مشروبات سے دل بہلاتے ہیں۔ ان کے قریبی دوستوں کی ایک منڈلی بھی شاہی حمام کے کنارے انھیں وش رکھنے کی کوشش کرتی ہے وہ آنے جانے والوں سے شیخ رشید، امیر مقام، چوہدری برادران، کشمالہ طارق، فردوس عاشق اعوان اور دیگر کاف لیگیوں کا پوچھتے رہتے ہیں۔ جناب پرویز مشرف اہل زبان ہیں اگر پنجابی ہوتے تو میاں صاحبؒ کا یہ شعر ضرور پڑھتے

اس دنیا تے کم نہ آوے اوکھے سوکھے ویلے
اس بقدرے سنگے نالوں بہتر یار اکیلے

پرویز مشرف بھی بھولے بھالے نہیں۔ جناب زرداری کے ساتھ ایک دیسی پیر ہے جو صرف گوٹیاں فٹ کرتا ہے گوٹی مارتا نہیں۔ جناب مشرف کا مرشد شیخ ناظم ترک النسل قرصی یونانی ہے جنکی پیش گوئی ہے کہ ان کا بالکا پھر اقتدار میں آئے گا اور بہ جابہ جا کردے گا۔

سچ پوچھتے تو آئیڈیل کے بارے میں میں خود بھی خود غرض اور سلیپری ہوں۔ جو کوئی اقتدار میں ہوتا ہے یا پھر لفافے، پلاٹ اور پرمٹ خیرات کرتا ہے وہی میرا آئیڈیل بن جاتا ہے۔ جب سے چھ کروڑیے صحافیوں کا حصہ سنا ہے آزاد کشمیر

کا وزیر اعظم اور سینئر وزیر میرے آئیڈیل ہیں مگر کسی بھی کرپٹ اعلیٰ تک میری رسائی نہیں۔ جن صحافیوں کو چھ کروڑ کی شاباش ملنے کی غیر مصدقہ اطلاع ہے ان کی صحافت بھی واجبی نہیں ہے۔ دونوں ہی پراپرٹی ڈیلر اور سفارشی ہیں۔ خیرات میں مردے کا کفن بھی مل جائے تو دونوں بھائی تہبند اور کرتہ بانٹ لیتے ہیں۔ بات کرتے ہیں تو دو فٹ دور بیٹھے شخص پر تھوک گرتا ہے اور چاپلوسی میں تو پی ایچ ڈی ہیں۔

کچھ عرصہ تک ملک ریاض بھی میرے آئیڈیل رہے ہیں مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ پندرہ سے زیادہ ریٹائرڈ جرنیلوں کے آئیڈیل ہیں۔ برگیڈیئر اور ریٹائرڈ جنرل ان کے کچن میں کام کرتے ہیں۔ وہ اپنے نو دولتیے مہمانوں او کرپٹ سیاستدانوں سے پوچھتے ہیں کہ آپ برگیڈیئر کے ہاتھ کی بنی کافی فرمائینگے یا جنرل کے ہاتھ کی۔ اخبار میں ہر چیز پڑھ کر میرے ضمیر نے ملامت کی اور میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔ پھر اخبار میں خبر آئی کے پیر، شاعر، مصنف، محب وطن سپاہی اور درویش صفت دانشور جناب ضمیر کا فرزند اور فوجی جرنیل بھی ملک ریاض کے ادارے سے منسلک ہے تو مجھے کچھ حوصلہ ہوا چونکہ مرحوم میجر ضمیر جعفری مشہور کمپیئر شہناز کیساتھ ایک ٹیلویژن پروگرام کرتے تھے جسکا نام تھا ضمیر حاضر ضمیر غائب۔ شائد مرموم ضمیر جعفری اپنے اس پروگرام کے ذریعے بے ضمیروں کو کوئی پیغام دینا چاہتے تھے کہ ضمیر کو زندہ اور حاضر رکھوا ے

چند ٹکوں کی خاطر غائب نہ ہونے دو۔جب صحافیوں، دانشوروں اور وطن کے محافظوں کا
ضمیر غائب ہو جائے تو قوم زوال پذیر ہو جاتی ہے۔بر حال آپ ضمیر کو چھوڑیں اور چلتی
گاڑی کی زنجیر پکڑیں اور اپنے آئیڈیل پر فلم بنا کر بھیجیں اور انعام پائیں۔

توہین اولیاء

رومی کشمیر حضرت میاں محمد بخش کے روحانی درجات، فکری کمالات اور ادبی مقام و حیات سے کون واقف نہیں ۔ تصوف، روحانیت، ادب، فکر و فلسفہ حیات و بعد از حیات کے بیان میں جو مقام مولانا روم اور انکے روحانی مرید حضرت علامہ اقبال کا ہے وہی مقام حضرت میاں محمد بخش کا بھی ہے۔ جو کچھ علامہ اقبال اور مولانا روم نے فارسی اور اردو میں کہا اس سے کہیں بڑھ کر اور صاف اور سادہ الفاظ میں حضرت میاں محمد بخش نے پنجابی میں بیان کیا۔ اقبال اور رومی کو سمجھنے کیلئے استادوں اور ڈکشنریوں کی ضرورت ہے ۔مگر رومی کشمیر کو سمجھنے کیلئے گداز دل اور روشن دماغ ضروری ہے۔ میاں صاحب کا ہر شعر دوسرے شعر کی تشریح اور ہر لفظ کئی الفاظ کے معنی و مطالب کا ذخیرہ ہے، مولانا رومی فرماتے ہیں،

زر قلب وزر نیکو در عیار

بے مہک ہر گز ندارد اعتبار

کھوٹا سونا اور کھرا سونا پرکھنے میں بغیر کسوٹی کے ہر گز قابل اعتبار نہیں ۔ میاں صاحب فرماتے ہیں،

کچ وی منکا لعل وی منکا اکو رنگ دوہادا
جد صرافاں ہتھے چڑھدے فرق ہزار کوہاں دا

لعل اور کانچ ظاہری شکل و صورت میں ایک جیسے ہیں مگر جب صراف کے ہاتھ لگتے ہیں توانکی قدر و قیمت کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہر کسی کو نہیں ہوتی یہ کام صرف قدر شناسوں کا ہے۔ اسی موضوع پر میاں صاحب نے فرمایا

قدر پھلاں دی بلبل جانے صاف دماغاں والی
گرج کی جانے سار پھلاں دی مردے کھاون والی

پھولوں کی لطافت، نفاست، خوشبو اور نزاکت کی پہچان بلبل کو ہے چونکہ بلبل پاکیزہ ماحول کی عادی اور صاف دماغ والی ہے۔ پھولوں کی قدر گدھ کیا جانے وہ تو مردار خور ہے اسے تو مردہ جانوروں کے جسم سے اٹھنے والے بدبو کی پہچان ہے۔ کرپٹ، رشوت خور، چاپلوس اور جرائم پیشہ انسان بھی ایسے ہی خصلتوں کے حامل ہوتے ہیں جنکی وجہ سے نہ صرف معاشرہ اور ماحول بدبودار ہو جاتا ہے بلکہ ملک اور قومیں بھی برباد ہو جاتی ہیں.

میاں صاحب کا ہر شعر بامعنی، بامقصد اور بحر علم ظاہری و باطن کا انمول

موتی ہے۔ میاں صاحب نے پنجابی زبان کے انتہائی سادہ، عام فہم اور ایک سے زیادہ معنی و مطالب کے حامل الفاظ کو اپنے اشعار کی لڑی میں اس سلیقے سے پرویا جسکی مثال شاعری کی کسی صنف میں نہیں ملتی۔ میاں صاحب کی سلیقہ مند شاعری کو ادب کا کمال ہے کہ آپ سے پہلے اور آپکے بعد کی دنیا بھر میں کسی شاعر کو ادبی سلیقہ مندی کا ایسا ہنر نصیب نہیں ہوا۔ پنجابی کی طرح عربی، اردو، فارسی زبان میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں مگر ایک ہی لفظ کو ایک ہی شعر میں کثیر المقاصد مطالب کیلئے استعمال کا فن صرف رومی کشمیر حضرت میاں محمد بخش عارف کھڑی ہی کا کمال ہے

آئی جان شکنجے اندر جیوں ویلن وچ گنا
روح نو کہو ھن روح محمد ھن جے رویں تاں منا

روح گئے کارس، روح، روح رحمانی یا روح انسانی، روحیں یعنی اگر رک سکنے کی ہمت یا طاقت ہو تو رک جاؤ یا روک لو۔

قرآن کریم میں فرمان خداوندی ہے کہ فرشتے میرے حکم سے تمہاری رگ رگ سے روح کھینچ نکالتے ہیں۔ سورت واقعہ میں ذکر ہے کہ مرنے والے کے ہم تم سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں مگر نظر نہیں آتے۔ موت کو روکنا تمہارے بس میں نہیں۔ اگر سچے ہو تو روح کو پھیر کیوں نہیں لیتے۔ میاں صاحب نے انہی آیات مبارکہ کو

اپنے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اے انسان تو نے اپنے وقت مقررہ پر چلے جانا ہے اور تیرا جسم فانی ہے۔ اصل حقیقت روح کی ہے جو امر ربی ہے اور ایک مقررہ وقت تک تمہارے جسم کو سہارا دیئے ہوئے ہے۔ جب امر ربی پورا ہو جائے گا تو روح تو روح تمہارے جسم کو چھوڑ جائے گی اسلئے آنے والی اور ہمیشہ کی زندگی پر پر توجہ مرکوز کر۔ جب روح کھینچنے والے فرشتے آئینگے تو تیری حالت گنے کے اس ٹکڑے کی طرح ہو گی جو بیلن کے چرخے میں پھنس جاتا ہے۔ تیرا جسم موت کے شکنجے میں آجائے گا اور تیری نس نس سے روح نکال لی جائیگی۔ پھر فرمایا

جنہاں پچھے عیب کمائے کھتے نی تیری گھر دے

باہر پیا میں پیر پسارے کڈو کڈو کر دے

یعنی جن بیوی، بچوں، رشتہ داروں، دوستوں، یاروں وزیروں اور حاکموں کی خاطر تم نے گناہ کئے، مخلوق پر ظلم کیا، لوگوں کے حق پر ڈاکا ڈالا، رشوت خوری اور کرپشن کی، بے انصافیاں اور برائیاں کیں، آج وہ سب کدھر ہیں۔ آج تمہاری حالت یہ ہے کہ تم گھر کے باہر پڑے ہو اور تمہارا جسم مردہ ہے۔ تمہارے اعضا اکڑ گئے ہیں اور پاؤں مڑ گئے ہیں۔ تمہاری اولاد، بیوی اور دوست یار جلدی میں ہیں کہ مردے کو جلدی جلدی قبر میں ڈالا جائے تاکہ بدبو نہ آئے۔ آج تمہارے وہ گھر والے جن کی خاطر تم نے گناہوں کی کمائی اکٹھی کی

جلدی میں ہیں اور تم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دوڑ میں لگے ہیں۔۔

لوئی لوئی بھر لے کڑیئے جے تدھ پانڈہ بھرنا
شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نہ ڈرنا

لو یعنی روشنی، زندگی، اختیار، بس۔ شام یعنی بعد از غروب آفتاب اندھیرا چھانے کا وقت۔ پھر شام یعنی دوستوں کے، سہیلیوں کے۔ شام یعنی بغیر قافلے کے، بغیر کسی اثاثے کے خالی ہاتھ، یعنی بغیر ہتھیار کے۔

میاں صاحب فرماتے ہیں کہ اے انسان زندگی کو غنیمت جان اور روشنی میں، زندگی میں جوانی میں اپنا بہترین نیک اعمال سے بھر لے تا کہ موت کے بعد یعنی زندگی کی شام ہونے پر تو خالی ہاتھ اور شرمندہ اپنے رب کے حضور پیش نہ ہو۔ تیرے پاس آخرت کی زندگی کیلئے نیک اعمال اور نیکیوں کا اتنا خزانہ ہوتا کہ تو بغیر کسی حساب کے جنت میں قائم اپنے گھر میں داخل ہو جائے۔ تو اس زندگی میں اچھے اعمال اور عبادات سے لیس ہو کر چل جیسے ایک ہتھیار بند مجاہد بے خوف وخطر دشمنوں کا سامنا کرتے ہوئے فتح مند ہو کر گھر کو لوٹتا ہے۔ جیسے ایک نیک عمل دوشیزہ سہیلیوں کی جھرمٹ میں باحفاظت اپنا برتن بھر کر شام سے پہلے گھر لوٹ آتی ہے یا ایک تاجر اپنا خزانہ اور مال واسباب لیکر قافلے کے ہمراہ گھر پہنچ جاتا ہے۔ آگے فرمایا

جیون جیون جھوٹا ناواں موت کھلی سراُتے

لکھ ہزار تیرے توں سوہنے خاک اندر رل ستُے

زندگی ایک جھوٹ ہے، فریب ہے، وقتی کھیل ہے، ایک مہلت ہے۔ تو اس جھوٹ کو سچ سمجھ کر اسے حقیقت کا نام نہ دے اور موت کی تیاری کر۔ اس زندگی کی حقیقت اور مقصد وہ نہیں جسکا تصور شیطان نے تیرے دل و دماغ میں ڈال کر تجھے بے حس اور متکبر کر دیا ہے۔ ذرا قبرستان کی طرف دیکھ، تاریخ کے اوراق پر نظر ڈال تو تجھے پتہ چلے گا کہ ہزاروں، لاکھوں انسان جو تجھ سے زیادہ مالدار تھے، حسین و جمیل تھے، عقل میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ طاقت و قوت میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کتنے بہادر اور جری جرنیل اور سپاہی تھے۔ وسیع و عریض سلطنتوں کے بادشاہ اور خزانوں کے مالک تھے مگر موت کے آگے انکی بھی نہ چلی۔ آج ان میں سے کوئی بھی نہیں رہا اور سب ہی خاک در خاک ہو گئے۔

لکھ ہزار بہار حسن دی اندر خاک سمانی

لا پریت اجہی محمد جگ وچ رہے کہانی

پھر فرمایا کہ حسن ظاہری کی ہزاروں نہیں لاکھوں اقسام ہیں۔ چہرے کا حسن، دولت کا حسن، طاقت کا حسن، بقول پاکستانی سیاسی جنتا کے سیاست اور جمہوریت کا حسن، عیش و عشرت کا حسن، مگر سب کے سب حسن اور خوبصورتیاں آخر کار خاک میں سما جائیگی اور کوئی انہیں یاد بھی نہیں کرے گا۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں

پس نامور بزیر زمین دوزن کردہ اند
کز ہستیش بروی زمین برنشان نماند
بہت سے مشہور لوگ زمین کے نیچے دفن کر دئے گئے ہیں حتی کہ زمین پر انکی ہستی کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔
فارسی کا ایک شعر ہے
ایں خاک کہ بزیر پائیہ ہر نادان دست
کف صنم و چہرہ جاناں است
این خشت با کنگرہ ایوان است
انگشت وزیر یا سر سلطان است
اے ناداں تیرے پاؤں کے خاک کے نیچے کسی محبوبہ کی حسین بانہیں یا کسی محبوب کا خوبصورت چہرہ ہے۔ محل کی ہر اینٹ در حقیقت کسی وزیر کی کٹی انگلی یا کسی بادشاہ کا کٹا ہوا سر ہے دنیاکے ہر خوبصورت محل اور طاقتور قلعے کی یہی حقیقت ہے کہ وہ نشان عبرت یا پھر کھنڈر بن جاتا ہے -
میاں صاحب نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تو ایسی پریت لگا

ایسی محبت کر کہ دنیا میں تیری کہانی یاد رہے۔ لوگ تیری نیکی اور پارسائی کی مثالیں دیں۔ تو ایسے کام کر کہ تا قیامت تیرے عمل و کردار کے حوالے سے لوگ تجھے پہچانیں۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بخیر
گرچہ بسی گزشت کہ نوشیں رواں نماند

نوشیرواں عادل کا مبارک نام نیکیوں اور بھلائیوں کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے اگرچہ بہت زمانہ گزر گیا کہ نوشیرواں زندہ نہیں رہا۔

قارئین محترم:. اگر میں میاں صاحب کے اشعار کے متعلق لکھتا رہا تو یہ تحریر کبھی ختم نہیں ہوگی۔ میاں صاحب نے جو بات ایک شعر میں لکھی ہے اس پر اقبال، سعدی، رومی، اور دیگر صوفیائے کرام نے کئی کئی صفحات لکھے۔ میاں صاحب کا رتبہ عظیم صوفی شعراء، فلاسفہ اور فقراء سے کسی طور کم نہیں۔ اگر کوئی شخص اس دور میں علامہ اقبال کی پیروڈی کرے، ہجو لکھے یا انکے اشعار کا مذاق اڑائے تو یقینا غیرت مند پاکستانی ایسے ناخلف کا محاسبہ کرینگے جبکہ ایران اور ترکی میں کسی میں اتنی جرات نہیں کہ وہ مولانا روم، شیخ سعدی، حافظ یا کسی دوسرے صوفی شاعر کی توہین کرے یا انکے اشعار کو بیہودہ اور لچر مزاح کا حصہ بنا کر اپنی گندی ذہنیت، لچرپن بلکہ کنجرپن کا

مظاہرہ کرے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ سکھوں کے ساتھ پنجابی سنگت کرنیوالے گجرات کے چودھریوں، صوفیوں پر لکھنے والے نام نہاد دانشوروں، صحافیوں، گدی نشین پیروں اور صاحبزادوں، پنجابی ادبی کلچر کے دکانداروں سے لیکر آزاد کشمیر کے غلام حکمرانوں اور شرابی کلچر کو فروغ دینے والے سیاستدانوں، آزاد کشمیر کے لفافہ صحافیوں اور میاں محمد بخش کے چاہنے والے لنگر خوروں، آزاد کشمیر کے وزیر اوقاف، میاں صاحب کے دربار سے روزانہ کروڑوں روپے کی شیرینیاں اور نیازیں اکھٹی کرکے کھانے والے افسروں سے لیکر میاں صاحب کا کلام پڑھنے والے فنکاروں میں سے کسی کو بھی اس ولی کامل کی توہین کرنیوالے ٹی وی چینل کی باز پرس کی جرات کی اور نہ ہی کسی نے کوئی احتجاج کیا۔

میاں صاحب کی عرس سے چند ہفتے پہلے اکھنڈ بھارت کو امن کی آشا کا نام دینے والے پروگرام کے دوران ایک حسینہ نے حسن نثار کے کردار سے کہا کہ آخر BNN چینل پر میں آپ اپنا کوئی شعر سنائیں۔ حسن نثار کا کردار کہتا ہے کہ میرا تازہ شعر ہے

نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کسے نیں پایا
کیکر تے انگور چڑھایا تے چوہا گڈی تلے آیا

کیا اہلیان کشمیر خاص کر آزاد کشمیر کی مجاور حکومت، وزیر اوقاف، سیکرٹری

اوقاف، سیف الملوک آرٹس اکیڈمی کے نام نہاد ممبران، میاں صاحب پر لکھنے والے لفافہ اور چاپلوس صحافیوں، کشمیریات کے استادوں اور طالب علموں، آزاد کشمیر بھر کے آستانوں پر صاحبزادوں اور گدی نشینوں، اسمبلی کی سیٹ پر براجمان علماء و مشائخ کی سیٹوں پر قابض شیخوں اور خود ساختہ ولیوں، صوفی ازم کے پرستاروں اور پرچار کرنیوالے دانشوروں کیلئے عبرت کا مقام ہے کہ وہ ایک عاشق رسول، ایک ولی کامل، عشق مجازی اور حقیقی میں واضح فرق بتانے والے مفکر، زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھانے والے دانشور اور قرآنی آیات کی سادہ اور پر اثر تفسیر کو اشعار کے ذریعے دلوں میں ڈھالنے والے فلسفی کی توہین پر خاموش رہے اور کسی بھی شخص کو ان ناخلف اور بیہودہ لوگوں کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔

یقینا میاں صاحب کا کلام ایک ولی کامل کا پاکیزہ کلام ہے نہ کہ یہ چوہے بلی کا کھیل ہے۔ میاں صاحب کے خیالات ہمیشہ رہنے کیلئے ہیں یہ گڈی تلے دینے والے نہیں کہ اسے مردہ چوہے سے تشبیح دی جائے

مجھے یقین ہے اگر ٹی وی چینل حضرت داتا گنج بخش، حضرت پیر مہر علی شاہ، حضرت خواجہ قاسم موہڑوی، حضرت سائیں سہیلی سرکار، حضرت پیر صاحب لعل شہباز قلندر، حضرت شاہ لطیف بھٹائی یا پیر صاحب پگاڑا کے متعلق ایسی بیہودہ اور لغو زبان استعمال کرتا تو اہلیان سندھ و پنجاب اور ان فقراء اور اولیاء

کرام کے ماننے والے نہ صرف پرزور احتجاج کرتے بلکہ ایسے ناخلف اور بدزبان لوگوں کو نہ بھولنے والا سبق بھی سکھلاتے۔ حیرت ہے کہ اہلیان کشمیر خاص کر حکومتی ٹولے اور دانشوروں کا زعم رکھنے والوں کا ہاضمہ اسقدر تیز ہے کہ انہیں سرزمین کشمیر کے روحانی، علمی، ادبی اثاثے کی بے حرمتی ہضم کرنے میں بھی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔

آزاد کشمیر کی حکومت اور سیاست پر برادری ازم کا غلبہ ہے۔ ہر جماعت بلکہ ہر برادری کا اپنا علماء و مشائخ کا الگ ونگ ہے جسکا کام اپنی برادری کے لیڈروں کے حق میں بیان بازی کرنا ہے۔ آزاد کشمیر میں جاٹ برادری حکمران ہے شائد اسلئے حکمران چوہدریوں کو میاں صاحب کی کی توہین محسوس نہیں ہوتی کیونکہ میاں صاحب کا تعلق گجر قبیلے سے ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ آزاد کشمیر اسمبلی میں ایک اپوزیشن ممبر نے گوجری زبان کی ایک مثال غلط گوجری میں دی تو آزاد کشمیر کابینہ کے گجر وزیروں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا چونکہ غلط گوجری بولنے اور مثال دینے کو گوجری کی توہین تصور کیا گیا۔ اسمبلی میں گوجری زبان کی توہین برداشت نہ کرنے والے پیپلز پارٹی کے جیالے وزیروں اور انکے لیڈر قمر زمان کائرہ کو میاں صاحب کی توہین کا ذرہ بھر خیال نہیں آیا چونکہ میاں صاحب کسی کے مشائخ ونگ کے ممبر نہیں اور نہ ہی وہ بھٹو ازم سے وابستہ ہیں۔ میاں صاحب اپنے کلام کے متعلق لکھتے ہیں

کرے سوال فقیر محمد پڑھنے والے تائیں
رونق کھڑیں نہ شعر مرے دی نال ادا سنائیں
پھر فرماتے ہیں
سٹ پستا کرکے پڑھیاں لذت کجھ نہ رہن دی
جس دے بیٹے نوں کوئی مارے کد اسدی جند سہندی
یعنی شعر کو توڑ مروڑ کر اور الفاظ کو آگے پیچھے کرکے پڑھنے سے شعر کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔ میرے اشعار میرے بچوں جیسے ہیں اگر کسی کے بیٹے کو کوئی مارے تو وہ کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ فرماتے ہیں
جیونکر بیٹے تساں پیارے تیویں بیت اسانوں
بیٹے نوں کوئی انگل لاوے لگدے بیت تساں نوں
جس طرح آپ لوگوں کو بیٹے پیارے ہیں ایسے ہی مجھے اپنے اشعار پیارے ہیں ۔ اگر آپکے بیٹے کو کوئی انگلی لگا دے تو آپکو اسکا درد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپکے جسم پر کوئی چابک یا چھڑی سے مارے۔
افسوس کہ آج میاں صاحب کے ماننے والے ، کلام پڑھنے اور سننے والے تو بہت ہیں مگر انکے بیٹوں پر ظلم کا کسی کو کوئی احساس نہیں ۔ میاں صاحب اپنے

پاکیزہ اور بامعنی کلام کے بارے میں فرماتے ہیں

دشمن وانگ دسے اوہ سانوں جے کوئی بیت تروڑے
بیٹے لال سندر دے ایویں جے کوئی کن مروڑے

جو شخص میرے کلام کلام کو توڑے، اشعار کی توہین کرے، انکے معنی بدلے وہ میرا دشمن ہے۔ میرا شعر توڑنے والا ایسا ہی ہے جو میرے پیارے بیٹے کا کان بغیر کسی وجہ کے مروڑے اور اسے تکلیف پہنچائے۔ میاں صاحب کے کلام کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے والوں کے خلاف بولنے والا کوئی نہیں اگر انکے ماننے والے میاں صاحب کا ساتھ دیتے ہیں تو زرداری اور میاں صاحبان ناراض ہو جائینگے۔اور سیکولر اور سوشل میڈیا انکے خلاف ہو جائیگا۔ سول سوسائٹی اسے آزاد میڈیا کی آواز دبانے کے جرم میں اشتعال انگیزی کی مہم چلائے گی اور آزاد میڈیا میاں صاحب کے خلاف طوفان کھڑا کر دے گا۔ وزیروں، مشیروں کا بائیکاٹ ہوگا اور ٹی وی چینلوں پر منہ دکھلائی کا شوق پانے والوں کا شوق ماند پڑ جائے گا۔

میاں صاحب کو اپنے کلام کی ناقدری کا احساس تھا کہ آنے والے دور میں کچھ بھانڈ اور میراثی انکے کلام کی توہین کریں گے اور لوگ خاموش رہینگے۔ فرمایا

شعر مرے اس ملک اپنے وچ مول نہ پاندے قیمت

دور دراڈے جس نو لبھن جانے بہت غنیمت
کیسر سستا ہے کشمیرے پچھو مل لاہوروں
پستہ تے بادام محمد سستے ملن پشوروں
بے قدرے اور ناخلف لوگوں کے متعلق فرمایا
جس وچ گُجھی رمز نہ ہووے درد منداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشا سخن آ جہے نالوں
پھر فرمایا
ربا دئیں پناہ ایہناں تھیں جو حکم ایسے کردے
سیم سچے دا ستم بناون غم دا نہیں غم کردے
میاں صاحب ایک سچے عاشق رسول، ولی کامل اور علوم ظاہری و باطنی کی پرکھ رکھنے والے شاعر اور سخن ور تھے۔ جو لوگ آپ کے دشمن ہیں اور آپکے کلام پر پر طنز کرتے ہیں انکے متعلق خود میاں صاحب فرما گئے
شیش محل وچ کتا وڑیا اُس نوں سمجھ نہ آوے
جدھر دیکھے ادھر اُس نوں کتا ہی نظر آوے
میاں صاحب کے کلام کی پیروڈی کرنے والوں کے متعلق اور کیا لکھوں۔ میاں صاحب کا ہی ایک شعر ہے

وڑھ تمبے دی کڑوی ہیوندی سڑیں پتراں سڑیں بیاں
جہی ڈھٹی ماں محمد او ھو جیاں ڈھٹیاں دھیاں

محب وطن

سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ آیا اور فرمان جاری ہوا کہ عمران خان کا رویہ وقار کے منافی نہیں تھا، توہین عدالت کے ہر کیس میں غیر مشروط معافی نامہ ضروری نہیں ۔شرمناک کا لفظ انتخابی افسروں کی ذمہ داریوں سے متعلق ادا کیا۔غیر مشروط اور باقاعدہ معافی کے بغیر توہین عدالت کے حوالے سے اظہار وجوہ کا نوٹس خارج کیا جاتا ہے۔

پھر فرمایا سیاستدان اور عوامیہ شخصیات اچھی زبان اور بہتر ذخیرہ الفاظ کا انتخاب کریں وہ قوم کیلئے نمونہ ہیں ۔،

عمران خان کی وضاحتوں اور ان کے مجموعی رویے کے بعد اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ وہ محب وطن ہیں اور ان کے بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ۔اسلئے غیر مشروط اور باقاعدہ معافی کے بغیر توہین عدالت کے حوالے سے اظہار وجوہ کا نوٹس خارج کیا جاتا ہے۔

اخبار میں عالی المرتبت جناب انور ظہیر جمالی کے 18 صفحات اور 16 نکات پر مشتمل فیصلے کی تفصیل پڑھنے کے بعد میں نے تقریبا دو سو اٹھارہ مردوں اور

ایک سو سولہ خواتین سے سوال کیا تو سبھی نے جواب میں کہا کہ عمران خان نے بڑی جر ات اور دلیری سے شرمناک کہا تھا،اور پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے اس عدلیہ کیلئے قربانیاں دیں اور جیلوں میں گئے۔

ظاہر ہے لوگ جیلوں میں سپریم کورٹ کے جج صاحبان کیلئے گئے تھے جن میں زیادہ تعداد وکلاء کی تھی جبکہ ماریں کھانے والوں میں بھی وکلاء، صحافی اور عام لوگ شامل تھے۔سیاستدانوں نے وکیلوں اور صحافیوں اور عام لوگوں نے سڑک پر بکھرے خون کا ٹیکہ ماتھے پر لگایا اور شہید بن گئے۔عمران خان کو کیا پتہ کہ جیلیں کیا ہوتی ہیں اور قید کس بلا کا نام ہے۔اگر عمران خان کے پاس وقت ہو تو وہ میرپور کے راجہ اکبر کی داستان حیات پڑھے جس نے کشمیر میں آزادی کی تحریک کو نہ صرف اپنی جوانی بلکہ اپنی جان بھی دے دی اور کبھی کسی سے شکوہ شکایت نہیں کی۔راجہ صاحب نے دبے کچلے انسانوں کی آزادی اور عزت کی خاطر اپنی ساری عمر جیلوں میں گزار دی۔اور قید بامشقت کے دوران گندم چکی پر پیسنے کا تشدد برداشت کیا۔عمران خان نے جو چند روز وی آئی پی جیل میں گزارے اسے جبری آرام کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔اور اب ایسا ہی آرام عمران خان کے آئیڈیل پرویز مشرف بھی اپنے فارم ہاؤس میں فرما رہے تھے۔عمران خان نے عدالت میں پہلی پیشی کے بعد پھر کہا کہ آج پتہ چلا کہ شرمناک گالی ہے اور پھر بار بار کہا کہ معافی کس بات کی میں نے تو کوئی توہین عدالت کی ہی

نہیں۔ معزز جج صاحبان نے جو لکھ دیا اس پر اگر عدالتیں سیاستدانوں اور امیر لوگوں کو سزا دینے کی بجائے ہدایت نامہ جاری کریں گی تو یہ لوگ پہلے سے زیادہ دلیر ہو جائیں گے اور عدلیہ کا احترام چھوڑ دیں گے۔

میرے خاندان کا کوئی بھی شخص نہ جج ہے اور نہ ہی سیاستدان مگر جب بھی کوئی سیاستدان، صحافی یا معاشرے کا بظاہر عزت دار شخص عدالتوں اور ججوں کے خلاف لکھتا ہے یا بولتا ہے تو نہ صرف مجھے دکھ ہوتا ہے بلکہ خوف بھی آتا ہے۔ دکھ اس بات کا کہ جو سیاستدان، صحافی یا بااثر شخص عدلیہ پر بیجا تنقید کرتا ہے وہ اپنے قلم یا اسمبلی میں بیٹھ کر عوام کو تلقین کرتا ہے، آئین کا پاسبان بنا پھرتا ہے اور معاشرتی تبدیلی کے کھوکھلے نعرے لگاتا ہے۔

ایسا شخص کوئی امیر کبیر، وزیر مشیر یا خود ساختہ لیڈر تو ہو سکتا ہے مگر حقیقت میں وہ ایک دھوکے باز، فریب کار اور سیاسی بازیگر ہوتا ہے۔ جو شخص اپنی دولت کے بل بوتے پر عوام سے ووٹ چھینے، اپنے اثر ورسوخ سے اور دھونس سے وزیر و مشیر بن جائے اور ایسی ہی برادری میں معزز کہلائے، عوام کو دھوکہ دے، ان کی پریشانیوں میں اضافہ کرے اور ان ہی کے ووٹ سے منتخب ہو کر ان کو دھتکارے، اور ان کی رگ رگ سے مہنگائی اور کرپشن اور لوٹ مار کے ذریعے ان کا خون نچوڑے وہ ہرگز محب وطن نہیں ہو سکتا۔ خوف اس بات کا ہے کہ اگر عدالتوں

نے عمران خان کو چھوڑ دیا۔گیلانی، راجہ رینٹل اور کرپشن میں ملوث جرنیلوں اور ان کے حامیوں اور مفاد پرستوں کے معاملات سے آنکھیں بند کرلیں تو یہ ملک نہ صرف طالبان کے حملوں سے بلکہ کرپٹ سیاستدانوں، جرنیلوں اور ان کے حامیوں کے حربوں سے تباہ وبرباد ہوگا۔اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان سے درخواست ہے کہ الفاظ کے چناؤ کا ہدایت نامہ انصاف نہیں۔اگر جناب عمران خان کیلئے کوئی شخص یہی استعمال کرے تو موصوف اسے مارنے دوڑیں گے۔جس طرح وہ اپنی کرکٹ کی زندگی میں غریب صحافیوں اور اپنے چاہنے والوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔اور گالی مکے اور تھپڑ بھی چلاتے تھے۔انہیں صرف غیر ملکی صحافی، فین اور سیاح اچھے لگتے تھے، عدلیہ نے اگر عمران خان کو غیر مشروط اور بغیر معافی کے توہین عدالت کے حوالے سے معاف کردیا ہے تو ان ہزاروں لاکھوں لوگوں کا بھی خیال کرے جو معمولی جرائم جو مجبوریوں کے باعث سرزد ہوئے کے تحت جیلوں میں بند ہیں یا پھر عدالتوں میں گھسیٹے جارہے ہیں یقیناً یہ لوگ عمران خان، یوسف رضا گیلانی اور راجہ پرویز اشرف اور کرپشن میں، ملوث این ایل سی کیس والے جرنیلوں سے زیادہ محب وطن ہے۔

میاں نواز شریف کی جمہوریت نوازی

بادشاہ اور ڈکٹیٹر مطلق العنان ہوتے ہیں چونکہ وہ قوت کے بل بوتے پر اقتدار میں آتے ہیں اور پھر اپنی سوچ کے مطابق حکمرانی کرتے ہیں مگر اس کے باوجود معاشرے کا ایک طبقہ اس کی حمایت کرتا ہے اور ان کے طرز حکمرانی کو درست قرار دیتے ہیں ۔ایوب خان۔ جنرل یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کے پرستاروں کی بھی ایک بڑی تعداد عوام میں موجود ہے۔ جبکہ لیاقت علی خان ، ذلفقار علی بھٹو، بینظیر اور آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف کی پالیسیوں سے اختلاف کرنے والیبھی کم نہیں ۔ڈکٹیٹروں اور غیر منتخب حکمرانوں کو عوام اس وقت یاد کرتے ہیں جب جمہوریت پسند اور لوگوں کے ووٹ سے منتخب حکمران عوام سے وہی کرتے ہیں جو ڈکٹیٹر اور بادشاہ کرتے ہیں۔ منتخب نمائندوں کی محدود اور عوامی خواہشات کے منافی سوچ انہیں نہ صرف ڈکٹیٹروں اور مطلق العنان بادشاہوں کی صف میں لاکھڑا کر دیتے ہیں بلکہبلکہ وہ عوامی غیض و غضب کا نشانہ بن کر بے توقیر ہو جاتے ہیں ۔
وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف جب دوسری دفعہ وزارت عظمیٰ کے منصب سے ہٹائے گئے تو جرل پرویز مشرف کو عوام نے نجات دہندہ اور انکی خواہشات کا

مظہر قرار دیا۔جناب حسن نثار اور ان کے ہم خیال کالم نویسوں نےمشرف کے حق میں کالم لکھے اور کرپٹ اور بد دیانت حکمرانوں کو چوراہوں پر لٹکانے کی تجاویز دیں ۔پاکستان کے ہر شہر اور قصبے میں یوم نجات منایا گیا اور ایک منتخب اور جمہوری حکومت جس کا اندازہ شاہانہ تھا کے غیر جمہوری طریقے سے خاتمے پر یوم نجات منایا۔ بھٹو حکومت کے خاتمے اور جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے نفاذ پر بھی عوام نے کچھ یوں ہی خوشی منائی تھی مگر اس کا لیول ذرا کم تھا۔مذہبی سیاسی جماعتوں اور تحریک استقلال نے حلوے بانٹے تھے مگر ساتھ ساتھ احتجاج کی صدائیں بھی بلند ہو رہی تھیں ، مگر میاںں نواز شریف کی جبری رخصت پر سیاسی بشمول مسلم لیگ کے کچھ مخصوص دھڑوں نے خوشی کا اظہار کیا۔اور جب تک پرویز مشرف نے گجرات کے چوہدریوں اور عیش و آرام کرنے والے ایک خاص طبقے بلکہ کلب کی رکنیت حاصل نہیں کی تھی وہ عوام کے ہیر و تھے۔ جنرل مشرف کے مانیٹرنگ سسٹم نے تھانوں اور پٹوار خانوں کی چولیں ہلا دیں اور کرپٹ سیاستدانوں کو پہلی بار لوہے کی نتھ ڈالی مگر یہ نظام زیادہ دیر برقرار نہ رہا۔ شیم ڈیموکریسی ، کرپشن اور بد عنوانی کو جڑ سے اکھاڑنے والے مشرف نے سیاستدانوں ، بیوروکریٹس اور جرنیلوں کی ایک ٹیم کے ایک گھیرے میں آکر محمد شاہ رنگیلا بن گئے اور محض شاہی محل تک محدود ہو گئے۔ جنرل جی ایم کی حادثاتی موت کے بعد مشرف عملاً بے خصار اور شتر بے مہار بن گئے۔ جنرل جی ایم واحد شخص تھے جو مشرف کو صحیح مشورے دیتے تھے۔اور مشرف کو درست اور عوامی رائے

کے مطابق فیصلے کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ جنرل غلام محمد نے نہ صرف جنرل پرویز مشرف کی درست اور صحیح سمت رہنمائی کی بلکہ اسے چاپلوس اور لالچی ٹولے سے بھی دور رکھا۔ مشرف کی بدقسمتی کہ جنرل غلام محمد اپنے آبائی گاؤں جاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئے اور مشرف سیاسی حادثات کا شکار ہو کر عوام کی نظروں سے گر گئے۔

پاکستانی عوم کی خوش فہمی تھی کہ میاں نواز شریف جلاوطنی کے بعد عوام کے دکھ کا مداوا کریں گے۔ اور این آر او حکمرانوں کی ظلم وزیادتیوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں گےمگر یہ ہو نہ سکا اور عوام کو پانچ ماہ کی اس حکمرانی نے مشرف اور زرداری کو بہتر حکمران تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے، ساری دنیا جانتی ہے کہ آزاد کشمیر پر ایک .برادری کی حکومت ہے۔ اور ڈوگر راج کی طرح مجیدی ٹولے نے بھی آزاد کشمیر پر حکومت سازی ایک اوپن بولی کے ذریعے حاصل کی ہے۔ منظور وٹو، قمر الزمان کائرہ اور رحمان ملک نے ایک منسوبے کے تحت الیکشن کا ڈونگ رچایا اور اس ڈھونگ کو ڈھنکے کی چوٹ پر کامیاب بھی کرایا۔ صدارت سے لیکر وزارت اور مشارت تک کے عہدوں کے الگ الگ ریٹ لگا اور جس کے پاس جتنے ڈالر اور پاؤنڈ تھے سب نے استطاعت کے مطابقمن پسند وزارت حاصل کی۔ اسلام آباد میں لگنے والی جمہوری میں ایم ایل اے کو سو فیصد کامیابی کا سرٹیفیکیٹ جاری کیا گیا اور مال لگاؤ مال بناؤ جمہوریت کی

کامیابی کیلئے سرحد پولیس اور نادرہ کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا گیا۔

مسند اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد وزیر اعظم چوہدری عبد المجید نیا پنے لئے مجاور وزیر اعظم کا لقب پسند کیا اور گڑھی خدا بخش بھٹو جا کر بھٹو خاندان کی قبروں پر جھاڑو لگا کر مجاور حکومت کا عملی نمونہ پیش کیا؛ کشمیر کی تاریخ میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد چودھری مجید حکمران ہیں جنھوں نے مزارات پر جھاڑو لگانے کا اعزاز حاصل کیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے مزار پر حاضری دی، چادر چڑھائی، لنگر تقسیم کیا، قیدیوں کی رہائی کا اعلان کیا مہاراجہ کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اسلئے مزار پر حاضری دی اور پھر ولی عہد کی پیدائش پر دھڑیاں والی سرکار کے مزار پر حاضر ہوئے اور جھاڑو لگا کر مساکین میں لنگر تقسیم کیا اور منت ادا کی چوہدری عبد المجید نے لاڑکانہ جا کر کیا منت مانی اس کا تو پتہ نہیں مگر واپس آ کر چوہدری مجید اور سینئیر وزیر نے آزاد کشمیر کے خزانے پر جھاڑو پھیرا، کاغذی سکیموں سے مال بنایا، جیالوں میں عہدے تقسیم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی بی اے پاس جیالوں اور برادری والوں کو پبلک سروس کمیشن کا ممبر بنایا اور ہر عہدے اور پوسٹنگ پر رشوت اور سفارش کا بازار لگا کر میرٹ اور قابلیت پر جھاڑو پھیر دیا۔ منگلا ڈیم منصوبے پر جو کچھ سردار عتیق سے بچ گیا تھا اسے سمیٹا اور پھر جناح کالونی اور نیو میر پور سٹی سے مال بٹور کر بیرون ملک منتقل کر دیا

لوٹ مار اور کرپشن پر عوام نے چیخ و پکار کی تو بیرسٹر سلطان محمود چوہدری نے کرپٹ ٹولے کے خلاف تحریک عدم اعتماد لانے کا فیصلہ کیا تو میاں نواز شریف نے کرپٹ ٹولے کی حمایت کا فیصلہ کیا اور اسے جمہوری حکومت اور حکمرانی کا سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہوئے کرپشن اور بد دیانتی کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی۔اب کاہرہ ،وٹو منصوبے کی ایک جھلک دیکھئے کہ میاں نواز شریف کی پسندیدہ جمہوریت کس گورکھ دھندے کا نام ہے ۔میاں صاحب کی جمہوریت نوازی اور جمہوری وژن کیلئے آزاد کشمیر کی برادری جمہوریت کی ایک مثال آزاد کشمیر کا ایک انتخابی حلقہ نمبر 4 کوٹلی ہے جو آزاد کشمیر کے اصل وزیر اعظم اور دکھلاوے کے سینئیر وزیر کا حلقہ ہے۔کہنے کو تو چوہدری عبدالمجید وزیر اعظم ہیں مگر اصل قوت سینئیر وزیر کے پاس ہے جسے زرداری ہاؤس میں وزیر اعظم سے بڑھ کر پروٹوکول دیا جاتا ہے۔زرداری ہاؤس میں چوہدری عبدالمجید کو صرف مجید کہہ کر بلایا جاتا ہے جبکہ سینئیر وزیر کیلئے چوہدری صاحب پکارا جاتا ہے۔آزاد کشمیر الیکشن ڈرامے کی رات کو ہی برادری جمہوریت کے قیام کا فیصلہ ہو چکا تھا۔اور سرحد پولیس نے حلقہ نمبر 4 کے اہم سیاسی لیڈر جن کے گھر ن لیگ کے اہم ورکروں کا اجلاس ہو رہا تھا کو گھیرے میں لے لیا۔یہ گھر ضلع کوٹلی کے مرکزی قائد راجہ مشتاق ایڈووکیٹ کا تھا جہاں حلقہ بھر کے سینئیر کارکن اور بااثر افراد جمع تھے اور صبح ہونے والے الیکشن کے انتظامات کو حتمی شکل دے رہے تھے، سینئیر وزیر نے رحمان ملک، قمرالزمان کائرہ اور منظور وٹو کے حکم پر

سرحد پولیس کے ذریعے موضع کہلانی کو محاصرے میں لے لیا اور الیکشن کے اختتام تک ان لوگوں کو محصور رکھا، نہ یہ لوگ اپنے علاقوں میں جا سکے اور نہ اپنے ووٹروں کو لا سکے اور نہ ہی اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکے۔ کیا میاں نواز شریف کے سیاسی وژن کے مطابق یہ جمہوریت نوازی ہے، اگر میاں صاحب اس دھاندلی اور جبر کو جمہوریت نوازی کہتے ہیں تو ان کی جمہوریت کو سات سلام، سینئیر وزیر نے پھٹہ سازی کی بھی حدیں پار کر لیں۔ مرے ہوئے اور بیرون ملک مقیم لوگوں کے ووٹ بھی دیدہ دلیری سے پول کئے جس کا ریکارڈ راجہ مشتاق کے پاس موجود ہے لیکن سننے والا کوئی نہیں، سینئر وزیر، قمر الزمان کائرہ، منظور وٹو اور رحمان ملک کا اگلا کارنامہ بھی ملاحظہ ہو۔

الیکشن سے قبل رات دس بجے کے بعد اسلام آباد سے نادرا کوٹلی آفس کو حکم ملا کہ نادرا آفس کھول کر حلقہ نمبر 4 کے جیالے کو جس قدر شناختی کارڈوں کی ضرورت ہے صبح سے پہلے بنا کر حوالے کر دو۔ نادرا آفس نے انکار کیا تو ضلع کوٹلی کے ڈپٹی کمشنر اور ایس پی نے اسلام آباد حکومت کے حکم کے مطابق نادرا آفس کے مینیجر سے دفتر کھلوایا اور جعلی شناختی کارڈز کی چھپائی شروع کر دی۔ ن لیگ کے امیدوار راجہ اقبال خان نے اپنے بھانجے راجہ ثاروب اور دیگر رشتہ داروں کو نادرہ آفس بھیجا جہاں ضلعی پولیس اور سرحد پولیس نے ان نوجوانوں پر بری طرح تشدد کیا اور زخمی حالت میں ہسپتال لیجا کر پھینک دیا۔ پولیس

گردی کی یہ خبر دوسرے روز اخباروں میں بھی شائع ہوئی مگر زرداری حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ میاں صاحب سے گزارش ہے کہ اگر وہ آزاد کشمیر میں اپنی پارٹی کیساتھ ہونیوالی دھاندلیوں اور زیادتیوں کا ازالہ نہیں کر سکتے تو پھر آزاد کشمیر ن) لیگ بنانے کی تکلیف کیوں کی ہے آپ کی (ن) لیگ مسلم کانفرنس کی آفٹر نون) ہے جس کا سورج طلوع ہوتے ہی غروب ہونے لگا ہے اگر آپ کو جمہوریت کا کچھ احساس ہے تو آپ کوٹلی حلقہ نمبر 4 کے واقعات کی تحقیق کروائیں اور جن لوگوں نے جمہوریت کے ساتھ کھلواڑ کیا ہے انہیں سزا دیں۔ نادرا کے ڈی جی جس نے رات کو نادرا دفتر کھولنے کا حکم دیا اسے انصاف کے کٹھرے میں کھڑا کریں تو وٹو، کائرہ اور رحمٰن ملک کی سازشوں کا پول خود ہی کھل جائے گا۔ کوٹلی کے ایس پی اور ڈی سی کی غیر جانبدار انکوائری کروائیں تو دھاندلی اور غنڈہ گردی کی ساری گھتیاں سلجھ جائینگی۔ اگر آپ میں سچائی کا سامنا کرنے اور برائی کو ختم کرنے کی ہمت ہے تو غنڈہ گردی کو جمہوریت کہہ کر جمہوریت کی تذلیل نہ کریں اگر آپ کو آزاد کشمیر کے عوام سے کوئی دلچسپی نہیں اور مجید حکومت کی سپورٹ کسی این آر او کا حصہ ہے تو آزاد کشمیر (ن) لیگ کا بے مقصد دفتر بند کر دیں تاکہ مجید حکومت کے ستائے ہوئے عوام کھنہ ہاؤس سے وابستہ جھوٹی امیدیں ترک کرکے کاکا ہاؤس کی مجاروی شروع کر دیں۔ آزاد کشمیر کے بے بس عوام برادری جمہوریت، کرپشن کی سیاست اور غنڈہ گردی کی حکومت سے عاجز آچکے ہیں۔ کھانے پینے اور لوٹ مار کے علاوہ وزیراعظم اور

سینیئر وزیر کا کام ہیلی کاپٹروں کے ہوا لارے لینا، شادیوں اور جنازوں میں شرکت کرنا مخالفین کو تڑیاں لگانا، پٹواریوں اور تھانیداروں سے خفیہ میٹنگیں کرنا اور رٹے رٹائے بیان دینا ہے۔ اگر آپ اسے جمہوریت تصور کرتے اور صرف فضول اور بے مقصد کاموں کیلئے ایک سینئر اور ایک سینئر موسٹ وزیر اعظم رکھنے پر مجبور ہیں تو برائے کرم اس کرپٹ ٹولے کی جگہ وزیر اعظم امور کشمیر کے علاوہ ایک عدد وزیر اعظم تدفین بھی رکھ لیں اس کام کیلئے اگر موزوں آدمی میسر نہیں تو اس دو کے ٹولے کو دو عدد ہیلی کاپٹر دیکر ایک کو شادی اور مبارکبادی اور دوسرے کو اموات اور قبرستان کا محکمہ دے دیں۔

آزاد کشمیر کے غلام عوام آپ سے کسی غیر جمہوری اقدام کی فرمائش نہیں کرتے وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ حلقہ نمبر 4 کوٹلی کو مثال بناتے ہوئے الیکشن میں ہونیوالی دھاندلی اور اس میں ملوث نادرہ اور سرحد پولیس کیخلاف انکوائری کروائی جائے اور آزاد کشمیر کے چیف سیکرٹری اور آئی جی کوٹلی کے ایس پی اور ڈی سی کی انکوائری کریں جو کہ براہ راست اس جرم میں شریک تھے۔

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

امن کی کنجی طالبان کے ہاتھ ہے

جب سے مولانا فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر منور حسن نے شہید اور شہادت پر فتوے جاری کئے، محب وطن عوام اور خواص نے ان دونوں کے کچے چھٹے ہی نہیں بلکہ کچے پکے ادھیڑنے شروع کر دئے ہیں ۔جماعت اسلامی اور جمیعت علماء اسلام نے کچھ ایسا تاثر دیا ہے جیسے وہی طالبان کو فدائین مہیا کر رہے ہیں اور اصل طالبان لیڈر بلکہ سپریم کمانڈر دونوں یہی ہیں ۔ سلیم صافی نے اس انٹرویو کے بعد چپ سادھ لی ہے جبکہ وہ بھی اس فتنے میں برابر کا شریک ہے۔ سلیم صافی شاید بھول گئے ہے کہ ان کی صحافت بھی ایک فوجی کی مرہون منت ہے۔ ورنہ کابل اور جلال آباد جانے والے شنواری اور آفریدی ٹرک ڈرائیور سلیم سافی سے کہیں بہتر مشاہدہ رکھتے ہیں ۔اور پاک افغان تعلقات پر تبصرہ بھی کر سکتے ہیں ۔ مگر وہ اس بحث کو فضول تصور کرتے ہیں ۔ فوج کے خلاف مہم جوئی میں سلیم صافی کا کردار بھی مشکوک ہے۔ سلیم صافی کی صحافت سرحد کے سابق گورنر جنرل (ر) افتخار حسین شاہ کا کارنامہ ہے۔ سلیم صافی کو چاہئے کہ وہ اپنے محسن سے متعلق بھی ایک پروگرام کرلے اور یہ بھی بتائے کہ جب اافغانستان میں طالبان اسے سزا دینے والے تھے تو افتخار حسین شاہ نے کس طرح اور کس کے ذریعے اسے بچایا تھا۔ دیکھا جائے تو آج بہت سارے بزرگ کالم نگار بھی فوجی

ادوار کی پیداوار ہیں مگر موسم بدلتے ہی ان بزرگوں نے اپنے محسنوں کو بھی نہیں بخشااور چڑھتے سورج کو چالیس توپوں کی سلامی دینے کی رسم بحال رکھی۔ سلیم صافی اس سلسلے کا ابتدائی اور چھوٹا کردار ہے۔ جو امن کی آشا کے سائے میں پل کر جوان ہوا ہے۔اس طرح کے کالم نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ کالم نگاروں کی قلابازیوں کے مصنف جناب ڈاکٹر محمد فاروق نے ان قلم کاریوں پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ کہ یہ حضرات با اقتدار اور با اختیار حکمرانوں کی کس طرح مداح سرائی کرتے ہیں۔اور پھر پینترا بدل کر ان کے لتے لیتے رہے ہیں۔ڈاکٹر فاروق لکھتے ہیں کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ اس ملک کو جتنا نقصان سیاستدانوں نے پہنچایا ہے۔اس سے بڑھ کر دانشور طبقے نے اس ملک کی بربادی کے ذمہ دار ہیں۔ چینی کہاوت ہے کہ شہر کو آگ لگانے کیلئے لشکر کی نہیں بلکہ ایک بیمار چوہے کی ضرورت ہوتی ہے۔چوہے کی دم کے ساتھ جلتی رسی باندھ کر چھوڑ دیا جائے تو گھروں، گلیوں، گوداموں سے لے کر کھلیانوں تک بھاگتا پھرے گا اور مرنے سے پہلے سارے شہر کو جلا دے گا۔ ذرا غور کریں کہ کس طرح ایک آدمی نے صحافت کے لبادے میں سارے ملک کو ایک فتنے میں مبتلا کر دیا ہے۔ مولانا فضل الرحمان اور منور حسن کو اگر سوالنامہ پہلے سے نہیں ملا ہوا تھا تو تب بھی وہ احتیاط سے کام لے سکتے تھے۔ مگر بغیر سوچے سمجھے وہ ایک چالباز شخص کی باتوں میں آ کر کس قدر شرمندگی کا سامنا کر رہے ہیں اور اپنی بات پر جھوٹ در جھوٹ بول کر اسے سچائی کا چغہ پہنانے میں مصروف ہیں۔آج ان

کی جماعتوں اور ہم مسلکوں کے سارا ملک ان کے خلاف ہے اور ہو سکتا ہے کہ کل یہ احتجاج کسی بڑے حادثے کا باعث بن جائے جس کے ذمہ دار بھی یہ تینوں کردار ہوں گے۔ سلیم سافی نے ایک سازش کے تحت نہ صرف جمیعت علماء اسلام اور جماعت اسلامی کو امتحان میں ڈال دیا بلکہ طالبان کیلئے بھی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طالبان مسلمان ہیں۔ اور پاکستانی ہیں۔ اور امریکہ سمیت کوئی بھی غیر اسلامی طاقت حکومت پاکستان اور طالبان کے ساتھ امن کی بحالی سے خوش نہیں ہو گی۔ طالبان اپنے حملوں سے پاکستان اور اور افواج پاکستان کو نقصان پہنچائیں گے۔ تو اس سے بھارت اور اسرائیل اور ان کی حامی طاقتوں کو فائدہ ہو گا، مگر طالبان کو اس سے کچھ نہیں ملے گا۔ عقل کی آنکھ سے دیکھا جائے تو امریکہ نے پاکستان پر ایک ہی وقت میں دو حملے کئے۔ پہلا حملہ ڈرون کا کیا گیا جس میں حکیم اللہ کو مار دیا گیا یا شہید کر دیا گیا جسے متنازعہ بنا دیا گیا۔ دوسرا خود کش حملہ سلیم صافی کے ذریعے ہوا اور پاکستانی عوام کو دو حصوں تقسیم کر دیا گیا، سلیم سافی کے خود کش حملے نے جمیعت اور جماعت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور آج دونوں پارٹیوں کے لیڈر عملاً عوام کی عدالت میں کھڑے اپنے بیان کا جواب دے رہے ہیں مگر عوام ان کی کسی بات پر کوئی غور نہیں کر رہی۔ جمیعت اور جماعت کے مرحوم قائدین کے قصے بھی سامنے آ گئے ہیں اور اخبارات جناب مفتی محمود اور جناب مولانا مودودی کے پاکستان مخالف بیانات شائع کر رہے ہیں۔ یقیناً موجودہ نسل جناب

مفتی محمود اور جناب سید مودودی کے کردار سے واقف نہیں مگر سلیم صافی نے دونوں مرحومین کا منفی کردار نئی نسل سے متعارف کروایا ہے۔جناب مفتی محمود کے حوالے سے مستند کالم نگار لکھتے ہیں کہ وہ پاکستان کے وجود کے ہی مخالف تھے۔ مفتی صاحب کا بیان کئی بار دہرایا گیا جس میں انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ پاکستان بنانے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ خیرت کی بات ہے کہ ایک مفتی پاکستان بنانے والوں کو گنہگار اور پاکستان کو گناہ کا فتویٰ دے رہا ہے اور دوسری جانب اسی مٹی پر سیاست کرتا ہے ۔حکومت بناتا اور حکمرانی کی باتیں کرتا ہے۔اور پھر ایک صوبے کا وزیر اعلیٰ بھی بن جاتا ہے۔ بات یہاں نہیں رکتی بلکہ آگے چل کر پاکستانی سیاست کا بیڑا بن جاتا ہے اور اسے ڈبونے کی ہر سازش میں شریک ہوتا ہے ۔وہ اس کے محافظوں اور شہیدوں کو کتوں سے تشبیہ دیتا ہے، مگر پھر بھی ناقابل گرفت ہے ۔ مولانا نے یہ بات طالبان اور وزیرستان کے عوام کے حق میں کہی چونکہ امریکہ کے ڈرون حملوں میں وزیرستان کے عام شہری مارے جاتے ہیں فوجی نہیں ۔یہ سوال طالبان لیڈروں اور علماء کو کرنا چاہئے اور مولانا فضل الرحمان سے پوچھنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں اور کتوں میں فرق نہیں سمجھتے تو انہیں مولانا کہلوانے کا کوئی حق نہیں ۔ مولانا فضل الرحمان نے تو اپنی خاندانی روایت قائم رکھی ۔اور جس ملک کے وجود کو ان کے والد نے گناہ قرار دیا تھا اس کی مخالفت کا فریضہ سرانجام دیا مگر جو نقصان ڈاکٹر منور حسن نے اپنی جماعت کو پہنچایا اس کا ازالہ اب ممکن نہیں ۔

ایک قومی اخبار نے لکھا ہے کہ مولانا مودودی نے 1948 کے کشمیر جہاد کو ماننے سے انکار کر دیا اور انتخابات کو کتوں کی ڈور کہا، حیرت کی بات ہے کہ مولانا کی جماعت اسلامی جو پاکستان کے وجود کی مخالف تھی وہ اس ملک کی سیاست میں حصہ دار ہے، حکومتوں میں شامل رہتی ہے، مارشل لاؤں سے فیض یاب ہوتی ہے، امریکن ایڈ قبول کرلیتی ہیں اور آجکل جہاد کشمیر میں بھی شامل ہے مگر محافظین وطن کوگالیاں دیتی ہے اور اپنوں کو شہید بھی تسلیم نہیں کرتی پاکستان عوام اور حکومت وقت کو بغیر کسی مصلحت کے جناب فضل الرحمان اور ڈاکٹر منور حسن کے معلق سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ آخر یہ لوگ کس کی ضمانت کر رہے ہیں اور ان کی سیاست کے پردے میں کیا چھپا ہے۔طالبان پر الزام ہے کہ وہ آئین پاکستان کو نہیں مانتے؟ مگر یہ لوگ تو پاکستان کو ہی نہیں مانتے طالبان جہاد کی بات کرتے ہیں اور کئی بار ان کے لیڈر بیان دے چکے ہیں کہ اگر بھارت نے سرزمین پاکستان پر حملہ کیا تو سب سے پہلی صف میں طالبان کھڑے ہونگے مگر مولانا فضل الرحمان اور ڈاکٹر منور حسن نے کبھی ایسا بیان نہیں دیا۔وہ تو حکومت میں حصے داری اور کشمیر کمیٹی کی چیئرمینی کی بات کرتے ہیں اور فوج کو گلیاں دیتے ہیں۔

13 نومبر کے ایک ٹی وی پروگرام میں میزبان ،عمران خان اور جنرل شاہد عزیز

کی بھی کچھ جھلکیاں دکھائیں جو فوج پر تنقید کر رہے ہیں مگر ساتھ ہی کہا کہ ان لوگوں نے لائن کراس نہیں کی۔ عمران خان توسیاست دان ہے اور عمران خان کو خوش فہمی تھی کہ اس کی جماعت کو فاٹا سے سیٹیں ملیں گی مگر اب خان صاحب کو خوش فہمی دور ہو گی ہے۔ بیشک جنرل شاہد عزیز نے لائن کراس نہیں کی مگر وہ فوج میں رہے، پلاٹ مربعے اور جرنیلی و مراعات کے ساتھ ریٹائر ہوئے اور آب اسی فوج سے لی گئی، مراعات کے ملے ہوے ایک محل نما مکان میں بیٹھ کر فوج پر الزامات لگا رہے ہیں۔ جنرل شاہد ہوں یا ڈاکٹر منور حسن حساب سب برابر ہونا چاہیے۔ جنرل شاہد عزیز اگر واقعی اعلی کردار کے حامل ہیں تو انھیں فوج سے لی گئی مراعات واپس کر دینی چاہیے یاپھر فوج اور عوام سے معافی مانگنی چاہیے۔ 14 نومبر کے پروگرام کیپٹل ٹاک میں سیلم صافی نے ڈاکٹر منور حسن کے متعلق مزید انکشاف کیا کہ انہوں نے جلسے کے دوران فوج کے متعلق جو کچھ کہا وہ ناقابل بیان ہے۔ سیلم صافی نے ڈاکٹر منور حسن کے اٹک جلسے اور پریس کانفرنس کا بھی حوالہ دیا کہ جو کچھ یہ شخص اندرون جماعت کہہ رہا ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جناب لیاقت بلوچ جماعت اور فوج کی قربتوں کے حوالے تو دے رہے ہیں مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ ان کا امیر اندرون جماعت کیا کہہ رہا ہے اور وہ کون سی باتیں ہیں جو بقول سیلم صافی کے قابل بیان نہیں ڈاکٹر منور حسن کے حالیہ بیانات نے جماعت اسلامی کا جو چہرہ عیاں کیا ہے اس نے عوام الناس میں خا

عسکر فوجی جوانوں اور شہیدوں کے خاندانی میں جماعت اسلامی کیخلاف نفرت کا بیج بو دیا ہے وہ لوگ جو بنگلہ دیش کی حکومت کیخلاف تھے آب وہ بھی حسینہ واجد کے اقدام کو درست قرار دے رہے ہیں جبکہ سید علی گیلانی اور جماعت اسلامی کے کشمیر جہاد کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ کسی اخبار نے لکھا ہے کہ جب امریکہ اور فوجی اسٹیبلشمنٹ نے نئی دائی تلاش کر لی تو جماعت کیلئے امریکہ مردہ باد ہو گیا، کشمیر کا فساد جہاد بن گیا اور سیاست عین اسلامی ہو گئی ۔مگر صد افسوس کہ ملکی دفاع اور عوام کی حفاظت کرنے والی فوج جس کی وجہ سے آج جماعت اسلامی سمیت کروڑوں پاکستانی اس ملک میں آ دھم مچاتے رہتے ہیں ۔اس ملک کے فوجی جوان ملک بچانے کیلئے قربانیاں دیں ،اپنی جانوں کا نزرانہ پیش کریں تو وہ شہید ہیں مگر جو امریکی امداد پر پلا بڑھا ہو اور اسی کے زیر سائیہ مجاہد بنا ہو وہ کیسے شہید ہے۔ پختہ روایت ہے جماعت کی،

کہ جو کہا اس پر ڈٹ جاو

جو پڑھا پڑھ کے بھلا دیا

جو لکھا تو لکھ کر مٹا دیا

اسلئے منور حسن بھی وہی کرینگے جو ان سے پہلے کر گئے اور ہزار تاویلیں بیان ہو نگی، رجوع یا معذرت کا باب ان کی ڈکشنری میں نہیں۔

اہل غرض فرمانبردار ہوتے ہیں

بادشاہ اچانک کسی نے قتل کردیا اور قاتل مفرور ہوگیا۔ ولی عہد نے باپ کی بد اعمالیوں، عیاشیوں اور رعایا دشمن چالاکیوں اور چالبازیوں کا گہرا اثر لیا اور بادشاہ بننے سے انکار کردیا۔ فوجی جرنیلوں، وزیروں، مشیروں، قاضیوں اور دانشوروں کا اجلاس ہوا اور طے پایا کہ اگلا بادشاہ ویسا ہی ہونا چاہیے جیسے پہلا تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ کرپٹ اور ظالم بادشاہ کی حکمرانی میں اشرافیہ، انتظامیہ اور نوکرشاہی کی بدعنوانیوں، کرپشن ،لوٹ مار اور عوام دشمن کارروائیوں پر پردہ پڑا رہتا ہے اور عوام کی نظریں صرف بادشاہ کے مظالم پر مرکوز رہتی ہیں۔ اجلاس کے سبھی شرکاء نے باری باری اظہار خیال کیا اور اپنی اپنی کرپٹ کاروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گزر جانے والے بادشاہ سے پہلے ہم محض سرکاری ملازم تھے اور تنخواؤں پر گزارہ کرتے تھے۔ بادشاہ نے خود لٹ مچائی تو ہمیں بھی اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملا۔ ایک وزیر نے کہا کہ بادشاہ نے خود تو خزانہ خالی نہیں کیا، عوام کو مفلسی کے دلدل میں نہیں دھکیلا بلکہ یہ سب ہمارے ذریعے ہی ہوا ہے اور جو کچھ ہم نے عوام کی جیبوں اور خزانے کی تجوریوں سے نکالا ہے ان کا کچھ حصہ ہی بادشاہ کو پیش کیا ہے۔ ہم اس لوٹ مار میں برابر کے حصہ دار تھے مگر ساری

لعنت بادشاہ کے گلے پڑی ہے۔ اچھا ہوا کہ شہزادہ اپنی پارسائی اور عوام دوستی کی وجہ سے تخت و تاج سے علیحدہ ہوگیا ورنہ اسے قتل کرنا لازم ہو جاتا۔

سپہ سالار نے کہا کہ دیکھو بھائیو! ہم سب ایک ہیں اور ایک ہی رہینگے اسی میں ہماری بھلائی اور بہتری ہے۔ میں عام دیہاتی کسان کا بیٹا ہوں اور جسطرح اس عہدے تک پہنچا ہوں اس میں محض قابلیت کا دخل نہیں ،بلکہ بادشاہ سلامت کی مہربانیاں بھی شامل ہیں علاوہ اسکے میرے قبیلے اور علاقے کے اعلیٰ افسران نے بھی میری بہت سی خامیوں پر پردہ ڈالے رکھا اور میری ترقی میں کوئی روڑہ اٹکنے نہ دیا۔ میں نے بھی زندگی بھر یہی کیا اور اپنے علاقے، قبیلے اور دوستوں یاروں کی خامیوں پر پردہ ڈالتا رہا اور اُن کی ترقی کیلئے راہیں ہموار کرتا رہا۔ آج میں اس عہدے پر ہوں کل میرا ہم زبان ،ہم مسلک ،ہم خیال یا پھر میرا اقربیٰ اور ہم راز ماتحت اس کرسی پر بیٹھے گا۔ وہ نہ صرف میری خامیوں پر پردہ ڈالے گا بلکہ میری دولت کا بھی محافظ ہوگا۔

داروغہ شہر کی باری آئی تو اس نے سب سے پہلے مقتول بادشاہ کو خراج تحسین پیش کیا اور پھر بولا! مجھ سے بڑھ کر بادشاہ سلامت کو کون جانتا تھا؟ میں نے شہریوں کی کم اور بادشاہ کی زیادہ حفاظت کی۔ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ ملکہ عالیہ جو کہ عوام کے دکھ درد کو سمجھتی تھیں اور ان کی بہتری کیلیے کوشاں

تھیں کو بادشاہ سلامت نے ہی ایک حادثاتی موت کی بینٹھ چڑھایااور اپنا راستہ صاف کر دیا۔ ملکہ کے حادثاتی قتل میں جو جو شریک جرم تھے، بادشاہ سلامت نے سب کو نوازااور مالامال کر دیا۔ میری زندگی کو دیکھئے، چند برس پہلے میں معمولی پوزیشن پر تھا اور آج بادشاہ کی مہربانیوں سے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوں۔ میرے بچے دنیا کی بہترین درسگاہوں میں زیر تعلیم ہیں اور دنیاکے امیر ترین ممالک میں اُن کے لئے عالیشان بنگلے اور باغ تیار ہو چکے ہیں۔ان ممالک کے بینکوں میں، میں نے اتنی دولت جمع کر رکھی ہے کہ آنے والی سات پشتوں کے لئے کافی ہے۔ دوستو میں بادشاہ کا ہمراز تھا اور آپ کا بھی غمگسار ہوں۔ میں بادشاہ کیلئے عیش وعشرت کے سبھی لوازمات مہیا کرتا تھااوراُس کی سبھی بداعمالیوں کو جانتاہوں۔مجھے آپ کے چھپے خزانوں،جائیدادوں اوربداعمالیوں کا بھی پتہ ہے۔ میرے ذمے بادشاہ نے جوکام لگا رکھے تھے اُس میں ایک آپ لوگوں پر نظر رکھنا اورآپ لوگوں کی لوٹ مار کی کمائی کا سراغ لگانا بھی تھا۔بادشاہ سے صرف ایک غلطی ہو گئی کہ اس نے اپنی اورآپ سب کی بداعمالیوں کے ثبوت اپنے ایک ہمراز دوست کو دے دیئے۔آپ سب اسے جانتے ہیں کہ وہ کون ہے اور کس حیثیت سے موجودہ حیثیت تک پہنچا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر اس ملک میں کوئی کام نہیں ہوتا۔وہ جسے چاہے ادنی سے اعلیٰ عہدے پرلے جائے اور جسے چاہے ذلت ورسوائی کے دلدل میں دھکیل دیے۔بھائیو !اب بادشاہ تونہیں رہامگر بادشاہ گرتوموجود ہے۔کیوں نہ ہم اسی کی مرضی ومنشا جان لیں اور جس شخص کے سرپراُسکا ہاتھ

ہو اُسی کا بادشاہ بنالیں۔

داروغہ کی تقریر ختم ہوئی تو وزیر باتدبیر نے اپنا خطاب شروع کیا۔ فرمانے لگے کہ بادشاہ کا قاتل کوئی اور نہیں بلکہ اسکا ہمراز دوست ہے۔ آج تک جتنے امیروں وزیروں، سرکاری اہلکاروں اعلیٰ عہدیداروں کے قتل ہوئے اُس کی منصوبہ بندی اسی، ہمراز کے گھر ہوئی۔ قاتلوں کو رقم اور ہتھیار فراہم کئے گئے اور پھر انھیں باحفاظت دوسرے ملکوں میں بھجوادیا گیا۔ یہ شخص جرائم کا بادشاہ ہے جسکے سامنے ملک کے بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ ہم سب کے راز جانتا ہے اور ہمیں بے عزت وبدنام کرنے کے طریقوں سے بھی واقف ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی اُسکے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ جج، جرنیل، وزیر، مشیر، اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ حکومتی اہلکار، علمائے دین، مفکرین اور منتظمین سبھی پر اس کے احسانات ہیں۔ کچھ اس کی سخاوت کے قائل ہیں اور باقی اس کی دولت اور شہرت کے خوف میں مبتلا ہیں۔ وہ حج وعمرے بھی کرواتا ہے، مسجدیں اور مدرسے بھی بنواتا ہے، غریبوں کیلیے لنگر خانے بھی کھلواتا ہے اور ان کی جیبوں اور جائیدادوں پر بھی ہاتھ صاف کرتا ہے۔ بادشاہ کا ہمراز بادشاہ کا قاتل بھی ہے اور محسن بھی۔ جو شخص بادشاہ بناتا اور بادشاہی گراتا ہے اسکے سامنے ہماری کیا حثیت ہے؟ کہ مشیر خاص نے دیگر مشیروں کیساتھ کھسر پھسر کی اور اُن کی طرف سے اشارہ پا کر اُٹھا اور حاضرین مجلس کے سامنے بولا: میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ

بادشاہ کے ہمراز سے فوراً مشورہ کرلیا جائے اور جس شخص کی طرف میاں ہمراز اشارہ کریں اُسے گدی پر بٹھا دیا جائے۔سپہ سالار نے مشیر خاص سے اتفاق کیا اور اُٹھ کر میاں ہمراز کے کمرے میں چلا گیا۔میاں ہمراز کے کمرے میں دوست ملک کا سفیر اور دوست ملک کے بادشاہ کا مشیر بیٹھے تھے۔میاں ہمراز نے سپہ سالار سے کہا کہ دوستوں کا مشورہ ہے کہ مسٹر کالے، پیلے، ہرے اور جامنی میں سے ایک کو بادشاہ بنا دیا جائے۔سپہ سالار نے جواب دیا کہ یہ چاروں عوام کو قبول نہیں ہونگے اور ہو سکتا ہے کہ ملک میں ہنگامہ ہو جائے۔میاں ہمراز نے مسکرا کر جواب دیا کہ عوام غرض مند اور محتاج ہوتی ہے۔غرض مند اور محتاج محکوم ہوتے ہیں حاکم نہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ ان چاروں میں سے کون ہمارے دوستوں اور ساتھیوں کی خدمت کرنے اور اُن کی مرضی کے مطابق حکمرانی کا اہل ہے۔کالا چھٹا ہوا ڈاکو، سمگلر، نوسرباز، قاتلوں کا سرغنہ اور مافیا کا سرپرست ہے۔عوام پر اُسکا پہلے سے خوف اور دبدبہ ہے اسلیئے کوئی اسکے خلاف آواز نہیں اُٹھائے گا۔پیلا جاگیردار، عیاش اور رسہ گیر ہے۔ملک بھر کے جاگیرداروں، رسہ گیروں اور قبضہ گروپوں سے اُس کے تعلقات ہیں۔ملک کی سب سے بڑی برادری اُسکی رعایا ہے اور وہ کسی بھی دوسری برادری اور طبقے پر غلبہ حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔فوجی جرنیلوں، ججوں، قلمکاروں اور مذہبی حلقوں میں بھی اُس کی عزت ہے اسلیئے وہ بھی موزوں امیدوار ہے۔ہرا دین کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے مگر اندر سے کالے اور پیلے جیسا ہی ہے۔داڑھی اور دستار کی وجہ سے دوستوں کو قابل قبول نہیں اسلیئے

کامیاب نہیں رہیگا۔ جامنی جرائم کا بادشاہ ہے اور کالے، پیلے اور ہرے والی تمام خصوصیات کا مرتبان ہے مگر وہ میری طرح بادشاہ گر بننا چاہتا ہے بادشاہ نہیں۔

سپہ سالار نے دوست ملک کے مشیر اور سفیر کی طرف دیکھا اور کچھ کہنا چاہا مگر میاں ہمراز نے اشارے سے چپ رہنے کا کہا۔ پھر بولا: دیکھئے میدان میں صرف ایک ہی آدمی ہے اور وہ ہے کالا۔ کالے میں شیر اور لومڑی کی سبھی خصوصیات ہیں۔ وہ بد عہدی پر بھی شرمندہ نہیں ہوتا اور بد عہدی کو کامیابی کا ہتھیار کہتا ہے۔ اسلئے اس سے موزوں شخص اس ملک میں نہیں جو حکمرانی کا حق رکھتا ہو۔ میاں ہمراز نے اپنا فقرہ مکمل کیا تو دوست ملک کے مشیر اور سفیر نے سپہ سالار کو مبارکباد دی اور اپنے ملک اور بادشاہ کی جانب سے نئے بادشاہ کیلئے نیک داعاؤں کا پیغام دیکر ہر طرح کی مدد کا یقین بھی دلایا۔

کالے کی تاج پوشی کا اعلان ہوتے ہی ملک میں جشن منایا جانے لگا۔ سرکاری عمارتوں پر چراغاں ہوا۔ جگہ جگہ پھولوں کے دروازے سجنے لگے۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء نے کالے کے حق میں جلوس اور ریلیاں نکالیں۔ تاجروں، صنعت کاروں اور کارخانہ داروں نے اجلاس منعقد کئے۔ پریس کانفرنس کیں اور کالے کو ملک کی ترقی اور استحکام کی علامت قرار دیا۔ شہروں دیہاتوں اور دیگر اہم مقامات پر کالے کی قدآور تصاویر لگادی گئیں اور شاہی محل کی

نئے سرے سے تزئین وآرائش ہونے لگی۔ علماء ومشائخ نے خصوصی دعائیہ تقریبات کا انعقاد کیا اور کالے کی طویل العمری اور کامیاب حکمرانی کیلئے دعائیں مانگی گئیں۔ گدی نشین پیروں، متولیوں اور مخدوموں نے نیک تمناؤں کے پیغامات بھیجے اور مریدوں کو حاکم وقت کے ہاتھ مضبوط کرنے کا حکم جاری کیا۔ اہل قلم نے کالے کی شان میں طویل مضمون لکھے اور کچھ دانشوروں نے تاریخی حوالوں سے ثابت کردیا کہ کالے کا شجرہ ایران کے بادشاہ دارا سے ملتا ہے۔ سکندر نے جب دارا کو شکست دیکر اُسکا دارالحکومت تباہ کردیا تو شہزادہ سیاہ پوش جو اپنے کالے لباس اور سنہری ٹوپی کی وجہ سے سیاہ پوش کہلاتا تھا جان بچا کر ہندوستان پہنچا اور پھر گمنامی کی حالت میں مرگیا۔ اسی شہزادہ سیاہ پوش جسکا اصل نام کہکاؤس تھا کے بیٹے کہقباد سے دارا کی نسل چلی اور اس خاندان کو ہزاروں سال بعد کالے کی صدارت میں ایک بار پھر حکمرانی نصیب ہوئی جو ملکی اور قومی عظمت کا نشان ہے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ کالا مڑھ بلوچاں کا مسلی تھا جسے مقامی زمینداروں نے مخالفین کا قتل کرنے کیلئے استعمال کیا۔ کئی سال جیل میں رہا مگر زمینداروں نے کسی طرح سزا سے بچا کر رہا کروالیا۔ بعد میں کالے نے اپنا گینگ بنا لیا اور پولیس کی مدد سے بڑی بڑی وارداتیں کرنے لگا۔ سب دانشوروں، قلم کاروں اور دیگر طبقات کو پتہ تھا کہ کالے کا نام کالا ہی ہے مگر میاں ہمراز کے کہنے پر اُسکا نام کالے کے بجائے کیمروس لکھنا شروع کردیا۔ جس پر شاہی فرمان بھی جاری ہوگیا کہ آئندہ بادشاہ سلامت کو شاہ کیمروس کے نام سے

لکھا اور پکارا جائے چونکہ بادشاہ سلامت کا اصل نام کیمروس ہی تھا۔ تخت نشینی اور تاج پوشی کے فوراً بعد میاں ہمراز نے مڑھ بلوچوں کے پٹواری کو بمعہ ریکارڈ طلب کیا اور بندوبست مال اور مثل حقیقت میں ایک پرت کا اضافہ کرنیکا حکم دیا جس کے تحت شاہ کیمروس کے نام ہزار بیگہ زمین لگوائی گئ جو مغل بادشاہ اکبر نے شاہ کیمروس کے پڑدادا دُلا بھٹی (عبداللہ بھٹی) کے خلاف شاہی فوج کی مدد کے عوض دی تھی۔ اسی طرح موت اور پیدائش کا رجسٹر بھی بدل دیا گیا اور مڑھ بلوچاں کے مسلیوں کی جگہ میلان خانوادے کا اندراج ہوا جن کے بزرگ ایرانی نسل کے تھے۔ یہ سب ہو چکا تو سپہ سالار نے میاں ہمراز سے کہا کہ تم بڑی توپ چیز ہو۔ تم نے کالے، مُسلی کو میلان بنا دیا۔ تمھاری زہنیت اور عقلیت کو داد دیتا ہوں۔ تم واقعی بادشاہ گر ہو۔ تمہاری چالاکی اور پیرکاری نے عوام وخواص پر جادو کر دیا اور ہر طبقہ فکر نے کالے کو شاہ کیمروس تسلیم کر لیاہے۔ نہ کوئی احتجاج ہوا ہے نہ ہڑتال اور ہنگامہ۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ عوام سادہ مزاج اور اہل غرض ہوتے ہیں اور اہل غرض فرمانبردار اور احمق ہوتے ہیں۔اس حالت میں مکار اپنے شکار سے محروم نہیں رہ سکتا۔ عوام کے متعلق میکاولی کا یہ قول بھی درست ہے کہ وہ اچھی چیز کو ناپسند کرتے ہیں چونکہ مختلف المزاج ہوتے ہیں، خطروں سے ڈرتے ہیں، اسلیئے ہر جابر کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ سپہ سالار نے رخصت لی، میاں ہمراز کو سلیوٹ کیا اور کہا۔ تم میکاولی کے سچے پیروکار ہو۔ جب تک تم ہو یہ ملک ترقی نہیں کر سکتا اور نہ ہی عوام کی

حالت بدل سکتی ہے۔

یوم یکجہتی کشمیر

5 فروری کا دن یوم یکجہتی کشمیر کا دن ہے کہ اس روز اہل پاکستان محکوم و مظلوم کشمیریوں کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرتے ہیں۔ یوم یکجہتی کشمیر کا سلسلہ جماعت اسلامی کے سابق امیر قاضی حسین احمد نے شروع کیا جسے اس وقت کی وزیراعظم پاکستان محترمہ بینظیر بھٹو شہید نے ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر منانے کا فیصلہ کیا۔ 5 فروری 1990ء میں یہ دن پورے جوش وجذبے سے منایا گیا، ملکی سطح پر سیمینارز، جلسے اور جلوس منعقد کئے گئے جبکہ دنیا بھر میں تارکین وطن نے یہ دن مناکر اس دن کی اہمیت کو عالمی سطح پر اُجاگر کیا۔

5 فروری کی ایک اپنی اہمیت ہے اور ہر سال اہل پاکستان کو یاددہانی سی ہو جاتی ہے کہ دنیا بھر میں حل طلب مسائل میں ایک مسئلہ کشمیر کا بھی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ 5 فروری 1990ء کے بعد اس دن کو منانا محض رسمی اہمیت کا حامل ہے یا پھر اس دن کے منانے کا کچھ فائدہ بھی ہوا ہے۔ اگر ہم فوائد کی طرف دیکھیں تو مظلوم اور محکوم کشمیریوں کو اس دن کا کوئی فائدہ نہیں ہوا جبکہ آزاد کشمیر کے سیاستدانوں، بیوروکریسی، کشمیر کونسل اور وزارت امور کشمیر سمیت کشمیر کمیٹی کے چیئرمینوں کو کافی فائدہ ہوا ہے۔

فروری کی آڑ میں ہر سال آزاد حکومت کروڑوں روپے جلسے، جلوسوں اور سیمینارز پر 5 خرچ کرتی ہے ان تقریبات کا خرچ کم آتا ہے مگر اسکی آڑ میں قومی خزانے پر لمبا ہاتھ مارا جاتا ہے۔ آزاد حکومت کے وزیر، مشیر اور سرکاری اہلکار جو کہ ہر طرح کے اخلاقی اور قانونی ضابطوں سے بھی آزاد ہوتے ہیں۔بڑے۔بڑے ہوٹلوں میں یکجہتی بزنس کے پنڈال سجاتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں اور پھر رٹی رٹائی تقریریں پڑھ کر کھایا پیا ہضم کر کے اگلے یوم یکجہتی کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔ کشمیر کونسل اور وزارت امور کشمیر کا بھی یہی حال ہے، کشمیر کونسل مال کمانے اور دوستوں یاروں کو نوازنے کا ادارہ ہے۔ گزشتہ برس یوم یکجہتی سے پہلے ہی آزاد خیال کشمیریوں کے سلطنت کے لیڈروں نے سوچا کہ کیوں نہ اس روز کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کیلئے آزاد خطہ کے عبوری آئین میں تبدیلی کر لی جائے اور کشمیر کونسل کے ممبران کی تعداد بڑھا کر سرحد پار بسنے والے کشمیریوں کے خون کا سودا کرنے کیلئے جیالوں اور متوالوں کی تعداد میں اضافہ کر لیا جائے۔

آزاد کشمیر کے سنجیدہ طبقے کا ہمیشہ سے ہی 1973ء کے عبوری آئیں پر اعترض رہا ہے چونکہ یہ آئین آزاد کشمیر کے عوام کی خواہشات کا آئینہ دار نہیں اور نہ ہی یہ آئین تحریک آزادی کشمیر کے حوالے سے ایک مکمل اور مستحکم دستاویز ہے۔ 1973ء کا عبوری آئین سابق وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو

مرحوم کی خواہش پر ان کے وزیر قانون حفیظ پیرزادہ نے لکھا اور ایک گھنٹے کی رسمی بحث کے بعد آزاد کشمیر اسمبلی نے اس آئین کو تسلیم کرلیا۔ اس عبوری آئین کی خاص بات کشمیر کونسل کا قیام ہے جسے آزاد کشمیر کے سنجیدہ حلقے اور سیاسی شعور اور بیداری کے حامل افراد غلامی کی زنجیر تصور کرتے ہیں۔

ہم نے بارہا آزادی بزنس کے ڈیلروں اور ان کے کارندوں سے سنا ہے کہ وہ برسر اقتدار آکر کشمیر کونسل کی غلامی سے چھٹکارہ حاصل کرلینگے مگر عملاً سبھی اس طوق غلامی کو روزی روٹی کا تمغہ تصور کئے سینوں پر سجانے کیلئے بے تاب رہتے ہیں۔ کشمیر کونسل کے زریعے ہر سال کروڑوں روپے ہڑپ کئے جاتے ہیں اور سیاسی پارٹیاں اپنے ممبران کی وساطت سے اپنا اپنا حصہ لے کر ایک بار پھر کشمیر کونسل کے خاتمے کا نعرہ لگاتی ہیں۔

کشمیر کونسل کے ممبران میں اضافہ بھی سیاسی جماعتوں کی ضرورت ہے چونکہ کچھ ریٹائرڈ ججز، برادری میٹوں اور بزنس پارٹنرز کو ایڈجسٹ کرنے اور قومی خزانے کی تقسیم سے انہیں حصہ دینے سے ضروری ہے کہ انہیں اسمبلی یا پھر کشمیر کونسل کی ممبری سے نوازا جائے۔

کچھ کے چاچے اور مامے بھی بیروزگار بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ پاکستان میں مقیم مہاجرین کی نشستوں میں کس طرح اضافہ کیا جائے تاکہ پندرہ بیس رشتہ داروں اور برادری کے انوسٹرز کو نوازا جائے۔ دُکھ کی بات یہ ہے کہ اس ساری

منصوبہ بندی اور بندر بانٹ میں پاکستان کی سرخیل سیاسی جماعتیں اور انکے عہدیدار شامل ہوتے ہیں چونکہ وہی اس لوٹ کھسوٹ کے بڑے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی ایک طرح کی یکجہتی ہی ہے اور اسی یکجہتی کی آڑ میں 5فروری والی یکجہتی بھی منائی جاتی ہے۔ اگر ہم پاکستان کی سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کو یکجہتیوں کی فہرست گنوانے لگیں تو ایک اور راج ترنگنی مرتب ہو جائے۔ آزاد کشمیر کے حالیہ الیکشن بھی اس یکجہتی کا حصہ ہیں جسے وٹو فارمولہ اور کائرہ پلان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یکجہتی اور یگانگی کا اندازہ لگایئے کہ آزاد کشمیر کے حلقہ نمبر4 میں کل ووٹوں کی تعداد تقریبا 40 ہزار ہے جبکہ جیتے ہوئے جیالے نے بارہا بیان دیا کہ اسے 55 ہزار ووٹ ملے ہیں جو کہ ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ بیشک یہ واقعی تاریخی کارنامہ ہی ہے کہ جمہوریت کی برکت اور حکومت پاکستان کی کشمیریوں سے یکجہتی کا غلغلہ سن کر پندرہ ہزار مردوں نے قبروں سے اُٹھ کر جناب زرداری صاحب کے چہیتے اور وٹو کے ہمزاد وہم خیال کو ووٹ دیئے اور پھر واپس اپنی قبروں میں چلے گئے۔ ایسا ہی بیان جناب کائرہ کے عزیزالجان جناب بڈھانوی نے دیا کہ انہیں پچیس ہزار سے زیادہ ووٹ ملے ہیں جبکہ ان کے مخالف کو سترہ ہزار ووٹ ملے ہیں۔ موصوف نے نجی ٹیلیویژن چینل کے اینکر پرسن کے ایک سوال پر جواب دیا کہ انکی برادری جاگ اُٹھی ہے اور یہ ووٹ انکی برادری کے ہیں۔ اینکر نے پوچھا کہ حضور آپ کے

حلقے میں کل ووٹوں کی تعداد ہی پچیس ہزار ہے تو مخالف امیدوار کو سترہ ہزار کہاں سے ملے۔ ظاہر ہے کہ یہ ووٹ بھی یکجہتی کے تھے اور برادری صرف نکیال میں ہی نہیں بلکہ گجرات، جہلم اور گوجرانوالہ تک جاگ رہی تھی۔ اب اسی یکجہتی کو دوام بخشنے کیلئے آزاد کشمیر کے ان باشندوں کو جو پاکستان میں نوکریاں کرتے ہیں، بستے ہیں کاروبار کرتے ہیں کو پاکستان میں ووٹ کا حق دے دیا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو آزاد کشمیر کا ہر دوسرا شخص پاکستان میں رہتا ہے۔ اگر برادریاں اسی طرح جاگتی رہیں اور لیڈروں کے کشف القبور کے علم میں اضافہ ہوتا رہا تو کیل سے چھمب تک سارے مردے اپنے زندوں سے پہلے ووٹ ڈالنے آئیں گے اور کوئی جیالہ اور متوالہ کبھی بھی پاکستان میں الیکشن نہیں ہارے گا۔ ایسی ہی ایک یکجہتی شملہ میں ہوئی تھی جس کی برکت سے مسئلہ کشمیر عالمی فورم سے اٹھا کر پاکستان اور بھارت کی باہمی پنچائیت کے حوالے کر دیا گیا۔ ایک یکجہتی جناب زرداری صاحب نے بھی کی ہے جسے آزاد کشمیر میں ان کی جماعت جو کہ آجکل شاہی حکمران جماعت ہے نے بخوشی قبول کر لیا ہے۔ یہ یکجہتی گلگت بلتستان کو کشمیر سے کاٹ کر علیحدہ صوبہ بنانے اور وہاں اپنا راج قائم کرنے کی صورت میں ہے جو کہ معاہدہ کراچی، اقوام متحدہ کی قراردادوں اور آزاد جموں وکشمیر سپریم کورٹ کے فیصلہ کی کھلی خلاف ورزی ہے، اس سلسلے میں جسٹس (ریٹائرڈ) منظور گیلانی نے اپنے مضامین کے زریعے جو کہ روزنامہ نوائے وقت میں تفصیل وار چھپے کے علاوہ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ مگر حال ہی میں

منظور گیلانی صاحب نے آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے سے متعلق بیان دے کر ثابت کر دیا ہے کہ یہاں صرف مفادات مقدم ہوتے ہیں۔ جب ہر کسی کے منہ میں اختیارات، اقتدار اور مفادات کی ہڈی ہو تو اعتراض کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ جب اسلام آباد میں کرپشن اور لوٹ مار کی کمائی سے تعمیر کردہ عالیشان کوٹھیوں اور قیمتی کاروں کے چھن جانے اور اعلیٰ ترین معیار زندگی میں فرق آنے کا اندیشہ ہو تو اعتراض و انکار کرنے والے کو گنہگار سمجھا جاتا ہے۔

آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی دنیا کی واحد اسمبلی ہے جس میں مشائخ کی نشست بھی ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ شیخ روحانیت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ شیخ کی پہچان علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کروائی ہے کہ یہ وہ ہستی ہے جس سے خدا خود پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔

عارف کھڑی حضرت میاں محمد بخش نے شیخ کے رتبے اور فضیلت کے بیان میں فرمایا کہ انکی نظر کیمیا ہوتی ہے مگر آزاد کشمیر اسمبلی کی نشست جیتنے کیلئے ہمارے شیخوں کی حیثیت سبزی منڈی والے چیچوں کی سی ہو جاتی ہے۔ اسمبلی میں علماء و مشائخ کی سیٹ پر براجمان شیخ صاحب نے اپنے مریدوں کا اکٹھ کیا اور پوچھا کہ جب موت قریب ہوتی ہے تو قریب المرگ شخص کے سرہانے بیٹھ کر کیا

پڑھا جاتا ہے؟ بیچارے مریدوں نے کہا حضور سورۃ یٰسین، پھر فرمایا مصیبت کہ وقت کیا کرتے ہو؟ بے بس مریدوں نے کہا حضور جب کوئی ظاہری ومادی وسیلہ نہ ہو تو سورۃ یٰسین، پیر طریقت جو کہ پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے اور مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر پانچ سال تک وزارت کے مزے لوٹتے رہے تھے پر واقعی مرگ الاقتدار طاری تھی اور اگلے پانچ سال اسمبلی سے باہر گزارنا ایک مشکل اور مصیبت ہی تھی اس لئے فرمایا کہ اگر سورۃ یٰسین پڑھتے ہو اور میری ولایت پر یقین رکھتے ہو تو مسٹر یٰسین کو ووٹ دے دو۔ حضور یہ ہے اصل یکجہتی ورنہ کوئی عام آدمی ایسی حرکت کرتا تو اس پر توہین قرآن اور توہین اسلام فتویٰ جاری کردیا جاتا اور وہ اسمبلی کی بجائے بن خرماں جیل میں ہوتا۔ مگر قربان جاؤں ان یکجہتیوں کے حضرت مولانا فضل الرحمٰن جیسا جید عالم اور شیخ المشائخ پہلے پاکستان پیپلز پارٹی سے یکجہتی کے طفیل کشمیر کمیٹی کے چیئرمین اور اب مسلم لیگ ن کی ڈور پکڑ کر اس عہدہ پر براجمان ہیں جنہیں کشمیر سے کم اور کشمیر ہاؤس سے زیادہ لگاؤ ہے۔ اگر سیاستدانوں میں یکجہتی ہوسکتی ہے تو علماء ومشائخ میں کیوں نہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن بھی اپنے ہی مدرسوں کے گریجویٹ ہیں اور آزاد کشمیر والے شیخ بھی۔ کتنی مماثلت ہے ان یکجہتیوں میں۔ سنا ہے کہ آزاد کشمیر والے شیخ کی ڈگریوں پر خود شیخ کے ہی دستخط ہیں۔ اب پتہ نہیں کہ پاکستان میں کتنے شیخوں

کے پاس ان کی جاری کردہ ڈگریاں ہونگی۔ یکجہتیوں کی فہرست طویل ہے جسے بیان کرنا مشکل ہورہا ہے۔ اس فہرست میں سرفہرست مہاجرین مقیم پاکستان کی سیٹیں ہیں جن کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ کراچی کی دو نشستوں پر ایم کیو ایم نے بذریعہ یکجہتی قبضہ کرلیا ہے اور سوچ بچار ہورہی ہے کہ کراچی میں دو سیٹوں کی مزید گنجائش پیدا کردی جائے تاکہ ایک مستقل سیٹ پیپلز پارٹی اور دوسری اے این پی کیلئے وقف رہے۔ اسی طرح پنجاب، بلوچستان، گلگت اور پشاور میں دو دو نشستیں بھی زیر خیال ہیں جبکہ علماء ومشائخ کی سیٹوں میں اضافے کا بھی امکان ہے۔ علماء ومشائخ کی ایک سیٹ جس کا اہتمام مجاہد اول کیلئے کیا گیا تھا انکی بیماری کی وجہ سے ڈانواڈول رہتی ہے۔ مجاہد اول کے بعد مسلم کانفرنس کو جو شیخ صاحب دستیاب تھے وہ ہر الیکشن کے بعد پارٹی بدل لیتے ہیں۔ اب ڈر ہے کہ اگلے الیکشن سے پہلے وہ کسی دوسری سورۃ کا ورد شروع کردیں۔ ضروری ہے کہ آزاد کشمیر اسمبلی میں چار شیخ موجود ہوں جن کا تعلق مسلم کانفرنس، نون لیگ، پی پی پی اور ایم کیو ایم سے ہو۔ شکر ہے کہ جمعیت علماء اسلام، جماعت اسلامی، اے این پی اور تحریک انصاف روحانیت پر زیادہ زور نہیں دیتیں ورنہ آزاد کشمیر کے عوام پر یکجہتیوں کا مزید بوجھ بڑھ جاتا۔

کشمیر جو جنت نظیر کہلاتا تھا اب جہاں ظلم اور بربریت کی انتہا ہے اور کوئی

پرسان حال نہیں۔ ایک طرف سے دوستی، کاروبار اور فیورٹ نیشن کی پیشکشیں اور دوسری طرف سے لاشوں کے تحفے آئے روز ملتے ہیں۔ کشمیر میں ہر روز کسی فرد یا خاندان پر قیامت بن کے گزرتا ہے ایسی ہی ایک رپورٹ ایک بین الاقوامی ادارے نے شائع کی کہا گیا کہ سعیدہ بیگم کے لیے کشمیر ایک میدان جنگ ہے، جس میں ان کا سب کچھ لٹ گیا وہ ایک غسل خانے سے بھی تنگ کوٹھری میں رہائش پذیر ہے۔ 40 سال قبل سعیدہ کے خاوند ایک حادثہ میں ہلاک گئے تھے۔ وہ سسرال میں موجود جائیداد سے بے دخل ہوگئیں اور چار چھوٹے چھوٹے بیٹوں کو لے کر سرینگر میں اپنے میکے آئیں جہاں انہیں ایک کوٹھری دی گئی۔ بیٹے جوان ہوئے، کمانے لگے لیکن 1990 میں جب مسلح شورش شروع ہوئی تو ان کے تین بیٹے دو سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے تشدد کی مختلف وارداتوں میں ہلاک ہوگئے۔ اس صدمے کی وجہ سے ان کا چوتھا بیٹا ذہنی توازن کھو بیٹھا اور بالآخر لاپتہ ہوگیا۔ سعیدہ اشک آور لہجے میں کہتی ہیں: یہاں جنگ نہ ہوتی تو میں آج محتاج نہ ہوتی۔ میرے تو چار بیٹے تھے، میں ایک روٹی کے لیے کیوں ترستی اس جنگ میں سب کچھ ختم ہوگیا۔ سعیدہ جیسی ہزاروں خواتین کشمیر میں کشمیر کی جنگ سے متاثر ہوئی ہیں۔ انسانی حقوق کے اداروں کا کہنا ہے کہ کشمیر میں ہزاروں ایسی خواتین ہیں جن کے خاوند لاپتہ ہوگئے۔ انہیں اب ہالف وڈو یا نصف بیوہ کہا جاتا ہے۔ انہیں نہ توسسرال میں پناہ ملتی ہے نہ میکے میں۔ سعیدہ جیسی ہزاروں مائیں بھی ہیں جو اس جنگ زدہ سماج میں اپنے آپ کو تن تنہا پاتی ہیں۔ مگر آزاد

کشمیر میں آزادی ہیں کیمپ والوں کو کیا خبر جن کی راتیں اور دن نشے میں چور گزرتی ہیں۔ نشہ عوام کے ووٹ کا ہو یا انگور کی بیٹی کا دونوں ہی انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ختم کر دیتے ہیں۔

اب ایک نظر عالمی منظر نامے پر نظر بھی ڈالتے ہیں، بھارت کو جو خطرہ اس وقت محسوس ہو رہا ہے وہ دو ہزار چودہ میں افغانستان سے امریکی اور نیٹو افواج کے انخلا کے بعد کی صورتحال ہے۔ مختلف حلقوں کی جانب سے یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ کیا مقبوضہ کشمیر میں جہاد پھر سے شروع ہو سکتا ہے؟ اس بارے میں میر واعظ کا بیان بھی سامنے آیا جس میں دہشتگردوں کا افغان جنگ کے بعد کشمیر کی طرف رخ کرنے کا کہا گیا۔ ماضی میں ایسا دیکھا گیا ہے کہ جہادی گروپوں نے اپنے ٹھکانے تبدیل کیے ہیں جس سے اس خدشے کو تقویت ملتی ہے کہ افغانستان سے غیر ملکی افواج کے نکلنے کے بعد پنجابی طالبان کے نام سے مشہور عسکریت پسند اپنی توجہ کشمیر کی جانب کر سکتے ہیں۔ گذشتہ کئی دہائیوں سے دونوں ملکوں کی جانب سے ایک دوسرے پر لگائے گئے الزامات اور ہونے والی جنگوں کی وجہ سے لگنے والے زخم اتنے گہرے ہیں جن کا جلدی مندمل ہونا قدرے مشکل ہے۔ اگرچہ دونوں ممالک کشمیر کے تنازعے کا حل چاہتے ہیں مگر وہ یہ بھی چاہیں گے کہ برسوں سے جاری خونریزی اور پراکسی فورسز پر خرچ کی جانے والی رقم کے کوئی مناسب نتائج بھی حاصل ہوں۔ اس سوال کے جواب کے لیے ذرا خطے کی

صورتحال کے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی اقتصادی صورتحال کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب معیشت ہی پالیسی بنانے کا ماخذ ہوگا اسی لیے پاک بھارت تعلقات کو بہتر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دو طرفہ تجارت فروغ پائے۔ دونوں ملکوں کے بہتر تعلقات کی وجہ سے خطے میں استحکام آئے گا اور نتیجے میں چین اور دیگر ممالک سرمایہ کاری کریں گے۔ چین پہلے ہی سے پاکستان میں ایک اقتصادی راہداری کے ذریعے پاکستان اور جنوبی و وسطی ایشیا میں اپنے مفادات کو فروغ دے رہا ہے۔ اس کے لیے چین نے خطے میں امن و امان کی بہتر صورتحال پر زور دیا ہے۔ مگر کیا امریکہ بھی اس حل کے لیے راضی ہوگا؟ یہ سوال سب سے اہم اور معنی خیز ہے۔

کشمیر کے مسئلے کے حل میں عالمی برادری سے مداخلت کرنے کے پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف کے مطالبے کو خارجہ سلمان خورشید نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ ایک ایسے سوال پر جسے شملہ معاہدے میں دونوں ملکوں نے ایک باہمی تنازع تسلیم کیا ہے اس کے بارے میں کسی تیسرے فریق کی مداخلت قبول کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جبکہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور کسی کو اس کے بارے میں کوئی سوال اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

سابق سفیر عارف کمال کا کہنا ہے کہ کشمیر اب ایک علاقے کو اپنے ساتھ ملانے

کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ سولہ ملین لوگوں کی زندگیوں کا مسئلہ ہے جو اب اپنے مسئلے کے حل کے لیے دہلی اور اسلام آباد سے باہر جانا شروع ہو گئے ہیں۔اس صورتحال کو نظر میں رکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کشمیر کا مسئلہ خطے کے امن واستحکام کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ اسی لیے پاکستان اور بھارت کی حکومت کو دہشتگرد گروپوں کی حوصلہ شکنی کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے اور معیشت اور امن کی فروغ کی جانب زیادہ توجہ دینا ہو گی۔

کشمیری حکمران اگر صرف دن منانے اور کشمیریوں کے خون پر سیاست کرتے رہے تو آنے والے دنوں میں حالات مزید ابتر ہوں گے۔ جس طرح کی یکجہتیوں کا موسم آزاد کشمیر پر چھایا ہوا ہے اس کے طور طریقے ظاہر کرتے ہیں کہ اس سے کشمیر تو آزاد نہیں ہوگا مگر آزاد کشمیر دو چار سالوں کی مار ہے۔ اگر پیپلز پارٹی پاکستان میں اب کی بار برسر اقتدار آ جاتی تو اصول یکجہتی کے تحت آزاد کشمیر پاکستان کا چھٹا صوبہ ہو جاتا اور مسئلہ کشمیر فوراً حل ہو جاتا۔ اور مشرف فارمولہ سے بھی کچھ آگے کی سوچ رائج ہو جانی تھی جسے مظلوم کشمیریوں نے سر تسلیم خم کرنا تھا۔ مگر ایسا نہ ہوا لیکن اس سلسلے میں میاں صاحبان بھی کم نہیں، جبکہ آزاد کشمیر جو صرف نام کی حد تک آزاد ہے، حقیقتاً یہاں کے حکمران زہنی طور پر غلام ہیں اس لیے آزاد کشمیر کے حکمرانوں سے چاہے وہ پیپلز پارٹی ہو یا مسلم لیگ ،یا مسلم کانفرنس کوئی بیعد نہیں کہ کیا کر لیں

ہو سکتا ہے کہ یہ یوم یکجہتی ہمارا آخری یکجہتی ہو اس لئے اسے جی بھر کر منایئے اور اظہار یکجہتی کیجئے۔ چونکہ راجہ فاروق حیدر، بیرسٹر سلطان کو بھی چوہدری مجید، سرادر یعقوب اور سردار عتیق کی طرح اقتدار اچھا لگتا ہے۔ اور اس کے لیے آزاد کشمیر کو گلگت بلتستان جیسا سٹیٹس دلوانا کوئی بڑا مسلہ نہیں ہو گا۔

حدیث شریف ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ بھی ہوگی کہ معاشرے کے گھٹیا ترین اور انتہائی ناپسندیدہ لوگ اقتدار میں آ جائینگے۔یہ حدیث پاک کا ترجمہ نہیں بلکہ تشریح ہے جو اسی طرح کا مفہوم بیان کرتی ہے۔ قیامت ایک حقیقت بھی ہے اور تخشل بھی ہے حقیقی قیامت کا علم صرف خالق کائنات کو ہے جسکا بیان قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور انسانوں کو اس دن کی ہولناکیوں اور خوفناکیوں سے مطلع کیا جاتا ہے تاکہ وہ اچھے اعمال کریں اور قیامت کے دن عذالت الٰہی سے محفوظ رہیں۔یہ قیامت ایک حقیقت ہے اور اہم سب نے ایک دن اسکا مزہ اپنے اعملا کی نسبت سے دیکھنا ہے۔یہ دن جزاء اور سزا کا ہوگا اور ہر بشر اپنا اعمال نامہ ہاتھ میں لئے میدان حشر میں موجود ہوگا۔اعلیٰ و ادنیٰ سب ایک ہی مقام پر ہونگے جہاں کسی کا حسب و نسب ،فرقہ ،مسلک، طبقہ و طریقہ، علم و مرتبہ، دولت، غربت و امارت نہیں دیکھی جائے گی۔ہر شخص ابتلاء کی کیفیت میں ہوگا اور حکم ربانی کا منتظر ہوگا۔بقول شاعر، نہ اس دن باپ بیٹے کا نہ بیٹا باپ کا ہوگا محمد ﷺ تخت پر ہونگے عدالت میں خدا ہوگا۔

جب خدا کی عدالت ہو گی تو فیصلے بھی خدائی احکامات کے مطابق ہونگے اور یہ وہی احکامات ہیں جن کا ذکر خدا نے بار بار قرآن پاک میں کیا اور اپنے فیصلوں سے بھی مخلوق کو آگاہ کیا یہ بیان ہے اس قیامت کا جس کے قیام کا کسی کو پتہ نہیں مگر ایک قیامت تمثلی ہے جو ہر روز کسی نہ کسی صورت میں برپا ہوتی ہے جو ہر روز کسی نہ کسی صورت میں برپا ہوتی ہے کرپشن، بددیانتی، دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ زنی، حکومتی اور حکومتی شخصیات کی لوٹ مار، عدلیہ کی بے حسی اور کمزوری، انتظامیہ کی درندگی سیاست اور حکومت کے نام پر چور بازاری اور عیاری جیسی قیامتیں ہر روز مظلوم، محکوم، بے ہمت اور بے سہارا عوام پر ٹوٹتی ہیں جس سے معاشرہ بے حس و بے آبرو اور مملکت کمزور اور محدوم ہوتی جارہی ہے ہر روز نازل ہونے والی قیامتیں خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ہماری نیتوں اور اعمال کی وجہ سے ہیں۔ ہمارے ان اعمال میں ایک عمل نام نہاد جمہوری نظام کا قیام بھی ہے جسکے ذریعے معاشرے کے چھٹے ہوئے

بدمعاش، غنڈے، نودولیتے، مال مویشی اور گھاس پھوس چوری کرنے والے، کٹے و چھے چوری کرکے بیچنے والے، عدالتوں اور تھانوں میں بیٹھنے والے ٹاؤن، برادری ازم کا ناسور پھیلانے والے انسان نما شیش ناگ، منشیات فروش، جنگلات سے سرکاری لکڑی چوری کرنیوالے ٹھیکیدار اور دیگر معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کے حامل لوگ کسی نہ کسی صورت سے الیکشن ڈرامے کے اختتام پر اسمبلیوں تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر اپنے کسی گرو کو صدر یا وزیر اعظم بنا کر نہ صرف مظلوم عوام پر قیامت ڈھاتے ہیں بلکہ

انہیں نفسیاتی مریض بنا کر اپنے مقصد کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی اور سہولت کے لئے قانون سازی کرتے ہیں اور عدالتوں کو اپنے مفاد کیلئے استعمال کرتے ہیں وہ اپنی مرضی اور سہولت کے لئے قانون سازی کرتے ہیں اور عدالتوں کو اپنے مفاد کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ اپنی اپنی برادریوں کو یرغمال بنا لیتے ہیں اور برادری تحفظ کے نام انھیں دیگر برادریوں سے لڑاتے ہیں تا کہ معاشرہ ابتری کا شکار ہو احکامتی اور ست ہو جائے معاشرے کے بد ترین اور بد اعمال لوگ ووٹ اور ووٹر ہی نہیں خریدتے بلکہ عام انسانوں کا دین و ایمان بھی خرید لیتے ہیں۔ وہ انھیں جھوٹ، فریب اور مکاری پر لگا کر بظاہر اپنی اپنی برادریوں اور سیاسی جماعتوں کی خدمت کرتے ہیں ور عام لوگوں کا جینا حرام کر دیتے ہیں قومی دولت اور ملکی خزانہ ان کا ذاتی خزانہ اور خیراتی ادارہ بن جاتا ہے جس سے ملکی معیشت تباہ ہو جاتی ہے جبکہ ان کی اندرون ملک اور بیرون ملک جائیدادیں وسعت پذیر ہو جاتی ہیں وہ جرائم پیشہ لوگ حکومتی ایوانوں میں بیٹھ کر اہم شخصیات اور معززین معاشرہ کہلاتے ہیں۔ عدالتوں اور قانون ان کے اشاروں پر کام کرتی اور چلتی ہیں جبکہ ریاستی مشینری ان کے احترام میں عوام پر ہر طرح کا ظلم و ستم کرنے پر ہمہ وقت تیار رہتی ہے فلسفہ حیات، اور نفسیات کے حکماء اس بات پر متفق ہیں کہ جرائم پیشہ عناصر انسانی اخلاقی اور تمدنی اقدار کے مخالف اور معاشرتی فلاحی اطوار و روایات کے باغی ہوتے ہیں ایسے لوگ اگر کسی وجہ سے معاشرے اور ریاست میں

اعلیٰ مقام پر قابض ہو جائیں تو معاشرہ اور ریاست زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ قانون شکنی، بد نظمی، بد عہدی اور برائی جو ان اشخاص کی سرشت میں ہوتی ہے معاشرے میں بگاڑ اور ریاست کے زوال کا باعث بنتی ہے بد اعمال، بد کردار، ہوس و حرص کے امراض میں مبتلا اشخصا کا مقتدر اعلیٰ بن جانا قوم کی بد نصیبی اور رسوائی کا باعث بنتی ہے ایسے لوگوں کے ہاتھ جب اقتدار آ جائے تو ایک فلاحقی مدنی معاشرہ درنگی کا شکار ہو کر غلامی کے دور میں چلا جاتا ہے جس میں عزت، غیرت اور حرمت انسانیت قصہ ماضی بن جاتا ہے۔

جرائم پیشہ عناصر جب اشرافیہ کا روپ دھار لیں اور معاشرہ انھیں معزز اور معتبر ماننے پر مجبور ہو جائے تو ایسا معاشرہ روحانی اور جذباتی لحاظ سے مردہ اور بے حس معاشرہ کہلاتا ہے جو اصل معاشرتی اقدار اور روایات سے ہٹ کر ایک مصنوعی اور مجبور زندگی کا دائرہ ہوتا ہے ایسے معاشرے اور ریاست کے عوام جبر کو جمہوریت غلامی کو حفاظت اور غنڈہ عناصر کی تابعداری کو قانون ،آئین کی تابعداری کا نام ایک ایک مصنوعی محکوم زندگی دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں سالہا سال کی اس زندگی کے لوگ عوام اسقدر بے حس ہو جاتے ہیں کہ وہ معاشرے کے بدترین اور گھٹیا لوگوں کو نجات دھندہ اور قائد تسلیم کر لیتے ہیں۔ابن خلدون اور ابن رشد نے بھی ایسے مجبور اور محکوم معاشروں کا ذکر کیا ہے جن کا اختتام انتہائی بھیانک اور عبرت ناک ہوتا ہے۔

آزاد کشمیر کی سیاسی اشرافیہ اور بلیک میل قائدین کی تاریخ نہ تو قدیم ہے اور نہ ہی طویل،اہل سیاست کی اکثریت نو دولیتوں، نوسربازوں، جعلسازوں ،انسانی سمگلروں، کرنسی سمگلروں، منشیات فروشوں، لینڈ مافیا، جنگل مافیااور جرائم پیشہ افراد پر مشتمل ہے۔ایسے لوگوں کے شجروں سے جناب آصف علی زرداری، میاں نواز شریف بھی واقف ہیں مگر اقتدار کی غلام گردشوں کی اندھیری راتوں سے یہی لوگ واقف ہیں اس لئے ن لیگ اور پیپلز پارٹی کا اقتدار ایسے ہی نام نہاد قائدین کی رہن منت ہے۔میاں محمد نواز شریف ہوں یا آصف علی زرداری جنرل مشرف ہو یا جنرل ضیاء الحق ہر کسی کو اقتدار سے غرض ہے چاہے آزاد کشمیر کے عوام پر کیسی بھی قیامت ٹوٹے پر ان کی سردردی نہیں۔وٹو کاہرہ منصوبہ ہو یا کسی ٹھیکیدار کی مرضی یا منشاء پاکستانی قائدین کو سب کچھ قبول ہے۔

پچھلے ڈیڑھ عشرے سے لیکرتا حال آزاد کشمیر کے ریاستی نظام اور اقتدار جو کروٹیں لیں وہ کسی بھی لحاظ سے مثبت اور قابل تعریف نہیں آزاد کشمیر کے ریاستی اور معاشرتی بگاڑ میں سو فیصد پاکستانی اشرافیہ ،اقتدار اعلیٰ سیاسی بازی گری کا ہاتھ ہے۔معاشرے کے بد نام ترین اور جرائم کی غلاظت میں لتھڑے ہوئے لوگوں کو اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھانے میں بھی پاکستان کے

سیاسدتانوں، بیوروکریسی اور حکمرانوں کا ہاتھ ہے بلکہ ان ہی کی مرضی سے آزاد کشمیر پر جبر، ظلم اور برادرازم کا اقتدار غالب ہے جس میں عام آدمی کی حیثیت غلامانہ ہے۔ آزاد کشمیر کے متعلق خبروں میں صحافتی حضرات اکثر اعلیٰ ترین شخصیات کا حوالہ دیتے ہیں اور کسی مجرم کا نام نہیں لیتے۔اس کی وجہ جسٹس ،پولیس سرکھوی مرحوم اور جسٹس ریاض اختر چوہدری کی کرپشن کی خبریں اور قصے ہیں جب صحافیوں نے کرپشن کے ثبوت اور نام شائع کیئے تو صدر آزاد کشمیر جنرل انور اور جنرل پرویز مشرف کے چیف سیکیورٹی آفیسر نے برادری ازم اور کرپشن کے نشے میں سرشار ہو کر دونوں جج صاحبان کا ساتھ دیا جو آزاد کشمیر کے صحافیوں کیلیئے قیامت خیز ثابت ہوا۔ججوں کے خلاف کسی انکوائری کرنے کے بجائے جسٹس انور نے صحافیوں سے انتقام لینے کی ٹھانی چونکہ یہی صحافی جنرل انور کے کرتوتوں سے بھی پردہ فاش کرنے والے تھے۔ جنرل انور نے اپنی حفاظت کو یقینی بناتے ہوئے ججوں کا ساتھ دیا اور آزاد کشمیر پولیس کی مدد سے صحافیوں کو اسلام آباد سے اغواء کرکے اپنی موجودگی میں ان پر تشدد کروایا۔جج صاحبان سے بھی توہین عدالت کا ہتھیار خوب استعمال کیا اور کئی ماہ تک ان صحافیوں پر ظلم کے پہاڑ گرانے کے بعد انھیں عدلیہ کیخلاف سازش اور ججوں کی توہین کے الزام میں سزائیں دیکر آزاد کشمیر کی آزاد اور حقیقی صحافت کو ہمیشہ ہمیشہ

کیلئے ختم کر دیا۔

جسٹس سرکھوی جو پہلے سے بیمار تھے اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے چونکہ جو الزامات ان پر لگے تھے وہ درست بھی تھے اور سچائی پر بھی مبنی تھے۔ جسٹس سرکھوی ان الزامات اور فطری کمزوریوں کے باوجود ایک غیرت مند انسان تھے ان کے ضمیر پر الزامات کی سچائی اور بیگناہی صحافیوں پر ہونے والے ظالمانہ اور سفاکانہ تشدد کا بوجھ تھا۔ ان صحافیوں پر ایس ایس پی مظفر آباد چوہدری صابر، صدر جنرل انور اور دونوں جج صاحبان اور ان کے دوست سیاستدان کی موجودگی میں تشدد کرتا اور ساتھ اعلان بھی کرتا کہ جناب دیکھ لیں میں نے انکا بر کس کس طرح نکالا ہے۔ دنیا کی تاریخ کا یہ واحد اور منفرد واقع ہے کہ سچ لکھنے اور کرپشن کے بھیانک چہرے سے پردہ اٹھانے کے جرم میں صحافیوں پر فرد جرم عائد کی گئی اور بغیر نوٹس کے صحافیوں کو اسلام آباد سے پولیس کی مدد سے اغواء کیا گیا اور نام نہاد ریاستی صدر (انور) چیف جسٹس سپریم کورٹ (جسٹس سرکھوی) اور چیف جسٹس شریعت کورٹ وہائی کورٹ (جسٹس ریاض اختر) کی موجودگی میں کئی کئی بار ان صحافیوں پر ظالمانہ تشدد کیا گیا تاکہ آئندہ کوئی شخص آزاد کشمیر کی حدود میں سچ نہ بولے اور نہ ہی عدالتوں سے عدل وانصاف کی توقع رکھے۔ جنرل انور میں اگر تھوڑی سے غیرت ایمانی اور عزت نفس کا خیال ہوتا تو وہ سب سے پہلے ان الزامات کی تصدیق کرواتا اور پھر توہین عدالت کا کیس کسی

غیر جانبدار جج کے سامنے رکھ کر انصاف کے تقاضے پورا کرتا۔اگر جج کرپشن اقرباء پروری اور کوڈ آف کنڈیکٹ کے خلاف کام کرنے کے جرم سے مبرا تھے تو صحافیوں کو سزا دی جاتی اور بصورت دیگر ججوں کا معاملہ سپریم جوڈیشل کونسل کے حوالے کیا جاتا۔ایک مہذب معاشرے اور ریاست کے دستور، روایات، آئین اور قانون کا یہی تقاضا تھا مگر جنرل انور نے جنرل ڈاپر کا روپ دھار لیا اور مظلوم صحافیوں پر قیامت.برپا کر دی۔ حیرت کی بات ہے کہ حکومت پاکستان ،پاکستان کی اشرافیہ، صحافتی تنظیموں،انسانی حقوق کا غم رکھنے والی این جی اوز،آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتوں اور دیگراداروں کو بھی سانپ سونگھ گیا اور کسی بھی طرف سے سچ بولنے کے جرم میں گرفتار صحافیوں کے حق میں آواز نہ اٹھی۔

اب ذرا قدرت کے فیصلوں پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ جنرل انور جس خفیہ خانے سے آیا تھا ضمیر کا بوجھ لے لیکر واپس آسی خانے میں چلا گیا۔ صحافیوں کو اغواء اور تشدد کرنیوالا ایس ایس پی انسانی سمگلنگ کے جرم میں رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا تو جرائم پیشہ اعلیٰ شخصیات نے کئی ماہ کی تگ و دو کے بعد اسے جیل سے نکالا۔اس سے پہلے کہ وہ اہم اور اعلیٰ شخصیات کا نام لیتا اچانک غائب کردیا گیا۔ مشہور ہوا کہ ایس ایس پی نے دلبرداشتہ ہوکر دریا میں چھلانگ لگا دی ہے مگر تاحال اسکی لاش نہیں ملی۔ یہ اور بات ہے کہ اسی طرح کا ایک شخص حیات

آباد فیز 7 میں اکثر سڑکوں پر سیر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور سابق وزیر اعظم سردار عتیق کے ہمراہ علاقہ غیر میں قبائلی سردار کے دستر خوان پر بھی موجود تھا۔

جسٹس سرکھوی صحافیوں کو کوستے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اور جسٹس ریاض اختر پر وہی الزامات دھرائے گئے۔ موصوف پہلے تخت سے اتارے گئے اور پھر سپریم جوڈیشل کونسل میں اپنی ذات پر لگے الزامات کا دفاع نہ کر سکے اور عدلیہ سے فارغ کر دیئے گئے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر گرے سن کرک نے The Face of Democracy نامی تصنیف کے ابتدائیے میں 1810ء کی مشہور ادبی شخصیت کونسٹنٹین فرانسیکو وولنے Volney نے کہا"Let us all seek Truth as if non of us had passession of it" کا قول دھرایا ہے۔ یوں تو جنرل انور بھی دانشوری کا زعم رکھتا ہے اور کئی عسکری اداروں میں بحثیت استاد پڑھاتا بھی رہا ہے مگر سچ کے معاملے مس ی نہ صرف کھوکھلا بلکہ ان پڑھ نکلا۔ جنرل انور نے جسطرح سچ کا قتل کیا اور کرپشن کا ساتھ دیا اس سے تو یہی ملتا ہے کہ یہ شخص نہ صرف سچ کا دشمن ہے بلکہ سچائی کا قاتل بھی ہے جنرل انور نے جسطرح پانچ سال تک آزاد کشمیر کی صدارت پر قبضہ جمائے رکھا وہ کہہ سکتا ہے کہ "Let us not speak truth one who commits this crime shell be executed" آزاد کشمیر کی اہم اور اعلیٰ شخصیات کی کرپشن، بد عنوانی، عوام دشمنی کی خبروں پر قد غند

کیوں ہے اور مظلوم صحافی ان اعلیٰ اور اہم شخصیات کا نام لینے سے کیوں گھبراتے ہیں اسکی زندہ مثال آپ کے سامنے پیش کی ہے اگر یہی انکشافات انصار عباسی، حامد میر، رؤف کلاسرا، کاشف عباسی، محمد مالک، طلعت حسین، سلیم صافی، ڈاکٹر دانش یا کوئی دوسرا پاکستانی صحافی کرتا تو حکومتی مشینری ہل جاتی اور چیف جسٹس آف سپریم کورٹ فوراً نوٹس لیتے ایک طرف پاکستان کا جسم ہے جیسے چھوٹی موٹی بیماریاں تو لگی ہیں مگر تھوڑا بہت علاج بذریعہ سچ اور صحافت ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان شہ رگ ہے جو کینسر کے مرض میں مبتلا ہے مگر اسکا علاج سچ سے نہیں بلکہ بلیک لیبل اور بلک کریکٹر سے کیا جارہا ہے۔

آزاد کشمیر میں سچ کی سزا صرف صحافیوں اور معاشرے کے عام لوگوں کو ہی نہیں بلکہ ججوں کو بھی ملتی ہے تاکہ عدل کا ترازوں اعلیٰ اور اہم شخصیات کی
کرپشن، بدعنوانی، دھونس، دھاندلی اور بد کرداری کی طرف جھکا رہے آزاد کشمیر شریعت کورٹ، ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب جسٹس غلام مفطفےٰ مغل ایک سچے، ایماندار اور قابل جج ہی نہیں بلکہ وہ خلق خدا کو انصاف فراہم کرنے اور حق سچ کا دامن تھامنے والے نجات دھندہ بھی ہیں۔ جسٹس غلام مصطفےٰ مغل کے کردار عمل سے ساری ریاست کے عوام واقف ہیں اور ان کے فیصلوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اقرباء پروری، کرپشن اور برادری ازم کے دلدل میں دھنسا ریاستی

نظام جہاں اہم اور اعلیٰ شخصیات کا لقب بد دیانت بد کردار اور بد اعمال طبقے کی نشاندہی کرے ایسے ماحول اور معاشرے میں جناب جسٹس مغل جیسے مسیحا کا وجود کیسے۔برداشت کیا جاسکتا ہے مجاورانہ حکومت کے قیام کے بعد جہاں۔برادری ازم کرپشن اور اقرباء پروری کو حکومتی پالیسی کا باقاعدہ حصہ بنایا گیا وہی عدل و انصاف اور انتظامی امور کو پانچ پیاروں کی مرضی کے مطابق چلانے کا منصوبہ بھی بنا۔ساری ریاست کے عوام و خواص ان پانچ پیاروں اور ان کی چال بازیوں سے واقف ہیں مگر دہشت کا یہ عالم ہے کہ کوئی شخص ان کا نام لینے کی ہمت نہیں کرتا انتظامیہ کو تتر بتر کرنے اور من پسند افراد کو اعلیٰ ایوانوں میں بٹھانے کا مرحلہ تمام ہوا تو مظفر آباد میں چیف جسٹس ہائی کورٹ جناب غلام مصطفےٰ مغل پر اچانک قاتلانہ حملہ ہوا جب وہ ایک ساتھی جج کے ہمراہ مظفر آباد کلب کے گراؤنڈ میں جاگنگ کر رہے تھے۔یہ گراؤنڈ بھی وہاں موجود ہوگا مگر ایک شخص نے گراؤنڈ میں داخل ہو کر جناب مغل پر گولیاں۔برسائیں اور آرام سے چلا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ قاتلوں کا منصوبہ قدرت نے ناکام بنا دیا اور جناب مغل کافی عرصہ تک زیر علاج رہنے کے بعد دوبارہ اپنے منصب پر فائز ہوگئے۔حیرت کی بات ہے کہ مجید حکومت نے اتنی بڑی شخصیت پر ہونے والے قاتلانہ حملے کو زیادہ اہمیت نہ دی اور تا حال کوئی مجرم گرفتار نہیں ہوا۔پولیس نے کاروائی

ڈالتے ہوئے کچھ لوگوں کو گرفتار کرکے تشدد کے ذریعے انھیں مجرم ثابت کرنے کی کوشش بھی کی مگر بات نہ بنی۔ وکلاء برادری بھی ایک عرصہ تک احتجاج کرتی رہی اور ہر جمعرات کو عدالتوں کا بائیکاٹ اور ہڑتال بھی ہوتی رہی مگر حکومت نے اس طرف توجہ ہی نہ دی۔ حکومت کے حامی وکیلوں اور اہم شخصیات سے اس ہڑتال کو اور وکیلوں کی جمعرات کہہ کر تمسخر اڑا دیا۔ کئی ماہ تک جاری اس احتجاج خیرات کا دن کا حکومت پر اثر نہ ہوا تو جناب جسٹس کو عوام کے وصائب کا دکھ تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ عام لوگ کاروائی رک جانے کے باعث پریشانی کا سامنا کریں۔

جہاں تک اس گھناؤنے منصوبے کا تعلق ہے تو یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کس کے گندے ذہن کی اختراج تھی اور خدانخواستہ اگر جسٹس مغل کو کچھ ہو جاتا تو کسے فائدہ پہنچتا تھا۔ اگر حکومت چاہتی تو چند روز میں ہی مجرم کو پکڑ لیتی مگر حکومت کو کسی ایسی کاروائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک جج اور جسٹس بھی سچائی کے جرم میں گولیوں کا نشانہ بن سکتا ہے تو ایسی ریاست میں ایک عام آدمی یا عام صحافی کی جان و مال، عزت آبرو کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ چیف جسٹس جناب غلام مصطفٰے مغل نے موت کو قریب سے دیکھا، دہشت گرد کی گولیوں کا پورے عزم اور حوصلے سے مقابلہ کیا اور اپنے مشن کو بھی جاری رکھا مگر اعلیٰ اور اہم شخصیات نے

عدلیہ جیسے ادارے کو بھی نہ بخشا اور ایک اہم پیغام بذریعہ بندوق دے دیا۔
آزاد کشمیر کی اہم اور اعلیٰ شخصیات کی کاروائی بھی جاری ہیں اور ہر طرف اندھیر نگری کا راج ہے مگر عدلیہ بھی یہ سطح پر ایسے لوگ موجود ہیں جو ان اندھیروں میں عوام الناس کیلئے حوصلے اور امید کی کرن اور روشنی کا باعث ہیں۔اس طرح دیگر اداروں میں بھی خداترس لوگوں کی کمی نہیں مگر جہاں.برادری کے بت خدائی کے دعویدار بنکر فرعونیت پر اتر آئیں وہاں خداترس اور عدل وانصاف کرنیوالوں کی اہمیت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

سپاہی کبھی مرتا نہیں

"Soldier Never Dies" مشہور امریکی جرنیل جنرل میکارتھر کی تصنیف ہے۔میکارتھر امیر کبیر امریکی گھرانے کا چشم وچراغ تھا مگر جوانی میں دولت اور امارت کی خواہش کی جگہ سپاہیانہ زندگی نے لے لی میکارتھر پیدائشی سپاہی تھا جس نے کوریا کی جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔میکارتھر کی کتاب "سپاہی کبھی مرتا نہیں" ایک سپاہی کی ظاہری اور باطنی زندگی کا بہترین عکاس ہے۔میکارتھر کا سپاہی پر وہ شخص ہے جو جوانی میں سپاہ گری کا پیشہ اختیار کرتا ہے تربیت حاصل کرتا ہے، یونیفارم پہنتا ہے، ایک ریگولر ڈسپلنڈ زندگی گزارتا ہے،اس کے کھانے پینے، سونے جاگنے، عبادات کرنے، مختلف مواقع پر مختلف لباس پہننے، جمالی اور فوجی مشقیں کرنے، ہتھیاروں کی سیکھلائی اور مہارت حاصل کرنے سے لیکر تفریحات اور زندگی کے دیگر اوقات مقرر ہوتے ہیں ایک مدت تک اس ماحول سے جڑے رہنے کی وجہ سے وہ ایک مخصوص طرز زندگی کا عادی ہوجاتا ہے اور پھر کبھی بھی اس زندگی سے جدائی کا تصور نہیں کرتا۔کامریڈشپ اسکی زندگی کا اہم حصہ بن جاتا ہے جسے سپاہیانہ طرز معاشرت بھی کہا جاتا ہے۔جو بھی شخص اس طرز معاشرت کا خوگر ہوتا ہے وہ چاہیئے ایک عام سپاہی ہو یاجرنیل وہ سپاہی ہی کہلاتا ہے۔سپاہی کبھی مرتا نہیں چونکہ وہ جس زندگی سے منسلک ہوتا ہے وہ ہمیشہ قائم رہتی ہے

یہ زندگی ازلی و ابدی چیز ہے جسے موت نہیں آتی۔ سپاہی ایک زندہ یا مردہ شخص کا نام نہیں۔ یہ ایک پیشے ایک طرز زندگی، ایک فن اور ایک ہنر کا نام ہے۔ کرہ ارض پر جب انسانی معاشرہ اور ریاست قائم ہوئی تو اس کی حفاظت کا ذمہ ایک سپاہی نے لیا۔ وہ غاروں کے دھانوں، گاس کی جھونپڑیوں، پتھروں کی دیواروں، چمڑے کے خیموں اور مٹی کے گروندوں، جانوروں کے باڑوں اور کھیتوں کے کناروں پر کبھی لاٹھی، کبھی کلہاڑی، کبھی تلوار، کبھی ترکش و تیر اور کبھی کنکریاں اور غلیل لیکر کھڑا ہوگیا تاکہ کھیت، گھر، غاریں اور خیمیں حملہ آور درندوں اور مخالف قبائیلوں سے محفوظ رہیں۔ قبائلی معاشرہ قائم ہوا تو قبیلے کے سارے مردوں کہ ہتھیار بند ہونا پڑا تاکہ مخالف قبیلوں کے حملوں کا مقابلہ کیا جائے۔ قبائلی معاشرے کی اگلی شکل قبائلی ریاست تھی جس کی حدود متعین کی گئی اور بہت سے قبیلوں نے باہمی اشتراک سے ایک ریاست کے قیام پر اتفاق کیا۔ ریاست کے قیام اور قبائل کے باہم اتفاق اور مل جل کر رہنے کے اتحاد کو سوشل کنٹریکٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سوشل کنٹریکٹ اور ریاست کے قیام نے ایک حکومت، حکمران، عدلیہ، قانون سازادارے کے قیام کے علاوہ ایک ایسے ادارے کے قیام کی ضرورت کو بھی اجاگر کیا جو ریاست کے افراد، ان کی جان و مال اور جغرافیائی حدود کی حفاظت کرے۔ ریاست کے ابتدائی قیام سے لیکر جدید معاشرے کی ابتداء تک فوجی ادارہ مختلف شکلوں میں رہا اور ضرورت کے مطابق اسکی شکل بدلتی رہی۔ ریاست کے قیام کے بعد بادشاہ اپنی ذاتی جائیداد، قلعے کی حفاظت

کیلئے اپنے قبیلے کے صحت مند نوجوانوں پر مشتمل ایک باقاعدہ فوج تیار کرتا اور اسے ہر لمحے تیاری کی حالت میں رکھتا۔ قلعے کی فصیلوں، برجوں اور اندرون شہر فوجی پہرہ دیتے اور گشت کرتے تاکہ شہر پناہ میں امن قائم رہے۔ قلعے کے اندر شاہی محلات کی حفاظت کیلئے الگ دستے متعین کیے جاتے اور اکثر اوقات ایک خفیہ راستے یا سرنگ کے ذریعے محل سے فرار کا راستہ بھی بنایا جاتا تاکہ ہنگامی حالت میں شاہی خاندان اور خزانے کو کسی دوسری جگہ منتقل کیا جائے۔ باقاعدہ فوج جو مختصر دستوں پر مشتمل ہوتی کا سپہ سالار بادشاہ کا ولی عہد یا کوئی شہزادہ ہوتا جبکہ چھوٹے کمانڈروں اور سپاہیوں کا چناؤ بڑی احتیاط سے کیا جاتا۔ یہ فوج ایک طرح سے خاندانی فوج ہوتی جس کے کمانڈروں اور سپاہیوں کی موت، بیماری یا عمر کی زیادتی کے بعد اس کا بھائی یا بیٹا باپ کی جگہ لیا۔ ریاست پر حملے یا کسی دوسری ریاست کے خلاف جنگ کی صورت میں ہر قبیلہ مال غنیمت اور لوٹ مار کے لالچ میں اپنے قبیلے کے جوانوں پر مشتمل دستے بادشاہ کے حکم پر میدان جنگ میں لاتا۔ فتح کی صورت میں دشمن ریاست کا مال اور اسباب لوٹ لیا جاتا، عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جاتا اور مردوں کو تہہ تیغ کر دیا جاتا۔ مال و دولت اور عورتوں کی ہوس میں بڑے بڑے لشکر جمع ہوتے اور جن علاقوں سے گزرتے وہاں کھیت کھلیان سے لیکر مال مویشی تک تباہ کر دیتے۔ ان لشکروں کے کھانے پینے کا کوئی انتظام نہ ہوتا اور نہ ہی انھیں تنخواہ یا پنشن ملتی۔ اکثر لشکر بھوک اور بیماری کا شکار بھی ہو جاتے اور

لمبی مسافت کی وجہ سے کم لوگ ہی واپس لوٹتے۔شاہی دستے جنھیں شہر پناہ، قلعے، خزانے اور شاہی محلات کیلئے متعین کیا جاتا انھیں تنخواہ، راشن، رہائش، لباس اور دیگر مراعات بھی ملتیں اور یہ دستے باقاعدہ جنگ میں شریک نہ ہوتے۔سکندر اعظم، ہنی بال، ہلاکو سے لیکر مغلیہ عہد تک فوج کی ترتیب و تنظیم انھیں خطوط پر استوار رہی۔

باقاعدہ فوج، اس کی تربیت، جوانوں کا چناؤ اور دیگر مراحات کا سلسلہ یونانی ریاستوں کے قیام سے شروع ہوا جب سپارٹر میں ایک ملٹری اکیڈمی کا قیام وجود میں آیا جہاں کم عمر بچوں کو عسکری تربیت دی جاتی۔یونانی ریاستیں شہری ریاستیں تھیں جن کی آبادی کم اور رقبہ مختصر تھا۔مقدونیہ کا سکندر جب عالمی فتوحات کیلئے نکلا تو اسے مروجہ عسکری نظام سے ہٹ کر لام بندی کا ہی سہارا لینا پڑا۔سکندر نے افریقہ اور ایشیائے کوچک کی فتوحات کے بعد مفتوعہ ریاستوں کے قبائل کو بھی ساتھ ملایا اور ان ہی کے قبیلوں کے کمانڈر بھی مقرر کیئے تاکہ قبائلی عصبیت برقرار رہے اور مختلف ممالک کے قبیلے ایک دوسرے پر برتری کا رعب جمانے اور جرات، بہادری کی نئی تاریخ رقم کرنے کے لالچ میں بڑھ چڑھ کر دشمن کا مقابلہ کریں۔یہی وجہ تھی کہ اربیلہ کی جنگ میں تین لاکھ ایرانی دارا کی دلیرانہ قیادت کے باوجود پچاس ہزار یونانیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

جنگوں میں لوٹ مار کا عنصر ہمیشہ سے غالب رہا اور قبائل اسی ہوس و لالچ کے تحت خونخوار جنگجوؤں کو میدان کارزار میں جھونکتے رہے وحشی قبائل کی جنگیں ہوں یا ہوس ملک گیری کے تمنائی بادشاہوں کی یلغاریں۔ دفاعی جنگیں ہوں یا پڑوسی ریاستوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انھیں مغلوب کرنے کا بہانہ جنگ کی جو بھی شکل رہی ہو اس میں قبائلی عصبیت کا عنصر ہمیشہ سے ہی غالب رہا ہے۔ قبائل اپنے جری بہادروں اور میدان جنگ کے ہیروز کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے جبکہ قبائلی نوجوان ان فاتحین یا پھر میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے جان دینے والوں کو اپنا آئیڈیل تصور کرتے اور ان کی تقلید میں میدان جنگ میں جانے کے خواہش مند رہتے۔ شاعران کی بہادری کو اپنے اشعار کے ذریعے اور قلمکار قصے کہانیوں کی صورت میں انھیں خراج عقیدت پیش کرتے۔ میدان جنگ میں اترنے سے پہلے ان بہادروں کے کارنامے دھرائے جاتے اور سپاہی ان کے نام کی قسمیں کھا کر میدان میں آتے یہی نہیں بلکہ ان کی تلواروں۔ نیزوں اور گھوڑوں کی تعریف بھی کی جاتی اور انھیں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا۔ لوک داستانوں کے ہیرو مرزا کی ''بکی'' اور 1857ء کی جنگ آزادی کے ہیرو رائے احمد خان کھرل کی ''نیلی'' پنجاب کی لوک داستانوں کا اہم حصہ ہیں۔ حضرت علیؓ کی ذوالفقار، حضرت خالد بن ولیدؓ کی سیف اسلامی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہیں۔

باقاعدہ فوج اور رجمنٹیشن کی ایک جھلک ریاست مدینہ کے قیام کے فوراً بعد سامنے آئی جب حضور ﷺ نے مدینہ میں مردم شماری کا حکم دیا۔ حضور ﷺ نے مدینہ کے مسلمانوں کے نام لکھنے کا حکم دیا تو ابتدائی دور میں مدینہ کے مسلمانوں کی کل تعداد پندرہ سو تھی جس میں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے شامل تھے۔آپ ﷺ کے حکم کے مطابق ہر کٹیگری کے الگ نام رکھے گئے تاکہ آئندہ کی منصوبہ بندی میں ان سے کام لیا جائے۔ حضور ﷺ کا یہ فیصلہ اپنی نوعیت کا انوکھا اور منفرد فیصلہ ہے۔تاریخ میں اس سے پہلے مردم شماری کرانے کا کوئی واقع نظر نہیں آتا آپ ﷺ نے اس امر کی کوئی تشریح نہیں فرمائی مگر بظاہر اس چھوٹے سے واقع سے بہت سبق اخذ ہوتے ہیں۔اول ایک حکمران کو اس کی مملکت کے افراد کا علم ہونا چاہیئے کہ ریاست میں بسنے والے افراد کی عمریں کیا ہیں عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے اور جوان کتنے ہیں۔ان کی معاشی حالت کیا ہے کتنے لوگ ملکی دفاع کیلئے موزوں اور میسر ہیں اور کہاں کہاں رہائش پذیر ہیں ان کی صحت کیسی ہے کتنے لوگ بیروزگار ہیں کتنے ہنر مند ہیں اور تعلیم یافتہ ہیں۔اس کے علاوہ مردم شماری سے ایک حکومت اور حکمران کو بیشمار معلومات حاصل ہوتی ہیں۔حکومت اور حکمران کو جب یہ ساری معلومات حاصل ہوں تو وہ عوام پر ان کی آمدنی کے مطابق ٹیکس لگاتا ہے۔ زکوۃ وعشر وصول کرتا ہے اور پھر اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے عوام کی فلاح و بہبود اور ملکی دفاع کیلئے مخصوص رقم قومی خزانے میں جمع رکھتا ہے۔ موجودہ دور میں ہم اسے ٹیکس اور بجٹ کا نظام کہتے ہیں جسکی بنیاد

مردم شماری سے ہی رکھی جا سکتی ہے۔

مردم شماری کے بعد اسلامی فوج سپہ سالار کا عہدہ بھی آپ ﷺ اپنے پاس ہی رکھا۔ غزوات اور سریات کے مواقع پر آپ ﷺ خود جوانوں کا چناؤ کرتے اور اس بات کا بھی فیصلہ کرتے کہ کسے میمنہ میں رہنا ہے اور کون میسرہ میں خدمات سرانجام دیگا۔ مختلف قبیلوں کے دستوں کی کمان آپ ﷺ ان ہی قبائل کے سرداروں یا نامور بہادروں کے سپرد کرتے۔ آپ ﷺ فوج کی تیاری کے سلسلے میں مدینہ میں فوجی مشقوں کا بھی انتظام کرتے جس میں گھڑ دوڑ، تیر اندازی، تلوار زنی، نیزہ بازی، کشتی اور دوڑوں کے مقابلے ہوتے۔ آپ ﷺ ان مقابلوں کی صدارت فرماتے اور اول، دوئم اور سوئم آنیوالوں کو کھجوریں، دنبے، گھوڑے یا پھر نقد انعامات دیتے۔ آپ ﷺ کے اس عمل کا مفصل ذکر جناب ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے خطابات بھاولپور میں کیا ہے جسے پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے کچھ نوجوانوں کا باقاعدہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا اور انھیں ہر وقت جنگ کیلئے تیار رہنے اور تربیت حاصل کرنے کا حکم تھا۔

خلیفہ دوئم حضرت عمرؓ کے دور میں افریقہ سے ایران، مکران اور دوسری جانب خراسان سے چینی سرحدوں تک اسلامی ریاست پھیل چکی تھی۔ اتنی بڑی ریاست کے دفاع کیلئے ضروری تھا کہ ایک باقاعدہ فوج رکھی جائے جسکے اخراجات سرکاری

خزانے سے ادا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے سوشل ریفارمز کی نئی اصلاحات متعارف کروائیں اور ٹیکس کا ایسا نظام وضع کیا جو آج بھی مغربی ممالک میں کسی نہ کسی صورت میں نافذ العمل ہے۔ آپؓ کے ٹیکسیشن اور ویلفیئر سسٹم کے بنیادی اصول یہ تھے کہ صوبے کے گورنر کو ہر شخص کے مالی حالات کا علم ہو اور ہر شخص کو روزگار کے مواقع میسر ہوں۔ نظام عدل کی بنیاد خود حضور ﷺ نے رکھی اور مختلف علاقوں میں قاضی مقرر کیئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے تک کوفہ میں جوڈیشل اکیڈمی کا قیام بھی ہو چکا تھا جہاں فقہ و اصول فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس جگہ کو مزید ترقی دی اور وہاں اسلامی قوانین کی تعلیم کو پہلی درسگاہ کے علاوہ ایک مسجد اور چھاؤنی بھی قائم کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس درسگاہ کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بعد ان کے شاگرد حضرت علقمۃ النخعیؒ جو عرب النسل تھے اور ان کے بعد حضرت حماد بن ابی سلیمانؒ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ جو دونوں ایرانی النسل تھے اس اکیڈمی کے انچارج یا ہیڈ مقرر ہوئے۔

اسلامی فوج کے قیام کے ساتھ قوانین کی ترویج کا ذکر اسلیئے ضروری ہے کہ اسلام کی آمد کیساتھ جس پر پہلے کوئی قانونی گرفت نہ تھی کو تحت ضابطہ لایا گیا تاکہ ریاست کا کوئی عنصر اور حکومت کا کوئی ادارہ من مانی نہ کرے۔ اسلام سے پہلے یا بعد میں غیر اسلامی فوجوں پر قانون کی گرفت نہ تھی۔ ریاست

یا حکومت اعلان جنگ کرتی تو سرکاری افواج جن کی تعداد کم ہوتی کی مدد کیلئے قبائلی لشکر لوٹ مار کے لالچ میں اپنے اپنے قبائلی سرداروں کی کمان میں جنگ کیلئے آتے اور بستیاں اور شہر تباہ کرکے سب کچھ برباد کردیتے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فوجی چھاؤنیاں قائم ہوئیں فوجیوں کے عہدے مقرر ہوئے اور انھیں سرکاری خزانے سے تنخواہیں اور دیگر مراعات ملنے لگیں۔ حضورﷺ کے زمانے سے ہی فوجی قوانین وضع ہوئے اور ہر دستے کا کمانڈر مقرر کیا جانے لگا فوج کوچ سے پہلے اپنا سامان رسد ساتھ لے جاتی اور جن آبادیوں سے گزرتی وہاں کے مکینوں سے بغیر معاوضے کے کچھ نہ لیتی۔ فوج کوچ کے دوران آبادیوں سے دور پانی کے چشموں یا پھر کنوؤں کے قریب قیام کرتی تاکہ فوج کی اپنی سیکورٹی اور مشن کی سکریسی برقرار رہے۔ فتح کے بعد شہروں اور بستیوں کو آگ لگانے، لوگوں کا مال و اسباب چھیننے اور قتل عام کی ممانعت تھی۔ شاہی خزانے اور سرکاری املاک کو بیت المال میں جمع کیا جاتا اور شاہی محلات کی کنیزوں اور غلاموں سمیت میدان جنگ میں ہاتھ آنیوالے دشمنوں کی بیویوں اور بچوں کو فوجی تحویل میں لیا جاتا۔ غلاموں اور کنیزوں کے حقوق کا تعین ہوا تو یہ رسم بھی دم توڑ گئی۔ باقائدہ فوج اور قوانین کے اطلاق کیساتھ ساتھ فوجی روایات بھی پروان چڑھیں جس نے فوج کو ایک قبیلے یا برادری کی شکل دے دی۔ قبائلی دور سے ہی ایک گھرانے کے متعدد افراد فوجی خدمات کیلیے آتے اور میدان جنگ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جنگی جوہر دکھلاتے۔ حالات کے ساتھ جنگ کا اعلان ہوا حضرت

داؤدؒ کے والد اپنے نو بیٹوں سمیت جنگ کیلئے آئے۔ میدان بدر میں دو کم سن بھائیوں نے ابو جہل کو قتل کیا۔ غزوۂ رسول ﷺ کی تاریخ لکھی جائے تو آپ ﷺ کے سب سے قریبی اور خونی رشتے سے منسلک سبھی مرد میدان جنگ میں اترتے۔ حضرت علیؓ بیماری کی وجہ سے خیبر کے معرکے میں تاخیر سے پہنچے خیبر کے علاوہ آپؓ ہر معرکے میں پیش پیش رہے مگر قربت رسول ﷺ کے باوجود آپؓ ہمیشہ ایک سپائی کی حیثیت سے لڑے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ اور حضرت حمزہؓ سمیت حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ آپ ﷺ کے مقرر کردہ کمانڈروں اور سپہ سالاروں کی ماتحتی میں لڑتے رہے۔ در حقیقت میرا مضمون افواج پاکستان کی وطن سے محبت اور قربانیاں تھا مگر سپاہی کی ابتداء کا تذکرہ اس لیے ضروری سمجھا کہ قارئین کو اپنے ناقص علم کے مطابق یہ بتا سکوں کہ اس معتبر پیشے کی ابتدا بھی دین اسلام اور میرے اور آپ کے پیارے نبی آخر الزماں ﷺ نے کی۔ لہٰذا ہمیں اپنی سرحدوں کے محافظوں کی عزت و ناموس کو ہر حال میں ملحوظ خاطر رکھنا ہے۔

عوام اور فوج کا رشتہ

فوج میں رجمنٹیشن سے بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں۔فوجی آفیسر ہو یا جوان وہ اسی رشتے سے منسلک ایسی ایسی تکالیف برداشت کرلیتا ہے جو عام زندگی میں ممکن نہیں اگر ہم ایک کیڈٹ کی زندگی کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ایک سویلین جسکی عمر اٹھارہ سال ہوتی ہے کسطرح ایک نئے ماحول،نئے رشتے،نئے معاشرے اور قبیلے سے منسلک ہوجاتا ہے۔پاکستان ملٹری اکیڈمی میں آمد کیساتھ ہی ایک جنرل،ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم وچراغ سے لیکر ایک سپاہی،عام دیہاتی اور کسان کے بیٹے کو ایک ہی نظر سے دیکھا جاتا ہے کیڈٹ کالج،ایچ ای سین،امریکن اور گرامر سکولوں سے لیکر ببی،سکردہ،کوہلو،دکی،آواران،مکران،خاران،سندھ کے دیہاتوں اور گوٹھوں کے سکولوں سے پڑھے کیڈٹ کو جنٹلمین کا نام دیا جاتا ہے۔کاکول آمد پر کسی کی
برادری،قبیلہ،دولت،سٹیٹس نہیں پوچھا جاتا اور سب کو اپنا سامان اٹھا کر اپنے کمروں میں لیجانا پڑتا ہے۔ایک جیسا ماحول،ایک جیسی تربیت اور دوران تربیت ایک جیسی مشکلات کا سامنا ان نوجوان افسروں میں ایک نیا جذبہ ایک نیا رشتہ اور تعلق پیدا کرتا ہے جو زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہتا ہے۔ایسا ماحول جوانوں کو بھی میسر آتا ہے جو چند سالوں میں نہیں بلکہ دو سے تین دیہائیوں پر محیط ہوتا

ہے۔ میدان اپنے افسروں اور ساتھیوں کے ہمراہ نہ صرف زندگی کا بہترین حصہ گزارتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکالیف میں معاون و مددگار بھی ہوتے ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ ایک شخص کی اوسط زندگی ساٹھ سال ہے جس میں پرائم لائف کے پہلے تیس سال وہ ایک ڈسپلن اور ضابطے کے تحت گزارتا ہے۔اس ڈسپلنڈ لائف میں اسکے کھانے، پینے، سونے، جاگنے، ایکسر سائز کرنے سے لیکر دشمن کیخلاف نبرد آزما ہونے کے اوقات کار مقرر ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کمانڈروں کے ہمراہ کبھی شمالی علاقوں اور کشمیر میں منفی پچاس ڈگری کے منجمند اوقات میں برف کے مورچے (ایگلو) میں بیٹھ کر ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے اور کبھی اسی موسم میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ برف پوش پہاڑوں پر گشت کرتا ہے تاکہ دشمن رات کے اندھیرے میں مقدس سرزمین پر اپنا ناپاک قدم نہ رکھے۔ان مشکل ترین برفانی علاقوں سے وہ اپنے ان ہی ساتھیوں کے ہمراہ تپتے صحراؤں میں چلا جاتا ہے اور ریت کے طوفانوں کا ہی نہیں بلکہ دشمن کا بھی مقابلہ کرتا ہے وہ اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں سے سینکڑوں میل دور وطن کی حفاظت کرتا ہے تاکہ اہل وطن کی آزادی اور عزت پر آنچ نہ آئے۔ وہ ایک عام مزدور جتنی تنخواہ لیتا ہے مگر شکوہ نہیں کرتا ایک سیاستدان جو ایئر کنڈیشنڈ ماحول کا عادی ہے او اپنے آپ کو جدی پشتی مسلم لیگی کہتا ہے اسمبلی میں کھڑے ہو کر جنت ارضی مادر وطن کے محافظ کو گالیاں دیتا ہے تو 343 سیاستدان تالیاں بجا کر اسے داد دیتے ہیں۔

رانا ثناء اللہ نجی ٹیلیوژن چینل پر ایئر مارشل (ر) شاہد لطیف سے پوچھتے ہیں کہ آپ کس کی نمائندگی کرتے ہو؟ رانا صاحب فیصل آباد کے ہیں اس لیے جگت بازی ان کی گفتگو کا حصہ ہوتی ہی، رانا صاحب ریٹائرڈ فوجی کو شرمندہ کرنے کا پروگرام بنا کر آئے تھے۔ شاہد لطیف کہتے ہیں کہ نہ میں فوج کا نمائندہ ہوں اور نہ ہی ریٹائرڈ فوجیوں کا۔۔! میں کہتا ہوں کہ ایئر مارشل نے سراسر غلط کہا اور جگت بازی کا جواب موثر انداز میں نہ دیا ایئر مارشل ہو یا جنرل یا ایڈمرل سپاہی ہو یا سیلر یا پھر ایئر مین وہ سروس میں ہو یا ریٹائرڈ وہ ہر حال میں فوج کا نمائندہ ہے وہ زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی فوج کا نمائندہ ہے فوجی نہ ریٹائرڈ ہوتا ہے اور نہ ہی مرتا ہے۔اسکے کارنامے اور کردار زندہ رہتے ہیں تل پترا، سبونہ، بی آر بی کا کنارہ، ہلی کا محاذ، چھور کا صحرا، بڈھا کھنہ کا پہاڑ، کارگل اور چونڈہ کا محاذ جب تک ہیں شہیدوں کی روحیں ان کی محافظ رہینگی۔ امن کی آشا، سیفما کے چمچے، بھارت سے تجارت اور بھارتیوں سے عشق سرگودھا کی فضاؤں سے ایم ایم عالم کے طیارے کی گونج ختم نہیں کر سکتے۔ جسطرح پرندے ایک دوسرے کی بولیاں سمجھ لیتے ہیں اسی طرح ایم ایم عالم کے طیارے کی گونج پاک فضائیہ کے ہر طیارے کی روح ہے۔ایسا ہی کوئی طیارہ کبھی شاہد لطیف اور ایاز چوہدری نے بھی اڑایا ہوگا جس میں ایم ایم عالم اور راشد منہاس کے طیارے کی گونج سنائی دیتی ہوگی۔ شاہد لطیف اور ایاز چوہدری اسی طیارے کی وجہ سے ایئر مارشل بنے تو پھر شرمندگی کیا ہے اور وہ

بھی رانا ثناء اللہ کے سامنے جو خواجگان کا ہم زبان ہے وزیر اعظم پاکستان اور رانا ثناء اللہ کے قائد کو توفیق نہیں ہوتی کہ وہ فوج کو گالیاں دینے والوں کا منہ بند کرتے اور نہ ہی سپریم کمانڈر اور صدر پاکستان جناب ممنون حسین کو خواجہ آصف کی تقاریر سنائی دیں تو پھر فوج کی نمائندگی ہر فوجی کا حق ہے ہر ریٹائرڈ فوجی پر فرض ہے کہ وہ بدزبان اور بدکلام صحافیوں اور سیاستدانوں کے خلاف اپنی آواز بلند کریں تاکہ باوردی فوجی جوان سیاہ سیاست اور گندی صحافت پر توجہ دیے بغیر دیکھے اور ان دیکھے دشمن کا پورے جوش اور جذبے سے مقابلہ کریں ہر ریٹائرڈ فوجی کا فرض ہے کہ وہ خود اور اپنے خاندان کے ہمراہ اپنے علم،اپنے قلم اور زبان کے ذریعے دشمن کے ایجنٹوں اور فوج کا حوصلہ پست کرنیوالوں کے خلاف جہاد کرے۔اس جہاد کی بنیاد تدبر،شائستگی اور شرافت ہو اور ساری قوم انکا ساتھ دے۔فوج ملک اور قوم کی توہین کرنیوالے چینلوں اور اخباروں کا بائیکاٹ کرے۔فوج کے حق میں سیمینار اور میٹنگیں منعقد کریں اور ہیروز کے کارناموں سے معاشرے کے ہر شخص کو باخبر کریں۔گندی اور بیہودہ زبان اور جگت بازی کا دلیری سے جواب دیں تاکہ سیاست کے مداری اور صحافت کے کھلاڑی اپنی زبانیں بند کرنے پر مجبور ہوجائیں۔

پچھلے برس مئی کے مہینے میں مجھے وادی لیپا جانے کا اتفاق ہوا تو دوران سفر بھمبر،میرپور اور جہلم کے کچھ جوانوں سے ملاقات ہوئی دوران سفر بات

چیت سے پتہ چلا کہ یہ سب فوجی جوان ہیں اور چھٹی لیکر لیبیا جارہے ہیں رانا ثناء اللہ صاحب آپ کو پتہ ہے کہ لیبیا کہاں ہے؟ اور جہلم سے کتنا دور ہے ؟ نہیں ---! آپ کو پتہ نہیں ہوگا چونکہ آپکا سارا علم پنجاب کی سیاست اور آپکا پاکستان فیصل آباد سے لاہور اور جاتی عمرہ کے جاگیر تک محدود ہے آپکی پارٹی میں جنرل قادر بلوچ بھی ہیں اور سرحدوں کے وزیر ہیں آپ ان سے لیبیا کے مطلق پوچھ سکتے ہیں اب ذرا ان جوانوں کا احوال سنئے یہ نوجوان فوجی لبیا میں ان جگہوں پر تھوڑی دیر کیلئے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھنے جارہے تھے جہاں ان کے والدین نے جام شہادت نوش کیا تھا وزیر اطلاعات اور وزیر اعظم کے نمائندہ خاص فرماتے ہیں کہ انھیں میڈیا سے عشق ہے اور فوج انکا ایمان ہے حضور عشق اور ایمان ایک ہی چیز ہے ایمان جب عشق کی منزل پر پہنچتا ہے تو عاشق بندہ مومن بن جاتا ہے بقول اقبالؒ اسی بندہ مومن سے خدا پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ بتوں سے عشق خدا پر ایمان، یہ کونسا دین ہے اکبر کے دین الہی میں بھی اسکا ذکر نہیں اور نہ ہی مولانا رومؒ نے کسی ایسے عشق کا ذکر کیا ہے جسکی بنیاد دھوکہ دہی اور عاشقان وطن کی توھین ہو۔جب مسلمان مومن کا ایمان پختہ اور یقین کامل ہو تو وہ سیفما کی محفلوں میں بیٹھ کر امن کی آشا کے گیت نہیں گاتا اور نہ ہی ملت کے محافظوں کی تذلیل پر زیر لب مسکراتا ہے اور سات روز کی خاموشی اختیار کرتا ہے۔

فوجی کیسے ریٹائرڈ ہو کر لا تعلق ہو سکتا ہے البتہ جنرل قادر بلوچ، جنرل ترمذی، جنرل عبدالقیوم اور درجن بھر فوجی ایسے ہیں جو واقعی ریٹائیرڈ ہیں اور فوج کی نمائندگی سے دستبردار ہو چکے ہیں شاید ان پر امن کی آشا اور سیفما کے بھوت کا اثر ہے پھر میاں صاحب اور خواجہ صاحبان کے عشق نے انھیں ریٹائرڈ کر دیا ہے ایک فوجی کیلئے نواز لیگ میں رہ کر فوج پر زہر آلود تیر برسانے والوں کے ساتھ رہنا بڑی ہمت اور حوصلے کی بات ہے کیا خواجہ آصف کی تقریر ان فوجی جرنیلوں کو کوئی پیغام نہ دے سکی یا پھر وہ سمجھ نہیں سکے یہ سب سمجھ سے باہر ہے رانا صاحب کیلئے اطلاع ہے کہ اولاد بڑھاپے کی لاٹھی اور والدین کا سہار تصور کی جاتی ہے قرآن مجید میں ذکر ہے کہ ’’ہم تمہیں بیٹے اور مال دیکر تمہارا امتحان لینگے‘‘ میرے گاؤں کے ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد فوج میں رہا ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی یونٹ میں اپنا بیٹا یا بھائی چھوڑ آیا ہے یہ رسم صدیوں سے جاری ہے اور آج بھی پاک فوج کی ہر یونٹ اور رجمنٹ میں ایسے جوان اور آفیسر ہیں جو کلیم پر ان یونٹوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں حیرت کی بات ہے کہ کوئی سیاستدان اپنا بیٹا فوج میں نہیں بھیجتا مگر فوج پر تنقید کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتا۔ ترقی اور جمہوریت غلامی اور باجگزاری میں ممکن نہیں جمہوریت پر امن معاشرے میں ہی پروان چڑھتی ہے اور ترقی سرمایہ دارانہ استحصال کا نام نہیں اٹھارہ کروڑ پاکستانی حمزہ شہباز، مونس الٰہی اور بلاول زرداری کے مستقبل سے جڑے ہوئے ہیں مقدس

پارلیمنٹرین قوم کے مقدر کے دیوتا ہیں۔ سندھ کی مقدس ہستیوں نے حفاظتی بند توڑ کر اپنے فارم بچائے اور سندھی عوام کو سیلاب کی نظر کر دیا پنجاب میں سستی روٹی کا چکر چلا کر گندم افغانستان سمگل کر دی دانش سکولوں پر اربوں روپے خرچ کیئے پہلے سے موجود سکولوں کو بھینسوں کے باڑوں میں بدل دیا گیا پرویز الہی نے اپنی انتخابی مہم پڑھا لکھا پنجاب کے نعرے پر چلائی کتابوں کی جلدوں پر اپنی تصاویر سجائیں مگر الیکشن میں منہ کی کھانی پڑی۔ شہباز شریف نے سلیبس ہی بدل دیا اور نئے قومی ہیروز متعارف کروائے۔ جمہوریت کی بحالی عوام کی خوشحالی ہمارے سیاستدانوں کی اولین ترجیح ہے جسکا انجام بد حالی پر ہوتا ہے جمہوریت کا مطلب بانٹ کا کھانا اور پچھلے کھائے پیئے کو قانونی شکل دینا ہے پاکستانی جمہوریت منافع بخش بزنس ہے اور سارے بزنس مین اسمبلیوں میں بیٹھ کر بڑے بڑے سودے طے کرتے ہیں۔ پاکستان میں جمہوریت کی طرح ہر محکمہ موجود ہے مگر حکومت اور عوام کو کسی محکمے پر اعتبار نہیں فوج واحد محکمہ ہے جو حکمرانوں، سیاستدانوں اور شترے مہار میڈیا والوں کو پسند نہیں مگر سب کو اسی پر اعتبار ہے سیاستدانوں نے اربوں روپے لوٹے اور تعلیم عام کرنے کے بہانے گھوسٹ سکول قائم کر دیئے باغات کے گرد اونچی دیواریں کھڑی کی اور اندر محل نما ڈیرہ اور عیاشی کا اڈہ قائم کر لئے گھر سے پکی سڑک ڈیرے تک لے گئے اور میلوں پر پھیلی باغات کی حفاظی دیوار کے عالیشان گیٹ پر ماڈل ہائی سکول کا بورڈ لگا دیا گھوسٹ استاد بھرتی کیئے اور ماہانہ لاکھوں

روپیہ استادوں کی تنخواہوں کی مد میں وصول کرنے لگے اسی طرح صحت کے مراکز قائم کیئے اور اپنے گھوڑے،گائیں اور بھینیس ان مراکز میں رکھ لیں۔واپڈا،ریلوے،پی آئی اے اور سٹیل مل میں سیاسی بھرتیوں کا طوفان برپا کیا اور ان اداروں کو تباہ کرکے اربوں کھا لئے۔کرپشن،بد دیانتی،اقربا پروری اور عیاری کی حد بڑھ گئی تو سب نے یک زبان ہو کر کہا فوج کو بلاؤ فوج کو بلاؤ کراچی کا امن بحال کرے فوج کو بلاؤ سوات پر قبضہ ہوگیا ہے فوج کو بلاؤ واپڈا کا برا حال ہوگیا ہے فوج کو بلاؤ گھوسٹ سکولوں اور استادوں کا سراغ لگائے۔فوج کو بلاؤ زلزلہ زدگان کی مدد کرے،فوج کو بلاؤ سیلاب زدگان کو بچائے،فوج کہاں ہے؟فوجی جوان کہاں ہیں؟فوج کو بلاؤ مردم شماری کرے،فوج کو بلاؤ الیکشن کروائے۔ملک کے اٹھارہ کروڑ عوام چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں میرے وطن کی فوج کہاں ہے؟سنا ہے وہاں ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں ہمارا کوئی علاج کر دے،ہمیں اصل دوا دے،جعلی ڈاکٹروں اور نقلی دواؤں سے کوئی ہمیں بچائے۔ہمیں ڈاکٹروں پر اعتبار نہیں،ہمیں پولیس پر اعتبار نہیں،عدالتیں انصاف نہیں دیتیں،وکیل بھاری فیس مانگتے ہیں،ریٹائرڈ اور نامور وکیل عوام کے حق میں بیان دیتے ہیں انصاف نہیں دلاتے،ہمیں الیکشن کمیشن پر اعتبار نہیں ووٹ کسی کو دیتے ہیں جیت کوئی جاتا ہے فوج کو بلاؤ امن قائم کرے فوج کہاں ہے؟اٹھارہ کروڑ پاکستانیوں کی مسیحا فوج،محافظ فوج،قابل اعتبار فوج،جعلسازی اور کرپشن کے نام سے ناواقف فوجی جوان،میرے وطن کا ڈھول سپاہی،جراتوں کا نشان،عظمت کی

پہچان، سرحدوں کا محافظ، سرفروش و سربکف جیالا اور جی دار جوان، شہادت کا خواہش مند، ہر لمحے سربلند، عزتوں کا رکھوالا، ماں کا لاڈلہ، جوانمرد جیالا۔ ان تمام رشتوں کے بعد عوام کے دلوں میں فوج کے خلاف نفرت ڈالنے کی ہر کوشش نہ صرف ناکام بلکہ عوام اور فوج کو مزید پاس لانے کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا حکومت اور اس کے چیلے چمچے اس خام خیالی سے خود کو نکال کر اپنے محافظوں کی عزت و تقریم کو یقینی بنا کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔

افواج پاکستان اور سیاستدانوں کی قربانیوں کا فرق

امن کی آشا اور سیفما کے پرستاروں، ترقی اور جمہوریت کے علمبرداروں، ٹیکس چوروں اور قرضہ خوروں، بھارتی چاپلوسوں کے مہروں اور ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے ناسوروں کو پتہ نہیں فوج اور عوام کا کیا رشتہ ہے اس ملک کا ہر غریب فوج کا نمائندہ ہے اس ملک کا ہر ذی الشعور فوج کا ترجمان ہے۔ عوام کو صرف فوج پر اعتبار ہے اور فوج ہر لمحے عوام کی مددگار ہے رانا صاحب نے سیاسی جگت بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایئر مارشل شاہد لطیف سے پوچھا کہ کیا آپ فوج کے ترجمان ہیں رانا صاحب خواجہ صاحبان اور امن کی آشا کے نام پر ملک کو بدامنی میں دھکیلنے والوں کے ترجمان جناب پرویز رشید کسی دن کسی فوجی جوان سے پوچھیں تو وہ کہے گا ہاں میں فوج کا ترجمان ہوں، میرا باپ اور دادا بھی ترجمان تھے اور میرا بیٹا بھی ترجمان ہوگا۔ وہ کسی مزدور کسان اور محنت کش سے پوچھیں تو وہ بھی کہے گا کہ ہاں میں فوج کا ترجمان ہوں مجھے پولیس، پٹواری، ڈپٹی کمشنر، ایس پی، ڈی آئی جی، سیکرٹری، سینیٹر، ایم این اے، ایم پی اے، وزیر، مشیر، وکیل، جج، گورنر، وزیر اعظم حتیٰ کہ صدر پاکستان پر بھی اعتبار نہیں مگر مجھے سرحد پر کھڑے سپاہی پر اعتبار ہے جرائم کے اڈے اور تربیت گاہیں، جیلیں اور تھانے ہیں۔ پولیس جرائم

پیشہ لوگوں کی محافظ اور عوام کی دشمن ہے کچہریوں میں جتنے مقدمات ہیں سب پٹواریوں اور تھانیداروں کی وجہ سے ہیں جنھیں سیاستدانوں، قبضہ گروپوں، سمگلروں اور دہشت گردوں کی حمایت حاصل ہے وکیل سیاسی جماعتوں سے وابستہ ہیں اور ججوں کی تعیناتی میرٹ، قابلیت اور اعلیٰ درجے کی ایمانداری پر نہیں بلکہ سیاستدانوں اور حکمرانوں کی مرضی پر ہوتی ہے۔ جج کے خلاف بات کرنا جرم ہے اور عدالت کی توہین ہے فوج کے خلاف بات کرنا آزادی اظہار رائے ہے؟ آزاد میڈیا، آزاد عدلیہ، مقدس پارلیمنٹ اور باعزت و باوقار پارلیمنٹرین کے سامنے بے یارومددگار فوج اور بے بس وبے کس عوام۔ آزاد میڈیا حکومت کی شان اور حکومت میڈیا کی ترجمان، فوج ملک وقوم کی محافظ اور عزت و وقار کی پہچان، گلی کا عام آدمی فوج کا ترجمان جواب دیگا کہ اسمبلی کے ہر ممبر اور سیاستدان کے پاس دوسرے ممبر اور سیاستدان کے گناہوں کے ثبوت ہیں صدور اور وزرائے اعظم پر کرپشن کے الزامات ہیں عدالتوں کے پاس ثبوت بھی ہیں پر سب لوگ امیر کبیر ہیں ان کے اثاثے بیرون ملک ہیں اور کمائی کے ذرائع پاکستان میں ہیں ان کی ٹکٹ، پاسپورٹ، جہاز ہر لمحے تیار ہیں جبکہ فوج کا سپاہی ان سب آلائشوں سے پاک ملک و قوم کی حفاظت پر معمور کسی صلے یا لالچ سے کوسوں دور دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار ہے جمہوریت، ترقی اور امن حفاظت کے بغیر ممکن نہیں جناب پرویز رشید کی دلیل میں غلیل اور رانا صاحب کی جگت میں دلیل ہے چونکہ جس کام کی ابتداء خواجگان نے کی تھی اسکی انتہا میڈیا ہاؤس نے کی

ہے سیفما اور امن کی آشا ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور یہ سکہ چانکیائی چالوں کی مثال ہے جناب پرویز رشید کو پتہ ہوگا کہ حضرت داؤدؑ کے پاس غلیل اور جالوت کے پاس دلیل تھی دلیل دانشور کا اثاثہ ہے جاہل کا ہتھیار نہیں جاہل کی دلیل بے جان اور بے وزن ہوتی ہے اسلام کا ابدی پیغام آیا تو یہود و نصاریٰ نے من گھڑت دلیلوں کے انبار لگا دیئے اور کفر و شرک کی حمایت میں یکجہتی کا مظاہرہ کیا خدا کا فرمان ہے کہ یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کے دوست اور مسلمان مومنین کے دشمن ہیں اسی طرح ان کی دلیلوں کا بھی ذکر ہے کہ یہ اسلام کو جھوٹا ثابت کرنے کیلئے بھونڈی دلیلوں کا سہارہ لیتے ہیں مشرکین مکہ کے پاس بھی دلیلوں کی کمی نہ تھی مگر ان کی سب سے دلیلیں کفر و شرک پر مبنی تھیں امریکہ کے پاس بھی بیشمار دلیلیں تھیں جنکا سہارہ لیکر افغانستان عراق اور لیبیا کے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ ہر فتنہ پرداز اور امن دشمن کے پاس، ایک شیطانی دلیل ہوتی ہے شیطان ابلیس نے رب کا حکم نہ مانا آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا چونکہ ابلیس کے پاس بھی ایک دلیل تھی۔ انصار عباسی نے آئی ایس آئی کے چیف سے استعفےٰ کا مطالبہ کیا اور دلیل پیش کی کہ اس طرح آئی ایس آئی کی بیشنگ نہ ہوتی انصار عباسی کی دلیل میں آئی ایس آئی کی بیشنگ کا تو جواز نہیں بلکہ اس بیان ہی سے اس کا مدعا سمجھ آ جاتا ہے، چھ گھنٹے کی ہرزہ سرائی کے بعد بیشنگ کا خیال کسی بیوقوف ہی کی سوچ ہو سکتی ہے کسی نے سچ کہا کہ چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ

جائے مگر یہاں تو چور چوری اور ہیرا پھیری کی دلیل بھی دیتا ہے کسی نے پوچھا ارسلان افتخار کے کیس میں افتخار چودری سے استعفیٰ کیوں نہ مانگا ؟ دلیل دی کہ ملک ریاض کے پاس ثبوت نہ تھا حیرت کی بات ہے کہ ملک ریاض کے پاس ثبوت نہ تھا تو مسٹر دلیل ذرا اپنے گریبان میں جھانکو او یہ بھی تو بتاؤ کہ جنرل ظہیر الاسلام کے خلاف تمہارے پاس کونسا ثبوت ہے ؟ وزیر اطلاعات کی لاڈلی باتوں میں جتنا لاڈو پیار فوج کے خلاف زہر اگلنے والوں کیلئے ہے ۔کاش وہ اپنا تھوڑا سا پیار پیارے وطن کے محافظوں کیلئے بھی رکھ لیتے ۔ میاں صاحب گوادر میں کھڑے آرمی چیف کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم ایک ہیں ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ابھی ہم ایک ہی ٹیبل پر بیٹھے تھے لگتا ہے کہ میاں صاحب سیفماء کی ہدایات پر چل رہے ہیں اور فوج کیخلاف مکمل منصوبہ بندی کے تحت صف آراء ہیں پہلے خواجہ صاحبان حملہ آور ہوئے تو صدر اور وزیر اعظم خاموش رہے فوج میں ابال آیا تو کاکول جا کر جنرل راحیل شریف کی شان میں ایک قصیدہ پڑھ کر اپنے آپ کو تسلی دے دی جو ایک کامیاب حملے پر خواجگان کیلئے داد تحسین اور میاں صاحبان کیلئے باعث تسکین تھا۔ دوسرا حملہ نجی ٹیلیوژن چینل سے کروایا اور اپنے ترجمان وزیر کے ذریعے پیغام دیا کہ ہم وطن دشمن پراپیگنڈہ مشینری اور اسکے کل پرزوں کیساتھ ہیں غلیل والوں کیساتھ نہیں۔ اور وہی ہوا جس کا اظہار تمام صاحب بصیرت لوگ کر رہے تھے۔

پیمرا کے حالیہ آرڈر کے بعد نجی چینل ایک بار پھر حملہ آور ہوگا اور کھل کر دلیلانہ بمباری کریگا چونکہ اسے آئینی اور عدالتی طاقت بھی میسر ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ میاں برادران تجارتی تعلقات کی عالمی اور بھارتی بالادستی قبول کرنے کی خام خیالی میں مبتلا ہیں میاں برادران اور تاجران انجمن لاہوریاان کا ایک مخصوص ٹولہ ذاتی مفادات کو قومی خوشحالی اور مفادات کا لیبل لگا کر قوم کو بیوقوف بنانے کا تہیہ کیئے ہوئے ہے مفاد پرستوں کے اس ٹولے کو صحافیوں کے ایک ٹولے کی حمایت بھی حاصل ہے جو صحافت اور دیگر کاروبار چلاتے ہیں صحافیوں میں ایک طبقہ لینڈ مافیاNGO کی آڑ میں اپنی ذاتی سے بھی تعلق رکھتا ہے جبکہ دیگر دو نمبر ٹھٹھہ بازی میں نہیں سٹہ بازی بھی شامل ہے کی آڑ میں فارن فنڈنگ کا سیلاب قومی سلامتی کے اداروں ااور ملکی مفاد کیNGO جبکہ بات کرنیوالوں کیلیئے ایک عذاب ہے میاں صاحبان کے قول و فعل میں تضاد کا یہ حال ہے کہ حکمران خاندان نے بیرونی دوروں پر صحافیوں کو ساتھ نہ جانے کا ڈھونگ رچایا ہے مگر شاہی سواری کے پیچھے ایک چارٹڈ جہاز بھی اڑتا ہے جس میں مخصوص صحافیوں کا ایک ٹولہ سیر سپاٹے کیلیئے چل نکلتا ہے یہ لوگ بیرون ملک فائیو سٹار ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں جبکہ شاپنگ اور دیگر عیاشیوں کیلیئے انھیں غیبی قوت ڈالروں کے بیگ تھما دیتی ہے انوسٹی گیٹو رپورٹروں کی انوسٹی گیشن کرپٹ صحافیوں کی طرف کیوں نہیں جاتی؟کیا انھیں پتہ

نہیں کہ کس کس صحافی نے اسلام آباد میں کاروبار کھول رکھے ہیں؟ اور ان کاروباری NGOکو صحافیوں کی فنڈنگ کہاں سے ہوتی ہے۔کیا انھیں یہ خبر نہیں کہ صحافیوں کی کون فنڈنگ کرتا ہے اور یہ این جی اوز کیا کام سرانجام دیتی ہیں ۔ فوج اور اس کے ذیلی ادارے باشعور اور باحیاء افراد پر مشتمل ہیں وہ ایک خاندان،ایک قبیلہ اورایک برادری ہیں فوج اور قوم کا خون کا رشتہ ہے یہ رشتہ ایسا ہے جس میں کوئی اونچ نیچ نہیں اور نہ ہی کوئی رخنہ اور رنجش ہے۔سپاہی کا بیٹا جرنیل ہے اور جرنیل کے گھر میں اسکے شہید بھائی یا بیٹے کے خون کی خوشبو ہے۔ جنرل راجہ اکبر خان سیالکوٹ سے خنجراب تک کے علاقے کے محافظ تھے1971ء کی جنگ میں انکا بیٹا کیپٹن راجہ ظفر اکبر میدان جنگ میں شہید ہوگیا تو وہ شہادت کی خبر سنکر دعا گو ہوئے اور دفتر کی طرف چل پڑے بیگم صاحبہ نے پوچھاکہ آپ کا بیٹا شہید ہوگیا ہے مگر آپ نے ایک آنسو تک نہیں بہایا۔جنرل صاحب نے کہاکہ میرے بہت سے بیٹے ہر روز شہید ہوتے ہیں اور ظفران ہی میں سے ایک تھا۔نواز لیگ کی نامور سیاستدان عظمیٰ بخاری نے فرمان جاری کیا کہ فوج اور جیو دو ادارے ہیں۔ بیشک یہ دو ادارے ہیں ایک قوم کا اور دوسرا حکومت اور حکمران خاندان کا۔ اگر میاں صاحبان کی بیشنگ پالیسی نہ ہوتی تو عظمیٰ بخاری، خواجگان اور پرویز رشید کے بیانات پر صاحب اقتدار صاحبان میں تھوڑی بہت جنبش ضرور ہوتی۔

بیشنگ زدہ صحافیوں کو شاید پتہ نہیں کہ فوجی رشتہ خونی رشتوں سے بھی زیادہ مضبوط اور شک شبے سے بالاتر ہے بیگم نواز شریف کا بیان ریکارڈ پر موجود ہے کہ جب پولیس نے گھیرا ڈالکر میری کار کو لفٹر کے ذریعے اٹھایا تو جانثاران میاں نواز شریف بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ پھر ان سیاسی بھگوڑوں نے اپنی الگ جماعت بنائی اور بھاگتے بھاگتے جنرل مشرف کے گھر چلے گئے۔ دس بارہ سال جنرل مشرف کے لنگر سے فیض یاب ہوئے اور جنرل مشرف کے زوال پر واپس جاتی عمرہ چلے گئے۔

اب ذرا فوجی جانثاروں کی چند مثالیں بھی سنیں۔ سیاہ چین کے محاذ پر ایک ہی یونٹ کے آٹھ افسروں نے ایک دوسرے کی جان بچانے کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور ان میں سے کوئی بھی موت کے ڈر سے میدان سے نہ بھاگا۔ دو سپاہیوں نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو نیچے گرایا اور ان کی جان بچانے کیلئے ان پر لیٹ گئے دشمن کی یلغار ختم ہوئی تو زخمی کمانڈر کو اٹھایا گیا انھوں نے بتایا کہ کسطرح دو جوانوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے اپنے کمانڈر کی جان بچائی۔ نانگا پربت کی مہم کے دوران سپیشل سروس گروپ کے میجر ہمدانی برفانی دراڑ میں گر کر شہید ہوگئے۔ دراڑ وسیع تھی اور میجر ہمدانی کا جسد خاکی کئی سو فٹ کی گہری کھائی میں نظر آ رہا تھا۔ موسم مزید خراب ہوا تو باقی لوگوں کو مجبوراً واپس آنا پڑا موسم کھلتے ہی کیپٹن خالد

بشیر اپنے جوانوں کے ہمراہ اپنے دوست کا جسد نکالنے نانگا پربت پر پہنچے مگر جونہی وہ رسوں کی مدد سے نیچے اترے ایک برفانی تودہ ان پر آ گرا اور کیپٹن خالد بشیر جو اپنے والدین کی واحد اولاد تھے ہزاروں من برف کے نیچے دب گئے کیپٹن خالد بشیر کے حادثے کے بعد فوج نے مزید مشن بھیجنے سے منع کر دیا تو میجر زاہد خان اور ان کے چند ساتھی فوج سے چھٹی لیکر اپنے طور پر گلگت گئے اور اپنی جیب سے کوہ پیمائی کا سامان خریدا۔ نانگا پربت میں اس مقام پر گئے جہاں ان کے دو ساتھی برف کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ میجر زاہد خان اور ان کے ساتھی دن رات برف کھودتے رہے مگر وہ تہہ تک نہ پہنچ سکے اس مشقت کی وجہ سے میجر زاہد فراسٹ بائیٹ کا شکار ہوگئے اور موسم کی خرابی کی وجہ سے واپس آ گئے۔ اس مشن پر میجر زاہد کے ہاتھ کی تین انگلیاں کٹ گئیں مگر اس بہادر سپائی نے ہمت نہ ہاری۔ دوسرے سال میجر زاہد پھر اس مقام پر پہنچے تو برف کے طوفانوں نے سب آثار مٹا دیئے تھے اور دونوں افسروں کا مقام شہادت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گلیشیئر میں بدل چکا تھا میجر زاہد بعد میں کرنل بنے اور ملک دشمن عناصر کیخلاف لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ کیا کسی سیاسی جماعت، این جی او یا پھر میڈیا کی آڑ میں مافیا گینگ چلانے والوں کے پاس کوئی ایسی مثال ہے؟ برٹش سکالر جان بینس Johan Baynes کا قول ہے کہ :۔

Nothing has ever been made safe until The soldier has made safe The field where the building shell be built and the soldier is the

scaffolding untill it has been built and the soldier gets no reward but honour.

میاں صاحب پلیز:۔وطن کے سپاہی کو ڈس آنر نہ کریں بھارت، بھارت نواز صحافی، این جی اوز اور پرائیویٹ چینلوں کے بل بوتے پر آپ دولت تو کمالینگے مگر ملک کا وقار اور قوم کی عزت نیلام کردینگے۔فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے اور وقت کم ہے جو کچھ ٹیلیوژن سکرینوں پر دکھائی دیتا ہے وہ سراب ہے حقیقت نہیں۔قوم دکھی ہے اور فوج یا سیاسی جماعت نہیں آپ فرق سمجھ جائیں اور فوج کو فتح NGO کیساتھ ہے یہ فوج ہے کرنے کی مہم ترک کردیں۔یادرکھیں کہ سپاہی کبھی مرتا نہیں اسکی قبر کی مٹی سے ایک اور سپاہی پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

برطانیہ میں سفیر کی تعیناتی اور چوہاں

ایک مطالعاتی ٹور پر آسٹریا، جرمنی، فرانس، ہالینڈ اور بلجیم جانے کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ جناب قمرالزمان کائرہ بھی سیاسی دورے پر اڑوس پڑوس میں ہی پھر پھرا بلکہ پھڑ پھڑا رہے ہیں اور یورپ کی ٹھنڈی فضاؤں سے صوتی رابطے پر اسلام آباد کی گرم ہواؤں میں پھونکیں مار رہے ہیں کائرہ صاحب سیاستدان ہیں اور سابق وزیر بھی۔

وزیروں، امیروں اور مشیروں کے دورے مطالعاتی نہیں بلکہ ذاتی اور مفاداتی ہوتے ہیں پرانے انوسٹر ری انوسٹ کرتے ہیں اور نئے مستقبل کی انوسٹ منٹ کا پروگرام بناتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں بیٹھے پاکستانی بزنس مین اب سیاستدانوں پر انوسٹ کرتے ہیں اور سو فیصد کماتے ہیں کچھ لوگ یورپ میں ہی رہتے ہیں اور یہاں بیٹھے بیٹھے کونسلر اور سفیر بن کر کماتے ،لگاتے اور پھر کماتے ہیں۔ حسین حقانی اور واجد شمس الحسن کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں میاں.برادران اقتدار میں آئے تو ان کے بیرون ملک بیٹھے دوست یار پاکستان میں ان ہوگئے جنھیں سپریم کورٹ بھی آؤٹ نہ کر سکی .بڑی.بڑی کارپورشنوں اور منافع بخش اداروں پر بیٹھے چیئرمین راتوں رات آؤٹ کر دیئے گئے اور آؤٹ ڈور بیٹھے یاران چمن آؤٹ آف ٹرن ان ہوگئے۔

اسلام آباد سے غریب صحافیوں کا مختصر قافلہ دوبئ روانہ ہوا تو امیگریشن والوں نے مسکرا کر پوچھا اے غریب اخباروں کے سفید پوش رپورٹروں اور چھوٹے چھوٹے صحافیو کیے جارہے ہو یا کچے ؟ہم نے امیگریشن آفیسر کے طعنے کا جواب مسکراہٹوں سے دیا اور عازمین دبئ ہوگئے بحر حال دبئ سے ویانا کی فلائٹ پر بخیریت سوار ہوئے اور ویانا پہنچتے ہی اپنا اپنا بستہ اٹھا کر سیمینار ہال میں جا پہنچے دیسی، ولائتی، ہندی چینی اور ماچینی صحافیوں ،دانشوروں اور زندگی کے ہر موضوع پر بولنے والوں کو سنا اور دیکھا ہماری خوش بختی کہ وہاں کوئی پاکستانی لنگر نظر نہ آیا۔نہ کوئی فتنہ نہ فساد،نہ دوغلاپن اور منافقانہ چال،ہر طرف امن شانتی اور سکون نہ امن کی آشاء ،نہ سیفما کا سایہ نہ میاں صاحب کا توپخانہ اور خواجگان کا جنگی ترانہ۔

دس روز دس گھنٹوں کی طرح گزر گئے اور پانچ ملکوں میں دو دو دن کی مہمانی کا لطف اٹھا کر صبح سویرے اسلام آباد اترے تو وہی امیگریشن آفیسر سامنے کھڑے تھے کچھ دیر وہ ہمیں اور ہم انھیں دیکھتے رہے ہم حیران تھے کہ شاید یہ دس روز سے وہ ہمارے انتظار میں ہی کھڑے رہے اور وہ پریشان تھے کہ ہم سب کے سب واپس آگئے کسی چچی، پھوپھی، ماسی اور مسیری نے ہمیں پناہ نہ دی آفیسر صاحب نے عالم حیرت میں پہلے پاسپورٹ اور پھر بھاروں گنے پاسپورٹوں پر مہریں لگائیں اور پھر حیرت سے پوچھا آپ لوگوں کا سفر کیسا رہا؟

آجکل دنیا سمٹ کر قریب آگئی ہے آٹھ گھنٹے میں یورپ اور پندرہ گھنٹوں میں کینڈا،آسٹریلیا اور امریکہ کے آخری کونے تک پہنچا جاسکتا ہے جس شہر میں جاؤ وہاں پاکستانی بھائی مل ہی جاتا ہے تقسیم ہند سے پہلے

حاجی، فوجی،ڈاکو، سمگلر، مہاجر،غلام، سیاستدان، قیدی،اور سیاح بیرون ملک جاتے تھے۔اب قیدی اور غلام صرف امریکہ جاتے ہیں یا پھر امریکہ کی ڈیمانڈ پر بھجوائے جاتے ہیں۔ہماری ساری قوم امریکہ کی غلام ہے عافیہ صدیقی امریکہ نے مانگی ہم نے دے دی عافیہ نے کسی امریکی کو نہیں مارا تھا یہ صرف امریکہ کی خواہش تھی کہ وہ ایک مسلمان عورت کو نشان عبرت بنا کر عالم اسلام کو پیغام دے کہ تمہاری حیثیت غلامانہ ہے اور ہم جب چاہیں تمہیں ذلیل ورسوا کر سکتے ہیں۔مہاجروں کی جگہ سیاسی پناہ گزینوں نے لے رکھی ہے اور ایم کیو ایم ابھی تک مہاجر ہے۔ الطاف بھائی.برطانیہ میں پناہ گزین اور کراچی میں کسی کو پناہ میسر نہیں کون کس کو مار رہا ہے یہ سب کو پتہ ہے مگر پردے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے فوجی اب اقوام متحدہ کی ڈیمانڈ پر جاتے ہیں اور امن فوج کا حصہ بنتے ہیں۔ڈاکو، سمگلر اور سیاستدان حج پر جاتے ہیں اور حاجی صاحب کہلاتے ہیں یہی لوگ سیر و سیاحت پر بھی جاتے ہیں اور دنیا کے مہنگے ہوٹلوں،جوا خانوں اور شاپنگ سنٹروں میں دولت لٹاتے ہیں عام آدمی کے نصیب میں نہ حج ہے،نہ سیاحت اور سیاست ۔عام پاکستانی بیرون ملک تارکین وطن کہلاتے ہیں اور

نفرت سے دیکھے جاتے ہیں میرے گاؤں کے بھی کئی لوگ ترک وطن کرکے یورپ اور امریکہ میں آباد ہیں اور خوشحال ہیں پہلی اور دوسری افغان جنگ کے دوران مہاراجہ کشمیر نے تاج برطانیہ سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے ایک بریگیڈ فوج رائل برٹش آرمی کی مدد کیلئے بھجوائی۔پہلی افغان جنگ میں میرے جدامجد راجہ تانوں خان ذیلدار سفید پوش بھی شامل ہوئے اور واپسی پر ایک افغان اور ایک ایرانی بلوچ بیگم بھی ساتھ لائے۔ذیلداری اور کمانداری انھیں ورثے میں ملی تھی البتہ سفید پوش کا منصب مہاراجہ کشمیر نے جنگ میں شمولیت کی وجہ سے دیا جو ان کے پوتے ذیلدار سفید پوش راجہ ولائت خان کی زندگی تک برقرار رہا۔راجہ تانوں خان برٹش آرمی کے باقاعدہ فوجی نہ تھے اس لئے انھیں کوئی تمغہ وغیرہ نہ ملا البتہ وہ اپنے ذاتی خرچ پر دو عدد بیگمات لے آئے دو تمغوں کے برابر کارنامہ تھا راجہ صاحب کی پہلی دو بیگمات کا تعلق مینڈھر اور پلندری سے تھا افغانی اور ایرانی بیگم کے اضافے کے بعد چار بیویاں مکمل ہوگئیں تو آپ نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کرتے ہوئے کسی مہم پر نہ جانے کا ارادہ کر لیا اور باقی زندگی عبادت اور ریاضت میں گزار کر ایک سو دس سال کی عمر میں دار فانی سے کوچ کیا دوسری افغان جنگ میں راجہ تانوں خان کے دو بیٹے راجہ غلام محمد خان اور راجہ حفیظ خان شامل ہوئے۔راجہ غلام محمد قندھار کے قرب وجوار میں کسی دریا کے کنارے اپنے والد کے سسرالی افغانوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے اور کھڑکی کے مقام پر دفن ہوئے آپ کی وفات پر انگریز نے پیتل کی پلیٹ جو برطانیہ

،سے کندہ ہو کر آئی ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا

”Ghulam Muhammad died for freedom and honour.He was among those who at the call of king and country come froward and left those who were deer to them. Faced odds and finally sacrifised their lives so that others may live in peace“

سکرول کے علاوہ شاہ برطانیہ نے راجہ غلام محمد خان کے بیٹوں کے نام بہادری کی دو اسناد بھجوائیں جو آج بھی محفوظ ہیں۔بڑے بوڑھے کہتے تھے کہ غلام محمد صاحب کے بیٹوں کو منٹگمری میں دس مربع اراضی بھی الاٹ ہوئی تھی جو بعد میں مقدمات اور شادیوں کے کام آئی۔راجہ تانوں خان کا دوسرا بیٹا راجہ حفیظ خان بھی افغان جنگ میں مارا گیا جبکہ تیسرا بیٹا راجہ بہادر علی خان راجپوتانہ رائفل سے ریٹائرڈ ہو کر طبعی موت مرا۔پہلی عالمی جنگ میں میری والدہ کے نانا صوبیدار راجہ صلاح محمد خان نے شرکت کی اور افریقہ تک جا پہنچے۔1921 میں دوسری عالمی جنگ میں وہ انڈین پولیس میں بھجوا دیے گئے اور بحثیت ڈی ایس پی ریٹائیرڈ ہوئے۔ راجہ تانو خان کے پوتوں حوالدار راجہ عبداللہ خان اور نائیک کلرک راجہ اشرف خان نے شمولیت اختیار کی عبداللہ صاحب لیبیا کے صحرا میں جرمن قیدی بنکر مجھ سے پہلے جرمنی گئے اور کئی سال قید کاٹ کر واپس آئے مولانا راجہ اشرف صاحب جاپانیوں کے قیدی بنے اور سنگاپور میں قید کاٹی۔ میرے

گاؤں سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ضلع کوٹلی آزاد کشمیر کا خوبصورت گاؤں براٹلہ واقع ہے دوسری جنگ عظیم کے دوران براٹلہ سے تعلق رکھنے والا فوجی جوان راجہ زمان علی خان بھی سمندر پار جرمنی اور اٹلی سے دو ہاتھ کرنے گیا۔ راجہ زمان خوبصورت جوان اور عاشق مزاج شاعر بھی تھا راجہ صاحب کی محبوبہ (چناں) سراہ کی رہائیشی اور کالی رنگت کی لوہاری تھی۔ حوالدار راجہ زمان علی خان نے اپنی محبوبہ سے جدائی، بے رخی اور بے مروتی پر ہزار ہا شعر لکھے مگر بد قسمتی سے وہ رانجھے، پنوں، مرزے اور مائیوال کی طرح مشہور نہ ہوئے اور نہ ہی ان کا دیوان عشق اشاعت پذیر ہوا۔ حوالدار راجہ زمان شاعر عشق تھے اور عاشقوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔

راجہ زمان کی شاعری سہ حرفی اور چار حرفی کی شکل میں ہے راجہ صاحب نے اپنے سفر یورپ اور اپنی محبوبہ چناں سے جدائی کو مختصراً کچھ ان الفاظ میں تحریر کیا

ملک پنجاب وچ باہوں پھریاں دلی کانگڑہ جھنگ ملتان تکیا
میر پور ٹپ دریاتوں پار ہویاں کالا مندرہ تے گوجر خان تکیا
کیتے سیر سمندری جہاز اتے اٹلی روم تے عجب انگلستان تکیا
کی پچھنے او بچ زمان کولوں وزن چناں دے ملک ویران تکیا

راجہ زمان اور دیگر عاشقوں میں فرق یہ ہے کہ راجہ صاحب خود شاعر تھے جبکہ رانجھا، مرزا، پنوں اور مائیوال وغیرہ نہ شاعر تھے اور نہ ہی فوجی حوالدار۔ لوک داستانوں کے ہیرو کی کہانیاں صدیوں بعد دیگر شاعروں اور داستان گو ادیبوں نے بیان کیں اور بہت کچھ اپنی طرف سے بھی ملا دیا راجہ زمان کی داستان عشق دراصل سوانح حیات عشق ہے جو کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ رانجھا اور مرزا جٹ تھے، پنوں بلوچ، مائیوال سنٹرل ایشیاء کا شہزادہ اور فرہاد لوہار تھا۔ صاحبان اور ہیر جٹیاں تھیں اور رشتے بھی موزوں تھے مگر اس دور میں چوہدری شجاعت نہ تھے۔ اگر چوہدری صاحب ہوتے تو برادری ازم کا ڈھول ڈالکر رانجھے اور مرزے کی شادیاں کروا دیتے اور کم ازم کم چار حلقوں سے ان کے امیدار بھی جیت جاتے سوہنی کمہاری تھی اور گجرات کی تھی چوہدری صاحبان سوہنی کو ضرور کیش کرواتے اور سنٹرل ایشین شہزادے سے شادی کروا کر وہاں دو چار فیکٹریوں کا لائسنس حاصل کرتے اور شہزادہ مونس الٰہی پاکستان میں ازبکستان اور ترکمانسان کا خیر سگالی سفیر ہوتا۔ شیریں اور سسی شہزادیاں تھیں اور جو کچھ صدیوں پہلے ہوا آج بھی وہی ہوتا۔ پنوں اور فرہاد کا شمار گم شدہ افراد میں ہوتا اور دونوں لڑکیاں کاری کر دی جاتیں۔ فرہاد اور پنوں گم نہ ہوتے تو وہ بھی کاری ہوجاتے اور ایک جرگے میں ظفر اللہ جمالی مرحومین کے ورثاء کو پانچ پانچ لاکھ روپے معاوضہ دلا کر کیس داخل دفتر کروادیتے۔ حوالدار زمان پہلا راجپوت اور مسلح عاشق ہے جس نے عشق کا روگ پالا

مگر ہتھیار نہ ڈالے۔وہ چاہتا تو چناں کو اٹھا لاتا مگر فوجی حوالدار نے ملٹری ڈسپلن کا پورا خیال رکھا جسطرح راجہ زمان کو چناں کے بغیر سارا یورپ ویران نظر آیا اسی طرح انگلینڈ میں مقیم ڈاکٹر اشرف چوہان کو میاں نواز شریف کے بغیر دنیا ویران نظر آرہی ہے۔ڈاکٹر اشرف چوہاں کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے اور وہ لندن میں نیوروسرجن اور انگلینڈ میں امیر کبیر آسامی ہیں۔انھوں نے ایک پروگرام میں فرمایا کہ میں میاں نواز شریف کا چمچہ ہوں۔حیرت کی بات کہ میاں صاحب اپنے اس عالمی چمچے سے تا حال بے خبر کیوں ہیں؟آجکل یورپ میں ڈاکٹر چوہان کی چمچہ گیری اور وزیر دفاع خواجہ آصف کی خاموش سفارتکاری کے چرچے ہیں۔یورپ میں مقیم پاکستانیوں کو محترم ڈاکٹر اشرف چوہاں کے دورے کی بھی فکر ہے ڈاکٹر صاحب کے حامی اور ہمدرد مختلف طریقوں سے اظہار خیال کر رہے ہیں یا پھر ڈاکٹر صاحب خود ان سے کام لے رہے ہیں سارے یورپ میں خبریں ہیں کہ ڈاکٹر اشرف چوہاں انسان دوست اور ہمدرد انسان ہیں آپ نے نون لیگ کیلئے بہت کام کیا ہے اور میاں برادران کے یورپ میں سب سے بڑے خیر خواہ ہیں ان کی پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت بلکہ چاہت اور الفت کے قصے بھی بیان ہو رہے ہیں اور جگہ جگہ لاہوری بھائی ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا ذکر کرتے تھک نہیں رہے۔
ایک جیالی محفل میں کچھ نوجوان جیالوں نے اشارتاً بتایا کہ جناب کائرہ بھی

ڈاکٹر چوہان کیلئے خاموش لابنگ کر رہے ہیں اور یہ لابنگ خالصتاً برادری کی خدمات کیلئے ہے ہمارا ماتھا ٹھنکا تو جیالے بھائی نے بتایا کہ چوہان گجروں کی ایک اہم گوت ہے اور کائرہ صاحب گوجر برادری کے چیف ہیں کائرہ صاحب بھی چاہتے ہیں کہ سپوت گوجرانوالہ جناب ڈاکٹر اشرف چوہان انگلینڈ میں پاکستان کے ہائی کمشنر تعینات ہوں انگلینڈ میں اب یہ روایت چل گئی ہے کہ یہاں کے مقامی باشندے کو ہی ہائی کمشنر بنایا جائے۔جناب واجد شمس الحسن انگلینڈ میں رہتے ہوئے دو بار ہائی کمشنر بنے اور ایک بار بھی پاکستان نہ گئے واجد شمس الحسن نے جس دلیری سے زرداری صاحب کی خدمت کی کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔واجد شمس الحسن ڈاکٹر چوہان اور ڈاکٹر عبدالرحمان ملک ایک جیسی خوبیوں کے مالک ہیں یورپ میں مقیم سارے چوہان اور اعوان ڈاکٹر اشرف چوہان کی تعیناتی پر متفق ہیں تو میاں صاحب کو بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔

ہمارے ایک دوست نے اشارتاً بتایا کہ درجن بھر سینئر صحافی بھی لندن والے سفارتخانے پر قبضہ کرنے کی امید لئے بیٹھے ہیں۔حال ہی میں واہ فیکٹری والے کپتان صحافی سیکیورٹی کلیئرنس نہ ملنے کی وجہ سے اس واک سے آؤٹ ہوئے ہیں۔ واک سے کیوں؟ دوڑ سے کیوں نہیں ہوئے ؟ایک جونئیر صحافی نے جواب دیا کہ وہ اب دوڑ نہیں سکتے ایک جیالے میزبان نے کہا تب ہی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ بھائی جلدی سے ڈاکٹر چوہان کو ہائی کمشنر لگاؤ، نجم سیٹھی،امتیاز عالم، عطاء الحق

قاسمی، عرفان صدیقی، مشتاق منہاس، افضل بٹ میں اگر دوڑ کا مقابلہ کرایا جائے تب بھی ڈاکٹر چوہان دس نمبر لیکر کوالیفائی کر جائینگے اور باقی سب مختلف امراض کی وجہ سے بہوش ہو کر لندن کے سفارتخانے کے بجائے کسی ہسپتال میں داخل ہونگے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو پھڑک بھی جائیں۔ اگر سپاہی سے لیکر کور کمانڈر تک صبح پی ٹی کرتا ہے اور ایک میل کی دوڑ بھی لگاتا ہے تو وزیروں، سیکرٹریوں اور سفیروں کو بھی فٹنس سرٹیفکیٹ لینا چاہیئے۔ خاص کر وزیر دفاع کو صبح کسی فوجی یونٹ کیساتھ ایک میل کی دوڑ میں ضرور شامل ہونا چاہیئے۔

بہرحال ہم ذاتی طور پر بزرگ صحافیوں، متوقع سفیروں اور وزیروں کی دوڑ کے حق میں نہیں۔ اگر دوڑ کی شرط رکھی گئی تو پھر جناب جمشید دستی کی بلڈ ٹسٹنگ والی شرط کو بھی تقویت ملے گی جو کہ جمہوریت کے لئے بھی خطرہ ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر اشرف چوہان کی خدمات کا تو ہمیں پتہ نہیں البتہ جناب اثر چوہان کی گورنر پنجاب سے دوستی اور محبت جو کہ ان کے کالموں سے اکثر چھلکتی ہے سب پر عیاں ہے جناب اثر چوہان محب الوطن صحافی ہیں اور ان کے خاندان نے تحریک پاکستان میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ قربانیاں بھی دیں اثر چوہان وطن پرست مسلم لیگی ہیں وہ اچھے شاعر اور ادیب ہی نہیں بلکہ بہت ہی اچھے انسان بھی ہیں انکی تحریروں میں انسانیت اور پاکستانیت کا رنگ ہوتا ہے۔ اگر میاں صاحب نے کسی چوہان کو ہی ہائی کمشنر تعینات کرنا ہے تو ہمارا ووٹ جناب اثر چوہان کے

حق میں ہے اگر کوالیفکیشن صرف صحافی ہے تو جناب اسد اللہ غالب موزوں ہیں۔اگر ٹوٹل کا صحافی درکار ہے تو ہم بذات خود بھی کوالیفائیڈ ہیں بلڈ ٹیسٹ،ایک میل کی دوڑ اور سکیورٹی کلیئرنس کا بھی مسئلہ نہیں۔قراۃ العین حیدر کا''کار جہاں دراز ہے''میں لکھتی ہیں کہ بی بی سی ریڈیو پر کام کرنیوالوں میں ایک نام جناب نور محمد چوہان کا بھی تھا جو ملکہ برطانیہ کو انگریزی پڑھانے آئے تھے۔یہ ممکن نہ ہوا تو ریڈیو پر ملازم ہو گئے تھے انگلینڈ پہنچ کر وہ عیسائی ہوئے مگر بندے معقول تھے اور محمد چوہان کے متعلق لکھا کہ ان کے کسی دوست نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

کہا لندن چلا جاوں کہا لندن چلے جاؤ

کہا چوہان کاڈر ہے کہا چوہان تو ہوگا

کہا برما چلا جاؤں کہا برما چلے جاؤ

کہا جاپان کا ڈر ہے کہا جاپان تو ہوگا

خدا جانے جناب نور محمد چوہان اور ڈاکٹر اشرف چوہان کا کیا رشتہ ہے چوہانوں کی بات چلی تو ایک پرتھوی راج چوہان بھی ہو گزرے ہیں جنکے ڈر سے سارا ہندوستان کانپتا تھا۔میاں صاحب بھی سوچ لیں کہ جناب اشرف چوہان کے علاوہ اگر کوئی لندن چلا گیا تو وہاں چوہان بھی ہوگا۔اگر موزوں قسم کا چوہان نہیں ملتا تو کسی غزنوی یا غوری کی طرف

دیکھیں، سیٹھی، شیخ، خواجے، منہاس، سرلاس، بٹ، ہاشمی، قریشی اور قاسمی بھی ٹھیک ہیں مگر چوہان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے لندن میں ایک عامر غوری بھی ہیں انکا شجرہ بھی منگواہیں شاید چل جائیں خالص درانی او غزنوی تو اب افغانستان میں بھی نہیں رہے پاکستان میں کہاں ملینگے۔ نسلاً محمود غزنوی بھی ترک تھا اس لئے ترکی میں سفیر برائے انگلستان کا اشتہار دیں یا پھر چوہان پر ہی اکتفا کریں۔

میاں صاحب تاریخ سے بھی کچھ سبق حاصل کریں ہمارے اکثر لیڈر آخری عمر انگلینڈ میں ہی گزارتے ہیں اور وہاں پر ہی خالق حقیقی سے جاملتے ہیں چوہدری رحمت الٰہی اور سکندر مرزا سمیت کئی لیگی رہنما شاعر اور ادیب ولائت کے قبرستانوں میں اسودہ خاک ہیں حال ہی میں جناب محمود ہاشمی نے انگلینڈ کی سرزمین پر قبر کا اضافہ کیا ہے۔ بہت سے سیاستدان بیورکریٹ اور صنعت کار انگلینڈ کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا چکے ہیں بقول عمران خان جناب زرداری اور جناب رحمٰن ملک سمیت سینکڑوں پاکستانیوں کی دولت کے انبار اسی ملک میں ہیں میاں صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ امیر آدمی کا بڑھاپہ خواری میں گزرتا ہے ایسے موقع پر ایک صاف ستھرا اور پر فضا اولڈ ہاؤس نعمت خداوندی سے کم نہیں ہوتا۔ جناب اشرف چوہان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انگلینڈ کے پر فضا اور بارونق ساحل سمندر پر انکا ایک اولڈ ہاؤس بھی ہے اس لئے جناب اشرف چوہان نہ

صرف اقتدار میں بلکہ بڑھاپے اور برے وقت میں بھی کام آ سکتے ہیں۔

میاں صاحب کا توپخانہ اور اس کا انجام

میدان جنگ میں توپخانے کی بڑی اہمیت ہے۔ تیر، تلوار، نیزے اور بھالے کی زد سے بچنے اور دشمن پر کارگر کاروائی کیلئے کسی ایسے ہتھیار کی ہمیشہ سے ضرورت تھی جس کی مدد سے دشمن کی ہتھیاروں سے بچتے ہوئے اس پر حملہ آور ہوا جاسکے۔ توپخانے کی ابتدائی شکل منجنیق کی تھی جسکا بنیادی آئیڈیا فلاخن سے لیا گیا فلاخن ایک سادہ سا ہتھیار ہے جسکی مدد سے پتھر پھینکا جاسکتا ہے فلاخن اور غلیل ایک ہی کام کرتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فلاخن غلیل کی نسبت بھاری پتھر پھینک سکتی ہے اور غلیل میں چھوٹا پتھر یا لوہے کی گولی پھینکی جاسکتی ہے۔ فلاخن یا غلیل کا تاریخی استعمال حضرت داؤدؑ نے کیا۔ آپؑ اپنے والد اور آٹھ بھائیوں کے ہمراہ حضرت طالوتؑ کے لشکر میں شامل ہوئے اور اللہ کے حکم سے کافر بادشاہ جالوت کو اپنی فلاخن کا نشانہ بنا کر واصل جہنم کیا۔ وقت گزرتا رہا اور منجنیق کا سائیز گولے کا وزن، درستگی اور رینج بھی بڑھتا گیا۔ بنو امیہ دور کی ایک بڑی منجنیق جامع امیہ دمشق میں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس سادہ مگر ہیبت ناک ہتھیار کی میدان جنگ میں موجودگی سے دشمن کس قدر نفسیاتی دباؤ پڑتا ہوگا۔ بعد کے ادوار میں منجنیقیں بحری جہازوں پر بھی فٹ کی جانے لگیں اور پتھروں کی جگہ بڑے بڑے آہنی اور فاسفورس اور گندھک کے تیزاب سے بھرے

ڈرم نما آگ لگانے والے گولے بھی پھینکے جانے لگے۔ پانی پت کی لڑائی میں بابر کے توپخانے نے خوب کام کیا اور ابراہیم لودھی کے ہاتھیوں کا کام تمام کر دیا۔ ہنی بال اور سکندر نے بھی منجنیق نما کسی توپخانے کا استعمال کیا جن کے دھماکوں سے ہاتھی، گھوڑے اور اونٹ بپھر جاتے اور سواروں کے قابو میں نہ رہتے۔ جدید توپخانے کا رواج ہوا تو فرانسیسی، روسی اور امریکی توپیں مشہور ہوئیں۔ تاریخی توپوں میں امجد شاہ ابدالی کی بھاری توپ بھی مشہور ہے۔ احمد شاہ نے یہ توپ نیشاپور اور شیراز کے محاصرے سے پہلے ڈھلوائی اور ایران کے کئی شہر اور قلعے اس توپ کی مدد سے فتح کیئے۔ یہی توپ پانی پت کی لڑائی میں بھی استعمال ہوئی اور فتح کا باعث بنی۔ امجد شاہ کی یہ توپ کئی بادشاہوں کے ہاتھوں گزرتی رنجیت سنگھ کے توپخانے کا حصہ بنی جس کے عملے میں سکھوں کی بھنگی مثل کے سپاہی شامل تھے۔ سکھوں کی شکست کے بعد انگریز سکھ توپخانہ تو ساتھ لے گئے مگر بڑی توپ یہی چھوڑ دی احمد شاہ در دوراں (احمد شاہ درانی) کی یہ توپ آج بھی لاہور کی اہم شاہراہ پر موجود اپنی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔ تاریخ لاہور کے مطابق لاہور کا فقیر خاندان رنجیت سنگھ کے توپخانے کا انچارج تھا۔ پتہ نہیں لاہور کے فقیر صرف توپیں چلاتے تھے یا پھر ڈھالتے بھی تھے۔ اگر ڈھالتے تھے تو یقیناً توپیں ڈھالنے والی بھٹی پر ہی میاں صاحبان نے اتفاق فاؤنڈری کی بنیاد ڈالی ہوگی!

جدید توپ خانے سے ترقی کی اور قسم قسم کی توپیں وجود پذیر ہونے لگیں جن میں چھوٹی، بڑی اور درمیانی رینج کی توپوں کے علاوہ حرکتی توپیں، ہوائی توپیں، گن شپ ہیلی کاپٹر، بحری توپیں اور کمپیوٹر سے چلنے والی توپیں اور پھر توپوں سے بھی آگے میزائل اور بغیر پائیلٹ کے جہاز جنھیں ڈرون کہا جاتا ہے تخلیق ہوئے اور تباہی کے نئے سامان لائے۔آج کے دور میں سائینسی تحقیق اور تخلیق کا مقابلہ ساتھ ساتھ چل رہا ہے ایک طرف توپوں، جہازوں اور میزائلوں سے بڑھ کر بارودی دھماکے اور خود کش بمبار تباہی پھیلاتے ہیں تو دوسری جانب منفی پراپیگنڈہ فوج اور قوم کے مورال پر اثر انداز ہوتا ہے۔میاں صاحبان کے توپخانے میں بھی نہ توپیں ہیں، نہ جہاز، نہ میزائل اور نہ ہی خود کش بمبار مگر یہ توپخانہ اول الذکر توپخانوں کی نسبت زیادہ کارگر ہے۔یوں تو میاں صاحب کی نون لیگ جو کہ پاکستان کی حکمران جماعت ہے میں کچھ جرنیل بھی ہیں مگر میاں صاحب کے توپخانے کا انچارج نہ تو کوئی استاد عل قلی خان ہے، نہ بھنگی اور فقیر۔جنرل عبدالقادر بلوچ انفنٹری کے جرنیل ہیں اور جنرل ترمذی رسالے کے سابقہ جرنیل ہیں۔مگر لگتا ہے کہ وہ نون لیگ سے الگ ہیں چکوال والے جنرل عبدالقیوم توپخانے کے جرنیل تو ہیں مگر میاں صاحب کے میزائل خانے میں فٹ نہیں آتے۔سنا ہے کہ اس توپخانے کے انچارج چڑیا والے نجم سیٹھی ہیں اور ان کی معاونت ایک میڈیا گروپ کے دانشور رصحافی اور لنکر کرتے ہیں۔میاں صاحب کے توپخانے کی ساری توپیں ایک ہی رخ پر اور ایک ہی حدف پر فائیر کرتی

ہیں ان توپوں کا رخ جی ایچ کیو اور آئی ایس آئی ہیڈ کواٹر کی طرف ہے۔ کبھی یہ توپیں جنرل پرویز مشرف کی آڑ میں اور کبھی آمریت اور جمہوریت کی آڑ لیکر فائیر کرتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ''غم یاراں تے ناں بھراراں''یعنی غم یار کا اور نام بھائی کا۔ on locationفائیر مشرف جمہوریت اور آمریت کا نام لیکر فوج پر حملہ دراصل ہے۔ آئی ایس آئی اور جی ایچ کیو دو ہیڈ کوارٹرز نہیں بلکہ دو قلعے ہیں دو مضبوط مورچے ہیں دو گھر ہیں اور دو مضبوط دیواریں ہیں جنہیں میاں صاحب کا توپخانہ دن رات مکارانہ بمباری کر رہا ہے تاکہ پاکستان غیر محفوظ اور پاکستانی بے گھر ہو جائیں اور دشمن انہیں یرغمال بنالے۔ نون لیگ کے تھنک ٹینک میں شامل سارے ٹینک شرمن ہیں جن کی مرمت صرف بھارت میں ہوتی ہے یہی تھنک ٹینک میاں صاحب کی بوفر گنوں کا ایندھن تیار کرتا ہے تاکہ بمباری میں مکاری اور عیاری کا عنصر غالب رہے جب کبھی توپیں زیادہ گرم ہو جاتی ہیں یا نیا ایمونیشن آنے کا انتظار کرتی ہیں تو تھینک ٹینک شرمن ٹینکوں کا روپ دھار کر خود بمباری کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ میاں صاحب کا توپخانہ اور ٹینک میاں صاحب کے کمپوزٹ ڈائیلاگ کی طرح ایک کمپوزٹ فورس ہے جس میں بھارتی صحافیوں، دانشوروں، سیاستدانوں کے علاوہ فوجی میڈیا میں موجود پاکستان دشمن دستہ بھی شامل ہے۔

میاں صاحب کے تھینک ٹینک اور توپخانے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ

ہمایوں بادشاہ سے مماثلت رکھتے ہیں ہمایوں بیمار ہوا تو بابر نے دعا کی کہ اسکی عمر ہمایوں کو لگ جائے۔ہمایوں صحت مند ہوگیا اور بابر مرگیا۔امیر المومنین جنرل محمد ضیاء الحق شہید نے اپنی عمر میاں محمد نواز شریف کو لگ جانے کی دعا کی تو جنرل صاحب معہ امریکی سفیر اور دیگر جرنیلوں کے شہید ہوگئے اور میاں صاحب بادشاہ بن گئے۔ہمایوں جلا وطن ہو کر ایران چلا گیا اور میاں صاحب سعودی عرب پہنچ گئے۔ہمایوں شاہ طہاسپ کی مدد سے واپس آیا تو اس کے ہمراہ قزلباش ترکمان اور ازبک فوجی دستے تھے جبکہ میاں صاحب کے ساتھ خاص میڈیا گروپ کی کمپوزٹ فورس کے علاوہ ذاتی ٹینک رجمنٹ (تھینک ٹینک) اور لیگی توپخانہ بھی آیا اور ملک پر چھا گیا۔ میاں صاحب کے توپخانے کی بڑی بڑی توپیں جناب وزیر دفاع، وزیر ریلوے، وزیر اطلاعات و قانون، مخصوص اینکر و صحافی بمعہ میڈیا مالکان کے جبکہ معاون توپوں میں مسترد شدہ کیڈٹ صحافی، اور ایک ہیرو کا زیرو بیٹا اور دیگر میں اخلاقی لحاظ سے زیرو گروپ شامل ہے۔ہیرو کے زیرو نے اپنی صحافت چمکانے کیلئے کہا کہ جناب الطاف حسین کو گرفتار کروانے میں عمران خان کا ہاتھ ہے۔زیرو ذہن کو پتہ نہیں کہ اسطرح کا بیان سکاٹ لینڈ یارڈ پولیس کے کردار کو مشکوک بناتا ہے اگر لندن پولیس کو اس بات کا علم ہوگیا تو صحافت کا شوق ٹھنڈہ پڑ جائے گا انگلینڈ میں دو نمبر پیسے سے خریدی ہوئی جائیداد کا حساب دینا پڑ گیا تو نہ اینکری رہے گی اور نہ بیکری۔

حیران کن بات ہے کہ نوائے وقت جیسے ادارے نے پی ایم اے سے مسترد شدہ نااہل کیڈٹ کو اپنے ادارے میں ملک دشمن طاقتوں کی نمائندگی کیلئے کیوں رکھا ہوا ہے۔جناب مجید نظامی صحافت کی دنیا کے ہیرو ہیں اور نوائے وقت کے مالک بھی۔ کہتے ہیں کہ اگر کسی کا کتا کسی دوسرے کو کاٹ ڈالے تو ذمے داری مالک کی ہوتی ہے۔ایسی ہی ایک مثال نوکر کی ہے نوکر بھی کوئی غیر اخلاقی حرکت کرے تو مالک ہی جوابدہ ہوتا ہے۔ادارے بلاشبہ مالکوں کے ہوتے ہیں مگر نمائندگی عوام کی کرتے ہیں۔بے شک یہ تمام لوگ امن کی آشا کی آڑ میں پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں پر حملہ آور ہیں۔

میاں صاحب کے توپخانے میں بڑی اور معاون توپوں کے علاوہ رانی اور شیرنی قسم کی توپیں بھی ہیں جو اکثر پھوکے فائیر کرتی ہیں۔ محترمہ عظمیٰ بخاری نے میاں کے توپخانے میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے ایک فائیر کیا اور فرمایا کہ جیو اور آئی ایس آئی دو ادارے ہیں۔پھوکا فائیر اسلئے ہے کہ ایک معزز رکن اسمبلی کو علم ہی نہیں کہ آئی ایس آئی ایک اہم ادارہ ہے جسکا تعلق ملکی سلامتی سے ہے۔آئی ایس آئی ملک پاکستان اور پاکستانی قوم کی آنکھیں اور کان ہیں۔یہ قوم اور ملک ہے تو میاں صاحب اور بخاری صاحبہ ہیں خدا اس ملک کی حفاظت کرے اگر یہ نہ رہا تو میاں صاحب کے خاندان کو جاتی عمرہ اور محترمہ کو بخارہ میں کوئی نہ پوچھے گا۔میاں صاحب کو اگر اپنی دولت کا گھمنڈ ہے تو وہ تاریخ کی

طرف دیکھیں۔ شاہ ایران، صدام حسین، قذافی، شاہ ادریس اور شاہ فاروق کے پاس خزانوں کی کمی نہ تھی۔ وقت کی آندھی ریت کے محل مسمار کرتی ہے کہ کھنڈرات بھی باقی نہیں رہتے۔ آئی ایس آئی کے ساتھ جیو اور جنگ سے مقابلہ کرنا عقلی دیوالیہ پن کی نشانی ہے آئی ایس آئی قائداعظمؒ کے پاکستان کے محافظ ہے اور جیو قائد کے پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی بنیادیں کھوکھلی کرنیوالا ایک کمرشل ادارہ ہے۔ محترمہ ذرا حامد میر کے لیکچروں پروگراموں کی طرف بھی دھیان دیں اور ان کی چھاتی پر سجے بھارتی اور بنگلہ دیشی تمغوں کی چھنکار بھی سنیں۔ آئی ایس آئی ایسے خاموش سپاہیوں کی فوج ہے جو مسلسل حالت جنگ میں رہتی ہے جبکہ جنگ اور جیو پاکستان دشمن بھارتی میڈیا کی بزنس پاٹنر شپ میں امن کی آشا کے نام سے ایک پراپیگنڈہ مہم چلا رہے ہیں۔ محترمہ عظمیٰ بخاری اور میاں صاحب کے توپخانے کے گنروں اور کمانڈروں سے گزارش ہے کہ وہ جنگ اور جیو پر لکھے جانے والے کالموں اور پروگراموں کی تھیم کو سمجھیں کہ یہ اخبار اور اس کے چینل صرف اور صرف نظریہ پاکستان، اسلام، افواج پاکستان، پاکستانی کلچر و ثقافت اور آئی ایس آئی پر فوکس کر رہے ہیں۔ اگر محترمہ عظمیٰ بخاری اور تہمینہ دولتانہ کے پاس وقت ہو تو وہ حامد میر کے بھارتیوں کے ساتھ انٹرویو اور پروگراموں کے علاوہ حامد میر کی ڈھاکہ والی تقریر اور اردشیر کاؤس جی اور ڈاکٹر ہود بائی کے ساتھ انٹرویو دیکھ لیں۔ علاوہ اسکے حامد میر کے کیپیٹل ٹاک میں وزیر دفاع کے بیانات، سوال و جواب اور سلیم صافی کے

پروگراموں پر بھی ایک نظر ڈالیں اور پھر نفسیاتی جنگ کے متعلق کسی بھی رائیٹر کی کتاب دیکھ لیں۔اس سلسلے میں جنرل قادر بلوچ اور جنرل عبدالقیوم صاحب سے بھی پوچھ لیں کہ کیا ان صحافیوں کے پروگراموں میں پیش کیا جانے والا مواد اینٹی پاکستان اور اینٹی اسلام نہیں ؟

میاں برادران کا شمار دنیا کے کھرب پتیوں میں ہوتا ہے جبکہ ان کے اہم پارٹی ممبر بھی ارب پتی ہیں۔ تھوڑا سا مال مفت خرچ کر کے جیو کے پروگراموں کا کسی بھی عالمی نفسیاتی جنگ کے ادارے سے تجزیہ کروایا جاسکتا ہے۔ کتوں کی شہادت، پنجابی فوج، آئی ایس آئی کے سربراہ کا میڈیا ٹرائیل، صوفی شعراء کے کلام کی بیہودہ کامیڈی، بزرگان دین کا تمسخر، اصحاب رسول ﷺ اور خانوادہ رسول ﷺ کی توہین، قرآن پاک کی آیات کا غلط ترجمہ و تشریح، بھارتی بیہودہ کلچر کا فروغ، پاکستانی تاریخ و تمدن پر غلط بیانی، امن کی آشا کی آڑ میں نظریہ پاکستان کی نفی سمیت ہزاروں بیانات ایسے ہیں جن کی بنا پر اس میڈیا گروپ پر مستقل پابندی لگ سکتی ہے اور اس ادارے کے اینکروں، صحافیوں اور مالکان پر بھی توہین اصحابؓ، توہین قرآن اور توہین پاکستان کی دفعات کے تحت مقدمہ چل سکتا ہے۔ مگر جب حکومت وقت ایسے ادارے کی معاون ہو تو مقدمہ کون چلائے اور سزا کون دے؟

محترمہ تہمینہ دولتانہ نے ایک پروگرام میں فرمایا کہ اب وقت آگیا ہے کہ

آرمی کو بیلنس آوٹ کیا جائے۔پتا نہیں وہ آرمی کو بیلنس آوٹ کرنا چاہتی ہیں یا آوٹ آف بیلنس کرنا چاہتی ہیں۔فی الحال ان کے کامریڈ ممبران اسمبلی اور وزراء کرام اپنی بیلنس شیٹ پر نظر ڈالے بغیر فوج کو آوٹ آف بیلنس کرنے کی کوشش میں ہیں۔ن لیگ کی اس مہم میں چینلوں کے کچھ لنگروں نے جنگی پیانے پر کام کیا اور حکومتی داد وصول کی۔حکومتی ترجمان جناب پرویز رشید کے مبارک زبان سے کھلا پیغام بھی دیا کہ ہم غلیل والوں کے ساتھ نہیں۔جناب پرویز رشید کے بیان پر غور کیا جائے تو یہ اکھنڈ بھارت کے خواب کی تعبیر ہے اکھنڈ بھارت کا فلسفہ یہ ہے کہ کہ اشوکا کے بھارت کو یکجا کیا جائے اور آموں دریا سے لیکر بنگال اور تبت سے لیکر ایران تک ایک ہندو ریاست قائم کی جائے۔اکھنڈ بھارت کا دوسرا نام ہندواتا ہے جسکا مطلب ہندو راج کا قیام اور دیگر مذاہت کے ماننے والوں سے ہندو دھرتی کو صاف کرنا ہے۔نو منتخب بھارتی وزیر اعظم نریندرا مودی اسی فلسفے پر کاربند ہے اور اسکی پارٹی کا دستور بھی یہی ہے۔اشوک اعظم کے وزیر اعظم چانکیہ کوتیلیہ کا قول ہے کہ دشمن کا دشمن میرا دوست۔بھارت کے پاکستان دشمن ہونے میں کسی کو شک نہیں جبکہ پاک فوج اور آئی ایس آئی جو کہ پاکستان کی محافظ ہے بھارت دشمن ہے۔جبکہ چند ملک دشمن امن کی آشا کے رشتے میں منسلک بھارت دوست اور ن لیگ کی بھارت دوستی کے معاون و مددگار۔نون لیگ

بھارت دوست، بھارت پاکستان دشمن، اسلام دشمن اور پاک فوج و آئی ایس آئی دشمن، کیا دنیا میں کوئی ایسی حکومت ہے جو اپنے ہی ملک، قوم اور

مسلح افواج کے دشمنوں کی دوست ہے۔اگر جناب پرویز رشید اور ان کی جماعت جو حکمران جماعت ہے ایک ایسے ادارے کے ساتھ کھڑی ہے جو ملک دشمنی، فوج دشمنی اور دین دشمنی پر گامزن ہے تو پھر یہ ملک، یہ قوم اور فوج کس کے سہارے پر کھڑی ہے؟ کہتے ہیں کہ منفی پراپگنڈہ کسی بڑے حادثے کو جنم دیتا ہے میاں صاحب کو پتہ ہی ہوگا کہ ہر بمباری کے بعد جوابی بمباری بھی ہوتی ہے۔فوج ایک ڈسپلنڈ ادارہ ہے اسے بیلنس آوٹ کرنے کی بجائے اس کی جرات اور جوانمردی کے بیلنس کو بڑھایا جائے اور چاہیں تو وہ سیز فائیر بھی کر سکتے ہیں وہ اپنی توپوں کو خاموشی کا حکم بھی دے سکتے ہیں مگر لگتا نہیں کہ وہ امن کی آشا اور سیفما کے اشوکا چکر سے نکلیں۔فوج کے بجائے جیو،جنگ اور دیگر چینلوں پر بیٹھے شترے مہار اینکروں کو بیلنس آوٹ کرنے اور انھیں کسی ڈسپلن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔کچھ صحافی اور اینکر ایسے بھی ہیں جو اگر

بھارت،اسرائیل،امریکہ اور برطانیہ میں ہوتے تو ٹیلیوژن سکرینوں کے بجائے جیل کی کوٹھری میں ہوتے۔اکھنڈ بھارت،ہندواتا اور امن کی آشا ایک ہی موروتی کی تین شکلیں ہیں اور تینوں کے مکروہ مقاصد پاکستان،اسلام،پاک آرمی اور نظریہ پاکستان کو مٹانا ہے میاں برادران اگرچہ چانیکائی چالوں کا شکار ہیں جو کہ چند شاتر ذہنوں کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ اس جال میں مسلسل

پھنستے ہی جائیں وہ چاہئیں تو اس چکر سے نکل بھی سکتے ہیں۔ ورنہ ناراض چوہدری نثار کی طرح مزید لوگ آپ سے متنفر ہو کر الگ ہونے لگیں گے اور طاہر القادری کے انقلاب اور عمران خان کے سونامی سے قبل ہی آپ اپنے توپ خانے سمیت کہیں کسی بڑی تباہی کا شکار نہ بن جائیں۔

فاطمہ کا پیغام ، بے حس حکمرانوں کے نام

ماتا جی میں آپ کو اسلام علیکم نہیں کہہ سکتا کہ آپ پر مسلمان ہونے کا شک کیا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ کوئی جنونی آپ کی جان لینے آ جائے۔ میں آپ کو پر نام وغیرہ بھی نہیں کر سکتا چونکہ اس میں میرے عقیدے کا مسئلہ ہے۔ میں ایک غریب صحافی ہوں، بلکہ سچ یہ ہے کہ صحافت کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ میری تجوری میں سوائے عقیدے کے اور کوئی دولت نہیں اور میں اس دولت سے محض آپ کی چاپلوسی کی خاطر محروم نہیں ہونا چاہتا۔ آپ ایک عمر رسیدہ ہندو مذہب کی پیروکار ہیں اور میرے دین اور عقیدے کے مطابق بچوں، بیماروں، بوڑھوں، قیدیوں، عورتوں، مسافروں اور معزوروں کا احترام اور معاونت ضروری ہے۔ میرا دین اور عقیدہ یہ بھی سکھلاتا ہے کہ مسجدوں، مندروں، گردواروں، پگوڈوں اور کلیساؤں کا بھی احترام کیا جائے اور کسی بھی مسلک اور عقیدے کی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

میں نے آپ کے بڑھاپے کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ کو ماتا جی کہا حالانکہ آپ صرف ایک ایسے شخص کی ماں ہیں جو اسلام دشمن، مسلمان دشمن، اورانسان دشمن ہے اور اپنے ملک میں کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کا قتل اور ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنا جائیزاور درست قرار دیتا ہے۔ میں آپ کو کیسے مخاطب کروں؟ میرے

پاس مناسب الفاظ نہیں۔میں نے جب ''ماتا جی لکھا'' تو حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ اچانک میرے سامنے آ گئے۔میں احتراماً کھڑا ہو گیا اور وہ کچھ بولے بغیر واپس چلے گئے۔میں سوچ میں پڑ گیا اور قلم ایک طرف رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ ایسا کیوں ہوا۔ابھی اسی سوچ میں تھا کہ ہمارے پڑوسی جناب قاری فاروق احمد تشریف لائے اور ایک پرانا اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے کہ کبھی وقت ملے تو پڑھ لینا۔اخبار دیکھا تو یہ دو سال پرانا اقبال نمبر تھا جسمیں صفحہ اول پر محترمہ عائشہ مسعود ملک نے لکھا تھا کہ گاندھی کو باپو لکھنے پر علامہؒ نے برا منایا اور لکھنے والے کو حکم دیا کہ آئندہ گاندھی کو باپو نہ لکھا جائے۔گاندھی کسی مسلمان کا باپ نہیں ہو سکتا۔علامہؒ کی زیارت کا جواب تو مل گیا مگر میرے پاس پھر بھی ایسے الفاظ نہیں کہ آپ سے مخاطب ہو سکوں۔علامہؒ سے معذرت کا طلبگار ہوں اور آپ سے مخاطب ہوں۔آپ کسی

مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی اور بدھ مت کے ماننے والی کی ماں نہیں چونکہ آپ کے پوت کے عقیدے کے مطابق سوائے ہندوؤں کے باقی سب مذاہب کے ماننے والے واجب القتل ہیں آپ کا بیٹا، اسکی سیاسی جماعت، عقیدہ اور مسلکی گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ہندوؤں کے علاوہ دیگر مسالک کے لوگ بھارت چھوڑ دیں یا پھر ہندو مذہب اختیار کر لیں۔بصورت دیگر انھیں چن چن کر قتل کیا جائے اور انھیں ان ہی کے گھروں عبادت گاؤں، محلوں، بستیوں اور شہروں میں جلا دیا جائے تاکہ بھارت دھرتی پوتر، ہو جائے۔

میرا آپ سے مخاطب ہونے کا مقصد اپنے وزیر اعظم ،ان کی کابینہ ،نام نہاد اپوزیشن اور پاکستانی سیاست کے شکست خوردہ پٹے ہوئے مفلوج ذہنوں کے مالک بھارت نواز مہروں سے شدید احتجاج کرنا ہے جنھوں نے آپ کے ظالم، خونخوار اور انسان دشمن بیٹے کی تاج پوشی کا جشن منایا۔ مجھے امن کی آشا اور سیفما کے مداریوں اور راہ کے وظیفہ خواروں کو وطن دشمن، دین دشمن،انسان دشمن اور مسلمان دشمن کہنا ہے اور اپنے ہم وطنوں کو خبردار کرنا ہے کہ وہ اپنے حال و مستقبل سے بے خبر راشٹریہ سیوک سنگھیوں کے ایجنٹوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بنیں۔ مجھے اپنے ہم وطنوں کو بتانا ہے کہ امن کی آشا ان کا امن چھیننے اور انھیں تباہی کے گھڑے میں دھکیلنے کا بہانہ ہے۔ وہ اس فریب سے نکلیں یا پھر مودی رعایا بننے کیلئے تیار ہو جائیں۔ آپ کا پتر کتنا خوش نصیب ہے کہ وہ اشوک اور اکبر کے تخت پر جلوہ افروز ہوا تو ارد گرد کے ملکوں نے بغیر کسی جنگ کے نریندر مودی کو بھارت کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور اسکی باجگزاری قبول کر لی۔ سری لنکا، نیپال، بھوٹان چھوٹے ملک ہیں اور آپ کے ہم مذہب ہیں۔ بنگلہ دیش کی حسینہ سیکولرازم کی دعویدار تو ہے مگر تھوڑی سی باغیرت بھی ہے۔ وہ نہ خود آئی اور نہ ہی اپنا صدر بھیجا۔ لگتا ہے کہ حسینہ کے خون میں خوری ہے۔ وہ ٹیگور کے نغمے تو گاتی ہے مگر اقبالؒ اور نذر اسلام کو بھی نہیں بھولی۔

میں یہ سطور لکھ رہا تھا تو ذہن کابل، قندھار اور غزنی کی طرف چلا گیا۔ بابر کو کابل میں، احمد شاہ ابدالی کو قندہار میں اور محمود کو غزنی میں گریہ کناں دیکھا اور شہاب الدین غوری کو جی ٹی روڈ کے کنارے بے آسرا بیٹھا دیکھا جو کبھی غور اور کبھی پانی پت کی طرف دیکھتا ہے وہ پشاور سے آنے والوں سے پوچھتا ہے کہ یہ کرزائی اور عبداللہ عبداللہ کون ہیں۔ کیا یوسفزئی اور قزلباش ختم ہوگئے ہیں؟ گلبدین حکمت یار اور عبدالرب رسول سیاف کہاں ہیں۔ کیا افغانستان کے کہسار اور افغان ختم ہوگئے ہیں۔ ایک بوڑھا افغان کوچی مغموم و مجبور سلطان شہاب الدین غوری کے پاس بیٹھ کر سمجھاتا ہے کہ بابا ایسی باتیں نہ کرو۔ پاکستانی طالبان تمہارے مقبرے پر بم لگا دینگے یا پھر کوئی خود کش ازبک تمہارے چھیتڑے اڑا دے گا۔ عبداللہ عبداللہ تاجک ہے اور کٹر بھارت نواز ہے۔ کرزئی قندہاری ہے اور بھارت کا کاروبار دوست ہے یہ وہ زمانہ نہیں جب تمہیں ایک درویش نے خط لکھ کر ہندوستان پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور تم مسلمانوں کو پرتھوی راج چوہان کے مظالم سے بچانے دینی غیرت کے جذبے سے سرشار جاٹوں اور مرہٹوں کا غرور خاک میں ملانے ہندوستان پر چڑھ دوڑے۔

اب زمانہ بدل گیا ہے۔ نہ وہ افغان رہے ہیں اور نہ ایرانی، تم جہاں بیٹھے ہو یہ پاکستان ہے اور یہاں بھارت کے عشق میں مبتلا میاں محمد نواز شریف حکمران ہے۔ تمہارا دور تو گیا جب قوم کے بہترین دماغ اور منصوبہ ساز پالیسیاں بناتے

تھے اور حکمران کو مشورے دیتے تھے۔ حکمران مانے یا نہ مانے وہ اپنے دل کی بات کہہ جاتے تھے چونکہ وہ بھاری تنخوائیں اور پروٹوکول نہیں لیتے تھے۔اب احمد خراسانی اور حبیب اللہ بلغی جیسے بوریا نشین بادشاہوں کے مشیر نہیں ہوتے کرزائی اور عبداللہ عبداللہ بھارت اور امریکہ کے کمیشن ایجنٹ ہیں انہی کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ یہ لوگ برائے نام حکمران ہیں۔اصل سکہ امریکہ کا چلتا ہے اور وہی ان کٹھ پتلیوں کو نچاتا ہے۔ پاکستان کے حکمران کسی خفیہ معاہدے کی پیداوار ہیں۔انھیں بیرونی آقاؤں سے جو حکم ملتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں اور عوام کا خون نچوڑتے ہیں۔ یہاں کہنے کو تو جمہوریت ہے مگر اسمبلیوں میں سرمایہ دار، جاگیر دار، وڈیرے اور کارخانہ دار بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی رعایا سے جبری ووٹ لیکر آتے ہیں اور ظالمانہ ہتھکنڈوں کے ذریعے حکمرانی کرتے ہیں۔اب افغانستان کا صدر بھارت کا تنخواہ دار اور باجگزار ہے۔آجکل تاجر، سرمایہ دار اور ساہوکار پالیسیاں بناتے اور حکومت چلاتے ہیں بھارت نے افغانستان میں سرمایہ لگا رکھا ہے اور پاکستان کا حکمران خاندان تاجر، کارخانہ دار اور سرمایہ دار ہے۔

آغا بس کرو اور چلے جاؤ۔ میں نے دیکھا کہ ایک زخم خوردہ شخص جی ٹی روڈ کے کنارے اٹھ کر سوہاوہ ریلوے سٹیشن کے عقب میں واقع چٹانوں کی طرف چلا گیا

اور بوڑھا کوچی اپنی بھیڑوں کو ہانکتا نیلی بابا کے دربار کی طرف چل دیا۔ کسی نے پوچھا خان کو کدھر جا رہے ہو۔ بولا اوپر پہاڑی کی چوٹی پر شیر شاہ سوری کی بارہ دری، حفاظتی چوکی اور تالاب ہے وہاں چارہ ہے پناہ گاہ ہے اور روہتاس کا قلعہ بھی نظر آتا ہے کبھی کبھی فرید الدین بھی آتا ہے۔ فرید الدین کون ہے؟ بوڑھے افغان کوچی نے کہا۔ جسے تم شیر شاہ سوری کہتے ہو۔ وہ بھی دکھی ہے مگر بے بس ہے تمہارا قائداعظمؒ اور اقبالؒ بھی دکھی ہیں۔ وہ دیکھ تو رہے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے۔

ماتا جی میں آپ کے بیٹے نریندر مودی کی بات کر رہا تھا۔ نیپال، سری لنکا اور بھوٹان آپ کی ہم مذہب ریاستیں ہیں اور اکثر بھارت کے زیر عتاب رہتی ہیں بھارت نے سری لنکا پر کئی عشروں تک دہشت گردی کا عذاب نازل کئے رکھا جس کی پریکٹس آجکل پاکستان پر ہو رہی ہے۔ بھوٹان اور نیپال ایسے خطے میں ہیں جہاں انھیں بھارت کے راستے ہی دیگر دنیا سے ملاپ رکھنا ہوتا ہے۔ افغانستان عملاً بھارت اور امریکہ کی کالونی ہے اور افغانستان کے صدر کی حکومت صرف کابل شہر تک محدود ہے جلال آباد پر مہمند، شنواری اور دستو خیل قبائل کی عملداری ہے اور کابل کے حکمران قبائلی عمائدین سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ یہی حالت قندہار، مزار شریف اور ہرات کی ہے جبکہ دیہاتی افغانستان پر طالبان کی حکومت ہے بنگلہ دیش بھی ایک باجگزار ملک ہے۔ جہاں بھارتی دھندناتے پھرتے ہیں۔

بنگالی تاجر بھارتی گھٹیا مال خریدتا ہے اوراس کے عوض کلکتہ اور مدراس کا ہندو سیٹھ بھاری رقوم اینٹھ لیتا ہے مگر میری سمجھ سے باہر ہے کہ جاتی عمرہ کے سیٹھوں کی کیا مجبوری ہے کہ وہ اکھنڈ بھارت کے ادھورے نقشے کو مکمل کرنے کے جشن منا رہے ہیں کیا ان کے پولٹری فارموں کی مردہ مرغیاں ہمارے لئے کافی نہیں کہ اب وہ بوجا کے بوڑھے بیل اور نیم مردہ گائیں اور گدھے بھی ہمارے م مقتدروں میں انڈیلنا چاہتے ہیں۔ خوشبودار چھتری والا میٹھا کیلا دس بیس روپے درجن کے حساب سے بھارت جارہا ہے اور بھارت سے درآمد شدہ توری نما کیلا تین سو روپے درجن خریدنے پر ہمیں مجبور کیا جارہا ہے ہمارے ہاں ایک نجم سیٹھی بھی ہے جو اپنے پروگراموں میں اکثر کہتا ہے کہ بھارت سے سستی چیزیں آنے پر کچھ پاکستانیوں کے پیٹ میں مروڑ پڑرہے ہیں سیٹھی کا ہر اشارہ فوج کی طرف ہوتا ہے مگر مروڑ والی بات سچ ہے ظاہر ہے کہ گندی، غیر معیاری اور مکروہ اشیاء کھانے سے مروڑ تو پڑیں گے۔

ہماری مجبوریاں اب محکومیوں میں بدل رہی ہیں آپ کے سپوت نے آتے ہی اپنے ایجنٹوں کے ذریعے کراچی کو آگ میں جھونک دیا ہے ہمارے ایک کالم نگار نے اسے مودی کی سلامی لکھا ہے۔ آپ سے مخاطب ہونے کی فوری وجہ سیٹھ نواز شریف کی طرف سے پیش کی جانے والی ساڑھی ہے جو پاکستان کے سرکاری مونو گرام والے گرین ڈبے میں آپ کو پیش کی گئی۔ سفید ساڑھی کی اتنی اہمیت نہ ہوتی اگر یہ

اتفاق لمٹیڈ کے کسی خوبصورت ڈبے میں رکھ کر پیش کی جاتی۔ گرین رنگ اور پاکستان کا مونو گرام ہمارا قومی غیرت کا نشان ہے۔ اپنے ملک کے دو سینئر اینکروں سے معذرت چاہوں گا انھیں قومی غیرت سے چڑھ ہے۔ جو شخص قومی غیرت کا لفظ بولے یہ صاحبان اسے غیرت بریگیڈ کا طعنہ دیتے ہیں مگر میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ میری قوم کی پہچان گرین کلر اور اسپر بنا قومی پہنچان کا نشان آپ کی گود میں رکھ دیا جائے جس گود میں نریندر مودی جیسا خونخوار انسان پل کر جوان ہوا ہے میں جانتا ہوں کہ یہ ساڑھی اور گرین ڈبہ محض دکھاوے کیلئے آپ کی گود میں رکھا گیا اور پھر اسے کسی چوارہے پر پھینک دیا گیا ہوگا یہی نہیں راشٹریہ سیوک سنگھیوں نے آپ کو بھی گنگا جل سے نہلا کر پوتر کیا ہوگا چونکہ آپ کے دھرم اور مودی کی پارٹی کے عقیدے کے مطابق مسلمان نا پاک ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کے دھرم میں جو چیز ناپاک ہے وہ بھارت کے بادشاہ کی ماں کی گود میں رکھ دی جائے آپ کا ظالم اور سفاک بیٹا اسی لئے تو بادشاہ بنا کہ وہ مسلمانوں کو مٹانے، آزاد کشمیر پر قبضہ کرنے اور پاکستان کو باجگزار ملک بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

آپ کی گود میں ہرے رنگ کا ڈبہ دیکھ کر کچھ سوچنے لگا تو کشمیر کی وہ ہزاروں مائیں اور بیٹیاں میرے سامنے آگئیں اور پوچھنے لگیں کہ جس شخص اور جس کی حکومت نے ہمارے سہاگ اجاڑے، ہمیں بے آبرو کیا، ہمارے جسم نوچے، ہمارے جگر گوشوں کو ہمارے سامنے قتل کیا، ہمارے بھائی اور بیٹے اجتماعی قبروں میں سلا

دیئے، ہمارے برہنہ جسموں پر سنگینیں چلائیں، ہمیں برہنہ کرکے بازاروں اور گلیوں میں پھرایا اور ہمیں اجتماعی آبروریزی اور درندگی کا نشانہ بنایا اس کی ماں کو ہمارے جسم سے اتارا ہوا سفید کفن اس نریندر مودی کی ماں کو پاکستان کے سرکاری رنگ کے ڈبے میں رکھ کر کس نے پیش کیا؟اس سے پہلے میں کچھ کہتا، حیدرآباد کی ہزاروں معصوم بچیاں سامنے آگئیں اور پوچھنے لگیں کہ جس شخص نے ہمارے والدین کو چن چن کر قتل کروایا اور ہمیں شیطانی ہوس کا نشانہ بنوایا۔ہمارے گھر جلائے اور ہمیں سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اٹھا کر آر ایس ایس کے کیمپوں میں بھجوایا، ہماری عصمت کو تار تار کیا اور ہمیں ہندوؤں کے بچے جننے پر مجبور کیا، ہمارے برہنہ جسموں پر آر ایس ایس کا نشان داغا اور ہمارے جسموں سے لباس اتار کر اپنی پگھڑیاں بنائیں اس درندے کی ماں کو ہمارے جسم سے اتاری ہوئی چادر پاکستان کے قومی نشان والے ڈبے میں رکھ کر کس نے پیش کی؟میں کچھ کہنے والا تھا کہ انسانی گوشت کے ایک ڈھیر سے آواز آئی۔ہم سب پاکستانی ہیں ہمیں خود کش حملوں اور بموں کے ذریعے شہید کیا گیا ہم میں فوجی جوان اور آفیسر بھی ہیں یہاں جنرل مشتاق بیگ جنرل بلال اور جنرل نیازی بھی ہیں۔ہم میں مزدور بھی ہیں اور راہ چلتے مسافر بھی ہیں۔ہم میں شعیہ
سنی، وہابی، ہندو، سکھ اور عیسائی بھی ہیں ہمیں اسلئے مارا گیا چونکہ ہم پاکستانی تھے۔ہمیں، مارنے والوں کی تربیت گائیں افغانستان میں ہیں جہاں بھارتی خفیہ ایجنسیاں کونسل خانوں کی آڑ میں دہشت گردی کے کیمپ چلا رہی

ہیں۔ ہمارے جسموں کو بارود کی گرم ہوا نے ریزہ ریزہ کر دیا، ہمارے لباس جل کر فضا میں تحلیل ہو گئے مگر اٹھارہ کروڑ پاکستانیوں نے ہم سے وفا نہ کی ہماری قوم ایسی جمہوریت لائی جو بھارت کی غلامی قبول کر چکی ہے ہمارے دانشور اور صحافی بھارتیوں کے عشق میں مبتلا ہیں اور امن کی آشا کا راگ الاپ رہے ہیں۔

چند روز پہلے میں نے ایک آواز سنی۔ دہلی دربار کے چوبدار نے بآواز بلند کہا پاکستان کا وزیر اعظم حاضر ہو۔ پھر ایک شخص کالے سوٹ اور خون آلود ہندو عورت کے ساتھ چلتا ہوا آیا ہندوانی اتنی لمبی اور بارعب تھی کہ ساتھ چلنے والا شخص ٹھگنا لگتا تھا۔ لڑکی نے خون آلود انسانوں کے قاتل بھارت کے بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ خون آلود سرخ ٹائی والا بادشاہ کے سامنے نظریں نیچی کیئے باادب بیٹھا رہا اور بادشاہ کی طرف سے ہدایت نامہ سن کر اسی لڑکی کے سائے میں اپنے کوٹ کے بٹن تھامے شرمندہ شرمندہ بھارتی اداکاروں، کارخانہ داروں اور ناکارہ سیاستدانوں سے ملنے چلا گیا۔ انسانی گوشت کے اس ڈھیر سے ایک اور آواز آئی۔ میں ایک مزدور کی بیٹی ہوں ماں کیلئے دوا لینے جا رہی تھی کہ ایک بم پھٹا اور میرا جسم گوشت کے ٹکڑوں اور ریزوں میں بدل گیا آج میرے کئی جسم ہیں کچھ مٹی میں دفنائے گئے کچھ کوئیٹہ کے ہسپتال کے ارد گرد بکھر گئے، کچھ چیلیں اور کوے اٹھا کر کوہ چلتن، کوہ مردار اور ٹکاٹو کی چوٹیوں پر لے

گئے۔ مجھے کسی کتے، چیل اور کوے نے نہیں کھایا چونکہ وہ میرے ہم وطن ہیں کتوں نے میرے جسم کے لوتھڑے اٹھا کر قبرستانوں میں دفن کئے اور چیل کوؤں نے فرقہ واریت اور دہشت گردی کے شکار شہر سے مجھے اٹھایا اور پہاڑیوں کے ان پتھروں پر رکھا جو برف سے ڈھکے ہوئے اور پاک تھے۔ مجھے اس لئے مارا گیا چونکہ میں مسلمان تھی اور جس نے مارا وہ بھی مسلمان تھا۔ اس نے مجھے مار کر جہاد کیا اور اپنا مذہبی فریضہ ادا کیا جس نے اسے مارنے کی تربیت دی وہ ایک بھارتی تھا جسے امریکہ اور اسرائیل نے اس مقدس کام کیلئے پیسہ دیا۔

مجھے پتہ ہے کہ وہ قندھار کے بھارتی کونسل خانے میں دہشت گردی کا کیمپ چلا رہا ہے پاکستان کے صدر، وزیر اعظم اور سبھی سیاستدانوں کو بھی پتہ ہے مگر بھارت کے بادشاہ کے سامنے کسی کو بولنے کی ہمت نہیں اے دوست کیا تو بتا سکتا ہے کہ امن کی آشا کیا ہے؟ یہ کیا جہاد ہے جو ایک نہتی غریب مزدور کی فاقہ زدہ بیٹی کے جسم کا قیمہ بنا کر فضا میں بکھیر دیتا ہے۔ کیا مولانا فضل الرحمٰن، ملا عمر، ملا فضل اللہ، میجر عامر، مولانا سمیع الحق، پروفیسر ابراہیم کے پاس اسکا جواب ہے کوئی ڈاکٹر منور حسن، مولانا فضل الرحمٰن اور سلیم صافی سے پوچھ کر بتا سکتا ہے کہ میں شہید ہوں یا مجھے مارنے والا شہید ہے ہم اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ پھر بولی۔ میں نے اپنے جسم کے ٹکڑے تو تلاش کر لئے مگر پیوند لگی سفید چادر کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کل میں نے دیکھا کہ میری سفید

چادر کو ہرے ڈبے میں بند کیا گیا جسپر پاکستان کی مرکزی حکومت کا سنہری نشان بھی تھا۔ میں نے ایسے ہی رنگ کے تابوت بھی دیکھے جنھیں سبز ہلالی پرچموں میں لپیٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے فوجی جوانوں کو رکھا گیا پھر یہ تابوت ان کے گھروں کو بھجوائے گئے۔ میں اپنی چادر اور ڈبہ پہچان گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ ڈبہ اور چادر ڈاکٹر عبدالمالک یا پھر محمد خان اچکزئی کو دیا جائے گا اور وہ یہ ڈبہ اور چادر کوئیٹہ کی ایک سنسان گلی میں واقع بوسیدہ مکان میں پڑی میری بیمار ماں کو دینگے۔ کوئی کہے گا زینب بی بی یہ تیری شہید فاطمہ کی چادر ہے جو اڑ کر اسلام آباد چلی گی تھی۔ یہ فاطمہ کی آخری نشانی اور تیری امانت ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ میرا باپ بھی اچکزئی پٹھان ہے اور میری ماں بلوچ ہے وہ غریب ہیں تو کیا ہوا ان کے قبیلے تو عظیم ہیں محمد خان اچکزئی ایک بڑے اور بہادر باپ کا بیٹا ہے وہ جانتا ہے کہ بیٹی کی چادر کی کیا عظمت ہے ڈاکٹر مالک بھی غیور بلوچ ہے وہ تو ہے ہی قوم پرست اسے پتہ ہے کہ قوم کی بیٹیوں کی عظمت و حرمت کیا ہے۔ وہ میری چادر کوئیٹہ میں واقع اس قبر پر لیجا ئینگے جہاں میرا سر اور جسم کے چند ٹکڑے دفن ہیں۔ بلوچستان پولیس کا دستہ میری ادھاری کچی قبر پر سلامی دیگا اور ڈاکٹر مالک میری پیوند لگی سفید چادکور قومی اعزاز کیساتھ میری قبر پر چڑھائے گا۔

اے دوست، ایسا نہیں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ پاکستانی حکومت کے سرکاری مونو گرام

والے گرین ڈبے پر بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کی ماں کیلئے لکھا گیا۔ نریند مودی کا نام دیکھ کر یوں لگا جیسے ایک اور دھماکا ہوا اور اسبار میری روح کو بکھیر گیا میری چادر اس شخص کی ماں کیلئے بھیج دی گئی جس کے کونسل خانے میں وہ بم تیار ہوا جس نے میرے جسم کے سو ٹکڑے کر دیئے میرے استاد نے کہا تھا کہ قوم کا لیڈر قوم کا باپ ہوتا ہے۔ شاید میں نے غلط سنا تھا یا پھر استاد غلطی پر تھے۔ کالے سوٹ اور سرخ خون آلود ٹائی والا شخص کیسا لیڈر ہے اور کس کا باپ ہے؟ سرخ خود آلود ٹائی اس کی اپنی امیر کبیر بیٹی نے پسند کی اور میری چادر بیچنے کا مسودہ کسی بڑے منہ والے سیفما زدہ صحافی اور جعلی میر چاکر نے دیا۔ کوئی طارق فاطمی اور سرتاج عزیز بھی اس مشورے میں شامل ہوا۔ خرم دستگیر بھارت میں پاکستانی سفیر نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور سندھ کے وڈیرے خورشید شاہ، آصف علی زرداری، عمران خان نیازی اور امیتا بھچن کے دوست چوہدری شجاعت نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ وقفے کے بعد پھر آواز آئی۔ کیا کوئی طالبان، کوئی خان، کوئی چوہدری، کوئی ملک، کوئی میاں، کوئی مولوی، کوئی لشکر، کوئی صحافی یا قوم پرست لیڈر میری چادر واپس لا سکتا ہے؟

میں خاموش رہا کہ فاطمہ کا پیغام کیسے دوں۔ میاں برادران امن کی آشا کے گیت گا رہے ہیں اور پاکستانی میڈیا بندے ماترم کی دھن بجا رہے ہیں۔ سفارتکار، صنعت کار اور تاجر بھارت دوستی سے مال کما رہے ہیں اور

سیاستدان انقلاب لا رہے ہیں دینی سیاسی جماعتوں کے لیڈر جمہوریت بچا رہے ہیں اور قوم پرست لیڈر اپنی اپنی قوم اور برادری کا الگ الگ ملک بنا رہے ہیں۔ پھر سوچا کیوں نہ نریندر مودی کی ضعیف العمر ماں سے ہی درخواست کروں کہ وہ گرین ڈبہ اور چادر آپ کے دھرم کے مطابق ناپاک ہے اور میرے لئے قومی غیرت کا نشان ہے۔ یہ چادر آپ کے پاس رہی تو آپ کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا اور واپس آ گئی تو فاطمہ کی روح کو سکون ملے گا۔ کشمیر سے کراچی اور پشاور سے گوادر تک جتنی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں بھارتی درندوں، بھارتی کونسل خانوں میں تیار ہونے والے بموں اور تربیت پانے والے خود کش بمباروں کے ہاتھوں شہید ہوئیں ان سب کی آواز فاطمہ کی آواز ہے۔ آپ جس فاطمہ کے گھر اس کی چادر بھجوائیں گی وہ فاطمہ کو ہی ملے گی جس فاطمہ کی قبر پر پیوند لگی سفید چادر چڑھائینگے یہ وہی فاطمہ ہو گی جو جنت میں خاتون جنت فاطمہ بنت رسول ﷺ کے قدموں میں بیٹھی اپنی داستان سنا رہی ہے کہ اسکے ایک طالب بھائی نے نفاذ شریعت کی خاطر مودی کے کونسل خانے سے تربیت لیکر کس طرح اسے گوشت کے لوتھڑوں میں بدل دیا۔ وہ ضرور پوچھ رہی ہو گی کہ اے اماں کیا تیرے ابا کی شریعت میں کہیں لکھا ہے کہ راہ چلتی فاطمہ کے جسم کے ٹکڑے کرنا جائیز ہے؟

آزاد کشمیر ریڈیو مجید آباد

اے ٹو زیڈ چوہدری کی جانب سے چوہدری بھائیوں، بہنوں، بچوں اور بوڑھوں کو سلام،آداب اینڈ بیرون ملک بسنے والی برادری کو گڈ مارننگ۔اس وقت مجید آباد میں دن کے بارہ بجے ہیں اور پیٹر برواینڈ برطانیہ کے دیگر شہروں میں صبح کے آٹھ بجے ہیں۔اب آپ برادری جمہوری حکومت کے حکمران چوہدریوں کے فرامین اور ان پر مختصر تبصرہ سنیئے۔

مظفرآباد سے نمائندہ برادری نے خبر دی ہے کہ حکمران برادری کے ہم خیال علمائے کرام نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا ہے۔ علماء کا کہنا ہے کہ طاہر القادری کی لٹھ بردار خواتین اور عمران پارٹی کا مخلوط ڈانس غیر شرعی، غیر اخلاقی اور اسلامی جمہوری اقدار کے منافی ہے۔

علمائے کرام سے سوال کیا گیا کہ آزاد حکومت کے آزاد منش وزیروں اور اعلیٰ حکومتی عہدیدار اور اعلیٰ ترین حکومتی شخص کے بیٹے کی ایک غریب طالبہ کے ساتھ اجتماعی زیادتی کس زمرے میں آتی ہے؟ تو علماء نے اس سوال کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ سوال مجید حکومت کو بدنام کرنے کے مترادف ہے۔ایک صاحب نے فرمایا کہ آپ کو زیادہ تکلیف ہے تو شریعت کورٹ میں چلے جائیں اور یاد رکھیں

کہ یہ اب ٹائم بار ہو چکا ہے اسلئے اسے بھول کر کسی نئے حادثے کا انتظار کریں۔
برادری وزیر اعظم چوہدری مجید نے ایک بیان میں فرمایا کہ پیپلز پارٹی نے ہمیشہ غریب عوام اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے موصوف نے یہ بیان سویٹ ہوم کیڈٹ کالج کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے دیا ہے۔
ایک نا ہنجار تبصرہ نگار نے بیان کو موتی چور لڈو سے تشبیح دیتے ہوئے کہا کہ اس تقریب اور پراجیکٹ کی ویلیو ایک لڈو کے برابر ہے چونکہ چوہدری صاحب سوائے میگا پراجیکٹ کے کسی منصوبے کا سنگ بنیاد نہیں رکھتے۔اس کالج کی تعمیر سے ملنے والے کمیشن سے بلال مجید، قاسم مجید کیلئے صرف ایک لڈو ہی خریدا جا سکتا ہے۔
بیرسٹر سلطان محمود چوہدری نے امریکہ سے انوکھی فرمائش کی ہے کہ وہ بھارتی کنٹرول والے کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی کو رکوائے۔اس انوکھی فرمائش کے جواب میں برطانیہ میں بسنے والے راجہ بھولا خان نے چوہدری صاحب سے الٹی فرمائش کر دی ہے کہ وہ کوٹلی کے عوام پر ہونے والے مجیدی مظالم کو

بھی رکوائیں اور ڈوگرہ صفت وزراء اور ان کے گماشتوں کو لگام دیں۔راجہ بھولا خان نے بیرسٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا حلقہ نمبر 4 کوٹلی کے راجپوت مسلمان نہیں ؟اور کیا ضلع کے راجپوت گھرانے انسان نہیں۔کیا ان کے حقوق کی پامالی انھیں نظر نہیں آتی۔بیرسٹر سلطان محمود نے راجہ بھولا خان کے بیان کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ میں .برادری ازم۔ بھٹو ازم،زرداری ازم سمیت دیگر ازوم پر ایمان رکھتا ہوں اسلئے.برادری حکومت اور جمہوریت کے خلاف کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔راجہ بھولا خان جب ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا تو بیرسٹر صاحب نے فرمایا کہ تمھیں یہ سوال راجہ فاروق حیدر سے کرنا چاہیئے جو میاں نواز شریف کے حکم پر تحریک عدم اعتماد سے دستبردار ہوگیا۔چوہدری صاحب نے راجہ بھولا خان کو لاجواب کرتے ہوئے کہا کہ ایک.برائے نام کشمیری صحافی کو میاں نواز شریف ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر آزاد کشمیر کا دورہ کیوں کراتا ہے؟ان جیسے لوگوں کیخلاف راجہ فاروق حیدر اور سردار سکندر آواز کیوں نہیں اٹھاتے؟جنگی نحوست سے مجید حکومت بھی نالاں ہے مگر مجبور ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر شخص جس کے پاس بنی منہاساں میں دو مرلے جگہ نہیں کشمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کا چیئرمین کیسے بن گیا ہے؟اس سے پہلے کہ بیرسٹر صاحب لینڈ مافیا کا کچا چھٹا کھول بیٹھتے راجہ بھولا اور دیگر راجے خاموشی سے اٹھے اور ن لیگ کے راجوں کیلئے چندہ جمع کرنے چلے گئے۔

صدر آزاد کشمیر سردار یعقوب نے فرمایا کہ وہ بھارتی آرمی چیف کے بیان اور دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونگے۔ صدر کے اس بے تکے بیان پر کسی منچلے نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے مرعوب ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ پہلے اپنی اوقات تو دیکھیں۔ فریال تالپور کے طلب کرنے پر آپ ننگے پاؤں بھاگتے نیلم ویلی چلے جاتے ہیں اور آپ کو سرپرست اعلیٰ آصف علی زرداری حکم دے تو سر کے بل دبئی پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کھائیں پئیں دورے کریں اور موج اڑائیں۔ آپ کی صدارت کی یہی حدود ہے۔ صدر صاحب نے منچلے تبصرہ نگار کو قریب بلا کر کہا کہ آپ خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہیں۔ مجھے بھی اپنی اوقات کا پتہ ہے۔ میرے پاس کونسی فوج ہے جو مقبوضہ کشمیر آزاد کروانے جا رہی ہے۔ اللہ کیپٹن حسین خان شہید کے درجات بلند کرے کہ وہ شہادت سے پہلے چیڑی کوٹ تک کا علاقہ آزاد کروا گئے تھے ورنہ آج علی سوجھل بھی مقبوضہ کشمیر میں ہوتا۔ تمھیں پتہ ہی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے پونچھ کے محاصرے پر کیا گل کھلائے۔ صدر صاحب نے ایک سفید لفافہ تبصرہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ وقت ملے تو کشمیر ہاؤس اسلام آباد آنا۔ کشمیر ہاؤسنگ سکیم پر ایک صحافی نما شخص قابض ہے ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے لئے بھی کوئی گنجائش نکالے اگست کے پہلے ہفتے میں سردار یعقوب نے سردار عبدالقیوم صاحب کی عیادت کی۔ اس موقع پر سردار عتیق اور عثمان عتیق بھی موجود تھے۔ بعد میں صدر ریاست نے سردار عتیق اور عثمان عتیق سے علیحدگی میں ملاقاتیں کیں جسکی وجہ سے سردار عبدالقیوم کی طبعیت مزید خراب

ہو گئی۔ تبصرہ نگار تاحال سکتے میں ہیں کہ آخر وہ کونسا پیغام تھا جو باپ بیٹے کو الگ الگ دیا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سردار عتیق کی جنرل عزیز سے رشتہ داری ہے۔ جنرل عزیز خان کا بھتیجا سردار صاحب کا داماد ہے اور جنرل صاحب کی بیگم نے پیپلز پارٹی کی زنانہ سیٹ پر الیکشن جیتا ہے۔ جنرل عزیز اب دھڑتک پیپلز پارٹی میں شامل ہیں اس لئے ہوسکتا ہے کہ سرڈبونے سے پہلے عثمان عتیق کو بھی ساتھ لیکر ڈوبیں۔

محترمہ سمشاد عزیز کی پیپلز پارٹی میں انٹری ایک بڑا اور انوکھا واقع ہے۔ آپ اگر سردار یعقوب، عثمان عتیق اور جنرل عزیز کو بھی ساتھ ملا لیتے ہیں تو نہ صرف سردار عبدالقیوم صاحب کی صحت پر برا اثر پڑے گا بلکہ سردار عتیق بھی بیمار پڑ جائینگے۔ ایک صوفی منش تبصرہ نگار نے کہا ہے کہ مسلم کانفرنس کے حامیوں اور ہمدردوں کو دسمبر آخر تک یا شافی کا ورد کرنا چاہیئے اور بنی منہاساں کے شر سے بچنے کیلئے کالی مرغیوں کا صدقہ دینا چاہیئے۔

آزاد حکومت کے سینئر ترین، امیر ترین، ذہین ترین، فطین، سندھی ادب، ثقافت کے شوقین وزیر جنھوں نے میٹرک کے سال دوئم کے امتحان میں سندھی زبان وادب میں فسٹ ڈویژن لیکر سندھی مفکر بن کر حیران کر دیا ہے نے اپنے ہوٹل واقع بارسلونا سپین سے بیان جاری کرتے ہوئے فرمایا کہ اقوام متحدہ غزہ پر اسرائیلی جارحیت بند کروائے۔

چوہدری صاحبان نے اس بیان پر ایک ٹن تبصرہ نگار نے کہا کہ جناب آپ نے تحصیل
چڑھوئی کو بھی تو غزہ بلکہ غزہ سے بدتر بنا رکھا ہے۔لگتا ہے کہ آپ نے یہودی پروٹوکول
پڑھنے کے بعد اسرائیلیوں کے اصولوں پر استوار پروگرام ترتیب دے رکھا ہے۔آپ کے
اور اسرائیل

کے منصوبے ایک جیسے ہیں۔اسرائیل مسلمانوں کا اور آپ راجپوتوں کے خلاف جارحیت
کر رہے ہیں۔آپ میں اور ارل شیرون میں صرف اتنا فرق ہے وہ اپنے آپ کو اللہ کا
شیر کہتا تھا اور آپ اپنے آپ کو کوٹلی کا شیر کہتے ہیں۔

اسرائیلیوں نے عربوں کی زمینوں پر قبضہ کیا اور آپ راجپوتوں کی شاملاتوں اور جدی
جائیدادوں کا پٹواریوں کے ذریعے ریکارڈ مسخ کروایا۔اب آپ حلقے کا پٹوار خانہ ہی اپنے
گھر لے گئے ہیں۔جہاں کسی مسلمان راجپوت کی رسائی ہی ممکن نہیں۔ضلع کوٹلی خاصکر
حلقہ نمبر 4 درحقیقت منی اسرائیل ہے۔برائے مہربانی یہ بھی تو بتائیں کہ آپ کی چیرہ
دستیوں کے خلاف کونسی اقوام متحدہ میں جائیں؟آزاد کشمیر کی عدالتیں اور حکومت آپ
کے کسی ظلم وزیادتی پر فیصلہ نہیں کرتیں۔آپ نے نادرہ کا دفتر اور سب تحصیل اپنے
گھر منتقل کر دی تو عدالت نے عوام کی نہیں بلکہ آپ کی حمایت میں فیصلہ دے
دیا۔حکومت نے سب

تحصیل کے نوٹیفکیشن میں لکھا کہ یہ سب ڈویژن سینئر وزیر کی خواہش پر قائم کیا جارہا ہے۔بعد میں یہ نوٹیفکیشن بدل دیا گیا اور آپ کے محترم و مقدس خواہش کی جگہ عوام کی خواہش لکھ دیا گیا۔ عوام عدالت میں گئی تو عدل کا ترازو آپ کے حق میں جھک گیا۔وزیر اعظم نے اس عدالتی فیصلے پر جشن منا کر ثابت کیا کہ وہ ایک برادری کے وزیر اعظم ہیں ریاست کے نہیں۔جو وزیر اعظم اور حکومت عوام دشمن اور برادری دوست ہو اسے ایک نااہل، نالائق اور جبری حکومت نہ کہنا جرم ہے۔

حضور ذرا یہ تو بتائیں کہ ایک صحافی کے پاس کونسا ایسا راز ہے کہ جسکی وجہ سے وہ کشمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کا چیئر مین بن گیا ہے۔چوہدری صاحب جواب کی تیاری کر رہے تھے کہ کسی جیالے نے کہا کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ مرغ ذبح ہونے سے پہلے منڈیر پر چلتا اور بے وقت آزان دیتا ہے۔ بھوکا بکرا روٹیاں کھا کر بدہضمی کا شکار ہو کر مر جاتا ہے۔کشمیر ہاؤسنگ سوسائٹی میں ماضی میں جتنے گھپلے ہوئے اب اسکا جواب بھی اب موصوف ہی دے گے۔نیو میر پور سوسائٹی کے گھپلوں اور کرپشن کے حساب میں بھی اسکو شامل کیا جائے گا چونکہ تیں کروڑ کی بخشش ڈکارنے والوں اور عدم اعتماد کی تحریک رکوانے والوں میں بھی شامل تفتیش ہے۔

چوہدری صاحب نے سوال کرنیوالے کی طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ خوش رہو، کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ۔ سامعین محترم آج کے پروگرام کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے۔ چکسواری ہوٹل پر کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اپنے میزبان اے ٹوزیڈ چوہدری کو اجازت دیں۔ اگلے ہفتے. برادری بولیٹن کے ساتھ آزاد کشمیر ریڈیو مجید آباد سے پھر حاضر ہونگا۔ جیئے. برادری جیئے قاسم جیئے بلال جیئے مجید۔

تبدیلی کے بغیر ترقی ممکن نہیں

پاکستان کے حالات کس نہج پر جا رہے ہیں؟ ان کا اختتام کیا ہوگا؟ کیا کوئی خوشگوار تبدیلی متوقع ہے یا محض چند لیڈروں کی ذاتی لڑائیاں میں غربت افلاس اور مصیبت کی ماری عوام کے دکھوں میں اضافہ ہی ہونے والا ہے؟ حکومت رہے گی یا نہیں؟ فوج آئے گی یا مڈٹرم الیکشن ہوں گے؟ یہ وہ تمام سوالات ہیں جو پاکستان کا ہر فرد پوچھ رہا ہے؟ چند روز سے اپنی پیشہ وارانہ سرگرمیوں کے سلسہ میں دینا پر حکمرانی کرنے والے اور خاص طور پر اسلامی دنیا کو اپنے اشاروں پر نچانے والے ملک امریکہ بہادر میں موجود ہوں۔ یہاں آ کر پاکستان، انڈیا اور دیگر اسلامی ممالک سے آئے ہوئے باشندوں سے ملاقات ہوئی جن کی زبان پر بھی وہی سوالات تھے۔ جس طرح پاکستان کے اندر بسنے والے ان سوالات کے جوابات اپنی اپنی مرضی اور پسند سے تلاش کرتے ہیں یہاں بھی پاکستانیوں سے ایسا ہی سننے کو ملا۔ مگر دیگر ممالک کے لوگوں میں سے ایک بزرگ نے کہا کہ آپ کے ملک میں مسائل دائرہ اختیار سے تجاوز کی وجہ سے ہیں۔ مجھے اس بزرگ کی بات حقیقت کے بہت قریب لگی۔ قدرت کا بھی یہی اصول ہے کہ تمام سیارے اپنے مقرر کردہ محور میں گھوم رہے ہیں۔ توازن بگڑنے سے قیامت برپا بھی اس حدود کی پامالی سے ہی ہو گی۔ خیر بات کسی اور طرف چل پڑی پاکستانی قوم کا ایک خاصہ ہے یہ جلد باز

اور وقتی فائدے کو ترجیح دیتے ہیں۔ محض وقت گزانے کے لیے انتہائی اقدامات اٹھا لیتے ہیں۔ بنا یہ سوچے کہ مستقبل میں ان اقدامات کا کیا فائدہ یا نقصان ہونے والا ہے۔ پاکستانی قوم اس وقتی، جلدی اور فوراً کے چکر میں 67 سالوں سے نقصان اٹھا رہے ہیں اور معلوم نہیں آگے اور کتنا مزید نقصان اٹھاتے رہیں گے۔ یہ ہمارا بحثیت قوم المیہ ہے۔ ملک میں آنے والے ہر فوجی آمر نے سیدھی اور معصوم (سیاسی شعور) قوم کو سبز باغ دکھائے عوام نے نعرے لگائے، بلے بلے کی۔ جب تک آمریت قائم رہی بیرونی دنیا اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہمیں استعمال کرتے رہے اور اس کا رینٹ دیتے رہے۔ پیسہ آتا رہا خواص عیاشیاں اور عوام کو بھنگ پلا کے مدہوش کیے رکھا۔ بظاہر پیسے کی ریل پیل اور ترقی نظر آتی رہی مگر حقیقت میں اندر سے کھوکھلا کرتے گے۔ بیرونی آقاوں کا ایجنڈا پورا ہونے کے بعد آمر کو جانا ہوتا ہے۔ جس سے بیرونی کمک بھی رک جاتی ہے اور عوام پر غربت اور افلاس آشکار ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں جمہوری حکومت کا ظہور ہو چکا ہوتا ہے لہذا سارا ملبہ جمہوریت اور سیاسی جماعتوں پر پڑھ جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ سیاسی جماعتیں یا جمہوریت پسند لیڈر اس فعل میں حصہ دار نہیں یا معصوم ہیں ۔ ہمارے پڑوس میں ہم سے زیادہ کرپشن ، غنڈہ گردی، پولیس گیری وغیرہ وغیرہ موجود ہے مگر وہاں جمہوریت چل رہی ہے وہاں کوئی ایڈونچرازم نہیں ہو رہا اس لئے وہ ہمارے ساتھ آزاد ہو کر آج ہم سے ترقی میں کئیں گناہ آگے ہیں۔

آصف علی زرداری صاحب سے ہزار اختلاف سہی، طرزِ حکمرانی میں ہزار خامیاں سہی، مگر آمر کے جانے کے بعد حکومت سنبھالنا اور پھر پاکستان میں پانچ سال پورے کرنا واقعی ہی ایک کارنامہ ہے۔ بیشک عدالتوں کے چکروں میں دو وزرائے اعظم بدلے مگر پانچ سال پورے کر لئے۔ پاکستان میں ہونے والے انتخابات ہمیشہ سے ہی تنقید کا نشانہ بنتے رہے۔ اس بار ایک جمہوری حکومت نے نگران حکومت کو تشکیل کیا اور اعلیٰ عدلیہ کی نگرانی میں تمام جماعتوں کی مرضی سے الیکشن کمیشن تشکیل دیا گیا۔ ان انتخانات پر بھی تمام جماعتوں نے ہمیشہ کی طرح تحفظات کا اظہار کیا اور دھاندلی کے الزامات بھی لگائے گے۔ اب اسمبلی میں بیٹھی سیاسی جماعتوں کا کام بنتا تھا کہ ہر بار دھاندلی کا الزام لگانے کی بجائے ایسے اقدامات کریں جن سے مستقبل میں ان قباحتوں سے بچا جا سکے۔ مگر ایسا نہ ہوا بلکہ علامہ طاہر القادری نے حسب سابق کینیڈا سے اعلان انقلاب کر دیا اور عمران خان صاحب نے لاہور کی سڑکوں پر آزادی مارچ شروع کر دیا۔ دھرنے احتجاج اور ریلیاں جمہوری حکومتوں میں ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا حکمرانوں کو پریشر میں، رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوتے ہیں۔ یہ انقلابی اور آزادی مارچ، دھرنے کس کے کہنے پر کیوں، کب کیسے یہ وہ بحث ہے جس کا کوئی واضح جواب نہیں مل سکتا، چونکہ سیاست دانوں نے ماننا نہیں اور انوسٹر کبھی سامنے آتا نہیں۔ لہٰذا اس مسلے کے حل کی طرف جانا چاہیے۔

عمران خان اور علامہ کے مارچ اور دھرنوں میں لوگ کیوں نکلے؟ پھر لاہور، کراچی ملتان، فیصل آباد لوگ کیوں اتنی بڑی تعداد میں آئے؟ یہ وہ سوال ہیں جو میاں نواز شریف سے ہر باشعور شخص پوچھ رہا ہے؟ اگر حکومت اپنے فرائض پوری طرح نبھا رہی ہوتی، عوام کے مسائل حل ہو رہے ہوتے، غریب کا چولہا جل رہا ہوتا تو عوام اتنی بڑی تعداد میں آپ کی مخالفت میں نہ نکلتے۔ مگر میاں صاحبان کی آنکھوں پر چھائے پردے جو اس سے قبل انھیں دو بار دو تہائی اکثریت ہونے کے باوجود حکومتوں سے نکال باہر کرتے رہے ابھی تک نہیں ہٹے۔ مسلم لیگ ن محض دس لوگوں کی جماعت کا نام ہے، جس میں میاں صاحب کے خاندان کے علاوہ وہ منظور نظر لوگ ہیں جو ہمیشہ خوش آمدی پروگرام میں مصروف رہتے ہیں۔ مرکز میں سارے اختیارات میاں نواز شریف اور صوبے میں میاں شہباز شریف کے پاس ہیں۔ مرکز میں وزارات ہونے کے باوجود وزیر بے اختیار ہیں۔ اسحاق ڈار، خواجہ سعد، خواجہ آصف، پرویز رشید ایک طرف اور چوہدری نثار دوسری طرف، ان احباب کی مرضی کے بنا عوام تو دور کسی وزیر یا ممبر اسمبلی کی بات بھی کوئی سیکریٹری نہیں سنتا۔ اس سے کہیں ابتر حالات پنجاب کے ہیں جہاں میاں شہباز شریف اور میاں حمزہ شہباز تمام سیاہ سفید کے مالک ہیں۔ پنجاب جو آدھا پاکستان ہے وہاں پر ایک فرد خواہ کتنا ہی محنتی کیوں نہ ہو کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو کیسے تمام معاملات حکومت چلا سکتا ہے؟ مرکز اور

صوبے میں میاں صاحبان تنہا ہوتے جا رہے ہیں مگر ان کے نو رتن انھیں خوش فہمیوں میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ جو ان کے لیے دن بدن مشکلات بڑھا رہے ہیں۔ عمران خان کے الزامات اپنی جگہ درست یا غلط مگر ان کے جواب میں تیسرے دن پرویز رشید آ کے بولتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے مسلم لیگ اعوان میں اکثریتی جماعت ہے مگر چند ایک چہروں کے علاوہ باقی ممبران کسی ٹی وی شو میں کیوں نظر نہیں آتے؟ کیوں کہ میاں صاحبان کا رویہ تمام کو متنفر کیے ہوئے ہے۔ چوہدری نثار کو تو میاں شہباز آ کر منا لیتے ہیں مگر دیگر ممبران پارلیمنٹ کو کیوں گھاس نہیں ڈالی جا رہی؟ میاں صاحبان یہ سمجھتے ہیں کہ ان تمام ارکان کو ووٹ مسلم لیگ ن کے ٹکٹ کی وجہ سے ملے ہیں۔ کسی رکن کی اپنی کوئی حشیت نہیں۔ یہی خام خیالیاں انھیں اس نہج پر لے آئی ہیں کہ ان کی حکومت شدید دباو کا شکار ہے اور نئے الیکشن کی بازگشت تیز ہوتی جا رہی ہے۔ گورنر پنجاب جیسے فرد کو بھی میاں شہباز شریف نے کھڈے لگائے رکھا ہے۔ وہ تعلیمی اور فلاحی کاموں کا تجربہ اور دلچسپی رکھنے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتے، کیونکہ شہباز شریف صاحب کو لگتا ہے کہ اگر چوہدری سرور کے نام کی تختیاں لگنا شروع ہو گئی تو ان کی شان میں کمی آ جائے گئی۔ ذرا سوچیے پنجاب اسمبلی کے 367 ممبران میں سے 311 مسلم لیگ ن کے ہیں، اتنی بڑھی تعداد میں ایم پی ایز ہونے کے باوجود شہباز شریف کو کیوں بیس وزاراتیں پاس رکھنی پڑھ رہی ہیں؟ محض چوہدراہٹ اور اجارہ داری کو قائم رکھنے کے لیے۔ یہ حالات ہیں

لیڈر شپ کے عوام کا یا مسلم لیگ کے ووٹر کا کیا حال ہو گا اس کا اندازہ باخوبی لگایا جا سکتا ہے ؟ اور اس کا عملی مظاہرہ تحریک انصاف کے جلسوں میں نظر آ رہا ہے۔ میاں صاحبان جب تک دوسروں کو برداشت کرنا نہیں شروع کرتے ان کے لیے حالات مزید خراب ہوتے جائیں گے۔

دوسری طرف خان صاحب سیاست کی بجائے آمریت پر اتر آئے ہیں جو درست نہیں۔ عمران خان کے مطالبات سب درست بھی مان لیے جائیں تو ان کا حل وزیر اعظم کے استعفٰی میں نہیں ہے۔ میاں نواز شریف کے چلے جانے سے سسٹم درست نہیں ہو جائے گا، آئین نہیں بدلے گا قانون میں تبدیلی نہیں آ جائے گی۔ عمران کا بڑا مطالبہ الیکشن میں دھاندلی ہے، اس دھاندلی کو اگلے انتخابات میں کیسے روکنا ممکن ہے ؟ اس کے لیے میاں نواز شریف کا جانا ضروری نہیں بلکہ آئینی اصلاحات ضروری ہیں۔ ملک میں کرپشن روکنے کے لیے بھی قانونی سقم دور کرنے ہوں گے نہ کہ وزیر اعظم کی چھٹی سے یہ معاملات حل ہونے والے ہیں۔ عمران خان اور طاہر القادری صاحب کے دھرنے کامیاب اور جلسے نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں اگر ان جلسوں اور دھرنوں کے زور سے حکومت کو آئینی ترامیم کرنے پر مجبور کر دیا جاتا۔ اگر عمران خان اور طاہر القادری واقعی ہی عوام کی جنگ لڑ رہے ہیں تو اس کا واحد حل یہی ہے۔ میں نہ مانوں والی رٹ لگانے کا مطلب پھر کچھ اور ہی ایڈونچر ہو سکتا ہے، عوام کی فلاح اور بہبود نہیں۔

میاں صاحبان کو ان کے نو رتن یہ مشورہ کیوں نہیں دے رہے، سو چھتر اور سو گنڈے، والا حساب نہ ہو! اس لیے حکومت کو چاہیے کہ سنبھل جائیں دوسروں کو برداشت کرنا سیکھیں۔ عوام کے، جمہور کے نمائندہ بنیں نہ کہ انا، ذاتیات، اور خاندان کے۔ عوامی تحریک، تحریک انصاف کے بعد جماعت اسلامی اور اب پیپلز پارٹی کے جلسوں سے محسوس ہو رہا ہے کہ الیکشن کا ماحول بنایا جا رہا ہے۔ اگر الیکشن ہو جاتے ہیں اور نئے الیکشن بھی اسی پرانے طریق پر ہوتے ہیں تو عمران خان کو قوم کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ملک میں تبدیلی نعروں سے نہیں بلکہ عملی اقدامات سے آئے گی اس کے لیے آئین میں تبدیلی ضروری ہے، پہلے الیکشن ریفارمز کیے جائیں اس کے بعد الیکشن کی طرف جایا جائے۔ تو ہی حقیقی تبدیلی آئے گی ورنہ خان صاحب کی تبدیلی محض کرسی کی اور اختیارات کی تبدیلی ہو گی۔ آخر میں حکمرانوں اور عمران خان دونوں کی خدمت میں جارج برنارڈ شا کا یہ معروف قول ۔۔۔۔۔ تبدیلی کے بغیر ترقی ناممکن ہے، اور جو لوگ خود اپنی سوچ تبدیل نہیں کر سکتے وہ کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے۔

چوہدری بلاول

دوستو! یہ طنز نہیں بلکہ حقیقت ہے اور عقلمندوں سے درخواست ہے کہ وہ اس تحریر کو سنجید گی اور غور سے پڑھیں۔ رب کائنات کا فرمان ہے کہ ہر چیز لوح محفوظ میں لکھی جا چکی ہے اور کوئی چیز اُس سے باہر نہیں۔ ہر چیز اللہ کے احاطہ قدرت میں ہے اور اُسی کے حکم کے تابع بنتی، بگڑتی اور سنورتی ہے۔ نباتات، جمادات اور حیوانات کی الگ تاریخ ہے اور ہر ایک کا مقصد و مطلب تاریخی صفحات پر موجود ہے۔

آیئے اب مقصد کی بات کرتے ہیں کہ آخر کیا ضرورت پڑی کہ آزاد کشمیر کے ضلع میرپور سے تعلق رکھنے والے جاٹ قبیلے کے تین تمنداروں نے لندن کے ملین مارچ سے پاکستان پیپلز پارٹی کے نوعمر چیئرمین کو خطاب کی دعوت دیکر اُسے بے توقیر کیا۔ بوڑھے کالم نگاروں اور نوعمر اینکروں نے بغیر سوچے سمجھے محض بغض اور کینے کی بنیاد پر بلاول بھٹو زرداری پر انڈوں، جوتوں اور بوتلوں کی بمباری کا سارا الزام عمران خان کے بھانجے پر لگا دیا۔ دیکھا جائے تو عمران خان نیازی اور بھانجے حسن نیازی کا کشمیر سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مولانا فضل الرحمٰن، آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف کا کوئی تعلق ہے۔ عمران خان اپنے جلسوں میں بڑی احتیاط سے مسئلہ کشمیر کا ذکر کرتا ہے اور کبھی کھل کر بھارتی جارحیت اور درندگی پر مذمت کے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ فضل

الرحمٰن کا کشمیر سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین ہیں اور کشمیر کے نام پر کھا رہے ہیں۔ مولانا کی شریعت جو بھی کہتی ہو اُسکا تعلق مولانا اور اُن کی پارٹی سے ہے مگر میرے نزدیک یہ حرام نہیں تو ناجائز ضرور ہے۔ سیاسی بلیک میلنگ سے مفادات کا حصول اور ایک ایسے کام کا صلہ جو اصلاً ہو ہی نہ رہا ہو کسی طور جائیز نہیں۔ یہ مفادات، سہولیات اور مراعات سراسر ناجائز اور مکروہ ہیں۔ مولانا کشمیر کمیٹی کی چیئرمینی سے کشمیریوں کو کیا فائدہ پہنچا رہے ہیں، سب کے سامنے ہے۔ کشمیر کمیٹی کی چیئرمینی محض پر لطف زندگی گزارنے کے لیے حاصل کرنا ایک گھناؤنی حرکت اور کرپشن سے لبریز عمل ہے جس پر کشمیریوں کو احتجاج کرنا چاہیے مگر بدقسمتی سے کشمیری ٹکڑیو میں بٹے ہوئے ہیں اور ٹکڑوں کی خاطر اپنے سیاسی آقاؤں کے قدموں میں بیٹھے خود اپنے لیے مراعات مانگتے پھرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ لندن مارچ میں کشمیر کمیٹی کے چیئرمین کیوں شریک نہ ہوئے اور بلاول بھٹو زرداری کو خطاب کی دعوت کیوں دی گئی۔ کیا بلاول کشمیری ہیں؟ اُنکے خاندان، قبیلے یا گوت کا کوئی تعلق کشمیر سے ہے؟ جہاں تک بھٹو اور زرداری قبیلے کا تعلق ہے تو اُنکی تاریخ بھی ایسی نہیں کے اُسے اچھے نام سے یاد کیا جائے۔ جناب زرداری کی تاریخ انتہائی تلخ ہے۔ پاکستان کی صدارت سنبھالتے ہی آپ نے فرمایا کہ پاکستان نیو کلئیر سٹرائیک میں پہل نہیں کریگا۔

موصوف سے کسی نے نہیں پوچھا کہ حضور دوسری سٹرائیک کیا ہوتی ہے۔ نیو کلئیر سٹرائیک پہلا پتھر یا دوسرا پتھر نہیں ہوتا اور نہ ہی پہلا حملہ اور جوابی حملہ ہوتا ہے۔ آخر یہ بیان ایک بھارتی چینل کو دینے کی کیا ضرورت تھی اور کس کو خوش کرنے کے لیے یہ بیان دیا گیا کسی نے اس پر برا نہ منایا بلکہ بہت سے ریٹائرڈ جرنیلوں اور بڈھے صحافیوں نے اس احمقانہ بیان کو بھی فلسفے اور منطق کا رنگ دے دیا۔ مرد حر کا خطاب دینے والے مرحوم نظامی صاحب نے بھی اپنا خطاب واپس نہ لیا اور نہ ہی ایوان وقت میں اس بیان پر کوئی تنقید ہوئی کہ صدر مملکت کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس قسم کا غیر ذمہ دارانہ بیان دیں۔ صدر زرداری نے ہی مولانا فضل الرحمٰن کو کشمیر کمیٹی کا چیئرمین بنایا اور پھر اعلان کیا کہ مسئلہ کشمیر کو چالیس سال تک منجمند کر دیا جائے۔ جناب زرداری کی کشمیر پالیسی کشمیریوں کو بھارت کے رحم وکرم پر چھوڑنے کی پالیسی تھی جسے شریف برادران نے بھی اپنا لیا۔ اسکا ایک تسلسل مولانا فضل الرحمٰن کو دوسری بار کشمیر کمیٹی کا سربراہ بنانا اور آزاد کشمیر میں ن لیگ کا قیام بھی ہے۔ شریف برادران بنیادی طور پر بیوپاری اور کاروباری لوگ ہیں۔ سستا خریدنا اور مہنگا بیچنا کاروبار کی بنیاد ہے۔ سو سنار کی اور ایک لوہار کی مثال ویسے ہی نہیں بنی۔ سنار تولہ، ماشا اور رتی کی بات کرتا ہے اور لوہار منوں، ٹنوں اور لوہے کی کانوں کے سودے کرتا ہے۔ وہ لوہار ہی کیا جو لوہے کو سونے کے بھاؤ فروخت نہ کرے۔ سنار ایک حد تک سونے میں کھوٹ ملاتا ہے جبکہ

لوہار کچرے سے لوہار بنا کر فروخت کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو میاں برادران ہی نہیں بلکہ اُن کے بچگان اور خواجگان بھی اس فن کے ماہر ہیں۔

زرداری کی پالیسیاں اپنانا اور تسلسل قائم رکھنا سیاست نہیں سازش ہے مگر ٹی وی اور اخباروں میں اسکا ذکر نہیں ہوتا۔ میڈیا کا فوکس عمران ، قادری ، ملالہ ، بلاول اور گلوبٹ تک محدود ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کو کشمیر کمیٹی کا چیئرمین برقرار رکھنا مسئلہ کشمیر سے دستبرداری کے مترادف ہے اور جیالے چوہدری اور حکمران برادری اس پر متفق ہے۔

اس سے پہلے کہ لندن مارچ کی طرف جائیں بھٹو خاندان کی کشمیر سے وابستگی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جناب سر شاہنواز بھٹو اور پنڈت نہرو انتہائی قریبی دوست تھے اور ایک ہی دور میں برطانیہ میں زیر تعلیم بھی رہے۔ جناب ڈاکٹر شبیر احمد مقیم فلوریڈا نے ایک مضمون میں لکھا کہ سر شاہنواز بھٹو تقسیم سے پہلے ریاست جوناگڑھ کے وزیراعظم تھے۔ آپ کا تعلق سندھ کے علاقے لاڑکانہ سے تھا اور آپ ایک راجپوت گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ جوناگڑھ کا نواب دور اندیش آدمی نہیں تھا اس لیے ریاست کا نظام وزیراعظم کے ہاتھ تھا۔ تقسیم کا وقت آیا تو سر شاہنواز نے کہا کہ ہم پاکستان کے لیے اور پاکستان ہمارے لیے ہے۔ ڈاکٹر شبیر لکھتے ہیں کہ اس نعرے کی بنیاد یہ

تھی کہ جوناگڑھ ایک مسلم ریاست تھی۔ ڈاکٹر شبیر بھول گئے کہ جوناگڑھ ایک چھوٹی اور جغرافیائی لحاظ سے پاکستان سے بہت دور تھی۔ مان لیتے ہیں کہ نواب مہابت خان سوئم دور اندیش نہ تھے تو اُن کے دور اندیش وزیراعظم نے جو فیصلہ کیا اُس فیصلے سے پاکستان، نواب خاندان اور جوناگڑھ کے عوام کو کیا فائدہ ہوا۔ 15 اگست 1947 کے دن نواب آف جوناگڑھ نے الحاق پاکستان کی دستاویز پر دستخط کیے اور یہ فیصلہ قائداعظم کی رائے لیے بغیر کیا گیا۔ 21 اگست 1947 کے دن الحاق کی دستاویز قائداعظم کو پیش کی گئی تو آپ نے بغیر کسی تاثر کے اس پر دستخط کر دیے۔ ظاہر ہے کہ قائداعظمؒ اس دستاویز کو مسترد نہیں کر سکتے تھے۔ جونہی قائداعظم نے دستاویز پر دستخط کیے سملداس گاندھی (چیف سیکرٹری جوناگڑھ) کے حکم پر بھارتی فوج ریاست میں گھس آئی۔ اس سے پہلے دو ہفتوں تک برٹش انڈین حکومت نے جوناگڑھ کا رابطہ باقی دنیا سے منقطع کر دیا اور ریاست کی مکمل ناکہ بندی کر دی۔ ٹیلی فون، پوسٹل سروس اور روڈ کیمونیکشن کاٹ دیا گیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نواب صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ الحاق پاکستان جیسی خطرناک مہم سے باز آجائیں ورنہ کسی بھی ناگہانی صورت میں پاکستان آپ کی مدد نہیں کریگا، جبکہ ریاست کی مسلم آبادی بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دے گی۔

بھارتی افواج انگریز افسروں کی قیادت اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل کے حکم

پر کاٹھیاواڑ اور جوناگڑھ میں داخل ہوئیں تو ریاستی پولیس اور فوج نے کسی مزاحمت کے بغیر ریاستی نظام انگریز افسروں کے حوالے کر دیا۔ جوناگڑھ اور کاٹھیاواڑ کے عوام نے بھی نواب صاحب کے فیصلے پر کوئی رد عمل نہ دکھایا اور نہ ہی بھارتی فوج کی آمد پر کوئی ہنگامہ ہوا۔ نواب صاحب کسمپرسی کی حالت میں کراچی آئے تو بھارتی سٹیٹ یونین نے کراچی کے بینکوں میں جمع نواب صاحب کے ایک کروڑ کے کھاتے منجمند کر دیے۔ جوناگڑھ ہندوستان کی خوشحال ترین ریاست تھی اور نواب کا خزانہ کسی طور سو کروڑ مالیت کے جواہرات سے خالی نہ تھا۔ نواب صاحب جان بچا کر کراچی آنے سے پہلے انتہائی دردناک تحریر چھوڑ کر چلے۔ نواب نے اپنے دستخطوں سے آخری شاہی فرمان جاری کرتے ہوئے لکھا کہ ہمارے آباواجداد کی قبروں، مقبروں اور یادگاروں سمیت تعمیرات کو مسمار نہ کیا جائے، مذہبی مقامات کا تقدس بحال رہے اور عوام پر کسی قسم کا ظلم نہ ڈھایا جائے۔

نواب آف جوناگڑھ خالی ہاتھ اور تن پر لگے کپڑے لیکر کراچی آئے تو کسی نے حال تک نہ پوچھا۔ دانشور اور دانشمند وزیراعظم کی جاگیر کے متعلق خود اُن کی پوتی محترمہ بینظیر بھٹو اپنی کتاب دختر مشرق میں لکھتی ہیں جیکب آباد سے ٹرین چلی تو انگریز نے اپنے ماتحت سے پوچھا کہ یہ زمین کس کی ہے۔ ماتحت نے جواب دیا کہ بھٹو کی زمین ہے۔ کئی ریلوے اسٹیشن گزر گئے تو افسر نے پھر

پوچھا کہ زمین کسی کی ہے۔ ماتحت نے کہا بھٹو کی ہے۔ انگریز افسر نے سونے کے لیے آنکھیں بند کیں اور ماتحت کو حکم دیا کہ جب بھٹو کی جاگیر ختم ہو جائے تو مجھے جگا دینا۔ انگریز افسر سو کر اُٹھا اور ایک پھر پوچھا اب زمین کس کی ہے۔ تو ماتحت نے پھر کہا زمین بھٹو کی ہے۔

بھٹو کی جاگیر بہت سی ہندوستانی ریاستوں سے بڑی تھی مگر نواب آف جونا گڑھ کے لیے اُن کی ریاست کے وزیر اعظم نے کچھ نہ کیا۔ ہندوستان کی خوشحال ترین اور امیر ترین ریاست کا خزانہ کہاں گیا یہ بھی کسی کو معلوم نہ ہوا۔ نواب بے یار و مددگار کراچی آیا مگر وزیر اعظم کی کہانی الحاق پاکستان کی دستاویز پر دستخطوں کے بعد ختم ہو گی۔ سر شاہنواز بھٹو 1947ء کے بعد سندھ کی سیاست میں سرگرم ہوئے اور نواب آف جونا گڑھ تاریخ کے تاریک گوشے میں گم ہو گئے۔

قبضے کے بعد جونا گڑھ اور کاٹھیاواڑ کے عوام پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے گئے اور ترقی و خوشحالی کے سارے ذرائع ہندو تاجروں کے ہاتھوں بک گئے۔ یونین منسٹر سردار پٹیل نے ریاست کا دورہ کیا اور مہاراجہ پٹیالہ کے ہمراہ انڈین پریس سے غیر رسمی بات چیت کے دوران دبے الفاظ میں ساری سازش کی کہانی بیان کر دی۔ نہرو، کانگریس، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور انڈین پریس کی مشترکہ کاوش نے

جوناگڑھ اور کاٹھیاواڑ پر قبضے کے بعد مہاراجہ کشمیر کو واضح پیغام دیا کہ وہ بھی خود مختار کشمیر کا خیال دل سے نکال دے۔

جوناگڑھ پر بھارتی قبضے کے بعد پاکستان میں کوئی ہلچل نہ ہوئی اور نہ ہی کسی اہم سیاسی اور حکومتی شخصیت نے نواب کا حال پوچھا۔ قانوناً ریاست کا الحاق پاکستان سے ہو چکا تھا اور حکومت وقت کو چاہیے تھا کہ وہ فوراً اس مسئلے کو عالمی سطح پر اُٹھاتی اور یواین او کے دروازے پر دستک دیتی۔ وزارت داخلہ خاص کر وزرات خارجہ اور دفاع نے کئی ہفتوں تک قائداعظم کو اس ساری کہانی سے بیخبر رکھا اور وزیر خارجہ سر ظفراللہ نے خاموشی اختیار کی۔ سر شاہنواز بھٹو کا کردار بھی منظر سے ہٹ گیا اور بعد میں جو کچھ کشمیر میں ہوا سر شاہنواز نے اس پر بھی کوئی رد عمل نہ دکھایا۔ سر شاہنواز بھٹو کے الحاق جونا گڑھ نے بھارت کی بہت سی مشکلیں آسان کر دیں۔ اُمید ہے کہ چوہدری عبدالمجید کی سربراہی میں لکھی جانیوالی تاریخ کشمیر میں ایک باب بھٹو خاندان کی کشمیر سے وابستگی کے حوالے سے بھی لکھا جائیگا۔ (جاری)

(چوہدری بلاول بھٹو زرداری (حصہ دوئم

سر شاہنواز بھٹو کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو، سکندر مرزا کی کابینہ میں شامل ہوئے اور انہیں قائداعظمؒ سے بڑا لیڈر قرار دیا۔ کابینہ میں شمولیت سے پہلے جناب بھٹو نے سکندر مرزا کے نام ایک خط میں لکھا کہ میرے والد نے نصیحت کی تھی کہ میں آپ سے رہنمائی حاصل کروں۔ کابینہ میں شمولیت کے فوراً بعد سکندر مرزا کا دور ختم ہوا تو آپ ایوب خان کی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ آپ نے ایوب خان کو بھی ایشیا کا ڈیگال قرار دیا اور بحثیت وزیر خارجہ بہت نام کمایا۔

کشمیر اور کشمیریوں کے متعلق آپ کے کارہائے نمایاں تاریخ کا حصہ ہیں جنہیں سلطان محمود چوہدری اور چوہدری مجید سیاسی مفاداتی نعروں سے مٹا نہیں سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ بھٹو ایک عظیم دانشور اور مردم شناس سیاست دان تھے مگر اُن کی ترجیحات میں کشمیر شامل نہ تھا۔ بھٹو صاحب نے آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں پر اکتفا کر لیا تھا اور اس سلسلہ سیاست میں کرنل حسن مرزا، سردار عبدالقیوم، سردار ابراہیم خان اور مرحوم کے ایچ خورشید کو بھی شمولیت کی دعوت دی۔ کرنل حسن مرزا اور سردار عبدالقیوم کے انکار پر انہیں جیلوں کی ہوا کھانی پڑی اور سردار ابراہیم خان مرحوم اور جناب کے ایچ خورشید نے

اپنی اپنی سیاسی جماعتیں ہی پیپلز پارٹی میں مدغم کردیں تاکہ وہ کسی سیاسی جرم کا حصہ نہ بنیں۔ دونوں ہی دانشمند اور دوراندیش سیاستدان تھے اور انہیں پتہ تھا کہ بھٹو جتنے ذہین وفطین ہیں اسی قدر کینہ پرور بھی ہیں۔ آزاد مسلم کانفرنس چوہدری نور حسین نے خرید لی اور لبریشن لیگ پیپلز پارٹی بن گی۔ اگر جناب بھٹو کو مہلت ملتی تو وہ آنیوالے سالوں میں آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں پر مشتمل ایک بڑا صوبہ بنانے کا اردہ رکھتے تھے مگر قدرت نے انہیں اقتدار کی پیڑی سے ہی اُتار دیا۔

برادری ازم جمہوریت، تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے اور تاریخ کا علم بھی رکھتے ہیں۔ اُن کے چیئرمین محترم بلاول بھٹو زرداری نے تو ولائیت سے ڈگری ہی تاریخ کے مضمون میں حاصل کی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بھٹو بننے سے پہلے اُنہوں نے اپنے نانا مرحوم و مغفور کے تمام تر معاملات کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ چوہدری صاحبان کا المیہ ہے کہ اُن میں سے کسی ایک کا بھی تحریک آزادی کشمیر اور جدوجہد آزادی کے مجاہدین سے تعلق نہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے آزادی اور حرمت کشمیر کے لیے قربانیاں دیں، دکھ اُٹھائے، جیلیں کاٹیں، اپنی جائیدایں قربان کیں اور اپنے خون سے صبح آزادی کے چراغ روشن کرنے کی کوششیں جاری رکھیں آج اُن کے نام سے بھی کوئی ٹن سیاستدان اور پاکستان میں بیٹھا اُنکا سیاسی ٹھیکیدار واقف نہیں۔ بیرسٹر سلطان محمود چوہدری، چوہدری مجید

اور دیگر بلیک لیبل سیاستدان پاکستانی سیاسی لیڈروں کے سیاسی ایجنٹ ہیں اور ان کی سیاست ان سیاستی لیڈروں کی خوشنودی سے منسلک ہے۔ لندن مارچ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جسکا مقصد بلاول کی خوشنودی حاصل کرنا اور تحریک آزاد کشمیر کو بلاول اور زرداری کی خواہش سے منسلک کرنا تھا۔ چوہدریوں اور چوہدری بلاول کو پتہ ہی ہوگا کہ بھٹو آرائیں نہیں بلکہ راجپوت تھے۔ یہ اور بات ہے کہ آرائیوں نے ضیاالحق کو آرمی چیف بنوانے کے لیے بھٹو کو آرائیں بنا دیا۔ آج بھی پنجاب کے آرائیں بھٹو قبیلے کو سندھ کے آرائیں کہتے ہیں۔ بھٹو صاحب کو ایک موقع پر کل پاکستان انجمن آرائیاں کا صدر بھی بنایا گیا جو کہ حیرت کی بات ہے۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں کہ ناہید مرزا ایک خوبصورت نوجوان کے ہمراہ میرے دفتر آئیں اور کہنے لگیں کہ مسٹر شہاب ان سے ملیں ۔ یہ بیرسٹر زلفی ہیں ۔ انکے والد سر شاہنواز بھٹو، سکندر مرزا کے انتہائی قریبی دوست تھے۔ آپ زلفی کو صدر کی ذاتی لائبریری میں مطالعہ کے لیے سہولت دیں۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں کہ پہلی نظر میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ایک کھلنڈرے نوجوان دکھائی دیے مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس نوجوان نے چند دنوں کے اندر صدراتی گھر کی لائبریری چھان ماری۔ مسٹر بھٹو نے سیاسیات، فلسفے، تاریخ اور سماجیات پر لکھیں جانیوالی سبھی کتابیں پڑھیں اور ضروری نوٹس بھی لیے ۔ بھٹو صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی وہ سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگوں کی عزت کرتے تھے اور ہمیشہ ادب سے گفتگو کرتے تھے ۔ بھٹو نے

پہلی ملاقات پر مجھے آپ صاحب کہہ کر بلایا اور آخری ملاقات تک ہمیشہ آپ صاحب ہی کہا۔

جناب چوہدری مجید کو زرداری اور بلاول ہاؤس میں سائیلین کی طرح پکارا جاتا ہے اور یہی حال دیگر قائدین برادری جمہوریت کا ہے۔ نون لیگی بھی ایسے ہی برتاؤ کے حقدار ہیں اور میاں صاحبان نون لیگیوں کو اپنے ذاتی ملازمین جیسا بھاؤ بھی نہیں دیتے۔ آزاد کشمیر نون لیگ کا ٹھیکہ راجہ ظفرالحق کے پاس ہے اور اُن کی طبعیت اکثر خراب رہتی ہے۔ وزیرِ اُمور کشمیر سانگلہ ہل کے چوہدری ہیں اور اُنہیں راجوں مہاراجوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے خیال میں انہیں سانگلہ ہل کی وجہ سے وزیر امور کشمیر بنایا گیا تاکہ وہ ہل مین ہونے کے ناتے کشمیر ہلز کے باسیوں کا خیال رکھیں۔ میاں صاحبان کو شائد پتہ نہیں کہ اب سانگلہ ہل میں کوئی ہل نہیں۔ ساری پہاڑیاں کاٹ کر بجری بنا دی گئیں ہیں اور جہاں کبھی ہلیں شلیں ہوا کرتی تھیں اب وہاں کچرے کے ڈھیر ہیں۔ سانگلہ ہل کی ایک مشہور شخصیت چوہدری کِلہ خان تھے۔ اگر وزیرِ اُمور کشمیر کا تعلق کلہ خاندان سے ہے تو پھر اُنکا سیاسی کِلہ بھی مضبوط ہوگا۔ ورنہ وزیر امور کشمیر کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ وزارت اُمور کشمیر، کشمیر کمیٹی اور کشمیر کونسل ایسے کلے ہیں جن پر بندھے سیاسی جانوروں کو جی بھر کر کھلایا پلایا اور کبھی کبھی کرسی سے گرانے کے لیے ڈرایا بھی جاتا ہے۔ جب سے یہ تین ادرے

بنے ہیں آزاد کشمیر کشمیریوں کا نہیں رہا۔ مہاجرین مقیم پاکستان کی اسمبلی سٹیوں اور نوکریوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ نئے مہاجرین کی تعداد بڑھ رہی ہے اور آزاد کشمیر کے باشندوں کے حقوق پر دن دیہاڑے ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔ نام نہاد کشمیری لیڈر اقتدار اور شراب کے نشے میں دھت کبھی ایک در اور کبھی دوسرے پر اقتدار اور آسائش کا کشکول لیے پھرتے ہیں اور ہر در سے دھتکارے جاتے ہیں۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کا ذاتی ملازم نوار، ضیا الحق کا اردلی صوبیدار میجر فقیر خان، وزارت خارجہ کا سیکشن افسر امان اللہ خان نیازی اور اب بلاول ہاؤس اور زرداری ہاؤس کے دربان جن الفاظ اور القاب سے مجاوروں کو پکارتے ہیں اسکا ذکر کرتے ہوئے راؤف کلاسرا نے ٹیلی ویژن چینل پر کہا کہ ان کی حیثیت کسی ادارے کے ہیڈ کلرک کے برابر بھی نہیں ہے۔ آزاد کشمیر کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر سو سو سرکاری گاڑیوں کے قافلے لیکر پھرنے والے کاغذی شیر گڑھی خدا بخش اور جاتی عمرہ کی بلیوں کا جوٹھا کھانے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں اور لائینوں میں لگ کر کرپٹ اور بددیانت نودولتیے لیڈروں کے دیدار کو ترستے ہیں۔ اگر ان نام نہاد لیڈروں کی رگوں میں اُن عظیم لوگوں کا خون ہوتا جنہوں نے مہاراجہ کشمیر کو ایک اشرفی نذرانہ دینے سے انکار کیا تو یہ کرائے کے لیڈر بلاول ہاؤس کے سامنے کرپشن کی کمائی کی بوریاں بھر نہ بیٹھتے۔ جن لوگوں نے عزت نفس کا سودا کر لیا ہو وہ آزادی تو کیا غلامی کے حقدار بھی نہیں۔ آیئے واپس بھٹو صاحب کی کشمیر پالیسی پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تاکہ جناب

چوہدری بلاول بھٹو زرداری کے لیے اپنی کشمیری رعایا سے معاملات طے کرنے میں آسانی رہے۔

جیالے کشمیری کہتے نہیں تھکتے کہ پیپلز پارٹی کا جنم اعلان تاشقند سے ہوا۔ عقل کے اندھوں کو پتہ نہیں کی اگر جناب بھٹو کے تیار کردہ مسودے پر جنرل ایوب خان دستخط کر دیتے تو آج لائن آف کنٹرول اوڑی کے بجائے کوہالہ پر ہوتی اور بھارتی بوفر توپیں پنڈی اور اسلام آباد پر گولے برساتیں۔ وہ یہ بھی بھول گے کہ اعلان تاشقند سے پیپلز پارٹی نے زبردستی جنم اس لیے لیا چونکہ بھٹو صاحب کو خان عبدالولی خان اور اصغر خان نے اپنی پارٹیوں میں جگہ نہ دی۔ انہیں یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ جناب بھٹو کو الگ سیاسی جماعت بنانے کا مشورہ جنرل یحییٰ خان نے دیا تھا اور نہ صرف حوصلہ افزائی بلکہ ہر طرح کی مدد بھی کی تھی۔ کشمیری جیالوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مشرقی پاکستان سقوط ڈھاکہ سے بنگلہ دیش نہیں بنا تھا بلکہ اسکا اعلان لاہور ایئر پورٹ پر گنگا طیارے کی تباہی کے دن ہوا جب جناب ذوالفقار علی بھٹو ہاشم اور اشرف قریشی سے مل کر طیارے سے باہر آئے تھے۔

کشمیر کی تاریخ میں ایک شخص کا نام مقبول بٹ شہید بھی تھا جسے بھٹو صاحب کے حکومتی ارکان نے ٹانڈا ڈیم ریسٹ ہاؤس کوہاٹ پہنچا کر ڈرایا دھمکایا مگر

بات نہ بنی تو مذاکراتی بہروپ بنا کر بات چیت شروع کر دی۔ ایجنڈا تحریک آزادی سے لاتعلقی اور آزاد کشمیر بشمول شمالی علاقہ جات کے ایک نئے اور بڑے صوبے کا قیام تھا۔ مقبول بٹ شہید کو صوبہ کشمیر کا تاحیات بااختیار گورنر بنانے اور دیگر مراعات کا لالچ بھی دیا گیا مگر مٹی سے محبت کرنیوالے درویش نے سب کچھ ٹھکرا دیا۔ سارے ہتھکنڈے ناکام ہوئے تو مقبول بٹ کو مقبوضہ کشمیر جا کر مسلح جدوجہد کے لیے میدان ہموار کرنے کا حکم دیا گیا اور وعدہ کیا گیا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت اس جدوجہد کی تیاری کے لیے مالی معاونت بھی کرے گی۔ مقبول بٹ وادی میں داخل ہوئے تو بھارتی انٹیلیجنس اداروں کو پہلے ہی خبر مل چکی تھی۔ آگے کی کہانی تہاڑ جیل کی کال کوٹھری میں اختتام پذیر ہوئی مگر پیچھے ایک نیا ولولہ، نیا جوش اور عزم چھوڑ گئی۔

کشمیر سیاست کی نظر

آج کشمیری جس کرب سے گزر رہے ہیں اُس کا اہتمام مسلم کانفرنس ، نیشنل کانفرنس اور پھر جناب گلزار حجازی کے مطابق مجاہد اول سردار عبدالقیوم اور جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کیا۔ مسلم کانفرنس کی اصل قیادت جموں جیل میں تھی اور جناب چوہدری غلام عباس ، اللہ رکھا ساغر اور سینئر رہنماؤں نے واضح پیغام دیا کہ کشمیر کی آزادی کے سوا کسی تجویز کو قبول نہ کیا جائے۔ مہاراجہ کشمیر بھی آزاد خود مختار کشمیر کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ مسلم کانفرنس کی جونیئر قیادت نے الحاق پاکستان اور آزاد کشمیر کا شوشا چھوڑ کر سارا کھیل ہی بھگاڑ دیا۔چوہدری غلام عباس کا خیال تھا کہ ایک آزاد و خود مختار کشمیر پاکستان کے لیے بہتر ہے نہ کہ ٹکڑوں میں بٹا ہوااور بھارت کی بالا دستی و تسلط زدہ کشمیر۔ پتھر مسجد اور آبی گزرگاہ کی کہانیاں سنانے والوں کے متعلق پنڈت کاک اور پریم ناتھ بزار لکھتے ہیں کہ جب مہاراجہ کشمیر بچانے کی کوشش کر رہا تھا اُسی وقت مسلمان سیاسی لیڈر کشمیر توڑنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ سابق امریکی صدر بل کلنٹن اپنی کتاب Between Hope and History میں لکھتے ہیں کہ (vision) دور اندیشی کے بغیر کوئی قوم اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی وہ مزید لکھتے ہیں کہ :۔

where there is no vision the people perish جہاں دور اندیشی

اور مستقبل کی منصوبہ بندی نہ ہو وہاں لوگ صفحہ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو چوہدری غلام عباس اور کے ایچ خورشید کے علاوہ کشمیری قوم کو کوئی ایسا لیڈر نہ ملا جو دور اندیش ہو۔ 1947 کی تحریک آزادی کی ناکامی کا تجزیہ کیا جائے تو اس تحریک کو ناکام بنانے والے فیلڈ مارشل اور خود ساختہ جنرل اور اُن کے الگ الگ جنرل ہیڈ کوارٹر ہیں جنھوں نے جہاد پر کم اور اپنی ذاتی تشہیر پر زیادہ زور دیا۔ ناقص منصوبہ بندی، خود غرضی، قبیلہ پروری اور کرپشن نے ابتداء سے ہی کشمیری قوم کا شیرازہ بکھیر دیا۔ کیپٹن حسین خان کی شہادت کے ساتھ ہی پونچھ آپریشن بھی شہید ہو گیا اور کسی مجاہد اول وآخر نے پونچھ شہر پر یلغار کی ہمت نہ کی۔ کئی ماہ تک پونچھ کا محاصرہ کرنیوالوں نے بھارتی فوج کا انتظار کیا تاکہ وہ پونچھ کا کنٹرول سنبھال کر انہیں پونچھ کے محاصرے سے نجات دلائے۔ پونچھ پر بھارتی فوج نے قبضہ کیا اور محاصرے میں بیٹھ کر لنگر کھانیوالوں نے مسلم کانفرنس اور آزاد کشمیر کی حکومت پر یلغار کر دی۔ پرائمری اور مڈل پاس کمشنر اور ڈپٹی کمشنر بنائے گئے اور حوالداروں نے کپتانیاں اور میجریاں تقسیم کر لیں۔ جمعدار اور صوبیدار کرنیل بن گئے اور اپنی بہادریوں کے قصے لکھ کر حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر سے اُن کی سندیں بھی لے لیں۔

مظفرآباد اوڑی سیکٹر کا حال اس سے بھی بُرا ہوا۔ قبائلی لشکری بھوکے

بھیڑیوں کی طرح آئے اور جو راہ میں آیا اُسے ہڑپ کرتے گئے۔ قبائلوں نے راستے میں آنیوالا ہر گاؤں لوٹا اور آٹھ سال سے اسی سال کی ہر لڑکی اور عورت کو بے آبرو کیا۔ قبائلی لشکروں نے سکھوں، افغانوں اور مغلوں کو بھی مات دی اور جبر و ظلم کا وہ طوفان برپا کیا کہ لوگوں نے اس خون خوار آزادی سے توبہ کر لی۔ کوٹلی مینڈھر سیکٹر میں حیدری فورس نے کمال کامیابیاں حاصل کیں اور حد پیر پنجال سے آگے شوپیاں تک کا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا مگر حکومت پاکستان پر پونچھ کی منڈیر پر بیٹھے مجاہدین کا بھوت سوار تھا جن کی اجازت کے بغیر وہ کسی اصل مجاہد کی مدد تیار نہ تھی۔ حکومت پاکستان اور مجاہدین پونچھ ایک منصوبے کے تحت جہاد کر رہے تھے جو صرف کاغذوں فائیلوں اور پراپیگنڈے کی حد تک محدود تھا۔ حکومت پاکستان کی طرف سے پونچھ والوں کو جو مدد ملتی تھی اُسکا نوے فیصد راولپنڈی کے بازاروں اور مری کے ٹھیکیداروں کے ہاتھ فروخت ہو جاتا۔ بد قسمتی سے جہاد آزادی کشمیر نے روز اول سے ہی آزادی بزنس کا روپ دھار لیا اور اب یہ حقیقت بن کر اپنا اثر دکھا رہا ہے۔

حیدری فورس کسی ایک قبیلے یا برادری پر مشتمل نہ تھی۔ اس فورس کے کمانڈر انڈین نیشنل آرمی کے تربیت یافتہ اور میدان جنگ کے آزمودہ کار افسر اور جوان تھے۔ بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن، کرنل اکمل، میجر محمد حسین، کیپٹن

شیر افگن کے علاوہ درجن بھر ایسے افسر بھی تھے جنھوں نے فرضی ناموں سے اس فورس کی قیادت کی اور تقریباً سارا مینڈھر اور دھرم شال سیکٹر آزاد کروالیا۔ اس فورس نے ڈوگرہ اور انڈین آرمی سمیت راشٹریہ سیوک سنگھ کے بڑے منظم اور پوری طرح مسلح دستوں کو زیر کیا اور اُن سے اسلحہ وایمونیشن چھین کر اپنی فورس کی فوجی قوت میں اضافہ کیا۔

حیدری فورس کے دائیں اور بائیں خود غرضی کی فرضی جنگ لڑی جارہی تھی۔ پونچھ کا محاصرہ کرنیوالے، اس محاصرے کو کیش کروارہے تھے اور کسی میں جرات نہ تھی کہ آگے بڑھ کر چار کمپنیوں پر مشتمل محصور ڈوگروں کا صفایا کرتے اور حیدری فورس کی کامیابیوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سرینگر کے قریب پہنچ جاتے۔ شوپیاں اور گلمرگ کے علاقوں پر تسلط قائم ہونے کی صورت میں بارہ مولہ میں بیٹھی لنگر خور فورس بھی شائد آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرلیتی مگر مجاہدین پونچھ نے تولی پیر پر ہی تکیہ کر لیا اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ کی۔ حیدری فورس کی ایک مشکل راجوری اور ریاسی کے جرالوں اور گجروں کے باہم چپقلش تھی۔ 1947ء کے بعد حالات بدلے تو گجر قبائل نے بوجہ عناد نہ مجاہدین کا ساتھ دیا اور نہ ہی حکومت کے پلڑے میں وزن ڈالا۔ ریاسی گیریژن میں تعینات ڈوگرہ بٹالین کی تین کمپنیاں مسلمانوں اور دو کمپنیاں ڈوگروں پر مشتمل تھیں جبکہ مقامی مسلمان آبادی میں بھی ریٹائرڈ فوجیوں کا بڑا حصہ موجود تھا۔ حالات

کا جائزہ اپنے ہوئے ڈوگرہ فورس ریاسی سے نکل گئی اور یہ علاقہ خود بخود مقامی لوگوں کے قبضے میں آگیا۔

کرنل شیر محمد کی قیادت میں تقریباً ایک ہزار مسلح افراد جنکا تعلق مینڈھر اور پونچھ کے علاقہ سے تھا بغیر کسی مذاہمت کے ریاسی پہنچے اور وہاں موجود کرنل رحمت اللہ کی تین کمپنیوں سے چارج لیکر انہیں پونچھ کا محاصرہ کرنیوالوں کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ کرنل رحمت اللہ کے پونچھ محاذ پر جانے کے بعد کرنل شیر محمد کی فورس نے ریاستی گیریژن اور سرکاری کیٹل فارم سے آسٹریلین بھیڑوں اور دیگر مویشیوں کو نکال کر مینڈھر کی طرف روانہ کیا اور اپنے دو سو جوانوں کو ان کی حفاظت پر لگا دیا۔ باقی فورس نے تین سو خچروں پر ریاسی بازار سے مال غنیمت اُٹھایا اور اُن کے ہمراہ واپس مینڈھر تشریف لے آئے۔

یہی حال راجوری کا ہوا۔ کرنل رحمت اللہ کی بٹالین پونچھ محاذ پر منتقل ہوئی تو سردار فتح محمد کریلوی نے اپنے ایک رشتہ دار کی کمان میں ایک سو مجاہدین کا دستہ راجوری بھجوایا۔ یہ صاحب ڈوگرہ آرمی کے ریٹائرڈ صوبیدار تھے جن کی قیادت میں بھیجے گئے مجاہدین نے بھی کرنل شیر محمد والی روش اپنائی۔ صوبیدار بوستان خان نے اپنی فورس میں صرف سرداروں کو ہی رکھا اور باقی لوگوں

کو فارغ کر دیا۔

راجوری سے ڈگرہ فورس کی پسپائی کے بعد علاقے کا انتظام جرال قبیلے کے سردار نمبردار محمد حسین جرال کے حوالے کیا گیا جو بری طرح ناکام ہوا۔ نمبردار صاحب اور گجر قبیلے کے اختلافات مزید بڑھ گئے اور مقامی ہندو آبادی خاموش رہی۔ کرنل شیر محمد اور صوبیدار بوستان خان نے جو کردار ادا کیا وہ بھی قابل نفرت تھا۔ کرنل شیر محمد کے بعد صوبیدار بوستان خان نے پسپائی اختیار کی تو گولد کے مقام پر مجاہدین نے انہیں پکڑ لیا۔ مجاہد کمانڈر نے صوبیدار بوستان اور سرداروں پر مشتمل پلاٹون سے ہتھیار چھین لیے اور انہیں گولیوں سے اُڑا دیا۔ مجاہدین کا یہ دستہ کرنل شیر محمد کے ہمراہ ریاسی گیا تھا مگر کرنل صاحب انہیں وہیں چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ بعد میں بھارتی بریگیڈ معہ توپخانے اور ہوائی مدد کے اس علاقے میں آیا تو مجاہدین کو بھی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

اب ذرا پونچھ کا محاصرہ کرنیوالی سپاہ کا حال بھی سنیئے۔ اس سپاہ میں باغ بریگیڈ زیر کمان سردار عبدالقیوم خان مجاہد اول، سدھن بریگیڈ نمبر 1 زیر کمان کرنل رحمت اللہ، سدھن بریگیڈر نمبر 2 زیر کمان خان محمد خان اور دو بریگیڈ پٹھان لشکری زیر کمان بریگیڈیر اعظم خان جن میں دیر، سوات، افغانستان، شمالی اور جنوبی وزیرستان کے لشکری شامل تھے۔ دیر اور سوات کے لشکری ایک

الگ ٹولہ تھا جبکہ سوات آرمی اور دیر سکاوٗٹ کے چند ترتیب یافتہ دستے میجر تیمور اور تحصیلدار حضرت عالی کی کمان میں نوشہرہ سیکٹر میں آئے جنگی کہانی الگ ہے۔

پونچھ فورس اور مظفرآباد سیکٹر میں کارروائی کرنیوالے لشکروں کو حکومت پاکستان کی جانب سے مدد ملتی تھی مگر سدھن.بریگیڈ یہ رسد اپنے تک ہی محدود رکھتے تھے۔ اس محاصرے کااحوال کرنل اکمل نے مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے.بریگیڈ ئیر اعظم خان اور سدھن کمانڈروں سے درخواست کی کہ وہ ایک.بریگیڈ پیر پنجال اور لشکری دستے ریاسی نوشہرہ سیکٹر میں بھجوادیں اور حیدری فورس کو صرف دوہفتوں کے لیے پونچھ کی جانب پیش قدمی کا موقع دیں۔ کرنل اکمل، میجر محمد حسین اور کرنل حق مرزانے گارنٹی دی کہ وہ ایک ہفتے کے اندر پونچھ کو جلاکر خاکستر کردینگے مگر مجاہد اول سمیت کسی بھی کمانڈر نے سونے کی چڑیاں ہاتھ سے نہ جانے دی۔

کوٹلی، نوشہرہ اور دہرم شال سیکٹر میں مقامی مجاہدین اور دیر سکاوٹ نے کیپٹن مظفرخان شہید کی قیادت میں کمال کامیابیاں سمیٹیں اور جموں، نوشہرہ روڈپر پیش قدمی کرتے ہوئے بہت سے اہم علاقوں پر قبضہ کرلیا جس کی تفصیل کیپٹن مظفرخان شہید کی ڈائری میں موجود ہے۔آیئے اب آخری محاذ کارونا روتے

ہوئے واپس بھٹوازم کی برکات کا جائزہ لیکر بات ختم کرتے ہیں۔

پاکستانی بیوروکریسی خاص کر وزارت خارجہ کے افسران اور کچھ سیاستدانوں نے کشمیریوں کے خلاف سازش کرتے ہوئے قبائلی جھتے آزاد کشمیر کے ان علاقوں میں بھجوائے جہاں پہلے ہی مجاہدین کی پوزیشن مستحکم تھی ۔ بجائے اس کے کہ مجاہدین کی رہنمائی کے لیے فوجی افسروں کو بھیجا جاتا اورانہیں اسلحہ وایمونیشن کے علاوہ راشن بھی سپلائی کیا جاتا تاکہ وہ باہم لڑنے ، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور عہدوں کی تقسیم پر چپقلشوں سے آزاد ہو کر سرینگر اور پونچھ کی طرف پیش مقدمی کرتے، ان کے سروں پر قبائلی مسلط کر دیے جن کی ہٹ دھرمی اور عوام الناس پر ظلم وستم نے تحریک آزادی کی اصل روح کو ہی گہنادیا۔ پتھر مسجد کی کہانیاں سنانے والوں نے اپنی اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجدیں بنائیں اور عوام کو قبائلیوں کے پنجہ تلے میں دیکر جہاد کے نام پر مال کمانے اور عہدے بانٹنے پر لگ گئے۔

مرحوم سردار ابراہیم خان کبھی کبھی دبی زبان میں اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ میں نے کبھی بھی قبائلیوں کی مداخلت کا مشورہ نہ دیا تھا۔ یہ مشورہ سردار شوکت حیات اور مسلم لیگی رہنماؤں کا تھا جو خود کبھی قائداعظم کی بات نہ مانتے تھے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ پاکستان بنتے ہی سازشیوں نے

اپنے گروپ بنا لیے اور انگریز افسروں سے ملکر قائدا عظم کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔

چوہدری ظفراللہ ، خان لیاقت علی خان، جی ایم سید ، ایوب کھوڑو ، میاں ممتاز دولتانہ ، افتخار ممدوٹ ، سکندر حیات ، شوکت حیات اور خان عبدالغفار سمیت کئی گروپ قائدا عظم کی پالیسوں سے اختلاف رکھتے تھے اور پاکستانی عوام پر اپنی مرضی سے حکومت کرنا چاہتے تھے ۔ قائدا عظم کو ان سب کی سازشوں کا پتہ تھا مگر وہ مایوس نہ تھے ۔ قائدا عظم کے سیاسی ، جمہوری اور معاشرتی اصولوں کے خلاف سب سے پہلے چوہدری رحمت علی نے بغاوت کی جنہیں بمبئ اور کراچی کے پارسیوں ، اسماعیلیوں ، پنجاب کے قادیانیوں ، گجر قبیلے کی اہم شخصیات اور یونینسٹوں کی درپردہ حمائت حاصل تھی ۔ چوہدری رحمت علی نے قائدا عظم کے خلاف سخت اور لغو زبان استعمال کی تو انہیں جمعیت علمائے اسلام اور علمائے ہند کی بھی حمائت حاصل ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر آگ کے شعلوں سے لپٹ رہا تھا اور پاکستانی سیاست دان باہم اُلجھاؤ کا شکار تھے۔ جہاں کہیں کشمیری ڈوگرہ اور بھارتی افواج سے نبرد آزما تھے انہیں کوئی پوچھنے والا نہ تھا اور نہ ہی انہیں کسی قسم کی مدد فراہم کی جاتی تھی۔ جہاں مفاد پرستوں اور سازشیوں کے مفاد کی بات تھی وہاں ہر طرح کی مدد مہیا کی جارہی تھی اور ایک منظم پراپیگنڈے کے تحت جہاد اور آزادی کا ڈرامہ کھیلا جارہا تھا۔

وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ نے جنرل گریسی کی اجازت لیکر 16 پنجاب رجمنٹ سیالکوٹ محاذ پر بھجوائی اور اس رجمنٹ کو حکم دیا کہ سیالکوٹ اور ارد گرد کے علاقوں سے ریٹائرڈ فوجیوں پر مشتمل ایک بریگیڈ فورس بھرتی کرے اور کشمیر کے علاقوں سے جموں کی طرف جسقدر رعلاقہ خالی ہے اسپر قبضہ کرکے جموں کے مسلمانوں کو انخلا میں مدد دے۔ 16 پنجاب رجمنٹ میں ایک بریگیڈ سے زیادہ افراد کو مسلح کرنیکے وسائل مہیا کیے گئے اور وزارت خارجہ نے اس بریگیڈ کا نام الفرقان بریگیڈ تجویز کیا۔
الفرقان بریگیڈ کی خبر آزاد آرمی ہیڈ کوارٹر رام پیاری محل گجرات پہنچی تو بریگیڈئر راجہ حبیب الرحمٰن نے گجرات کے کشمیری گھرانوں کے نوجوانوں اور سابق فوجیوں کو اس بریگیڈ میں شمولیت کی ترغیب دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گجرات سے دو ہزار کے قریب کشمیری مرالہ کے مقام پر پہنچے جہاں 16 پنجاب رجمنٹ کے افسروں نے کسی بھی کشمیری کو بھرتی نہ کیا۔ الفرقان بریگیڈ میں سوائے قادیانوں کے کسی کو پذیرائی نہ ملی اور زیادہ تر بھرتیاں کاغذوں کی حدتک ہی محدود رہیں۔
گجرات سے جانیوالے نوجوان مایوس ہو کر واپس لوٹے اور جلالپور جٹاں میں ایک کیمپ لگا کر کشمیر جانے کی آس لگا کر بیٹھ گئے۔ گجرات سے کشمیریوں کی ایک ٹولی جن کے پاس تلواریں، کلہاڑیاں، سوٹے اور کچھ کے پاس بارہ بور اور درہ

میڈ رائفلیں تھیں چھمب کے مقام پر دریائے توئی کراس کرکے پلاں والہ پہنچے اور وہاں موجود ڈوگرہ بٹالین اور سیوک سنگھیوں پر حملہ کر دیا۔ اتنی بڑی فوج پر غیر مسلح سویلین کا حملہ کامیاب تو نہ ہوا مگر سیوک سنگھیوں کے حوصلے پست کر گیا۔ ساری رات لڑائی جاری رہی اور بندوقوں کے مقابلے میں تلواروں نے بھی خوب چمک دکھلائی۔ اس لڑائی کے دوران پلاں والا میں محصور کشمیری خاندانوں نے راہ فرار اختیار کی اور تقریباً دو ہزار نفوس نے جان بچا کر قریبی جنگلات میں پناہ لی۔ اس شب خون کے نتیجے میں پانچ سو سیوک سنگھی اور رجنوں ڈوگرہ سپاہی واصل جہنم ہوئے۔ حملہ آور کشمیریوں میں سے صرف چند زخمی مجاہد واپس آئے اور باقی سب نے راہ حق میں جان قربان کر دی۔

الفرقان بریگیڈ جسکا انچارج سیالکوٹ کا احمدی ڈپٹی کمشنر تھا نے سیالکوٹ جموں روڈ پر کیمپ لگایا اور اپنی موجودگی میں چند میل کے فاصلے پر دو لاکھ کشمیری مسلمانوں کے قتل کا نظارہ کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ آزاد کشمیر اور پاکستان میں ہر سال شہدائے جموں کا دن منایا جاتا ہے مگر کسی نام نہاد کشمیری لیڈر اور برادری ازم کے مریض نو دولیتے بے خبر کو توفیق نہیں ہوتی کہ وہ الفرقان بریگیڈ کا بھی ذکر کرے جو ان دو لاکھ کشمیریوں کے قتل کا ذمہ دار تھا۔

(چوہدری بلاول بھٹو زرداری (آخری حصہ

کشمیریوں کیساتھ جیسا سلوک 1947 میں ہوا 2014 میں بھی ویسا ہی سلوک ہو رہاہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اُسوقت منصوبہ سازی کا اختیار چوہدری ظفراللہ کے پاس تھا اورالفرقان .برگیڈ کی کمان سیالکوٹ کے احمدی ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ تھی ۔آجکل منصوبہ سازی محترمہ فریال تالپور ، رحمان ملک اور آصف علی زرداری کرتے ہیں اور الفرقان .برگیڈ کی جگہ سلطان .برگیڈ ، مجید .برگیڈ اور یٰسین .برگیڈ نے لے رکھی ہے اور یہی لوگ ان .برگیڈوں کے کمانڈر ہیں ۔ سر ظفراللہ کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ بنے تو مسئلہ کشمیر نے نیا رخ اختیار کیا۔ آزاد کشمیر کا چارج وزیر خارجہ نے سنبھالا اور جوائینٹ سیکرٹری امان اللہ نیازی کشمیر کا وائسرائے بن گیا۔ مولوی یوسف شاہ ، سردار عبدالقیوم ، سردار ابراہیم خان اور چوہدری غلام عباس میں اختلافات پیدا ہوئے تو وزرات خارجہ نے خلیج پر کرنے کے بجائے اسے وسعت دی اور درپردہ دو بڑے فریقوں جن کے سربراہ چوہدری غلام عباس اور سردار ابراہیم خان تھے کو آشیرباد کا یقین دلایا۔

وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں جناب کے ایچ خورشید کو استعفے

دینے پر مجبور کیا گیا اور انہیں غداری کے مقدمے میں پھنسا کر دلائی کیمپ میں قید کر دیا گیا۔ وزارت خارجہ نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی نگرانی میں آپریشن جبرالٹر کی منصوبہ بندی کی تو جناب کے ایچ خورشید نے راولپنڈی اور کراچی میں مقیم اہل سیاست و اقتدار کو باور کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ اسطرح کے آپریشن کے لیے حالات سازگار نہیں۔ دوسری جانب کے کشمیری قبائلیوں کے مظالم نہیں بھولے اور نہ ہی مجاہدین کی پذیرائی کا کوئی انتظام ہے۔ نوجوانوں پر نیشنل کانفرنس کے پراپیگنڈے کا اثر ہے اور آزاد کشمیر کے عوام سے جسطرح حکومت پاکستان برتاؤ کر رہی ہے وہ بھی قابل تحسین نہیں۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے حکم پر کے ایچ خورشید کی نقل و حرکت محدود کی دی گئی اور انہیں دوسری بار گرفتار کرنے کا منصوبہ بھی بن گیا۔ جناب خورشید کا خدشہ درست ثابت ہوا اور وزارت خارجہ کی ناقص منصوبہ بندی کے صلے میں 1965ء کی جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں کشمیر تو آزاد نہ ہوا مگر درہ حاجی پیر جیسی اہم گزرگاہ پر بھارت نے قبضہ کر لیا۔ تاشقند مذاکرات میں جنرل ایوب خان درہ حاجی پیر اور ملحقہ پہاڑیاں بھارت سے واپس لینا چاہتے تھے اور جناب ذوالفقار علی بھٹو بار بار اس اہم معاملے کو مسودے سے خارج کر دیتے تھے۔ ایوب خان کو پتہ تھا کہ اگر درہ حاجی پیر واپس نہ لیا گیا تو بھارت کسی بھی وقت سیز فائر لائن توڑ کر کوہالہ تک پہنچ جائے گا اور اسلام آباد بھارتی

توپوں کی ذد میں ہوگا۔ بھارتی وزیراعظم شاستری نے اپنی جان پر کھیل کر درہ حاجی پیر کی واپسی پر دستخط کیے مگر سلطان ،یٰسین اور مجید بریگیڈ کو اس بات پر فخر ہے کہ پیپلز پارٹی نے تاشقند میں جنم لیا۔ اگر واقعی یہ فخر کی بات ہے تو انہیں ذوالفقار علی بھٹو پر نہیں بلکہ ایوب خان پر فخر کرنا چاہیے جس نے بھٹو کے تیار کردہ مسودے کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنے سیکرٹری اطلاعات کے مسودے پر دستخط کیے۔

بھٹو خاندان کی چوتھی خدمت گنگا طیارے کی تباہی اور مشرقی پاکستان کی علحیدگی ہے جسکے ساتھ کارگل سیکٹر پر بھی بھارت نے قبضہ کرلیا۔ پانچویں خدمت شملہ معاہدے کے تحت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحد سے مقامی پنچائت میں لانا ہے جس کی رو سے اب یہ مسئلہ بھارت اور پاکستان کشمیریوں کے مشورے کے بغیر باہم رضامندی سے حل کرینگے۔اسی خدمت میں سیز فائیر لائن کو لائن آف کنٹرول میں بدلنا ہے۔ جسکا مطلب ادھر کا کنٹرول ہمارے ساتھ اور ادھر کا کنٹرول تمہارے ہاتھ۔ یعنی اُدھر تم ایدھر ہم اور ہد ف دونوں جانب کے کشمیری ہیں۔

چھٹی خدمت آزاد کشمیر کا عبوری آئین ،آزاد کشمیر کونسل کا قیام اور آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کی حکمرانی ہے جسکی وجہ سے پاکستانی سیاسی

جماعتوں نے آزاکشمیر کو نوآبادیاتی ریاست کا درجہ دے کر اپنی اپنی جماعتوں کے نظر یاتی، سیاسی، سازشی اور مفاداتی اڈے کھول لیے۔ سیاسی جماعتوں کی آزادی بزنس میں آزاد کشمیر کے نودولتیوں نے بھی مال لگایا اور پھر لوٹ مار کی سیاست کی آڑ میں کئی گنا مال کمایا۔

بھٹو صاحب کی کشمیر نوازی کی کہانی بھٹو خاندان کی چار پشتوں پر مشتمل ہے۔ سر شاہ نواز بھٹو نے سینکڑوں میل دور ہندو اکثریتی ریاست کا پاکستان سے الحاق کیا تو مہاراجہ کشمیر کو بھارتی حکمرانوں نے مجبور کیا کہ وہ کشمیر کا بھارت سے الحاق کرے۔ اس دباؤ کے باوجود مہاراجہ کشمیر نے اپنی آزاد حیثیت قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی جسے کشمیری مسلمان سیاسی لیڈروں نے سبوتاژ کر دیا۔ جنگ آزاد کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا اور مفاد پرست ٹولے نے قبائلیوں کے ہاتھوں کشمیریوں کا قتل عام کروایا۔ سانحہ جموں سے بڑھ کر وہ حادثات ہیں جو قبائلی لشکریوں نے برپا کیے اور کشمیریوں کی جیتی ہوئی جنگ کو شکست میں بدل دیا۔

بھٹو صاحب کی خدمات کا تو ذکر ہو ہی چکا ہے جبکہ بھٹو صاحب کے روحانی بیٹے اور داماد نے گلگت بلتستان کو کشمیر سے کاٹ کر اپنی جاگیر میں تبدیل کر دیا ہے جو آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے فیصلے کی توہین اور معاہدہ کراچی کے علاوہ یو این او کی قرار داد کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ جناب زرداری کی کشمیریوں سے

محبت کی دوسری مثال چالیس سال تک مسئلہ کشمیر کو منجمند کرنے کی سازش ہے جس پر پانچ سال تک جناب زرداری نے عمل کیا اور اب اُن کے منہ بولے بھائی میاں نواز شریف اور ان کے بڑے بھائی چوہدری مجید عمل پیرا ہیں۔
ظاہر ہے کہ جناب زرداری کے چالیس سالہ منصوبے کی تکمیل میاں برادران کے بس کا روگ نہیں ۔ مجاہد اول کے سپوت اول نے اپنی دانشمندانہ سیاست کے نتیجے میں مسلم کانفرنس کا تقریباً خاتمہ کر دیا اور اب ملٹری ڈیموکریسی کی اُمید پر سیاست کر رہے ہیں۔ مجاہد دوئم پر اُمید ہیں کہ کسی نہ کسی دن پاکستان میں مارشل لا یا پھر کوئی بلا ضرور آئے گی اور اُن کی ملٹری ڈیموکریسی کی اُمید بھر آئے گی ۔ زرداری نے چالیس سالہ منجمند پالیسی کا اعلان کسی کے کہنے پر ہی کیا ہوگا ورنہ مولانا فضل الرحمٰن کو چیئرمین کشمیر کمیٹی نہ بناتے ۔ مولانا فضل الرحمٰن کا دوبارہ چیئرمین کشمیر کمیٹی بننا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ پیپلز پارٹی اور نواز لیگ نے باہم مشاورت سے مسئلہ کشمیر پر چالیس ٹن بوجھ ڈال کر اُسے دفن کرنیکا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ جہاں تک کھوکھلے نعروں اور بیانات کا تعلق ہے تو یہ سب دھوکہ فریب اور فراڈ ہے۔ میاں نواز شریف اور بلاول کی تقریریں کشمیریوں کو فریب میں مبتلا کرنیکا بہانہ ہے اور کشمیری بھی اس فریب زدہ ماحول کے عادی ہو چکے ہیں۔ بلاول کہتا ہے کہ پورا کشمیر لیسوں ۔فریب خوردہ کشمیریوں سے کوئی پوچھے کہ بلاول

پورا کشمیر کیسے لے سکتا ہے۔ کیا وہ اپنے نانا، پڑنانا اور والد کی پالیسوں سے انحراف کرتے ہوئے کوئی نیا منصوبہ بنائے گا؟ اب تو کوئی جوناگڑھ اور مشرقی پاکستان بھی نہیں جس پر سیاسی چالبازی ہوگی۔ اب 1965 جیسے حالات بھی نہیں اور کوئی کے ایچ خورشید بھی نہیں۔ جسے دلائی کیمپ میں قید کیا جائے گا۔ گلگت بلتستان کو اُن کے پاپا پہلے ہی ہضم کر چکے ہیں اور آزاد کشمیر اُن کی ذاتی جاگیر ہے البتہ سر چوہدری ظفراللہ کی سیٹ خالی ہے۔ بلاول چاہیں تو سر چوہدری بلاول کے نام سے ایک بھٹوڈویژن قائم کر لیں اور پہلے سے موجود یٰسین بریگیڈ، مجید بریگیڈ اور سلطان بریگیڈوں پر مشتمل فورس کے قیام کا اعلان کر دیں اور ان تین مسلح بریگیڈوں کی معاونت کے لیے انقلابی بریگیڈ بھی قائم کریں اور جنرل مشرف کے خادم خاص جنرل انور یا پھر اُسکے مشیر اعلیٰ میجر حفیظ کو ڈپٹی فورس کمانڈر تعینات کر دیں۔

علاوہ اسکے سابق چیئرمین جوائینٹ چیف آف سٹاف جنرل عزیز بھی ہمہ وقت دستیاب ہیں۔ جنرل عزیز کی بیگم پہلے ہی پیپلز پارٹی کی ایم ایل اے بن چکی ہیں اور اب جنرل صاحب گھر میں اکیلے اور بے روزگار ہیں جنہیں روزگار دینا باعث ثواب بھی ہے۔

سر چوہدری بلاول بھٹو زرداری چاہیں تو ظفراللہ چوہدری، ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ

اور الفرقان بریگیڈ کے ریکارڈ، دستاویزات اور ڈائریوں کا بھی مطالعہ کریں یا اس کام پر محترمہ فردوس عاشق اعوان اور جنرل انور کو لگا دیں۔

اگر سر بلاول بھٹو زرداری واقعہ ہی پورا کشمیر لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو سب سے پہلے مولانا فضل الرحمٰن کو کشمیر کمیٹی کی چیئرمینی سے ہٹائیں ورنہ مسئلہ کشمیر اتنا بھاری بوجھ برداشت نہیں کر پائیگا اور آزادی سے پہلے ہی دم توڑ دے گا۔ بلاول صاحب یہ بھی یاد رکھیں کہ لندن اور برمنگھم کے جلسے انہیں چوہدری تو بنا دینگے مگر ان کا سیاسی قد کم کر دینگے۔

سر بلاول کے لیے آخری مشورہ یہ ہے کہ اُن کے تینوں فورس کمانڈر غیر تربیت یافتہ ہیں۔ ان کے خاندان میں سے کسی نے کبھی جہاد آزادی میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی میدان جنگ دیکھا ہے۔ جنرل انور اور جنرل عزیز بھی کاغذی شیر ہیں۔ یہ لوگ بہت اچھے لیکچرار، استاد، خطیب اور خدمت گار ہیں جس بنا پر انہیں جرنیل بنایا گیا۔ کارگل کا منصوبہ جنرل عزیز نے بنایا جو ناکام ہوا۔ جنرل انور کی جرنیلی اور صدارت جنرل مشرف کی خدمت اور جی حضوری کا صلہ ہے ورنہ موصوف نے محترمہ فردوس عاشق اعوان کے حلقے میں ٹیوب ویلوں کے افتتاح کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔ فوج میں جانے سے پہلے وہ سکو ٹیچر تھے اور فوج میں رہتے ہوئے بھی زیادہ تر اُستادی ہی کرتے رہے ہیں۔

جناب بلاول پورا کشمیر کیسے لیتے ہیں، فی الحال بات سمجھ سے باہر ہے۔اگر بلاول الفرقان.بریگیڈوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں تو یہ.بریگیڈ سیالکوٹ والے الفرقان.بریگیڈ سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہونگے۔ سنا ہے کہ جناب بلاول نے تاریخ کے مضمون میں اعلیٰ ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو انہیں کشمیر کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے اور پیپلز پارٹی آزاد کشمیر کے لیڈروں کی خاندانی تاریخ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اُن کے جلسوں میں شرکت کرنی چاہیے۔ نو دولیتا قیادت اور.برادری سیاست کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ بلیک لیبل قیادت کا انجام بلیک ہول ہی ہوتا ہے۔ ٹن قائدین قوم کے زوال کا باعث تو بن سکتے ہیں، عزت، آزادی، اتحاد، اور حرمت کا نہیں جیسا کہ ابتدا میں لکھا ہے کہ ہر چیز لوح محفوظ میں لکھی جا چکی ہے اور قرآنی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے۔ قوموں کے زوال کا ایک سبب جاہل، اُجھڈ، کرپٹ اور نمائشی قیادت اور قوموں اور قبیلوں کا ایسے قائدین کی رہنمائی قبول کرنا بھی ہے۔ مسئلہ کشمیر محض سیاسی نہیں بلکہ روحانی دینی، مذہبی اور فکری مسئلہ بھی ہے جسے لوفر لفنگے اور چور لیٹرے حل نہیں کر سکتے۔

لندن اور.برمنگھم کے جلسوں کا مقصد نہ تو تحریک آزادی کشمیر کو تقویت دینا تھا اور نہ ہی بلاول کی تشہیر تھا۔ بلاول اگر تاریخ کا مطالعہ کریں تو

کشمیر اور مسئلہ کشمیر پر ہندوؤں کے بعد سب سے زیادہ انگریز مصنفین نے لکھا ہے۔ کشمیر اور کشمیریوں کے متعلق جتنا اہل یورپ جانتے ہیں اتنا پاکستانی اور کشمیری بھی نہیں جانتے ۔ بلاول بھٹو زرداری اگر غور کریں تو اُن کی سمجھ میں آجائے گا کہ لندن اور برمنگھم کے ہنگاموں کا مقصد مسئلہ کشمیر کو ہڑبونگ کی نذر کرنا اور بلاول کی تذلیل کرنا تھا۔ جس کا ثبوت بیرسٹر سلطان کے عمران خان کے ساتھ جا ملنے سے مزید واضح ہو گیا ہے۔ بلاول کو ان کے والد نے پہلے ہی گوشہ نشینی میں بھیج دیا ہے جس کی وضاحت ذوالفقار مرزا نے کر دی ہے۔ بہتر ہو گا کہ جناب بلاول چوہدریوں کے چکر میں آ کر کشمیر کے چوہدری نہ بنیں اور نہ ہی الفرقان بریگیڈوں کے سہارے سارا کشمیر لینے کی اُمید رکھیں۔

اپنی اپنی ملالہ

جس قوم نے آصف زرداری اور نواز شریف کو اپنا قائد اور نجات دہندہ تسلیم کر لیا ہو اور قوم کے دانشوروں اور داناؤں نے ان نجات دہندہ لیڈروں کے فرضی قصے لکھنے اور پڑھنے کو جزِ ایمان بنالیا ہو انہیں اندھیرے اور اُجالائے کی پہچان ہونا ممکن ہی نہیں۔ جعل سازی صحافت، سیاست اور دانش سے لیکر روحانیت تک سرائیت کر چکی ہے اور قوم ہر طرح اور ہر سطح کے جعلسازوں کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ کرپٹ، جاہل اور جعلساز سیاسی لیڈر، لشکر دانشور، کالم نگار، پیر، صوفی اور صحافی قوم کے اعصاب پر سوار ہیں اور جو کچھ ان کی زبان اور قلم سے نکلتا ہے اثر رکھتا ہے۔ آدھی قوم بھٹو ازم اور آدھی دیگر ازوم کی کھچڑی پر ایمان کی حد تک یقین رکھتی ہے۔

مشہور روسی دانشور رسول حمزہ توف لکھتا ہے کہ ایک گاؤں میں ایک بدھو اور ایک ہی دانشور قابل قبول ہوتا ہے۔ جس گاؤں میں بہت سے بدھو پیدا ہو جائیں وہاں عام لوگوں کا جینا محال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گاؤں میں ایک ہی عقل مند، رہبر اور قائد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر سارا گاؤں عقلمندوں، دانشوروں اور لیڈروں سے بھر جائے تو اُسکا حشر بھی برا ہوتا ہے۔

ہمارے بد نصیب ملک کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ عوام آصف زرداری اور نواز شریف سے خوشحالی، امن اور حفاظت کی اُمید لگائے ان ہی کے ہاتھوں، لٹ پٹ اور پس رہے ہیں مگر پھر بھی ان ہی کا دم بھرتے اور اُن کے نام پر مرتے ہیں۔ اخباری دانشور اور ٹیلی ویژن زدہ مفکر اور اینکر کہتے ہیں کہ قوم جاگ اُٹھی ہے۔ پتہ نہیں کہ غیر ملکی ایجنسیوں کے وظیفہ خور صحافیوں اور دانشوروں کی یہ قوم کہاں رہتی ہے؟ پاکستان میں ایسی کوئی قوم ہے ہی نہیں جو جاگ رہی ہو۔ جاگتی قوم کی جیبوں سے کوئی پیسہ کیسے نکال سکتا ہے۔ پولیس، پٹواری کے خوف کی ماری قوم جاگی ہوئی تو نہیں بلکہ تھکی اور ہاری ہوئی ضروری ہے۔ آج کا پاکستان قائداعظم کا نہیں بلکہ فضل الرحمٰن، اسفند یار ولی، زرداری اور نواز شریف کا پاکستان ہے اور اس پاکستان کے بطن سے ملالہ یوسف زئی، بلاول زرداری، حمزہ شہباز اور مریم نواز پیدا ہوئے ہیں۔

آج کا پاکستان رسول حمزہ توف کا گاؤں ہے جہاں اٹھارہ اینکر، پندرہ کالم نگار، پانچ سیاسی لیڈر اور اس ٹولے کے پندرہ بیس بچے اٹھارہ کروڑ بدھوں پر اپنے باپ دادوں کے بنائے ہوئے آئین اور قانون کے مطابق حکومت کر رہے ہیں۔

ایک دن سنا تھا کہ پاکستان کی عدلیہ آزاد ہو گئی ہے اور پھر افواہ پھیلی کہ میڈیا بھی آزاد ہے۔ ایک اور بدھو نے کہا کہ میڈیا آزاد ہوا اور پھر بک گیا۔ میڈیا والوں نے یہ گرُ آئی پی ایل سے سیکھا اور ہر صحافی، اینکر، میڈیا ہاؤس کے مالک اور دانشور نے کرکٹرز کی طرح اپنی بولی لگا دی۔ سیاستدانوں، حکمرانوں سمگلروں، کارخانہ داروں اور ساھو کاروں نے اپنی اپنی پسند کے اینکر دانشور، صحافی اور کالم نگار ہی نہ خریدے بلکہ چوٹی کے وکیل، کچھ وزیر اور جج بھی خرید لیے تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں۔ ملکی منڈی میں مندی ہوئی تو صحافیوں، دانشوروں اور اینکروں نے این جی او اور پاکستان مخالف غیر ملکی ایجنسیوں کے ہاتھوں بکنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کی اور جو جس کے ہاتھ لگا وہ خرید لیا گیا۔ سب عقلمندوں اور دانشمندوں کو ایک جیسا کام ملا تا کہ نظریات اور رجحانات میں ٹکراؤ نہ ہو۔ پاکستان، اسلام، افواج پاکستان، آئی ایس آئی اور عوام کی توہین، تذلیل اور تحیقرسب کا مشن و مقصد ٹھہرا اور سب کو تلقین کی گئی کہ جو کچھ اور جیسا مغربی میڈیا کی طرف ملے اُسے ویسا ہی وصول اور قبول کیا جائے اور پھر پوری قوت سے بدھوؤں کے دماغوں میں ٹھونس دیا جائے۔

حشر سامانیوں کا دور چلا تو عدلیہ نے چپ سادھ لی اور عوام کو چپ لگ گئی۔ ملک بدھوں کا دیش بن گیا تو میڈیا اور پارلیمنٹ نے یک زبان ہو کر فوج پر

حملہ کر دیا۔ کتا شہید اور ملک کا محافظ مردہ ٹھہرا۔ ملالہ پاکستان کی بیٹی بنی اور اہل مغرب نے بیٹی کی تعلیم وتربیت کا بیڑا اُٹھا لیا۔ ہمارے دانشوروں کی دانشورانہ غفلت حکمت اور زنگ آلود ذہانت کو سات سلام۔۔۔ جس قوم کا اثاثہ ایسے صحافی اور صافی ہونگے اُس قوم کا صفایانہ ہونا بھی ایک معجزہ ہے۔ دانشوروں سے گزارش ہے کہ وہ لارنس آف عربیہ (پیر کرم شاہ) اور دیگر کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں کہ کسطرح اہل مغرب نے اپنے ایجنٹوں کی تربیت کی اور انہیں استعمال کرکے عظیم اسلامی خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور کسطرح افغانستان کو ترقی، خوشحالی اور تعلیم کے حق سے ہمیشہ کے لیے محروم کرکے اُسے ملاؤں، قبائلی سرداروں اور غیر ملی وظیفہ خواروں کی جنت بنا دیا۔

صلاحیتوں سے محروم، عقل کے اندھوں اور غیر ملکی ٹکڑوں پر پلنے والوں سے گزارش ہے کہ میاں ضیا الدین کی خاندانی تاریخ اور سرحدی گاندھی کے اس سچے پیروکار کی طالب علمی کے دور سے سوات آپریشن تک کے حالات اور تقریروں کا بھی مطالعہ کریں تاکہ اُن کے بند دماغوں کی کھڑکیاں کھل جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ایک اندھیرے ذہن میں روشنی کی کرن چلی جائے اور اُسے نوبل انعام کی حقیقت نظر آجائے۔ مگر یہ سب مشکل ہے، کیونکہ درمیان میں ڈالروں کی دیوار ہے۔ پاکستان، قائداعظم اور اسلام کو گالیاں دینے والے عوامی نیشنل پارٹی

کے جانباز کی تقریروں کے مطالعے سے پتہ چل جائے گا کہ جو درخت باچہ خان کے پیرو کاروں نے ولی باغ میں لگایا تھا وہ کن مراحل سے گزر کر اور کس کے کنوے کے پانی سے سیراب ہو کر آج پھل دے رہا ہے۔ ملالہ کا چناؤ کیسے اور کس کے اشارے پر ہوا اور ایک منظم مہم چلا کر سرحد گاندھی کی بیٹی اور بھارتی گاندھی کے بیٹے کو امن کا مشترکہ نوبل انعام دیا گیا۔

اب ذرا آٹھ سالہ ملالہ کی تصنیف گل مکئی کی طرف آیئے جو بی بی سی پر نشر ہوئی۔ گل مکئی کیا ہے؟ میں نے پشاور یونیورسٹی کے بہت سے پروفیسروں، پختون قلمکاروں اور دیگر شعبہ جات کے اُستادوں سے پوچھا تو کسی کو بھی گل مکئی کا علم نہ تھا۔ کسی نے کہا کہ کوئی فرضی قصہ، کہانی یا داستان ہے۔ کسی نے بتایا کہ شاہد مکئی کا پھول ہے مگر مکئی کی تو دُم ہوتی ہے پھول نہیں تو پھر گل مکئی کیا چیز ہے؟ کسی نے کہا شاید اس پر کوئی فلم بھی بنی تھی؟ کس نے بنائی تھی اور کس نے دیکھی تھی؟ کوئی گواہ نہیں۔ شاہد کچھ صحافیوں نے دیکھی ہو؟ مگر فواد چوہدری اور معید پیرزادہ نے تو بلکل نہیں دیکھی ہوگی۔ معید پیرزادہ جس میرپور کا رہنے والا ہے وہاں تو کوئی فصل ہی نہیں ہوتی اور اس جگہ کا پرانا نام بلاگالہ تھا جہاں بلائیں رہتی تھیں اور شاہد اب بھی ہوں۔ ویسے بھی میرپور اور دینہ باجرے کے علاقے ہیں جہاں صرف باجرہ پیدا ہوتا ہے اور دریا کے دونوں جانب بلائیں رہتی ہیں۔ سنا ہے کہ

کشمیری لیڈر چوہدری یوسف باغ شہر میں کسی جلسے کے چیف گیسٹ تھے۔ سٹیج پر ایک کے بعد ایک سردار آ رہا تھا اور تقریر جھاڑ رہا تھا۔ چوہدری صاحب نے سپیکر آزاد کشمیر اسمبلی میجر ریٹائرڈ سردار ایوب سے پوچھا کیا یہاں کوئی چوہدری نہیں رہتا۔ میجر صاحب نے کہا جناب چوہدری اور باجرہ صرف میرپور میں ہوتا ہے یہاں چاول اور سردار ہوتے ہیں۔

لگتا ہے کہ گل مکئی نیشنل عوامی پارٹی کی ہی داستان غم تھی اور فلم ضرور بلوروں نے بنوائی ہوگی اور رات کے اندھیرے میں صابرینہ سینما پر چلی ہوگی۔ چلو مان لیتے ہیں کہ گل مکئی کوئی عشق و محبت کی فرضی داستان تھی تو اسکا انسانی حقوق یا عورتوں کی تعلیم سے کیا تعلق تھا؟ کیا یہ کنشک دور کا قصہ تھا یا بدھ کے زمانے کی داستان تھی،اگر کسی کو پتہ نہیں تو آٹھ سالہ ملالہ کو کہاں سے پتہ چلا اور اُس نے اس پر ایک کتاب بھی لکھ ڈالی جو اُسکے والد کی وساطت سے بی بی سی نے پر نشر ہوئی۔ یہ کیسا اتفاق اور کیسی واردات ہے؟

بی بی سی اور ایک چھوٹے سے گھر میں پرائیوٹ سکول چلانے والے میاں ضیاالدین کا کیا رشتہ تھا۔ کیا میاں ضیاء الدین بی بی سی کا نمائندہ تھا۔ رحیم اللہ یوسفزئی یا مظہر عباس کو پتہ ہوگا۔ رشتے اور تعلق کے بغیر تو بی بی سی

والے کسی کی ڈاک ہی وصول نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی مضمون یا خبر شائع کرتے ہیں۔کیا میاں ضیاء الدین نے گل مکئی بی بی سی کے نمائندے کے ذریعے بھجوائی؟ ایسا بھی کوئی ثبوت نہیں تو بھائی اٹھارہ کروڑ بدھوؤں کو مزید بدھو نہ بناؤ ان پر کچھ رحم کرو۔

بی بی سی تو دور کی بات ہے۔ جنگ، نوائے وقت، مشرق اور صدائے چنار بھی گم نام خط نہیں چھاپتے۔ ملالہ جب حامد میر کے پاس آئی تھی تو اُسکے ساتھ دو تین اور بھی لڑکیاں تھیں اور سب نے کہا تھا کہ ہمارا اسکول بند ہو گیا ہے ہمارا اسکول کھولو۔ باقی لڑکیاں کہاں گئیں۔ کیا اُنکا سکول کھل گیا تھا اور اُنکے گھروں میں امن آگیا تھا کون جانے اور کیوں جانے ہر کسی کو اپنی اپنی مرضی و منشا اور ملالہ ہے۔ میری بھی ایک ملالہ ہے جسے کسی ایوارڈ کی ضروری نہیں۔ میری ملالہ کی کہانی آگے آئے گی۔

ملالہ کی کہانی میاں ضیا الدین، عوامی نیشنل پارٹی اور گاندھی ازم کی مشترکہ کاوش ہے جسے پروان چڑھانے میں ملکی میڈیا گروپ، مغربی میڈیا اور پاکستان مخالف تحریک کا اہم رول ہے۔ کون نہیں جانتا کہ طالبان نے کس کے اشارے پر سوات پر حملہ کیا اور کون کون سے ممالک اور خفیہ ادارے طالبان کے معاون و مددگار تھے۔ سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ جن قوتوں نے طالبان کو شہہ

دی اُن ہی قوتوں نے ہی ملالہ کا کراد بھی متعارف کروایا۔
اثر چوہان لکھتے ہیں کہ سترہ سالہ پاکستانی ملالہ اور ساٹھ سالہ بھارتی کیلاش ستیار تھی کو امن کا مشترکہ انعام ملا۔ ملالہ نے فروغ تعلیم کے لیے کام کیا اور ستیار تھی نے آزادی کے سرخیل گاندھی جی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امن کے لیے جدو جہد کی۔ پھر فرماتے ہیں کہ ملالہ کو ملنے والا نوبل امن انعام اسلام کی فتح اور قائداعظم کے مشن کی کامیابی ہے۔ موصوف بھول کہ حامد میر کے پروگرام میں ملالہ کہہ چکی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نہیں بلکہ اُسکا باپ اور بینظیر بھٹو اُسکی آئیڈیل ہیں۔ اسی پروگرام میں دوسرے بچوں نے حضور ﷺ کو اپنا آئیڈیل قرار دیا تھا۔ اسی سالہ اثر چوہدری آجکل امریکہ میں ہیں جہاں ڈالروں کی بارش ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ملالہ کی تربیت جس ماحول میں ہوئی وہاں اسلام، پیغمبر اسلام، قائداعظم اور پاکستان کا کبھی ذکر نہیں ہوا۔ ملالہ کا کردار بدھوؤں کے کھیت میں ایک نیا بیج ہے جسکا پھل اہل مغرب کھائیں گے اور کانٹے بدھوؤں کے حلق میں اتریںگے۔ ملالہ کی وجہ سے پاکستان اور دنیا میں کونسا امن آیا اور کتنے لوگوں تعلیم یافتہ ہوئے۔ اُسکا جواب فرزانہ باری اور دیگر نام نہاد صحافی اپنی اپنی باری پر دے سکتے ہیں۔ اگر اس انعام کی کوئی حقیقت ہوتی تو یہ اُن سب بچیوں کے نام ہوتا جو ملالہ کے ساتھ زخمی ہوئیں۔

عجیب قصہ ہے کہ ہمارے منافق میڈیا کو کالام کی رہائشی ملالہ کی کبھی خبر نہ ہوئی جس نے تن تنہا اپنے گھر کی اور محلے کی خواتین کی حفاظت کی جو طالبان کے خوف سے اُسکے گھر میں پناگزین تھیں۔ ملالہ نے طالبان لشکر پر موثر فائر گرایا اور پانچ حملہ آوروں کو بقول مولانا فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر منور حسین کے شہید کر دیا۔ مولانا فضل الرحمٰن ان صحافیوں کے دوست ہیں اور اُن کے اقوال کے ترجمان بھی ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ کالام کی فائیٹر ملالہ کا کبھی ذکر نہیں ہوا اور نہ ہی جمہوریت پسند جنرل کیانی نے اُسے کوئی میڈل دینے کا اعلان کیا۔ ماوند کی ملالہ بھی کسی کو یاد نہیں چونکہ اُسکا تعلق کسی سیاسی جماعت کے پاکستان مخالف دھڑے سے نہ تھا۔ ماوند کی ملالہ کا باپ بھی کسی گاندھی گیری کا پرچار اور وطن مخالف لیڈر نہ رہا تھا۔ ماوند کی ملالہ نے اپنے چھوٹے سے گاؤں پر طالبان کے دس حملے پسپا کیے اور اپنے گھر کی چھت پر مورچہ بنا کر بیٹھ گئی۔ کیا گاؤں کی بیٹیوں اور ماؤں کی عزت بچانے والی ملالہ سے سلیم صافی اور رحیم اللہ یوسفزئی واقف نہیں؟ ماندو کی ملالہ پر بھی الزام لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے طالبان کے خلاف بندوق کیوں اُٹھائی ۔

آیئے اب ملالاؤں کے پورے گروپ سے ملتے ہیں۔ اس گروپ کا نام تھا ''داخوانداؤ ٹولو نہ'' یعنی بہنوں کی مجلس ۔اس گروپ میں سوات کی بہادر بیٹیوں نے اپنے

حقوق کی آواز اُٹھائی اور عورتوں کی آزادی، عزت، تعلیم اور صحت کے لیے مشترکہ جدوجہد کا آغاز کیا۔ بہنوں کی اس مجلس نے بہت قربانیاں دیں اور تکلیفیں اُٹھائیں۔ سکولوں سے نکالے گئے بچوں کو اپنے گھروں میں تعلیم دی اور اُن کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ بہنوں کی اس مجلس نے اعلان کیا کہ اگر سکول تباہ ہوتے ہیں تو ہونے دو ہمارے گھر تمھارا سکول ہیں۔ کیا ملالہ کے باپ میاں ضیاء الدین نے بھی اپنے چھوٹے سے پرائیوٹ سکول میں کسی کو مفت تعلیم دی یا پھر بیٹی کے نام پر گل مکئی ہی لکھتا اور کیش کراتا رہا۔ کسی صحافی، کالم نگار اور اینکر کو بہنوں کی مجلس یاد نہیں؟ یاد کیسے ہو یہ کوئی مغرب زدہ این جی او تو تھی نہیں اور نہ ہی انہیں کسی سیاسی جماعت یا مفاد پرست ٹولے کی حمایت حاصل تھی۔ جو لوگ ملک قوم اور عزت کے لیے میدان میں اترتے ہیں وہ ہمیشہ بے نام ہی رہتے ہیں۔

میرے محبوب کے خون کا وہ قطرہ جو وطن کی حفاظت میں دھرتی کے سینے پر گرا میں" اُس خون کے قطرے سے اپنی مانگ سجاؤنگی۔ یقیناً اس قطرے کی سرخی اور خوشبو میرے حسن کو چار چاند لگا دے گی۔ شہید کے خون کے اس متبرک قطرے سے میرا چہرہ کھل اُٹھے گا اور باغوں میں مہکتے گلاب شرما جائینگے۔ میرے محبوب کے خون کا یہ قطرۃ پختونوں کے خون کو گرمائے گا اور وہ وطن کی آزادی

اور عظمت کے لیے کٹ مرینگے"۔

میں نے اپنی ماں اور باپ سے شاہ بھوری اور بی بی عالیہ کی کہانیاں سنی ہیں۔ میرے" محبوب تیرے خون کے قطرے کی قسم ہم غیور پٹھان کبھی عزت اور آزادی پر حرف نہ آنے دینگے۔ زابل کے قلعے کے پتھر گواہ ہیں کہ پختونوں کی بیٹی نازو نہ اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑتی ہوئی وطن کی عزت پر قربان ہو گئی۔ جب تک غیر مند پختون مائیں زندہ ہیں شہیدوں اور غازیوں کی نسل ختم نہ ہوگی۔" یہ اشعار ملالہ انا نے شہادت سے پہلے اپنے شہید منگیتر کی شان میں کہے۔

ملالہ نے اپنے باپ اور منگیتر کے ہمراہ ماوند کی جنگ میں حصہ لیا اور بہادری کے وہ جوہر دکھائے جو کوئی مرد بھی نہ دکھا سکا۔ ملالہ کا منگیتر شہد ہوا تو ملالہ نے آگے بڑھ کر جھنڈا پکڑ لیا۔ کچھ دیر ملالہ نے ایک ہاتھ میں جھنڈا اور دوسرے ہاتھ میں بندوق تھامے رکھی مگر گولیوں کی ایک باڑ نے ملالہ کو اُسکے باپ اور منگیتر کی راہ دکھائی۔

افغان اور پاکستانی قبائل اس شہید ملالہ کو ملالہ انا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ملالہ انا یعنی افغانوں کی دادی۔ ملالہ انا، ملالہ کاکڑ، بی بی

عالیہ، شاہ بھوری، ملالہ گل اور سوات کی بیٹوں کی تنظیم بہنوں کی مجلس، ملالہ ناہید، ملالہ کائنات، شازیہ یوسفزائی سمیت کتنے نام ہیں جنہیں کسی ایوارڈ انعام اور جعلی نام کی ضرورت نہیں۔

افغانوں اور پٹھانوں کی یہ بہادر بٹیاں ہم سب کی بیٹیاں ہیں جنہیں کسی فرضی مفاد پرست صحافی یا سیاستدان کی ڈالروں بھری تشہیر اور تحسین کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ سب غریبوں کی ملالائیں ہیں۔ یہ لنگروں، این جی او اور اہل مغرب کی پسندیدہ اور پروردہ نہیں۔

میاں ضیاء الدین اور عوامی نیشنل پارٹی کی ملالہ کا نوبل انعام پاکستانی میڈیا، سول سوسائٹی، اور نریندر مودی اور میاں نواز شریف کو مبارک ہو۔ یہ آپکی ملالہ ہے جس نے ایک بھارتی کیساتھ ایوارڈ شیئر کیا ہے۔ ہم ملالہ انا، ملالہ کاکڑ، ملالہ کائنات کو سلام پیش کرتے ہیں۔ تمھاری ملالہ تمہیں مبارک چونکہ ہر کسی کی اپنی اپنی ضرورت اور ملالہ ہے۔ کوئی تشہیر اور ایورڈ والی اور کوئی غیرت ایمانی اور جرات و کردار والی۔

فاتح بڑجن

مغلوں کو کشمیر سے عشق تھا۔ مغل حکمران، شہزادے اور شہزادیاں وادی کشمیر جنت نظیر سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ مغلوں نے کشمیر میں شاہراہیں، باغ، باولیاں اور نہریں تعمیر کیں اور دور دراز کے ممالک سے ہنر منداور کاریگر بلا کر آباد کیے۔ مغلوں نے کشمیر کی زرخیز زمین کا بھی خوب استعمال کیااور ایران و افغانستان کے علاوہ وسطی ایشیاء سے پھلوں اور پھولوں کی ہزاروں اقسام کشمیر کی مٹی سے متعارف کرائیں۔

مغلوں سے پہلے کشمیر اور ہندوستان کو ملانے والے صرف دوراستے تھے جبکہ کشمیر کو چین، ایران اور مغربی ممالک سے ملانے کے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ یہ راستہ کاشغر، ہنزہ، چترال اور پشاور تک تھا جہاں دنیا بھر کے تاجر، سیاح، تاریخ دان اور آوارہ گرد اپنے قصے کہانیوں کی پوتھیاں لیکر آتے اور نئے قصے کہانیاں اور داستانیں لیکر مشرق و مغرب میں پھیلی تہذیبوں کی کڑیاں باہم ملاتے۔اپریل 1884ء کے دن انگریز مہم جو کیپٹن ینگ ہاسبنڈ سلک روڈ کی تلاش میں نکلا اور پیکنگ سے ہوتا ہوا اعظیم چینی صحرا تک جا پہنچا۔ کئی ماہ کی مسافت کے بعد ینگ ہاسبنڈ درہ مستاگ سے گزرتا ہوا ہنزہ آیا اوردرہ

بروغل کی بلندیوں کو چھوتا ہوا چترال اور پھر پشاور پہنچا۔ فرانسس ینگ ہاسبنڈ نے وہی راستہ اختیار کیا جس پر چلتے ہوئے ہیون سانگ، فائین، مارکوپولو، البیرونی اور دیگر سیاحوں اور کھوجیوں نے دنیا کی سیر کی۔ ینگ ہاسبنڈ نے اپنے سفری نقشے پر جن اہم مقامات کا ذکر کیا ان میں شمشال، ہنزہ اور چترال کے قلعے نمایاں ہیں۔ فائین، ہیون سانگ اور البیرونی نے بھی ان مقامات کا ذکر کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم دور سے یہ قلعے آباد تھے جنہیں حملہ آوروں نے کئی کئی بار مسمار اور برباد کیا مگر مقامی حکمرانوں نے انہیں پھر آباد کر لیا۔

کشمیر اور ہندوستان کے درمیان دوسرا اہم راستہ اوڑی، مظفرآباد، ایبٹ آباد سے حسن ابدال تک تھا جبکہ تیسرا راستہ جموں، پونچھ اور راوڑی سے گزرتا وادی کشمیر میں داخل ہوتا تھا۔ کشمیر کی حدود میں اوڑی اور مظفر کے قلعے قدیم دور سے چلے آرہے ہیں جبکہ پونچھ شہر کے گرد بھی ایسے آثار موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ پونچھ بھی کسی دور میں ایک قلعے ہی میں آباد تھا۔ اوڑی کا قلعہ ہر حملہ آور نے مسمار کیا مگر اوڑی کے ککھوں نے اسے دوبارہ آباد کر لیا۔ اوڑی اور اقوم ککھا کا ذکر راج ترنگی اور دیگر قدیم کتب میں بھی موجود ہے۔

مغلوں نے تین راستے متعارف کروائے جنھیں مغل شاہرائیں کہا جاتا ہے۔ یہ شاہرائیں پہلے راستوں کی نسبت زیادہ محفوظ اور انتظامی لحاظ سے آرام دہ تھیں۔ مغلوں نے ان شاہراؤں پر قلعے، مسجدیں، باولیاں، سرائیں، فوجی چوکیاں، درخت اور باغ لگوائے تاکہ مسافر اور مقامی آبادی ان سہولیات سے فائدہ اُٹھائیں۔ مغل شاہراؤں کی تعمیر سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران اور وسطی ایشیائی ممالک کے کاری گروں اور ہنر مندوں نے کشمیر کا رخ کیا اور کشمیری مصنوعات ساری دنیا میں متعارف کروائیں۔ کشمیری شال و دوشالے فرانس، روس اور دیگر دور دراز ممالک تک پہنچے اور کشمیری زعفران کی مہک نے بادشاہوں اور نوابوں کے دماغوں کو معطر کیا۔ گجرات سے بھمبر، باغسر، نوشہرہ، پونچھ، کہوٹہ، حاجی پیر، اوڑی کو کشمیر سے ملانے والی مغل شاہراہ پر بھمبر، باغسر، کھمباہ، پونچھ اور اوڑی کے قلعے تعمیر کیے گئے۔ بھمبر، پونچھ اور اوڑی کے قلعے مغلوں سے پہلے ادوار کے ہیں جن کے اب آثار ہی باقی ہیں۔ باغسر اور کھمبا کا قلعہ آج بھی موجود ہے اور عظمت رفتہ کی یاد لاتا ہے۔ باغسر کا قلعہ پاکستان آرمی جبکہ کھمباہ کا قلعہ بھارتی فوج کے استعمال میں ہے۔ ایک اور مغلیہ شاہراہ جسکا آغاز جہلم کے پتن سے ہوتا ہے۔براستہ میرپور کوٹلی، مینڈھر، راجوری سے ہوتا درہ پیر پنجال کے راستے وادی کشمیر میں داخل ہوتا تھا۔ مینڈھر تک یہ راستہ ہر موسم میں استعمال ہوتا تھا جبکہ برفباری کے موسم میں مینڈھر سے پونچھ یا پھر کوٹلی سے پونچھ.

اور اوڑی پر اُترتا تھا۔ اس مغل شاہراہ پر منگلا، رام کوٹ، بڑجن اور تھروچی کے مقام پر قلعے تعمیر کیے گئے جن کی اہمیت بیان کی جا چکی ہے۔

منگلا کا قلعہ منگلا ڈیم کی وجہ سے محفوظ ہے اور اہم سیاحتی مقام ہے۔ اگر یہ قلعہ عین منگلا بند پر موجود نہ ہوتا تو یقیناً کسی جیالے سیاستدان کے عالیشان بنگلے میں بدل چکا ہوتا۔ دوسری صورت میں بڑجن قلعے کی طرح اسے اُکھیڑ کر اس کے پتھر فروخت کر دیے جاتے اور زمین پر کسی نو دولیتے وزیر کا ہوٹل، پلازہ یا شادی حال بن چکا ہوتا۔

رام کوٹ کا قلعہ بھی ہمارے سیاستدانوں اور نو دولیتے لیڈروں کا منہ چڑانے کے لیے قائم ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ منگلا جھیل کی وجہ سے وہاں تک رسائی ممکن نہیں۔ راقم نے تین مرتبہ اس قلعے کا نظارہ کیا اور ہر بار اسے نقصان زدہ ہی پایا۔ اس قلعے میں موجود موریتاں اور نقش و نگار سے مزین پتھر کی سلیں اب وہاں موجود نہیں۔ سیاست اور دولت کے پجاریوں سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ھنومان جی بھی اپنے گھروں میں سجا لیں یا پھر اپنے سیاسی دیوتاؤں کے چرنوں میں جا رکھیں۔ دیوالی پر قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے اور قومی سطح پر چھٹی منانے کی تجویز دینے والے سیدوں کی بھی اس ملک میں کمی نہیں۔ ایسے عالم دین اور سیاسی قائدین بھی ہیں جنہیں پاکستان سے گھن آتی ہے اور

جن کے باپ دادا پاکستان بنانے کے جرم میں بھی شریک نہ تھے۔ ایسے سیاستدان جو مودی کی خوشنودی کے لیے دیوالی منانے چل نکلے ہوں وہ قلعے تو کیا قوم کو قربان کرنے اور بیچنے سے بھی دریغ نہ کرینگے۔

رام کوٹ سے آگے منگلا جھیل کے پار بڑجن کا قلعہ بھی تھا جواب نہیں ہے۔اس سے آگے تھروچی کا قلعہ ہے جواب بھی قائم ہے اور فوج کی تحویل میں ہے۔۔بڑجن کا قلعہ وزیراعظم چوہدری عبدالمجید کے حلقہ انتخاب میں آتا ہے۔۔بڑجن اور ڈڑجن میں چوہدری مجید کی برادری آباد ہے اور وزیراعظم کا حلقہ انتخاب ہونے کی وجہ سے لوگوں کو ہر طرح کا قانونی اور آئینی تحفظ حاصل ہے۔ وزیراعظم آزاد کشمیر جو ہمیشہ سے ہی اس حلقے سے الیکشن لڑتے ہیں اور اکثریت جیت جاتے ہیں کو اپنے ووٹروں، عزیز رشتہ داروں اور برادری والوں کی ہر جائز و ناجائز خواہش کا احترام کرناپڑتا ہے۔ جناب وزیراعظم کی پشت پناہی سے ان لوگوں نے جی بھر کر جنگل کاٹ کر فروخت کیااور پندرہ میل پر پھیلے رقبہ پر کوئی درخت نہ چھوڑا۔ سینئر وزیر نے اس رقبے پر اپنے ووٹروں کو آباد کیااور جنگل کا قصہ ہی ختم کر دیا۔ جناب وزیراعظم کے ووٹروں اور برادری والوں نے بڑجن کا قلعہ مسمار کیااور قلعے کے پتھر ٹرکوں اور ٹرالیوں میں بھر فروخت کر دیے۔ سنا ہے کہ کچھ پتھر سینئر وزیر کے محل اور کچھ جناب وزیراعظم کی رہائش گاہ کی چاردیواری کے کام بھی آئے۔ وزیراعظم کا لقب

مجاور اور سینئر وزیر کاشیر کوٹلی ہے جناب وزیر اعظم کو چاہیے کہ وہ اپنے نام کیساتھ فاتح بڑجن کا بھی اضافہ کرلیں چونکہ یہ قلعہ ان ہی کی مرضی اور ضرورت کی وجہ سے مسمار ہوا ہے۔ تاریخ میں جب کبھی بڑجن فورٹ کا ذکر ہوگا تو اُس کے تعمیر کندہ اکبر اعظم اور مسمار کندہ چوہدری عبدالمجید کا نام بھی سامنے آئے گا۔ تاریخ دان ضرور لکھے گا کہ بڑجن کا قلعہ مغلوں نے تعمیر کیا اور بڑجن کے جاٹوں نے مسمار کردیا جس پر حکومت آزاد کشمیر نے مجرمانہ خاموشی اختیار کی۔

میر کارواں کون ؟ جنرل راحیل شریف یا میاں نواز شریف

آل سعود اور آل شریف آف جاتی عمرہ پر بات کرنے سے پہلے ایک نظر ملک یمن پر ڈالتے ہیں چونکہ یمن کا پنجاب اور پنجابی ادب سے بڑا گہر رشتہ ہے۔ بھلے شاہ، شاہ حسین، بابا فرید اور دیگر پنجابی صوفی شاعر اپنا اپنا ایک مقام رکھتے ہیں مگر ان سب شاعروں کی نسبت جو انداز بیان رومی کشمیر، عارف کھڑی حضرت میاں محمد بخشؒ نے اختیار کیا ہے وہ ہر لحاظ سے منفرد ہے۔ پنجابی ادب اور میاں صاحبؒ کا ہیر و سیف الملوک جسکا اصل نام عاصم بن صفوان تھا ملک یمن کا ہی شہزاد تھا۔ قصہ سیف الملوک کے مطابق عاصم بن صفوان بدیع الجمال کے عشق میں مبتلا ہو کر تلاش یار میں نکلا تو سب سے پہلے اُسکے راستے میں سمندر حائل ہوا پھر ریگستان آیا، جنگل آئے اور آخر کار بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ عبور کرتے ہوئے وہ کوہ قاف کے ملک پریستان پہنچا ۔ منزل تک پہنچنے اور محبوب کی محبت کے حصول کی خاطر شہزادے نے جو جو دکھ اُٹھائے، قیدیں کاٹیں، مشکلات برداشت کیں اور جس جوانمردی اور جرات و استقلال کا مظاہرہ کیا اُسکا بیان الگ ہے۔

سعوی عرب، پاکستان اور یمن کے حالات سے لگتا ہے آج ایک عاصم بن صفوان نہیں بلکہ تین عاصم بن صفوانوں یا سیف الملوکوں کی ضرورت ہے جو صرف عاشق مزاج ہی

نہ ہوں بلکہ کردار میں بھی سیف الملوک کے ہم پلہ ہوں۔ پاکستانی شاہی خاندان اپنے آپ کو کشمیری النسل کہتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان پر بٹ شاہی حکمران مسلط ہیں جن میں خواجے، ڈار، شیخ اور جاٹ بھی شامل ہیں۔ کشمیر پر لکھی جانے والی سب سے مستند کتاب پنڈت کلھین کی راج ترنگنی ہے جس میں باون کشمیری حکمران خاندانوں کا ذکر نہیں ملتا۔ اسی طرح جن حکمران خاندانوں کا ذکر ہے۔ اُن میں بٹ خاندان کبھی حکمران نہیں رہا اور نہ ہی خواجے، ڈار، شیخ اور جاٹ کبھی حکمران رہے ہیں۔ بٹ، خواجہ، ڈار اور شیخ ایک ہی خاندان کی شاخیں ہیں جو تاریخی لحاظ سے دستکار، صنعت کار اور تاجر ہیں۔ کشمیر میں جہاں کہیں آپکی راج رہا ہے وہاں بھی شیخوں، بٹوں، خواجوں، ڈاروں اور جاٹوں کی الگ حکمرانی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کشمیر کے پہلے حکمران راجہ گوندہ جسکا تعلق تبت کے شاہی خاندان سے تھا، لیکر رانی کوٹہ اور پھر زین العابدین بڈھ شاہ سے ڈوگرہ راج تک بعض بٹ، ڈار، خواجہ اور شیخ معززین افسروں اور تاجروں کا ذکر تو ہے مگر بٹ شاہی کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

کشمیر سے الگ ریاست گلگت و بلتستان، وادی نیلم اور ہزارہ کا ذکر کریں تو ان علاقوں پر ایک طویل عرصہ تک بھٹ شاہی کا راج رہا ہے۔ جسے ہم میاں برادران، خواجگان اور بٹ صاحبان کی خوشنوی کی خاطر بٹ شاہی کہہ سکتے ہیں۔

اگر میاں صاحب کے داماد صفدر اعوان کا شجرہ مانسہرہ کے کسی ولی اللہ سے جوڑا جاسکتا ہے۔ تو بٹ صاحبان جو کہ پاکستان کے مطلق اُلعنان حکمران ہیں کو قیاس اور دلیل کی قوت سے بھٹ شاہی سے جوڑنا کوئی مشکل کام نہیں ۔ اس کام کے لیے حکومت چاہے تو پاکستان کی ٹی وی سکرین پر نظر آنے والے چند خود ساختہ اور مشہور دانشوروں ، محقق اور مدبر صحافیوں ،اینکر پرسنز کی خدمات حاصل کر سکتی ہے۔ چونکہ قصہ سیف الملوک پنجابی زبان میں ہے جسے پہلے پہل عربی اور فارسی کے بعد دکنی زبان میں نقل کیا گیا اس لیے ضروری ہے کہ یمن اور پنجاب کے درمیان ایک ادبی ، سماجی ، اور شاہی تعلق پیدا کیا جائے۔ ہمارے وزیر دفاع جناب خواجہ آصف بھی تو کسی سیف الملوک سے کم نہیں ۔ آئینی اور قانونی لحاظ سے پاکستانی مسلح افواج ان کے تابع فرمان ہیں اور عشق و محبت میں بھی وہ کسی سے کم نہیں ۔ پنجاب کی بدیع اُلجمال اُن پر فاریفتہ ہے اور شاہی خاندان ان کی مرضی و منشا کا محتاج ہے۔ شہزادہ عاصم بن صفوان اور شہزادہ آصف بن صفدر کا موازنہ کیا جائے تو شہزادہ آصف ہر لحاظ سے برتر ہیں ۔ شہزادہ عاصم مصر سے یمن پہنچا تو اُسکا لشکر سمندر میں غرق ہو چکا تھا اور وہ تنہا منزل کی جانب چلا تھا۔ شہزادہ آصف کے لشکر ایٹمی ہتھیاروں اور جدید جنگی ساز وسامان سے لیس ہیں اس لیے اُن کی پوزیشن ہر لحاظ سے مستحکم ہے۔

دوسری جانب آل سعود کی تاریخ بھی منفرد ہے جسکا مکمل احوال جناب محمد اسد

کی کتاب روڈ ٹو مکہ میں درج ہے۔ آل سعود نے ترکوں کے خلاف طویل جنگ لڑی جس کی بنیاد مسلک پر استوار تھی۔ اس جنگ نے بھی کئی رخ اختیار کیے اور ہر بدلتے رخ میں امریکہ، برطانیہ، اٹلی، فرانس اور جرمنی نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا۔ اسی جنگ کے کچھ کرداروں میں شریف آف مکہ، شاہ عبداللہ آف اُردن اور لارنس آف عربیہ بھی سامنے آئے اور اپنا اپنا حصہ لے کر رخصت ہوگئے۔ اہل مغرب نے صلیبی جنگوں سے سبق حاصل کر رکھا تھا اور انہیں یقین تھا کہ ایک بڑی اسلامی مملکت اہل مغرب کے کسی بھی وقت مد مقابل آسکتی ہے جسکا توڑ ابتداء سے ہی ضروری سمجھا گیا۔ آل سعود اور آل رشید کی چپقلش ختم ہوئی تو چرچل کی ذاتی دلچسپی اور کوششوں کے نتیجے میں اسرائیلی ریاست کا قیام وجود میں آیا جس کی وجہ سے اُردن کا رقبہ مزید سکڑ گیا۔

ایک منصوبے کے مطابق بلاد شام کو تقسیم کیا گیا اور اُردن، شام، عراق اور لبنان علیحدہ اور خود مختار ملک بن گئے۔ چونکہ بلاد شام کی مضبوطی سے سعودی عرب اسرائیل اور خلیجی ممالک کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ اُردن، شام، عراق اور لبنان مجموعی آبادی کے لحاظ سے شیعہ اکثریتی علاقے تھے جبکہ سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں میں بھی شیعہ آبادی وجود تھی۔

،مغربی سیاستکار اگر بلادشام کو تقسیم نہ کرتے تو آج جنوبی افغانستان

بلوچستان اور یمن تک ایک بڑی شیعہ ریاست قائم ہو چکی ہوتی جس میں سعودی عرب کا کچھ علاقہ جہاں شیعہ اکثریت موجود ہے کے علاوہ آدھی سے زیادہ خلیجی ریاستیں بھی شامل ہو چکی ہوتیں۔

سعودی عرب کے قیام اور بلاد شام کی تقسیم کے بعد مسلم دنیا تین بڑے فرقوں میں تقسیم ہو گئی اور ہر فرقے کے اکابرین نے دوسرے کو کافر، مشرک، بدعتی، خارجی اور ملائمتی قرار دیا۔ شیعہ، سنی اور وہابی فرقوں کی باہم چپقلش کئی ممالک میں خانہ جنگی میں بدل گئی اور کمزور طبقات کا خون بہایا گیا۔ مذہبی اور مسلکی جنگ کے علاوہ سوشلزم کیپٹل ازم اور سیکولرزم نے الگ رنگ دکھلایا جسکی وجہ سے اسرائیل مضبوط ہوا اور، مسلم ممالک کے تیل کے خزانوں سے اہل مغرب نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ درحقیقت اسرائیل کے خلاف نبرد آزما الفتح اور دیگر فلسطینی تنظیمیں سوشلسٹ نظریات کی پیروکار تھیں جبکہ مسلم دنیا انہیں مجاہد، غازی اور شہید قرار دے رہی تھی۔ کراچی، راولپنڈی اور پشاور کے لوگ فلسطینیوں کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے اور یاسر عرفات نہرو اور گاندھی کے گیت گا رہا تھا۔ اہل اسلام فلسطینیوں کے لیے خون کے آنسو بہا رہے تھے اور فلسطین کشمیریوں کو بھارتی غدار اور علیحدگی پسند قرار دے رہے تھے۔

آدھے یمن پر سوشلزم کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور آدھا کیپٹلزم کے گیت گا رہا

تھا۔ عراق اور شام میں سوشلسٹ ریپبلک حکومتیں قائم تھیں اور مصر کا جبزل نا صر عرب نیشنلزم کا جھنڈا اُٹھائے لینن اور گاندھی کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ اہل پاکستان جذبات کے بخار میں مبتلا تھے اور ترکی سیکولرزم کا مبلغ تھا۔

ماضی قریب کے اس منظر نامے پر نظر ڈالیں تو آج کے حالات اسی منظر کا دوسرا رخ ہیں ۔یاسر عرفات ، جمال عبدالناصر، صدام حسین ، معمر القذافی ، حافظ الاسد اور شاہ حسین کے بعد طالبان ، جند اللہ ، حزب اللہ ، داعش ، ہوثی اور زیدی منظر عام پر ہیں اور حدف بچا کھچا اسلامی اتحاد اور اسلامی عسکری قوت ہے۔

سعودی عرب کی مدد سے مصری فوج سے پہلی جمہوری حکومت کا خاتمہ کیا اور صدر مرسی کو عمر قید کی سزا دلوائی ۔ ذاتی عناد اور عرب بہار کی آڑ میں سعودی عرب اور کچھ خلیجی ممالک کی ایما پر قذافی اور صدام اپنے انجام کو پہنچے اور عراق و شام ٹکڑیوں میں تقسیم ہوگئے ۔ سوڈان طویل خانہ جنگی کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہوا تو مسلم دنیا نے اُس کی خبر تک نہ لی ۔لیبیا کے عوام کو نہ جمہوریت ملی اور نہ عزت و آزادی باقی رہی۔ لبنان عملاً خانہ جنگی کی لپیٹ میں آگیا اور ایک الگ حیثیت کا ملک بن گیا۔

اُردن معاشی لحاظ سے ایک کمزور اور چھوٹا ملک ہے۔جس کی آزادی اور امن کا

دارومدار سعودی عرب اور مغرب پر ہے۔ بنگلہ دیش کسی بھی لحاظ سے قابل اعتماد ملک نہیں۔ بنگلہ دیش بھارتی پالیسیوں پر گامزن سیکولرزم کی طرف مائل ہو کر مسلم دنیا سے الگ ہو چکا ہے۔ جبکہ افغانستان کے حالات کسی بھی طرح یمن، شام، اور عراق سے مختلف نہیں۔ دیگر مسلم ممالک کی طرف دیکھیں تو سنٹرل ایشیائی ریاستیں آزادی کے ابتدائی مراحل میں ہیں۔ ان ریاستوں میں آئے دن اندرونی خلفشار جنم لیتے ہیں جنکی وجہ سے وہاں کے عوام اور حکمرانوں میں باہمی اعتماد کا فقدان ہے۔ جنوبی مشرق ایشیاء میں انڈونیشیا اور ملیشیا آبادی، رقبے اور وسائل کے لحاظ سے بڑی مملکتیں تو ہیں مگر ان ممالک کی ایسی پوزیشن نہیں کہ وہ بیرون ملک کسی ایڈونچر کا حصہ بن سکیں۔
پچپن سے زیادہ اسلامی ممالک میں پاکستان، ترکی، مصر اور اردن ہی ایسے ملک ہیں جہاں باقائدہ تربیت یافتہ فوج تو ہے مگر سعودی عرب سے تعلقات کی نوعیت مختلف ہے۔

اُردن کی مسلح افواج اسرائیل کیخلاف تین جنگیں لڑ چکی ہے اور اُسے طویل عرصہ تک پی ایل او کے خلاف بھی شدید مزاحمت کا تجربہ حاصل ہے۔ دیکھا جائے تو ان جنگوں میں بھی اُردن کو پاکستان کی فوجی حمائت حاصل رہی ہے جن میں جنرل ضیاء الحق، ایئر مارشل انور شمیم، ایئر کموڈور خاقان عباسی اور

پاکستانی ہیر و ایم ایم عالم کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں پاکستانی مسلح افواج کا ایک بڑا گروپ مسلسل کئی سالوں تک سعودی عرب اور یمن کے بارڈر پر تعینات رہا اور سعودی مسلح افواج کی تربیت کا کام کرتا رہا۔ اسطرح پاکستانی مسلح افواج کے لیے اُردن ، شام اور سعودی عرب میں عسکری خدمات سرانجام دینا نہ تو مشکل ہے اور نہ ہی نا تجربہ کاری کا کوئی پہلو سامنے آتا ہے۔ سعودی عرب ، ترکی ، مصر اور اُردن کی مسلح افواج کی نسبت پاکستانی سپاہی بہت سی خوبیوں اور خدداد صلاحیتوں کا مالک ہے۔ جس سے ساری دنیا واقف ہے۔ شائد یہی بنیادی وجہ ہے کہ ساری دنیا اس کوشش میں ہے کہ وہ پاکستان کے نااہل ، ہوس پرست کرپٹ اور عاقبت نا اندیش سیاستدانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر عالم اسلام کے ، بے لوث مجاہد پاکستانی سپاہی کو فرقہ پرستی کے دلدل میں دھکیل کر اُسکی خوبیوں سے اُسے محروم کر دے۔ فرقہ واریت ، علاقائیت اور قومیت ایسے آسیب ہیں جنکا علاج عسکریت نہیں بلکہ عقلمندی ، دانشمندی اور بدلتے حالات سے واقفیت ہے۔

پاکستانی سیاسی قیادت نے سعودی عرب کے طوفانی دوروں اور قومی اسمبلی میں جلوہ افروز ہو کر جس غیر ذمہ داری ، بھونڈے پن اور نا اہلی کا ثبوت دیا ہے اس پر بحث کرنا ہی فضول ہے۔

پاکستانی وزیر دفاع اور پنجابی سیف الملوک نے اسمبلی میں کھڑے ہو کر جس طرح کا مظاہرہ کیا ہے اُس سے ثابت ہے کہ یہ شخص ایک اسلامی ایٹمی قوت کا وزیر دفاع تو درکنار شہری دفاع کا رضاکار بھرتی ہونے کے بھی قابل نہیں۔ سیف الملوک نے سب سے پہلے ایک فہرست پڑھ کر سنائی کہ سعودی عرب نے پاکستان سے انفنٹری، آرمر، توپخانہ، فضائی اور بحری جہازوں کی ڈیمانڈ کی ہے۔ کیا کسی ملک کا وزیر دفاع ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ کیا پاکستانی فوج کرائے کی فوج ہے یا پھر برائے فروخت ہے۔ کیا پاکستان عالمی برادری کا ایک اہم رکن نہیں؟ کیا پاکستان کسی دوسرے ملک کی طفیلی ریاست یا پھر بٹ شاہی اور خواجہ شاہی کی جاگیر ہے؟ کیا پاکستانی مسلح افواج انسانوں کی فوج نہیں؟؟؟؟؟۔

سوال یہ ہے کہ ایک شخص اپنے قائد میاں نواز شریف کی خوشنودی کی خاطر کبھی مسلح افواج کو گالیاں دیتا ہے اور کبھی اپنے سیاسی مخالفین پر تھڑے کی زبان استعمال کرتا ہے تو بٹ شاہی اُسے وزیر دفاع بنا دیتی ہے۔ وہ اسپر بھی اکتفا نہیں کرتا اور پھر اسمبلی میں کھڑے ہو کر نہ صرف اپنی فوج کو کرائے کی فوج ثابت کرتا ہے اور سعودی عرب جیسے قریبی دوست کو بھی شرمندہ کر دیتا ہے۔ کیا ایسا شخص جو عقل و خرد سے عاری ہے اور محض میاں برادران کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ملکی سالمیت کو داؤ پر لگا دیتا ہے، اس قابل ہے اسے وزیر دفاع کہا جائے۔ وزیر دفاع سمیت حکومت اور اپوزیشن میں سے کسی نے بھی اسمبلی کے

اجلاس میں پاکستان کی بات نہیں کی۔ دینی جماعتوں نے سعودی عرب کی کھلی حمائیت اس لیے کی چونکہ انہیں ذاتی اخراجات اور مدرسوں کے لیے سعودی عرب اور عرب امارات سے فنڈز ملتے ہیں۔ ان سیاسی مذہبی جماعتوں میں کچھ ایسی بھی ہیں جو پاکستان کے وجود کے ہی خلاف تھیں اور درپردہ اب بھی ہیں۔کیا مرحوم مفتی محمود کا یہ بیان کس کو یاد نہیں کہ وہ پاکستان بننے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ ان سے تو باچا خان بہتر تھے جو زندگی بھر پاکستان کے مخالف رہے اور مرنے کے بعد جلال آباد چلے گئے۔ ولی خان کیوں نہیں گئے اسکا جواب اسفندیار ولی ہی دے سکتے ہیں۔ مرحوم سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جہاد کشمیر کو فساد قرار دیا تھاجسکا اظہاراثر چوہان اکثر اپنے کالموں میں کرتے ہیں۔ اب جماعت اسلامی نے فساد کو جہاد کہنا شروع کیا ہے تو پیپلز پارٹی کے قائدآصف علی زرداری نے اس تیس سال تک منجمند کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

بلوچستان کے سیاسی قائدین کا بیان ہے کہ اگر کشمیری جدوجہد آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں تو کراچی اور بلوچستان والے ایسا کیوں نہ کریں۔

ہر دور میں حکمرانوں کی پسندیدہ شخصیت اور فرنٹ لیڈی ماروی میمن نے ایک ٹیلی وژن پروگرام میں فرمایا ہے کہ یہ میرا ملک اور میری فوج ہے۔ہم تو عرصہ ہوا سمجھ رہے تھے کہ یہ ہمارا ملک ہے اور ہماری فوج ہے۔ اب پتہ چلا کہ نہ یہ ملک ہمارا ہے اور نہ فوج ہماری ہے۔ اگر یہ ملک واقعی ماروی میمن کا ہے

تو فوج بھی اُن کی ہی ہے۔شائد یہی وجہ ہے کہ خواجہ آصف نے سعودی عرب کی ڈیمانڈ لسٹ اسمبلی میں پڑھ کر سنائی جو کسی بھی طرح سے عقلمندی نہ تھی۔ خواجہ صاحب یہ بتانا بھول گئے کہ جناب یہ ملک ماروی میمن کا اور میاں برادران کا ہے اور فوج ماروی کی ہے۔ سعودی عرب، ماروی میمن اور میاں برادران کے درمیان جو ڈیل ہو رہی ہے اُسکا احوال اب تک اتنا ہی ہے۔اب حکم کے مطابق مجھے تحریک انصاف پر بمباری کرنی ہے چونکہ اوپر سے یہی حکم آیا ہے۔

عقلمندی ، دانشمندی اور دور اندیشی کے فقدان کا قصہ یہی ختم نہیں ہوتا بلکہ سولہ اینکر دانشوروں اور درجن بھر تجزیہ نگار اور کالم نگاروں نے بھی اپنا اپنا حصہ بقدر جثہ ڈال کر اپنے آقاؤں اور بہی خوائیوں کو راضی کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ پاکستانی سیاستدانوں ، تجزیہ نگاروں ، اینکروں اور دانشوروں نے ایران ، سعودی عرب، یمن ، میاں برادران سے لیکر شیعہ سنی اور وہابی مسالک کی تو بات کی ہے مگر کسی نے بھی اسلام ، پاکستان اور افواج پاکستان کا ذکر نہیں کیا۔

اسفند یار ولی نے کہا کہ اگر فوج سعودی عرب گئی تو بلوچستان پاکستان سے جدا ہو جائیگا۔ بہت سے بد خوائیوں اور قوم دشمنوں نے کہا کہ اگر فوج نہ گئی تو

عرب امارات اور سعودی عرب پاکستانی مزدورں اور ہنر مندوں کو اپنے ممالک سے نکال دے گا کچھ تجزیہ نگاروں نے کہا کہ اگر میاں صاحب نے ماروی میمن اور خواجہ آصف کی فوج سعودی عرب بھجوائی تو پاکستانی سیاستدانوں، رئٹائرڈ جرنیلوں، بیورکریٹوں اور وزیروں کے بیرون ملک اثاثے منجمد ہو جائیگے۔

کچھ صافیوں نے بھارت دوستی اور پاکستان دشمنی کا کھل کر اظہار کیا اور فرمایا کہ اگر پاک فوج سعودی عرب جاتی ہے تو بھارتی فوج افغانستان میں کیوں نہیں آسکتی۔

عقلمندی اور دانشمندی تو اپنی جگہ مگر نمک حلالی اور وفاداری کا جو ثبوت یہ صافی دیتے ہیں اُس کی داد نہ دینا بھی درست نہیں۔ یہ بیان محمود اچکزئی اس لیے نہ دے سکے چونکہ اُنکا بھائی بلوچستان کا گورنر ہے اور خود میاں برادران کے ہمنوا ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن اس لیے نہ دے سکے چونکہ وہ حکومت میں شامل ہیں اور کشمیر کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔

دوسری وجہ کرنل قذافی کی موت اور سیف اسلام کی قید ہے۔ اگر قذافی زندہ ہوتے تو موصوف کبھی بھی سعودی عرب کی بات نہ کرتے۔ سعودیوں کو یاد ہوگا کہ جب قذافی مرحوم شاہ عبداللہ کے خلاف خواجہ آصف بنے ہوئے تھے تو مولانا فضل الرحمٰن طرابلس کے چکروں پر چکر لگا رہے تھے۔ ان چکروں میں ایک چکر ایسا بھی تھا کہ دبئی ایئر پورٹ والے مولانا کا بستر بند چیک کرکے خود بھی چکرا گئے۔ خدا جانے مولانا اس چکر سے کیسے نکلے؟ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ خلیجی ممالک میں اگر

کوئی چکر ہو جائے تو جناب آصف علی زرداری ، رحمان ملک ، اسحاق ڈار اور سیف الرحمٰن ہی رہائی دلوا سکتے ہیں۔
مولانا فضل الرحمٰن اور کرنل قذافی کی دوستی کا منہ بولتا ثبوت پشاور میں منعقد ہونے والی عالمی دیوبند کانفرنس ہے جسکا خرچہ لیبیا نے.برداشت کیا اور قذافی کا ولی عہد سیف الاسلام قذافی بذات خود اس کانفرنس میں شریک ہوا۔
قذافی پر عرب بہار خزاں بن کر گری تو مولانا نے اتنی جرات بھی نہ کی اور قذافی کے حق میں ایک بیان بھی نہ دیا۔ کہتے ہیں کہ چوہدری نثار اور مشاہد حسین سید نے.بڑی عالمانہ تقریریں کی ہیں۔ یاد رکھیں کہ چوہدری نثار اس وقت شدید ذہنی دباؤ میں ہیں اور بہہ حالت مجبوری اس حکومت کا ساتھ دے رہے۔ خواجہ آصف جب عمران خان اور تحریک انصاف پر شرم وحیا کی بمباری کر رہے تھے تو جناب سپیکر زیر مونچھ مسکرا رہے تھے اور ن لیگی متوالے انہیں داد دے رہے تھے۔ جناب وزیراعظم اور اُن کی کابینہ کے ارکان خواجہ آصف کی خوشبودار اور مدبرانہ تقریر سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ایوان میں بیٹھے معزز ممبران اسمبلی وسینٹ خوشی سے مسکرا رہے تھے۔ ایک ایسا ہی وقت بلکہ.برا وقت جناب چوہدری نثار پر بھی آیا اور جب چوہدری اعتزاز احسن سے چوہدری نثار کو

ہی نہیں بلکہ نام لیکر اُن کے مرحوم بھائی کو بھی اپنے سخت الفاظ سے نشانہ بنایا تو حیرت کی بات ہے کہ اُس وقت بھی جناب سپیکر زیر مونچھ مسکراتے رہے، ن لیگی خوش ہوتے رہے اور اپوزیشن والے چوہدری اعتزاز حسن کو داد دیتے رہے۔

جہاں تک مشاہد حسین سید کا تعلق ہے تو یہ وہی شاہ صاحب ہیں جو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ہیں۔ آپ کے دور میں میاں صاحب کی حکومت نے پاک آرمی کے خلاف روگ آرمی کے اشتہار شائع کروائے، جنرل مشرف کو بے عزت کرنے اور ڈسمس کرنے کا ڈرامہ رچایا اور میاں صاحب کو اٹک قلعے میں بند کروایا اور جنرل مشرف کا بھی بھرپور ساتھ نبایا۔

یمن کی جنگ کا سب سے بڑا فائدہ جنرل راحیل شریف اور اُنکے ساتھیوں کو ہوا ہے۔ فوجی قیادت کو اسمبلی کی کارروائی، لنگر بازی، صحافتی، دانشوری اور سیاسی ابتری سے پتہ چل گیا ہے کہ ہر کسی کو اپنے مسلک، مفاد اور مال سے غرض ہے کسی کو پاکستان، اسلام اور افواج پاکستان سے غرض نہیں۔ یہ ملک نہ ماروی کا ہے اور نہ فوج ماروی، میاں برادران، خواجگان اور بٹ شاہی کی ذاتی ملکیت ہے۔ ہماری فوج پاکستانی عوام اور نظریہ پاکستان کی محافظ ہے۔ جہاں تک سعودی عرب اور مقدس مقامات کا تعلق ہے تو شیعہ، سنی اور وہابی

کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے ہیں ایک ہی قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور مکہ جا کر ہی حج ادا کرتے ہیں۔ یمن کے پندرہ فیصد حوثی اور پندرہ فیصد زیدی یہ جرات نہیں کرسکتے کہ وہ کعبہ شریف یا مدینہ شریف پر قبضہ کرکے سارے عالم اسلام کے غیض و غضب کا نشانہ بنکر صفحہ ہستی سے ہی مٹ جائیں۔ یقینا ایران بھی اس بات سے آگاہ ہے کہ وہ خسرو اور دارا کا ایران بحال نہیں کرسکتا اور نہ ہی صفوی دور واپس آسکتا ہے۔

موجودہ حکومت جس نا اہلی کا مظاہرہ کر رہی ہے، یقینا وہ قائداعظمؒ اور اقبالؒ کے پاکستان پر حکومت کا حق نہیں رکھتی۔ علامہ اقبالؒ نے پاکستانی وزیراعظم کی کوالیفکیشن عشروں پہلے بتلائی تھی۔

نگاہ بلند، سخن دلنواز جاں پر سوز یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

خواجہ آصف، میاں نواز شریف اور دیگر دیکھیں کہ کیا وہ میر کارواں کہلانے کے قابل ہیں؟؟؟؟

کشمیر برائے فروخت

حلقہ 122 کے الیکشن سے ایک روز پہلے محترم خواجہ سعد رفیق نے ایک مشہور اینکر کو بتایا کہ جن لوگوں نے کبھی کسی اخبار میں کوئی کالم نہیں لکھا، جن کو بولنا نہیں آتا وہ بھی صحافی ہیں۔ ایسے نام نہاد صحافیوں سے گزارش کریں کہ وہ سوچ سمجھ کر بات کریں اور فضول تبصروں سے عوام کو گمراہ نہ کریں۔ جناب خواجہ سعد رفیق نے بلکل سچ کہا اور اہلیان آزاد کشمیر جناب نواز شریف سے یہی سوال پوچھتے ہیں کہ آپ نے باغ کے جلسہ عام میں جناب مشتاق منہاس کی کن خدمات کے عوض شکریہ ادا کیا اور وہ کون سے خفیہ مقاصد ہیں جن کی تکمیل مشتاق منہاس جیسے عظیم المرتبت انسان کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہونا قرار پائی ہے۔

کیا شاہی خاندان کے خدمتگاروں اور ملازموں سے کوئی بلبن، ایبک، نادر شاہ اور رضا شاہ نہیں جسے والی کشمیر مقرر کیا جائے۔ کیا تخت لاہور میں میہان سنگھ، دیہان سنگھ اور ھیرا سنگھ جیسے نادر و نایاب ہیرے بھی نہیں رہے کہ بات بنیی منہاساں تک جا پہنچی ہے۔

جہاں تک صحافت کا تعلق ہے تو مشتاق منہاس نامی شخص جسے نہ بولنے کا سلیقہ ہے

اور نہ لکھنے کا طریقہ ہے نہ کبھی کوئی کالم یا مضمون لکھا۔ جناب نصرت جاوید کے سائے میں بیٹھنے والے مشتاق منہاس کو لوگ اتنا ہی جانتے ہیں کہ نصرت جاوید مشتاق منہاس کے غلط تلفظ پر اسے بار بار ٹوکتے اور شرمندہ کرنے کی کوئی کسر باقی نہ چھوڑتے تھے۔ اگر مشتاق منہاس نامی صحافی نے کوئی کالم، کتاب، مضمون، ناول، افسانہ یا غزل نہیں لکھی تو شہنشاہ معظم نے کس بنا پر اُسے جناب مشتاق منہاس کہہ کر کشمیریوں کا مذاق اُڑایا ہے۔

کیا چائینہ کٹنگ، پلاٹوں میں ہیرا پھیری، لینڈ مافیا اور پلاٹ مافیا کی ممبر شپ مستقبل کے حکمرانوں کی کوالیفکیشن ہے؟ کسے پتہ نہیں کہ کشمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کی چیئرمینی، کشمیر کمیٹی اور سینٹ کے چیئرمین سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ کشمیر ہاوسنگ سوسائٹی کی چیئرمینی کیوں ملتی ہے یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں یہ بات بھی یقینی ہے کہ جب کبھی اس ملک کے عوام کی تقدیر نے کروٹ لی اور چوروں لیٹروں کا صاف وشفاف احتساب ہوا تو کشمیر ہاؤسنگ سوسائٹی اور جرنلسٹ ہاؤسنگ سوسائٹی میں ہونے والے گھپلوں میں ایسے ایسے نام آئینگے جن کے منہ اور قبروں پر بھی لوگ تھوکیں گے۔ جمہوریت عوام کے حقوق کی حفاظت اور عوامی فلاح و بہبود کا نام ہے سیاست کا مطلب ملاپ، بھائی چارہ، اور دکھ درد بانٹنا ہے۔ لوٹ کھسوٹ اور قومی وسائل پر ڈاکہ جمہوریت نہیں اور نہ ہی ایسی حکومت کا سربراہ صدر یا وزیر اعظم کہلوانے کا

حق رکھتا ہے جسطرح کے حکمران پاکستان اور آزاد کشمیر کے عوام پر مسلط ہیں۔ وہ بدترین سیاسی ڈکیٹر اور مطلق العنان بادشاہ ہیں جن پر آئینی ، قانونی اور اخلاقی پابندیوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اقرباء پروری کا یہ حال ہے کہ حکمرانوں کا سارا خاندان قومی خزانے کا مالک اور حکومتی امور میں کسی نہ کسی صورت مداخلت کا حقدار ہے۔ اگر میاں نواز شریف بادشاہ نہ ہوتے تو انہیں بحیثیت چیئرمین کشمیر کونسل اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا اور وہ آزاد کشمیر میں گڈ گورننس ، امن وامان اور عوامی خواہشات کا خیال اور احترام کرتے ہوئے ایک کرپٹ ، غیر سنجیدہ اور برادری ازم کے سہارے کھڑی حکومت کے ہمنوا نہ بنتے۔

جمہوری نظام حکومت میں کرپٹ حکمرانوں کے خلاف عدم اعتماد عوام کا حق ہوتا ہے مگر شہنشاہ معظم نے پیپلز پارٹی کے ساتھ ہونے والی باری بدل معاہدے کو آزاد کشمیر کے عوام پر جبراً مسلط کیا اور مشتاق مہناس جیسے لوگوں کی بارگین کو اولیت دیتے ہوئے آزاد کشمیر کے عوام کے حق میں عدم اعتماد پر شاہی فرمان جاری کرتے ہوئے اسے نہ صرف رد کردیا بلکہ عوامی قائدین کی سرزنش بھی کی۔

اگر میاں صاحب کا مزاج جمہوری ہوتا تو وہ سب سے پہلے یہ پتہ چلاتے کہ ایک

معمولی رپورٹر اور لفظ چبا کر غلط اُردو بولنے والا معاون لنگر کس خوبی کی بنا پر کشمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کا چیئرمین بنا اور اس کے پیچھے کونسی قوت ہے جو اس غیر اہم شخص کو بطور مہرہ استعمال کر رہی ہے۔ حکومت پاکستان اور متعلقہ اداروں کو اس افواہ کی بھی کھوج لگانی چاہیے تھی کہ حکومت بچانے کے لیے مجیدی ٹولے نے مشتاق منہاس کے ذریعے کروڑوں روپے ادا کیے جو نہ جانے کس کی جیب میں گئے مگر یہ سب نہ ہوا تو اب دورہ باغ بھی مشتاق مہناس کی خواہش پر ہوا اور ظل الٰہی نے جناب مشتاق منہاس کہہ کر آزاد کشمیر کے عوام اور جمہوری عمل کا مذاق اڑایا۔

کہتے ہیں کہ جنرل ایوب خان ہری پور میں جلسہ کرنے آئے تو ریحانہ کے پٹواری نے اُن کی والدہ سے درخواست کی کہ اس کی پٹوارانہ خدمات کے صلے میں اُسے ایوب خان کے لیے بنائے گئے سٹیج کے کسی کونے میں ایک کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ ایوب خان کی والدہ نے پوچھا کہ سٹیج پر بیٹھنے کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ پٹواری نے کہا آپ مجھے سٹیج پر بٹھا دیں فائدہ میں خود حاصل کر لونگا۔ ٹی وی رپورٹر ہو یا معاون لنگر یا پٹواری جب اُن کی خواہشات سٹیج پر بیٹھنے تک پہنچ جائیں تو وہ سٹیج گرانے کا کام بھی کر لیتے ہیں۔ جب حکمران ایسے لوگوں کو سٹیج تک رسائی دیتے ہیں تو انکا اپنا کردار بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔

کیا شاہی خانوادے کو پتہ نہیں کہ سٹیج کیسے اُلٹ دیے جاتے ہیں اور عام لوگ حکمرانوں اور بادشاہوں کو سٹیج سے اُٹھا کر سٹریچر پر لاد دیتے ہیں۔ یوں تو برصغیر کی تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ نہیں کہ عوام حکمرانوں کا احتساب کرنے اُٹھ کھڑے ہوں یہ خطہ سازشوں کا ہے انقلابوں کا نہیں اس مٹی کے باسی نسل در نسل شاہ پرست، تابعدار اور حکمرانوں کے وفادار رہے ہیں۔ معلوم تاریخ کے مطابق یونانیوں، ایرانیوں، ترکوں، عربوں، مغلوں، افغانوں اور انگریزوں نے طویل عرصے تک اس خطہ پر پورے طمطراق کیساتھ حکومت کی اور یہاں کے عوام نے غلامی کے آداب واطوار قائم رکھتے ہوئے حکمران طبقے کے جبر و ظلم کو تقدیر سمجھ کر برداشت کیا۔ مغلیہ حکومت کمزور ہوئی تو تیمور، نادر شاہ اور احمد شاہ نے اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادی مگر سوائے سکھوں کے کسی نے مزاحمت نہ کی۔

مقامی سطح پر سکھوں، جاٹوں، گجروں اور مرہٹوں نے بھی اپنی تلواروں، نیزوں، کرپانوں اور کلہاڑوں کا بے دریغ استعمال کیا مگر نہ کوئی بغاوت ہوئی اور نہ انقلاب آیا۔ پانی پت سے پشاور تک اُلو بولنے لگے تو رنجیت سنگھ پہلا مقامی حکمران سامنے

آیا جس نے خدا کی زمین پر مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے پنجاب کے سازشی ٹولے کو ساتھ ملایا اور انہیں جاگیریں دیکر عوام کی سرکوبی پر لگا دیا۔ سکھا شاہی کے بعد انگریزوں نے تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی اور مقامی جاگیرداروں کے علاوہ پیروں اور گدی نشینوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔

پاکستان بنا تو بانی پاکستان کے خلاف سازشی ٹولے نے اتحاد کر لیا۔ انہیں سازشوں کی وجہ سے کشمیر پر بھارت کا قبضہ ہوا اور قائداعظمؒ کے بعد جاگیرداروں، پیروں اور گدی نشینوں نے نودولیتوں، سمگلروں اور جرائم پیشہ لوگوں کو ساتھ ملا کر سیاست کو نیا رنگ و روپ دیا۔ فوجی اور نام نہاد جمہوری حکمرانوں نے جبر، ظلم اور کرپشن کے نئے طریقے متعارف کروائے اور ملکی سطح پر ایک نئی اشرافیہ نے جنم لیا۔

جنرل پرویز مشرف نے پاکستان نژاد امریکی شہری شوکت عزیز کی مدد سے عوام کش پالیسیاں بنائیں اور جاتے جاتے این آر او کے نفاذ سے جرائم پیشہ افراد کو ملک پر حکمرانی کا حق دے دیا۔

آصف علی زرداری نے این آر او کا بھرپور فائدہ اُٹھایا اور کرپشن، لوٹ مار اور لاقانونیت کے نئے ریکارڈ قائم کر دیے۔ پیپلز پارٹی اور نون لیگ میں

ہونے والے معاہدے کے مطابق اب جمہوریت نما آمریت کا دوسرا پنج سالہ دور شروع ہے جسے اڑھائی سال گزر چکے ہیں۔ ٹیلی ویژن پروگراموں پر ہونے والے واویلے کے مطابق ان اڑھائی سالوں میں حکمران طبقہ قریباً اڑھائی کھرب روپے کی لوٹ مار کر چکا ہے مگر عوامی نفرت و حقارت کا سامنا کرنے کے بجائے اڑھائی سو فیصد مقبولیت کا بھی دعویدار ہے۔ کرپشن اور لوٹ مار میں جہاں دیگر لوگ شامل ہیں وہاں نام نہاد صحافی بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ حکمرانوں کا ذہنی، اخلاقی اور عوامی خدمت کا معیار یہ ہے کہ ہاؤسنگ سوسائیٹیاں جن کی کرپشن، چائنا کٹنگ، لینڈ گریبنگ کے قصے زبان زدعام ہیں، اور یہی لوگ وزیراعظم کے میڈیا سیل کے ممبر اور آنکھ کا تارا ہیں۔ جناب وزیراعظم جو درحقیقت ملک کے بادشاہ ہیں، کے دورہ باغ نے آزاد کشمیر کے عوام کو یہ پیغام دیا ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام اور نام نہاد سیاسی قائدین کی کوئی اہمیت نہیں۔ سٹیج پر ریحانہ ضلع ہرپوری کے پٹواری کی طرح مشتاق منہاس کو بٹھا کر آزاد کشمیر کے عوام کو پیغام دیا گیا ہے کہ آپ کے ووٹ کی کوئی اہمیت نہیں۔ آزاد کشمیر کا اگلا حکمران مشتاق منہاس ہے یا پھر جو کوئی بھی حکمران بنایا گیا وہ مشتاق منہاس کے ہی تابع فرمان ہوگا۔ جب سے مشتاق منہاس اینڈ کمپنی نے بہترین ڈیلرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تحریک عدم اعتماد کو ناکام بنایا ہے وہ عملاً چوہدری ریاض اور

محترمہ فریال تالپور کی جگہ لے چکا ہے۔ آزاد کشمیر کے سارے معاملات مشتاق منہاس کی مرضی سے چلتے ہیں جبکہ جناب فاروق حیدر، سردار سکندر حیات اور دیگر لیگیوں کو کیپٹن صفدر اور حمزہ شہباز شریف سے ملنے یا بات کرنے کے لیے باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کی اشک شوئی کے لیے راجہ ظفر الحق کو بھی کچھ اختیار ہے مگر وہ صرف حوصلہ افزائی اور صبر کی تلقین ہی کر سکتے ہیں۔

یہ بھی خبر ہے کہ الیکشن سے پہلے آزاد کشمیر میں نون لیگ کی قیادت ہی بدل دی جائے گی اور موجودہ سینئر وزیر حکومت آزاد کشمیر اور مشتاق منہاس صف اول میں آ جائینگے۔ مشتاق منہاس کو پاکستان میں مہاجرین کی سیٹ پر یا پھر آزاد کشمیر میں ٹیکنو کریٹ کی سیٹ پر کامیاب کروا کر وزرات عظمیٰ کا قلم دان دیا جائے گا۔ سینئر وزیر کو وزرات عظمیٰ ملنے کی صورت میں مشتاق منہاس کو صدر آزاد کشمیر بنانے کا بھی پروگرام ہے۔

آزاد کشمیر کا صدر یا وزیراعظم کوئی بھی ہو یہ وزیراعظم پاکستان اور حکمران جماعت کا صوابدیدی اختیار ہے جسے آزاد کشمیر کے عوام رد کرنیکا اختیار نہیں رکھتے۔ وزیراعظم اور شاہی حکمران ٹولہ جو چاہے کر سکتے ہیں مگر آزاد کشمیر میں بسنے والی غلام رعایا کو اتنا تو بتایا جائے کہ مشتاق منہاس نے شاہی

خاندان اور حکومت کی کونسی خدمت کی ہے جس کی وجہ سے وہ حکومت اور حکمران کی آنکھ کا تارا ہے۔

وزرات اُمور کشمیر اور کشمیر کونسل کے اعلیٰ زہنوں کو پتہ ہوگا کہ معاہدہ کراچی اور اقوام متحدہ کیساتھ ہونے والا معاہدہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ ان معاملات کے تحت حکومت پاکستان اس بات کی پابند ہے کہ وہ آزاد کشمیر میں کسی قسم کی جغرافیائی تبدیلی نہ کرے اور آزاد کشمیر کے عوام کو ان کی خواہشات کے مطابق جینے کا حق دے۔ ان معاہدوں کے تحت حکومت پاکستان آزاد کشمیر میں امن ، خوشحالی اور عمدہ انتظامی امور کو یقینی بنانے کی ذمہ دار ہے۔ ان معاہدوں کی رو سے آزاد کشمیر کی حدود میں پاکستانی سیاسی جماعتوں کا کردار غیر قانونی ، غیر آئینی اور مذکورہ معاہدوں کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ وزرات امور کشمیر ، کشمیر کونسل سمیت چیئرمین کشمیر کونسل نے آزاد کشمیر کی موجودہ حکومت کی کھلی کرپشن کی حمایت کرکے ان معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے ۔کیا چیئرمین کشمیر کونسل کو پتہ نہیں کہ وہ موجودہ حکومت نے جاگراں پاور پراجیکٹ میں کرپشن کے ذریعے پیسہ کمایا جس کی وجہ سے جاگراں 2 اور 3 نہ بن سکے ۔ آزاد حکومت کے ایک وزیر نے غیر قانونی کھدائی کروا کر آثار قدیمہ کی نادر و نایاب اشیاء جن میں سکے ، تختیاں ، مورتیاں ، مجسمے ، بھوج پتر ، پانی کے ٹب نکال کر بیرون ملک سمگل کر دیے ہیں۔ کئی ماہ تک وادی نیلم کے صحافیوں اور عوام نے احتجاج کیا تو عدلیہ کے حکم پر ایک ٹب واپس کیا گیا جو کچھ

عرصہ تک مظفرآباد سول ہسپتال میں پڑا رہا اور پھر غائب ہو گیا۔

اسی وزیر نے وادی نیلم سے بہت سی نایاب جڑی بوٹیاں نکلوا کر افغانستان کے راستے بھارت بھجوا دیں اور اب یہ جڑی بوٹیاں وادی نیلم کے بجائے مقبوضہ علاقے میں نرسریوں کی صورت میں اگائی جا رہی ہیں۔ حکومت نے قیمتی پتھروں جن میں نیلم اور جیشٹر سرفہرست تھا کا ٹھیکہ ایک کنیڈین کمپنی کو دیا جسکا مالک بھارتی سکھ تھا۔ اس پر بھی عوام نے شور مچایا مگر کسی نے نہ سنی۔ کمپنی نے آزاد حکومت کی جیب گرم کی اور قیمتی خزانہ لے اُڑی۔ کیا مشتاق منہاس نے میاں صاحب کو نہیں بتایا کہ میرپور میں چیک ریجام اسلام گڑھ پل حکومتی کرپشن کے باعث مکمل نہیں ہوا اور حکومتی وزراء نے کمیشن کمانے کی خاطر بیشمار سڑکوں کا ٹھیکہ دیکر انہیں کھدوا دیا جو شاید کبھی بھی مکمل نہ ہونگی۔ مجید حکومت نے جنگلات کی بے رحمی سے کٹائی کروائی اور جو پہاڑ دس سال پہلے سرسبز و شاداب تھے وہ عتیق اور مجید کی حکمرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے اب مٹی کے ڈھیر ہیں۔ مشتاق منہاس جیسے کرداروں کا حکمرانوں کے قریب ہونا اور کرپٹ حکومت بچانے کے لیے بارگین کروانا آزاد کشمیر کے عوام کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ آزاد کشمیر کا ہر ذی شعور شہری یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا حکومت پاکستان اور حکمران ٹولے نے آزاد کشمیر کو ہاؤسنگ سوسائٹی کا درجہ دے دیا ہے اور اسے سیاسی ڈیلروں کے ہاتھ نیلام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا

آزاد کشمیر واقعی برائے فروخت ہے اور لینڈ مافیا الیکشن کی آڑ میں بولی لگانے والا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو مشتاق منہاس کی خدمات سے عوام کو آگاہ کیا جائے۔ اگر مشتاق منہاس نے مجید خاندان یا پرپھر میاں صاحبان کی کوئی خدمت کی ہے تو اُسے اپنی کسی فیکٹری یا مل میں نوکری دیں عوام پر مسلط نہ کریں۔ نپولین کی طرح اگر میاں صاحبان اپنے نوکروں، ملازموں، قصیدہ خوانوں اور دوستوں کو بادشاہیاں عطا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں کوئی روک نہیں سکتا۔ مگر میاں صاحبان یہ بھی یاد رکھیں کہ نپولین کا کیا انجام ہوا اور اُس کے بنائے ہوئے بادشاہ کہاں گم ہوئے۔

صحافت میں گند

جب کسی چیز کی بہتات ہو جائے تو اچھی چیز میں سڑاند کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے
ابن خلدون نے تہذیبوں کے عروج و زوال کو موسموں کی تبدیلی سے تشبیہ دی ہے
جبکہ ساڑھے تین سو سال قبل مسیح میں پیدا ہونے والے چانکیہ کوتیلیا نے انسانوں کو
پیریش ایبل کموڈیٹی یعنی گل سڑ جانے والی اشیاء میں شامل کیا ہے۔ ذولقدر خان
تاتاری ایک سفاک اور ظالم جرنیل اور بے رحم حکمران تھا۔ وہ جنگ پر جانے سے پہلے
ہر سپاہی سے ملتا اور ایک ہی سوال پوچھتا کہ تمہیں کس چیز سے محبت ہے۔ ظاہر ہے کہ
ہر سپاہی کا جواب الگ ہوتا۔ کوئی ماں کا نام لیتا، کوئی باپ کا، کوئی بچوں کا، کوئی
بادشاہ کا مگر جو سپاہی تلوار سے محبت کا اظہار کرتا وہ ذوالقدر خان جسے تاریخ میں ذولچو
خان بھی لکھا گیا کے خاص دستے میں شامل ہوتا جو بادشاہ کی حفاظت کے لیے چنا جاتا۔
ذوالقدر خان عجیب ذہنیت کا حامل تھا جس قدر وہ سفاک تھا اسی قدر وہ عالم بھی تھا اور
علماء کی قدر کرتا تھا۔ اُسکا کہنا تھا کہ تلوار نیام میں ہو تو اُسے زنگ لگ جاتا ہے، سیاہی
دوات میں رہے تو گند بن جاتا ہے سیاہی اوراق پر اور تلوار ہاتھ میں اچھی لگتی ہے۔
ننگی تلوار سپاہی کی مردانگی اور اورا

ق پر بکھری سیاہی لکھنے والے کی ذہنیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

ابن خلدون کے اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے ولی کاشمیری لکھتے ہیں کہ جسطرح چار موسم زمین پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح انسانی تمدن کے بھی چار ادوار ہیں۔ قرآن کریم میں بیان ہے کہ پہلے تم بچپن کی عمر میں ہوتے ہو، پھر جوانی اور آخر میں بڑھاپا دیکھ کر موت کی وادی میں منتقل ہو جاتے ہو۔ ولی اللہ کاشمیری فرماتے ہیں کہ ابن خلدون اور دیگر مفکرین میں یہ فرق ہے کہ وہ اسلام اور قرآن سے رہنمائی لیتا ہے جبکہ دیگر حکماء قیاس اور اختراع کا سہارا لیتے ہیں۔ ولی کے مطابق قیاس اور اختراع سطحی ذہن کے حامل فریب خوردہ جاہلوں کا وطیرہ ہے جو خزاں یعنی زوال کا نشان ہے۔ گو کہ یہ اشارہ اہل یہود کی طرف ہے کہ ایسے عالموں کی مثال اُس گدھے جیسی ہے جس پر بہت سی کتابیں لاد دی جائیں یعنی گدھا کتابوں کو بوجھ اُٹھانے سے عالم نہیں بن جاتا۔ ہم اگر اپنے ملکی میڈیا کو سچائی کی آنکھ سے دیکھیں تو ایسے حیوانات کی بڑی تعداد صحافت کے مقدس پیشے سے منسلک محض بار برادری کا بھاری معاوضہ لیکر دولتیاں مارنے اور گند پھیلانے میں مصروف ہے۔

چانکیہ کے بعد ایک ہندو دانشور، شاعر، فلسفی اور تاریخ دان پنڈت کلہن بھی ہو گزرا ہے جسکی مرتب کردہ تاریخ راج ترنگنی عالمی شہرت یافتہ ہے۔ راج

ترنگنی کا سنسکرت سے ہندی اور پھر اُردو ترجمہ ٹھاکر اچھر چند شاہ پوریہ نے کیا ہے۔ اس ترجمہ کے مطابق راج ترنگنی میں مذکورہ تیس سے زیادہ کشمیری حکمرانوں کا ذکر بوجہ نہیں ہو سکا کچھ عرصہ قبل ایک ہندو تاریخ دان جون راج کا ترجمہ سامنے آیا ہے جسے جون راج ترنگنی کہا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کلہن کے اشعار کا ترجمہ بھی ہے جسکا خالق ہر چند کا ٹھیہ ہے۔ کاٹھیہ کے مطابق کلہن نے انسانی سوچ کو ہی تہذیب کی عظمت قرار دیا ہے کلہن کہتا ہے کہ سوچ و چار ساری قوم کا کام نہیں۔ عام لوگ مختلف پیشوں سے منسلک ہوتے ہیں اور وہ دوسری اقوام اور ملکوں سے روابط بڑھاتے ہیں اور اپنی بہترین مصنوعات اُن کو فروخت کرتے ہیں۔ وہ دوسروں ملکوں سے نئی نئی چیزیں لا کر اپنی قوم کا شعور بڑھاتے ہیں۔ اسطرح وہ مختلف زبانیں سیکھتے ہیں، رسم و روج اور مذاہب کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ اخلاق اور اعلیٰ اقدار کے ذریعے اپنی ثقافت، روایات کا بھی پرچار کرتے ہیں۔ کلہن کے مطابق ہر تاجر اور صنعت کار کو اپنے پیشے پر توجہ دینی چاہیئے۔ تاجروں اور پیشہ ور خاندانوں کو فوج سیاست، تعلیم اور دیگر شعبوں سے دور کیا جائے اور کوئی تاجر یا اہل حرفہ اپنا پیشہ چھوڑ کر کسی دوسرے پیشے کا رخ کرے تو اُسے کڑی سزا دی جائے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ان کا مال و اسباب ضبط کیا جائے ان کے گھر جلا دیے جائیں اور انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔ کلہن اور کاٹھیہ تاجروں کو بہترین سفارتکار قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر تاجر بادشاہ، جرنیل یا معلم بن جائے

تو وہ ملک فروخت کر دیگا، فوج میں بغاوت ہو گی اور علم کی ہیئت بدل جائے گی۔ عوام مفلس ہو جائے گی، ملکی دفاع کمزور ہو گا، فوج بد دل بیکار ہو جائے گی اور علم سطحی، فروعی اور فرسودہ روایات تک محدود ہو کر گندی ذہنیت اور سوچ کے حامل پرچارک پیدا کرنے کا موجب بنے گا۔ جس قوم کے پرچارک بادشاہ، فوج اور علم کو فرسودہ اور بیکار ثابت کرنے پر لگ جائیں وہ جلد ہی قوم کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔ ایسی ذہنیت کے حامل عالموں پر دشمن قوم اور ملک کے کارندے دولت نچھاور کرتے ہیں اور مدمقابل اقوام کے زوال کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

دیکھا جائے تو آج ہمارا ملک پوری طرح اس بیماری کے شکنجے میں آچکا ہے۔ تاجر پیشہ لوگ جمہوریت کی آڑ میں ہر سطح کے حکمران ہیں اور ملکی خزانہ لوٹ رہے ہیں۔ ملکی دفاع کمزور ہو رہا ہے اور عوام سے لوٹا ہوا مال بیرون ملک منتقل کیا جا رہا ہے۔ ملکی قومی سلامتی اور معاون ادارے ایک منصوبہ بندی کے تحت تباہ کیے جا رہے ہیں تعلیم تجارت بن گئی ہے اور عوام غربت اور مفلسی کی زندگی جی رہی ہے۔ فرسودہ اور گھٹیا ذہنیت کے حامل پرچارکوں کو موجودہ دور میں صحافی، اینکر، مبصر، تجزیہ نگار اور دانشور کہا جاتا ہے جو فوج پر تنقید کرنے اور اُس کے حوصلے پست کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

اس سال چھ ستمبر کا دن کچھ ایسے ہی دماغوں پر بوجھ بن گیا جو 23 مارچ، 14 اگست اور 6 ستمبر جیسی تقریبات کے منسوخ ہونے پر خوش تھے۔ میرے پاس بظاہر کوئی ثبوت نہیں کہ میں ان رسیاذھنوں پر الزام لگاؤں کہ یہ بھارت یا کسی اور ملک دشمن کے وظیفہ خوار ہیں مگر یہ بات سب پر عیاں ہے کہ یہ پرچارک بھارت کی محبت میں بہر حال گرفتار ہیں۔ ایک ہلکانے والے صحافی اور اینکر صاحب جب سے امریکہ جانے لگے ہیں ان کے اطوار بتلاتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی کے دام میں ہیں۔ اس سال چھ ستمبر سے پہلے ہی انہوں نے 1965ء کی جنگ کا فاتح بھارت کو قرار دینا شروع کردیا اور اپنی دانشوری سے پاکستان کو شکست خوردہ قوم قرار دیا۔ جناب چاڑہ صاحب نے اپنی سوچ کا وزن بھارت کے پلڑے میں رکھا اور دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پاک فوج نے 1965ء میں شکست کھائی۔ مجھے یہ کہنے پر کوئی جھجک نہیں کہ یہ ایک گندی اور گھٹیا سوچ ہے جو ملک دشمنی کی عکاس ہے۔ ہکلانے ولاے کو پشتو زبان میں چاڑہ، پنجابی میں تھتھا اور اردو میں ہکلا کہتے ہیں۔ دیہاتی ضرب المثل ہے تھتھی رن وفادار نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہی ہے تو تھتھا مرد بھی کسی سے کم نہیں ہوتا جبکہ تھتھا صحافی تو کسی صورت قابل اعتماد نہیں ہو سکتا۔ میں مشہور صحافی، دانشور، مصنف، کالم نگار اور اینکر جناب چاڑہ صاحب سے درخواست کرونگا کہ وہ فتح وشکست کو پڑھیں اور عالمی جنگوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں کہ فتح وشکست کیا چیز ہوتی

ہے۔ 1965ء کی جنگ کا آغاز بھارت نے رن آف کچھ سے شروع کیا جو لارڈ ویول کے فارمولے پر مبنی سندھ کو پاکستان سے الگ کرنے کا منصوبہ تھا۔ بھارت کی ایک ڈویژن میکانائیزڈ یلغار کے مقابلے میں پاکستان آرمی کا ایک.بریگیڈ گروپ تھا جس نے بھارتی ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کا صحرائی قبرستان بنا کر فتح کا جھنڈا گاڑھا۔ اگر آپ کو ہلکانے ، سیکنڈل اور سٹوریاں تلاشنے سے فرصت ملے تو جنرل نادر پرویز سے ضرور ملیں چونکہ لیفٹننٹ نادر پرویز رن کا آف کچھ کا نوعمرہ اور نوخیز ہیرو تھا۔ لیفٹینٹ نادر پرویز کو دلیرانہ معرکوں کے صلے میں ستارہ جرات سے نوازا گیا۔ بقول کرنل سکندر خان بلوچ کے ، ملٹری اکیڈیمی کاکول میں نادر پرویز کے ایکشن کی خبر پہنچی تو ہر کیڈٹ میدان جنگ میں جانے کے لیے تڑپنے لگا چونکہ چند ماہ پہلے ہی وہ اکیڈیمی سے پاس آؤٹ ہو کر گیا تھا نادر پرویز کو سینکڑوں کیڈٹ جانتے تھے اور اب اس کی طرح میدان جنگ میں جانے کے لیے بیتاب تھے۔ لیفٹینٹ نادر پرویز جو چند ماہ پہلے اُنکا سینئر کیڈٹ تھا اب اُن کا ہیرو تھا۔ ہر کیڈٹ نے نادر پرویز کو خط لکھا، اُسے داد دی ، اسپر فخر کیا اور اُس کی طرح میدان جنگ میں جانے کا اظہار بھی کیا۔

جناب چاڑا صاحب سے گزارش ہے کہ وہ 65 کی جنگ کی وجوہات دیکھیں یہ جنگ فوجی منصوبہ سازوں کی نہیں بلکہ سیاستدانوں کے ذہن کی اختراع تھی وزیر خارجہ

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کشمیر میں گوریلہ جنگ کا منصوبہ بنایا تو نواب آف کالا باغ نے اس کی مخالفت کی۔ نواب آف کالا باغ کا یہ بیان تاریخ کا حصہ ہے جس میں انہوں نے ایوب خان کو لکھا کہ بھٹو کے خاندان میں کبھی کسی نے توپ، تلوار یا بندوق نہیں چلائی۔ تم بھٹو اور شعیب خان کے چکر میں نہ آؤ ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔ جناب بھٹو اور شعیب خان آخر دم تک ایوب خان کو امریکہ کے حوالے سے یقین دلاتے رہے کہ بھارت پاکستانی سرحد پر حملہ نہیں کریگا اور جنگ کشمیر تک ہی محدود رہے گی۔ جناب بھٹو، شعیب خان اور امریکہ کی یقین دھیانیاں دھری کی دھری رہ گئیں اور بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ جناب چاڑہ صاحب سے درخواست ہے کہ وہ اپنی زنگ آلود دانشوری سے کام لیتے ہوئے میدان جنگ کا تجزیہ کریں تو انہیں بات سمجھ آجائے گی۔ یہ سچ ہے کہ پاکستان آرمی اس جنگ کے لیے بالکل تیار نہ تھی مگر روزمرہ کی تیاریاں بھارت کی باقاعدہ تیاری پر سبقت لے گئیں۔ 6 ستمبر کی صبح بھارت نے حملہ کیا تو لاہور گیریژن میں فوجی افسران اور جوان جسمانی ورزش میں مصروف تھے۔ حملے کی اطلاع پر افسروں اور جوانوں نے کسی حیرت کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر اپنے ہتھیار اُٹھائے اور بارڈر پر پہنچ کر بھارتی ٹڈی دل کا راستہ روک دیا۔ کالم نگار اور اینکر جناب نصرت جاوید 65 کا احوال لکھتے ہیں کہ صبح سویرے وہ تندور پر نان چھولے خریدنے گئے تو ایک بڑا دھماکہ ہوا جس کہ وجہ سے معصوم نصرت جاوید کا ناشتہ زمین پر گر گیا۔ آگے چل کر لکھتے

ہیں کہ فوج کے بعد سارا لاہور ڈنڈے ، سوٹے ، رائفلیں ، ہاکیاں ، برچھیاں اور کلہاڑیاں لیکر واہگہ کیطرف چل دیا۔ اس لشکر میں خود ننھا منا مجاہد نصرت جاوید بھی شامل تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب پتہ چلا کہ واہگہ بہت دور ہے اور چھوٹا نصرت جاوید وہاں تک پیدل نہیں پہنچ سکتا اس لیے وہ واپس گھر آگیا۔ میرے نزدیک نصرت جاوید کا نان چھولے کی دکان سے دشمن پر وار کرنے کی نیت سے ریلوے اسٹیشن تک ننگے پاؤں سفر کرنا بھی جہاد ہے اور نصرت جاوید یقینا 65 کا غازی ہے۔

بہت سال پہلے مشہور سیاستدان اور وکیل اعتزاز احسن نے ایک ٹیلیوژن انٹرویو میں بتایا کہ 65 کی جنگ کے دوران موصوف نے اپنے بچاؤ کے لیے گھر کے خوبصورت لان میں ایک مورچہ کھودا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس مورچہ کھدائی پر وہ شرمندہ ہیں چونکہ اسطرح انہوں نے ان ڈائریکٹ 65 کی جنگ میں شمولیت اختیار کی جسکی وجہ سے ہزاروں لوگ مارے گئے۔ فرمایا آج بھی افسوس ہے کہ مجھے مورچہ نہیں کھودنا چاہیئے تھا۔ جناب اعتزاز احسن کا انٹرویو سن کر مجھے آزاد کشمیر کے گاؤں خواجہ بانڈی کی وہ نڈر مجاہدہ یاد آگئی جو بارہ بور رائفل لیکر اوڑی کی طرف جانے والے نالے کے کنارے بیٹھ گئی اور تب تک بھارتی حملے کو روکے رکھا جب تک فوجی جوان اُس کی مدد کو نہ پہنچے ۔ حیرت کی بات ہے کہ بیرسٹر اعتزاز احسن پیپلز پارٹی کے اہم رکن ہیں انہیں تو اگلے

مورچے میں ہونا چاہیے تھا چونکہ اس جنگ کے منصوبہ ساز اُن کے ہی سیاسی مرشد جناب ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ مشہور بھارتی صحافی درگا داس اپنی کتاب ’’ کرزن سے نہرو اور 65 کی جنگ کے بعد ‘‘میں لکھتے ہیں کہ وزیراعظم شاستری پر بھارتی فوج ، کابینہ اور اشرافیہ کا شدید دباؤ تھا کہ وہ آزاد کشمیر کے حاجی پیر سیکٹر پر کوئی بات نہ مانے اور درہ حاجی پیر پر بھارتی قبضے کو برقرار رکھے۔ دوسری جانب ایوب خان پر اپنے ہی وزیر خارجہ کا دباؤ تھا کہ سیز فائیر لائن کو چھوڑ کر باقی معاملات پر بات کی جائے ۔ آخر کار ایوب خان نے وزیر خارجہ کو ڈانٹ پلائی اور حتمی مسودہ خود لکھا جس میں در حاجی پیر اور ملحقہ چوٹیوں سے بھارتی انخلاء کو یقینی بنایا۔ آخری مسودے کی اطلاع دہلی دربار پہنچی تو لٹل مین آف سٹیل شاستری پر نہ صرف حکومتی بلکہ خاندانی دباؤ بھی بڑھ گیا۔ درگا داس کے مطابق شاستری کی بیگم اور بیٹے نے بھی کہا کہ وہ کسی ایسی دستاویز پر دستخط نہ کرے جس میں درہ حاجی پیر اور ملحقہ علاقے کی واپسی کا ذکر ہو۔ دوسری جانب میزبان ملک سویت یونین کی عزت ووقار کا مسئلہ تھا کہ تاشقند مذکرات کسی صورت ناکام نہ ہوں ۔ بھٹو صاحب جنھوں نے آپریشن جبرالٹر کی منصوبہ بندی کی تھی۔ جنکا کردار حیران کن تھا کہ انہیں آزاد کشمیر کے چھینے گئے علاقوں کا ذرہ بھر بھی احساس نہ تھا۔ جو اُن کے بنائے گئے ناکام منصوبے کی وجہ سے بھارت کے ہاتھ لگ گئے تھے اور مستقبل میں ان علاقوں کا بھارت کے ساتھ رہنا گویا سارے آزاد کشمیر سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔

چاڑہ صاحب اگر خود نہیں سمجھتا تو ٹیلی ویژن سکرینوں پر جلوہ افروز دو ائیر مارشلوں اور پانچ جرنیلوں سے ہی پوچھ لے کہ حاجی پیر سیکٹر کی فوجی تدبیراتی اور جغرافیائی لحاظ سے کیا اہمیت ہے۔ اگر توفیق ہو تو کبھی شہید گالہ جا کر اُن شہدا کی قبروں پر فاتحہ بھی پڑھ لے جنہوں نے جان کا ندرانہ دیکر جنرل سندر جی جیسے بھارتی کمانڈر کو کئی گھنٹے تک اس علاقے میں روکے رکھا اور اُسکا کوہالہ پہنچنے کا خواب خاک میں ملا دیا۔

جہاں تک فتح اور شکست کا معاملہ ہے تو پاکستان ہر لحاظ سے فاتح ہے۔ 1971ء میں تو سیاستدانوں کا ادھر ہم ادھر تم چل گیا مگر 65 میں آزاد کشمیر سے جان چھڑاؤ فارمولہ ناکام ہوا۔ پیپلز پارٹی کے وزیر قانون اور دانشور قانون دان مرحوم اقبال حیدر مرتے دم تک کشمیریوں کے خلاف بولتے رہے اور کہتے رہے کہ ہم اپنی اولادیں کشمیریوں پر کیوں قربان کریں۔ وہ ٹیلی ویژن چینلوں پر دلائل دیتے رہے کہ پاکستان جتنا جلدی کشمیر کے مسئلے سے جان چھڑائیگا اتنا ہی جلد ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہوگا۔ ایک طرف تو بھٹو صاحب کشمیر کے لیے سوسالہ جنگ کا اعلان کرتے تھے اور دوسری طرف تاشقند میں پونچھ اور نیلم سیکٹر کے اہم علاقوں سے بھارتی انخلاء پر بات کرنے پر نالاں تھے۔ جب خود اقتدار میں آئے تو شملہ کے مقام پر سیز فائیر لائین کو لائین آف کنٹرول میں بدل کر مسئلہ کشمیر عالمی عدالت سے باہمی پنچائیت میں لے آئے تاکہ بھارت

کشمیریوں پر اپنی مرضی مسلط کرسکے۔
اگر ہم چاڑہ صاحب کے رواس پٹاس پر نظر ڈالیں تو ان سے گزارش ہے کہ آپ کا بھارت نواز ہونا اب تسلیم ہوچکا اور آپ کی مسلسل امریکہ یاترا بھی کسی مصلحت کے بغیر نہیں۔ دیسی ٹٹو ولائیتی چیکاں والا محاورہ توآپ نے سن رکھا ہوگا۔ یہ چیچیں ڈالروں کے بغیر نہیں نکلتی ۔آپ کی چھ ستمبر والی چیچیں نہ صرف ولائیتی بلکہ بھارتی بھی تھیں۔
بھارت نواز دانشور لنگروں اور صحافیوں سے گزارش ہے کہ آپریشن جبرالٹر پاکستان کے وزیر خارجہ اور وزیر خزانہ کا برین چائیلڈ تھا جسکی سیاستدانوں نے ہی نہیں بلکہ اولیائے کرام نے بھی مخالفت کی تھی۔ فوجی افسراسے اپنے طریقے سے لڑنا چاہتے تھے مگر بھٹو صاحب کے اپنے ہی ارادے تھے۔ اس سلسلے میں انوار ایوب راجہ کی کتاب لینڈتھا، ممتاز مفتی کی کتاب الکھ نگری اور جناب علامہ حمید الدین برکاتی کی تصنیف انوار برکاتیہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے کہ انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود پاک فوج نے ہزاروں میل بھارتی علاقے پر قبضہ کیا۔ بھارتی بندرگاہ دوارکا اور دیگر بحری تنصیبات سمیت اہم بحری جنگی جہازوں کو تباہ کیا۔ پاک نیوی کی اس شاندار کارکردگی کے علاوہ پاکستان ایئر فورس نے پٹھان کوٹ ، ادھم پور، ہلواڑہ، جیسلمیر اور بیکانیر کے اہم ہوائی اڈوں کو ناکارہ بنادیا اور نصف کے قریب بھارتی ہوائی فوج کو تباہ کردیا۔

وسیع بھارتی علاقے پر قبضے کے علاوہ بھارتی توپخانے اور بھکتر کا بھی بہت بڑا حصہ تباہ کیا۔ کئی ہزار بھارتی فوجی مارے گئے اور قیدی بنا لیے گئے۔ 65 کی جنگ کو شکست کہنے والا صحافی ٹولہ در حقیقت شکست خوردہ گندی ذہنیت کا حامل صحافتی گند ہے۔ جو اپنے ہی ملک ، قوم اور فوج کے خلاف زہر اگل کر اپنے آقاؤں کو خوش کرنے اور حرام کا مال ہضم کرنے پر تلا ہوا ہے

عسکری میڈیا۔۔۔ ملکی بقاء کی ضرورت

جس ملک کا سیاسی نظام ملک لوٹنے والوں کے ہاتھ ہو، سیاستدانوں ، صحافیوں اور کاروباری خاندانوں کے حامد کرزائی اور بھارتی حکمران طبقے سے کاروباری تعلقات ہوں اور ملک کا وزیراعظم کرسی پر بیٹھتے ہی اعلان کر دے کہ مجھے بھارت سے تعلقات استوار کرنے کے لیے پاکستان عوام نے مینڈیٹ دیا ہے اوردوسری جانب بھارتی وزیراعظم کہے کہ مجھے پاکستان توڑنے ، مسلمانوں کو ہندو بنانے اور پاکستان میں دہشت گردی پروان چڑھانے کا میڈیٹ ملا ہے تو اس مخمصے اور خلفشار کے ماحول میں فیصلے کا اختیار کسے ہونا چاہیے ؟؟ ضروری ہے کہ ان حالات میں جب ملک کا نظام کمیشن مافیا، لینڈ مافیا، کرپشن مافیا، شوگر مافیا، بینک مافیا سمیت دیگر مافیاجات جس میں لنگرو صحافی مافیا بھی شامل ہے کے ہاتھوں آجائے تو ایک ایسے ادارے کا قیام ضروری ہے جو دنیاکے سامنے سچائی بیان کرے اور بیرونی اور اندرونی پراپیگنڈے اور ذہنی و نفسیاتی انتشار پھیلانے والوں کو موثر اور حقیقت پر مبنی جواب دے تاکہ بیرونی دنیا اور پاکستانی عوام کو پاکستان کے متعلق اصل حقائق سے باخبر رکھا جائے۔

جہاں تک عسکری میڈیا کور کا تعلق ہے تو یہ پاکستان کی سلامتی اور بقاکے

لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ ایک میزائل بردار یا ٹینک بردار کور کی ہے۔ نام کٹے صحافی کو شائد پتہ نہیں کہ ٹینک، توپ اور میزائل چلانے سے پہلے نفسیاتی، معاشی، ثقافتی اور اخلاقی جنگ جیتنا ضروری امر ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی، کشمیر پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ، افغانستان سے روس کا انخلا، عراق اور لیبیا پر مغربی طاقتوں کا غلبہ اور اب شام اور یمن میں جاری خانہ جنگی نفسیاتی اور معاشی جنگ کا ہی نتیجہ ہے۔ معاشی پابندیاں لگانے سے پہلے نفسیاتی، سیاسی، ثقافتی اور اخلاقی محاذ کھولے جاتے ہیں اور دینی اقدار اور رسم و رواج کو تباہ کیا جاتا ہے تاکہ انسانی حقوق کی آڑ میں دیگر ہتھیاروں کو میدان میں اُتارا جائے۔

کیا ہمارا میڈیا یہ نہیں جانتا کہ طالبان اور داعش بھی تو اسلامی اور شرعی نظام کی بات کرتے ہیں اور اُن کے جہاد کا مقصد خلافت اسلامیہ کا ہی قیام ہے مگر ان کی پشت پناہی کوئی اور کر رہا ہے جسکا مقصد مسلمان حکومتوں کو ختم کرنا اور مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو تباہ کروا کر اُن پر اپنی مرضی مسلط کرنا ہے۔

موجودہ حالات اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ عسکری ٹیلی ویژن چینل اور ریڈیو کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ کتوں کو شہید کہنے والوں اور کہلوانے والوں سمیت مودی کے دوستوں اور وظیفہ خوروں کے پراپیگنڈے سمیت صحافتی گند سے اہل

پاکستان کو خبر دار کیا جا سکے۔

جو صحافی اور اینکر زلزلہ زدگان کے لیے بھارتی امداد قبول کرنے کا مشورہ دے رہے تھے اُن کی گندی ذہنیت اور لالچ تو سب کے سامنے ہے مگر اُن کی حب الوطنی بھی مشکوک ہے۔ ایک طرف پاکستان کی بیٹی کہلوانے والی ملالہ بھارت یاترا پر ہے اور دوسری طرف ایک درویش اور انسانیت کی خدمت کرنیوالے بوڑھے شخص کی بیوی اور بیٹے نے مودی کے کروڑ روپے یہ کہہ کر ٹھکرا دیے کہ ہم حکومتوں سے مدد نہیں لیتے۔ ملالہ کا تعلق سرحدی گاندھی کے نظریات سے ہے اور بھارت اس نظریے کے حامل لوگوں اور سیاستدانوں کے لیے اجنبی ملک نہیں۔

دیکھئے ملالہ اور گیتا کی کب ملاقات ہوتی ہے اور ملالہ کی اگلی کتاب (بھارت یاترا) کب شائع ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس بار گیتا کو دہلی چھوڑنے کوئی وزیر کیوں نہیں گیا؟ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں گیتا کسی دن فرفر ہندی یا انگریزی بولتے ہوئے پاکستان کے خلاف کشمیرا سنگھ کی طرح پریس کانفرنس ہی نہ کر دے۔ ایک بڑے صحافی اور اینکر نے تو گیتا کو پاکستان اور بھارت کے درمیان گشتی سفیر مقرر کرنے کا بھی مشورہ دیا ہے جبکہ دو عدد ٹیلی ویژن چینل اس بات پر گتھم گتھا ہیں کہ گیتا کو ڈھونڈنے، پالنے پوسنے اور بھارت تک پہنچانے کا نیک کام انہوں نے کیا ہے۔ پتہ نہیں یہ نیکوکار چینل ان

سینکڑوں پاکستانیوں کا کھوج کیوں نہ لگا سکے جو ان کے مربی اور من پسند ملک بھارت کی جیلوں میں بند ہیں۔ عافیہ صدیقی نامی ایک پاکستانی بھی ہے جسے نہ صرف ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا گیا بلکہ ایک صدی کے قریب اُسے سزا بھی دی گئی ہے۔ اسی سالہ قید و بند کی سزا بھی سپر پاور امریکہ کا ہی کارنامہ ہے اور پاکستانی سیاستدانوں، حکمرانوں اور صحافیوں کا معدہ اتنا درست ہے کہ وہ اپنی ذات اور دولت کے حصول کو چھوڑ کر ہر طرح کی بے شرمی اور بے غیراتی ہضم کر جاتے ہیں۔

مودی کی طرف سے زلزلہ زدگان کے لیے خیرات وصول کرنے اور گیتا کو سفیر مقرر کرنے کا مشورہ دینے والے صحافی بھول گئے کہ بھارت نے چند سال پہلے ایک جنگی قیدی سپاہی محمد حسین کو پاکستان کے حوالے کیا تھا جسکی زبان کاٹ دی گئی تھی۔ وہ جنگی قیدی تھا اور اُسے جنیوا کنونشن کے تحت کچھ مراعات بھی حاصل تھیں مگر کسی اینکر اور صحافی نے حکومت کو یہ مقدمہ یو این او میں پیش کرنیکا مشورہ نہ دیا۔ ظاہر ہے کہ سپاہی محمد حسین کا خاندان نامور صحافیوں اور اینکروں کو جو لاکھوں روپے تنخواہ کے علاوہ حکومتوں سے کروڑوں روپے کی مراعات اور اپنے ہم خیال ملکوں اور حکومتوں سے بوریاں اور صندوق بھر کر ڈالر، تحائف اور چھٹیاں گزارانے کی سوغات بھی وصول کرتے ہیں کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ صحافت کا بہروپ اپنائے یہ لوگ

پاکستان میں بیٹھ کر پاکستان کے دشمنوں کی وکالت کرتے ہیں۔
نام کٹے صحافی اور ہمنوا صحافیوں کا علاج اُن کے میڈیا ہاؤسز مالکان کے پاس ہے مگر میڈیا ہاؤس مالکان کا نظریہ، عقیدہ، اخلاق اور حب الوطنی پیسہ ہے۔ نظریہ پاکستان کی محافظت کے دعویداروں کے بزرگوں نے بھارت جانے کی شرط رکھی تھی کہ اگر پاکستان کا صدر ٹینک پر سوار ہو کر دہلی جائے تو وہ اُسکے ہم سفر ہونگے۔ اب اسی میڈیا ہاؤس میں بیٹھے صحافی مودی کی ترجمانی کر رہے ہیں اور وطن کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی محافظ پاک فوج پر تنقید اور طنز کے تیر برسا رہے ہیں۔
جس ملک کے ٹیلی ویژن چینل گیتا تلاشنے پر جھگڑ رہے ہوں اور حکومت نے اپنی کمزوری اور بے انصافی میں فوج کو ملوث کرنے کی قسم کھائی ہو، اور نامور صحافی جنسی سکینڈل جیسے گھناؤنے جرم میں شیطانی مسکراہٹ کیساتھ کندے پر ہاتھ رکھ کر فوج کے ملوث ہونے کے اشارے کرتے ہوں، راجیش کھنہ کے جنازے اور تدفین پر بغیر سوچے سمجھے محض بھارتی محبت میں سرشار گھنٹوں ماتمی پروگرام کرتے رہے ہوں اور پاکستان کے ہیرو ایم ایم عالم کی رحلت پر خاموشی اختیار کرتے ہوں وہاں عسکری ٹیلی ویژن، ریڈیو اخبار اور ایک طاقتور عسکری میڈیا کور کی اشد ضرورت ہے تاکہ دشمن اور اسکے ایجنٹوں کے پھیلائے ہوئے منفی پرا

پگینڈے اور نفسیاتی حملوں کی روک تھام کی جائے۔ یاد رہے کہ مضبوط قلعوں کے دروازے ہمیشہ اندر سے کھولے جاتے ہیں باہر سے نہیں ٹوٹتے۔ جنگ کا مقصد دشمن کے شہروں، قصبوں اور ہتھیاروں کو تباہ کرنے سے نہیں بلکہ ذہنی طور پر مفلوج اور بے ہمت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر شہر تباہ کرنے اور لاکھوں لوگوں کا خون بہانے سے فتح کا پرچم لہراتا تو برطانیہ، روس اور امریکہ افغانستان میں، اہل مغرب اور امریکہ عراق، لیبیا، یمن اور ویتنام میں کامیاب ہو جاتے۔ حفاظتی نفسیاتی جنگ جہاں ہتھیار بند جنگوں کو روکنے کا باعث بنتی ہے وہی دشمن کے دل میں ہیبت اور خوف بھی ڈال دیتی ہے۔ دشمن جارحیت کے بجائے خود حفاظتی کے قدامات پر غور کرتا ہے اور جنگ سے باز رہتا ہے۔ نفسیاتی جنگ موثر میڈیا اور اس سے منسلک صحافی، دانشور، اور اعلیٰ سوچ کے حامل افراد لڑتے ہیں مگر ہماری بد قسمتی کہ ہمارا بیشتر میڈیا اپنی ہی قوم اور فوج کے خلاف نفیساتی جنگ میں مصروف ہے۔ ہمارا میڈیا دشمن کا آلہ کار اور اس سے منسلک بڑی تعدادی میں صحافی، دانشور اور اعلیٰ سوچ کے حامل افراد زہر اگلنے، گند پھیلانے اور پیسے کی خاطر دشمن کی زبان بولنے میں مصروف ہیں۔

سیاستدان اور حکمران ٹولہ تاجروں اور بیوپاریوں پر مشتمل ہے اور قومی خزانے کو ذاتی جدی جائیداد سمجھ کر عیاشیوں پر لٹا رہا ہے۔ کیا یہ حالات اس بات کے

متقاضی نہیں کہ کوئی آگے بڑھ کر ڈوبتی ناؤ کا چپو سنبھالے اور اُسے بھنور سے نکالے
؟؟؟؟۔۔۔

صوبہ سرحد یا کے پی کے ؟

آزادی کے بعد پہلی بار عوامی نیشنل پارٹی نے صوبہ سرحد میں حکومت بنائی تو میاں نواز شریف ، آصف علی زرداری ، مولانا فضل الرحمٰن اور ایم کیوایم کی حمائت و معاونت سے صوبے کا نام بدل ڈالااور چودہ اگست کی بجائے پندرہ اگست منایا مگر کسی دانشور کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس پر تنقید کرے۔ پراپیگنڈہ یہ کیا گیا کہ صوبے کا نام عوام کی مرضی و منشا کے مطابق پختون خواہ یعنی پختون کا رکھا گیا ہے۔ پھر ساتھ خیبر بھی لگا دیا گیا یعنی خیبر پختون کا۔ غور کیا جائے تو یہ نام فاٹا کا ہونا چاہیے چونکہ نہ تو خیبر صوبے کا حصہ ہے اور نہ ہی باقی علاقہ پختون یعنی پٹھان کا ہے۔ صوبے میں پختون یعنی پٹھان آبادی بھی اکثریت میں نہیں اور نہ ہی سب لوگوں کی مادری اور علاقائی زبان پشتو ہے۔ جن لوگوں کی علاقائی زبان پشتو ہے وہ قبائلی ایجنسیوں میں رہتے ہیں، صوبے کے بندوبستی علاقے میں نہیں ۔

سوائے قبائلی ایجنسیوں کے صوبے کی بڑی آبادی گجروں ،اعوانوں ، اور مقامی لوگوں پر مشتمل ہے جن کی ذاتیں اور گوتیں قدیم آریاؤں سے ملتی ہیں ۔ یہ علاقہ ہزاروں سال پہلے کشمیر اور ایران کا حصہ رہا اور بعد کے ادوار میں

ناگ، کنشک اور ہندو تہذیب کا مرکز رہا۔ گور کنٹھڑی، شہباز گڑھ، ٹیکسلا، پکھلی اور شاردہ کے آثار اور ڈوگرہ دور کے آخری ایام میں گلگت سے دریافت ہونے والے بھوج پتر اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ صوبہ سرحد ہمیشہ سے قبائلی علاقوں اور افغانستان سے الگ کسی نہ کسی تمدن کا حصہ رہا ہے جہاں زمانے کے مروجہ علوم اور ثقافت کا بھی اثر تھا۔ آثار بتلاتے ہیں کہ سنسکرت دور میں وادی پشاور بشمول دیر، چترال، ہزارہ، پکھلی اور چیلاس تک کے علاقے الگ الگ ریاستیں تھیں جہاں کے قدیم حکمران خاندان، کشمیر، بلورستان (گلگت بلتستان) ایران، تبت اور چین سے تعلق رکھتے تھے۔ یاد رہے کہ پشاور آرکائیو اور ضلعی گزیٹر میں شائع شدہ اکثر معلومات ادھوری اور قیاس پر مبنی ہیں جبکہ اصل تاریخ بھوج پتروں، اشلوکوں، کتبوں اور زمینی آثار سے ہی معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر تاریخ کی کڑیاں ملائی جائیں تو قبائلی ایجنسیوں پر مشتمل علاقے نئے آباد شدہ علاقے ہیں جہاں یہودی، آرمینیائی اور بابلی قبائل نے دشوار گزار اور آبادیوں سے دور پناہ گاہیں تلاش کیں اور بعد کے ادوار میں آبادی پھیلنے کی وجہ سے میدانوں اور ڈھلوانوں تک پھیل گئے۔ اگر ہم قبائل کا رشتہ افغانوں سے جوڑیں تو بھی تاریخ کی کڑیاں ٹوٹ کر کیرو کیہ" دی افغان" تک سمٹ آتی ہیں۔ اگر ہم چھوٹے یا میر کی ڈھلوان چٹی بوئی گلیشر سے چلیں تو گلگت کی جانب مسگر اور سوختر آباد کے علاقے ہیں جہاں گجر اور ازبک آباد ہیں۔ اسی علاقے کے دوسری جانب صرف گجر ہیں ازبک نہیں۔ چونکہ ازبک

چیکا انقلاب کے بعد اس علاقے میں وارد ہوئے جبکہ گجروں کی آبادی قدیم ترین ہے جسکا کوئی تاریخی ریکارڈ موجود نہیں ۔ گلگت سے نیچے چترال ہے جسکا اپنا کلچر، زبان اور ثقافت ہے۔ معلوم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی دور میں یہ سارا علاقہ بدخشاں اور قندوز سے لیکر آموں دریا تک بلورستان اور دردستان کا حصہ تھا۔ آج کے افغانستان پر نظر ڈالیں تو واخان میں گوجری، ازبکی اور شینا زبان بولی جاتی ہے پشتو نہیں ۔ اس علاقہ میں کوئی پختون آباد نہیں اور نہ ہی پختون کلچر اور روایات کا یہاں وجود ہے۔ چترال میں کھوار بولی جاتی ہے مگر سامنے افغان علاقوں میں پشتو ر اور فارسی دری) زبان رائج ہے۔ چترال کے بعد تھوڑا سا علاقہ سابق ریاست دیر کا ہے جبکہ) زیادہ تر سرحد باجوڑ، مومند اور خیبر ایجنسی سے ملتی ہے جہاں دونوں طرف آباد علاقوں میں اور سرحد پر بسنے والے قبائل کی نہ صرف زبان مشترک ہے بلکہ ایک ہی قبیلے اور برادری کے لوگ بھی آباد ہیں ۔ سرحد تک آباد قبائل میں صافی، مومند، شنواری جبکہ تیرہ اور اوکزئی کے علاقوں میں آفریدی اور کزائی آباد ہیں مگر دوسری جانب آفریدی اور اورکزائی آبادی انتہائی محدود ہے۔ کرم ایجنسی میں بھی دلچسپ صورت حال ہے چونکہ کرم ایجنسی میں آباد بنگشوں، اورکزائیوں اور دیگر قبائل جن میں خٹک بھی شامل ہیں کے دوسری جانب افغان صوبوں جن میں ننگرہار، پکتیا اور وردک کے علاقے شامل ہیں سے زبان، کلچر، قبیلے اور خاندان وغیرہ کا انتہائی محدود تعلق ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ فرقہ اور مسلک ہے چونکہ کرم اور

کرّئی ایجنسی میں آباد سیدوں اور بنگشوں کا تعلق شیعہ مسلک سے ہے جبکہ سرحد پار کے خروٹیوں، زردانوں اور دیگر قبائل کا مسلک سنی دیوبندی ہے۔ بعض جگہوں اور علاقوں میں فرقہ، مسلک اور مذہب بھی معاشرتی تقسیم کا باعث بنتا ہے جس کی وجہ سے زبان اور قبیلہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ شمالی وزیرستان کے کچھ علاقوں کا پکتیا اور پکتیکا کے افغانوں سے تعلق ہے مگر بیشمار اہم قبائل کے رسم و رواج الگ ہیں۔ وزیری، بٹنی اور مسعود قبائل کی تعلق داریاں خوست اور ملحقہ علاقوں تک محدود ہیں چونکہ اگلے علاقوں اور آبادیوں کے قبائل کا تعلق بلوچستان کے کاکڑوں، شیرانیوں غیبی زیوں، بڑیچوں اور ترینوں سے ہے۔ رقبے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ تعلق بھی دس بیس کلومیٹر سے آگے نہیں جاتا۔ افغانستان میں جاری صدیوں پرانی خانہ جنگیوں اور بیرونی حملہ آوروں کی تباہ کاریوں کی وجہ سے افغان آبادی مسلسل نقل مکانی کی کیفیت میں رہتی ہے۔ جسکا اثر پاکستانی قبائلی علاقوں کے علاوہ بلوچستان، سرحد اور ملحقہ پنجاب پر بھی آتا ہے۔ جہاں تک پشتو زبان کا تعلق ہے تو اس کے انداز و اطوار بھی دیگر زبانوں کی طرح مختلف ہیں۔ افغانستان کے ملحقہ صوبوں سے لیکر پنجاب کے ضلع میانوالی جو کبھی بنوں کا حصہ تھا کے علاوہ ڈیرہ غازی خان اور شمال میں اٹک، ہزارہ اور گلگت تک پشتو زبانی بولی اور سمجھی جاتی ہے مگر لکھی اور پڑھی نہیں جاتی۔ پنجابی، اُردو اور کسی حد تک انگریزی جو اس خطے کی زبان نہیں تعلیم یافتہ طبقے کی رابطہ زبان ہے۔ پنجابی، پٹھان، سندھی، بلوچی،

کشمیری بلتی یا پڑھا لکھا گلگتی اپنی مادری زبان بولتے ہوئے جب تک انگریزی کا تڑکہ نہ لگائے اسے نہ بولنے میں مزہ آتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ ہونے کی سند پیش کر سکتا ہے۔

سچائی اور حقیقت یہ ہے کہ ایک زبان جو صرف بولی جاتی ہے اور صوبے کی نوے فیصد آبادی نہ یہ زبان پڑھ سکتی ہے اور نہ لکھ سکتی ہے کی بنیاد پر صوبے کا نام محض تعصب کی بنیاد پر بدلنا اور قومی سیاستدانوں اور لیڈر کہلوانے والوں کو بغیر کسی تحقیق اور سوچ کے محض وقتی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی حمایت کرنا بھی حماقت ہے۔ اگر آبادی کو بنیاد بنایا جائے تو صوبے کا نام اعوانستان یا گجرستان ہونا چاہیئے اور مقامی زبانوں کو دیکھا جائے تو ہندکو سارے ہزارہ، ڈیرہ، کوہاٹ، پشاور، نوشہرہ اور ملحقہ اٹک میں بولی جاتی ہے۔ لیڈروں کی اس محدود اور متعصب سوچ نے صوبے کے نام کی بھی توہین کی ہے۔ سرحد ایک باوقار، بامعنی اور پختون روایات سے ہم آہنگ لفظ تھا جبکہ خیبر پختونخواہ جسے ہر کوئی اپنی آسانی کے لیے خیبر پی۔کے یا پھر کے۔پی۔کے لکھتا اور بولتا ہے۔ پشتو زبان وادب کی بات کی جائے تو خٹک قبیلے کا نام سرفہرست ہے۔ پشتو کے نامور شاعروں، ادیبوں، دانشوروں کا تعلق اسی قبیلے یا پھر سیدوں، قریشیوں اور گجروں سے رہا ہے۔ خوشحال خان خٹک، رحمان بابا، پروفیسر پریشان خٹک، اجمل خٹک اور دیگر کے نام سے کون واقف نہیں مگر اے

این پی حکومت نے خٹک قوم کے مرکز کرک پر ایک ایسا حملہ کیا جو قابل غور ہے۔ ضلع کرک جہاں پچانوے فیصد خٹک آبادی ہے مگر پسماندگی کے لحاظ سے شاہد دنیا میں پہلے دس نمبروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ صحرائی ضلع جہاں سہولتوں کا فقدان ہے مگر علم وادب کے لحاظ سے اس قدر زرخیز ہے کہ اسکا شمار دنیا کے پہلے پانچ ملکوں میں کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان آرمی کی کوئی یونٹ ایسی نہیں جہاں کرک کا خٹک افسر، سپاہی یا عہدیدار نہ ہو۔ سول سروسز میں دیکھا جائے تو بھی خٹکوں کی تعداد صوبائی اور مرکزی محکمہ جات میں سب سے زیادہ ہے۔ اسی طرح تعلیم، طب اور دوسرے شعبوں میں بھی خٹک قوم کے ہونہار سپوت ملکی اور قومی خدمت پر مامور ہیں۔ مگر عوامی نیشنل پارٹی کی حکومت نے کرک کے عوام کی زبان کو ہی مشکوک قرار دیکر وہاں بنیادی پشتو سکھلانے کا حکم جاری کیا۔ کئی سالوں تک کرک کے سکولوں میں پشتو زبان رائج ہونے اور خٹکوں کو بنیادی پشتو پڑھانے پر ضائع ہوئے جسکی وجہ سے کرک کے بچوں کے کئی تعلیمی سال ضائع ہوگئے۔ سوال یہ ہے کہ آخر کرک کے لوگوں کو ہی اس ستم کا نشانہ کیوں بنایا گیااور کسی جرگہ نما پروگروام کے چادر پوش اینکر کی کمزور نظر اس کی طرف کیوں نہ گئی حالانکہ یہ مشق بنوں یا لکی مروت میں ہونی چاہیے تھی جہاں کا ڈائی لکٹ مختلف ہے۔ خٹک قبیلے کے اُساتذہ کا خیال ہے کہ انہیں یہ سزا پاکستان سے پیار، فوجی

خدمات اور پشتو زبان و ادب کی خدمت کے عوض دی گئی تاکہ ہمارے بچے دس سال پیچھے چلے جائیں اور شہیدوں اور غازیوں کی سرزمین بنجر ہو جائے ۔ وہ لوگ جو صوبائیت اور لسانیت کے دعویدار ہیں نے کئی کئی انگلش میڈیم سکول کھول رکھے جبکہ اُن کے بچے بیکن ہاؤس ، سٹی سکول اور دیگر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھتے ہیں ۔ وہ جن کے دلوں میں طالبان کا خوف گھر کر چکا ہے کے خاندان ہی بیرون ملک چلے گئے ہیں جہاں ملک سے لوٹی گئی دولت سے وہ لوگ عیش و عشرت کی زندگیاں جی رہے ہیں۔ صوبے کا نام بدلنے کے بعد ہزارہ اور سرائیکی صوبے کے علاوہ پوٹھوہار اور کراچی کی بات چلی تو سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ خیبر پختون خواہ محض ایک نام کی بات نہیں اس کے پیچھے پختونستان اور گریٹر بلوچستان بنانے والوں کا دماغ ہے اور کالا باغ ڈیم مخالف قوتوں کی مرضی اور دولت بھی اس میں شامل ہے۔ آنے والا وقت بتائیگا کہ نام بدلنے کی رسم میں حصہ دار بننے والے آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف نے کیا غلطی کی اور کسطرح عوامی نیشنل پارٹی، مولانا فضل الرحمٰن ، محمود اچکزئی اور الطاف حسین کے چکمے میں آکر پاکستان کے خلاف ایک سازش کی بنیاد رکھی ۔ پاکستان بعض سیاسی جماعتوں کی مجبوری ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن ، اسفندیار ولی ، جناب الطاف بھائی اور محمود اچکزائی دنیا کی کسی بھی حکومت سے شراکت داری کے لیے تیار ملینگے بشرطیکہ وہ اس حکومت کا حصہ ہوں اور من پسند وزارتوں سے ان کی پذیرائی کی جائے۔ قومی خزانے کا کچھ حصہ انہیں بطور انعام عنائت کیا جائے

اور اُسے کرپشن وغیرہ تصور نہ کیا جائے۔ سیاسی اور معاشی نظریات اگرچہ میاں برادران اور زرداری صاحب کے بھی یہی ہیں مگر مرکزی حکومت پر تسلط اُن کی مجبوری ہے۔

سیاسی آلودگی اور گندی سیاست

حال ہی میں وزیر اعظم پاکستان فرانس کے شہر پیرس جا پہنچے اور وہاں منعقد ہونے والی ماحولیاتی کانفرنس میں ایک پرچہ پڑھ کر سنایا۔ سنا ہے کہ سیر سپاٹے کے شوقین وزیر اعظم کو پیرس کی سیر سے پہلے بتایا گیا کہ جناب آپ کی کابینہ میں ماحولیات کا وزیر ہی نہیں ۔ مشاۂد اللہ خان کو تو آپ سیاسی ماحول مزید آلودہ کرنے اور فوج کے ساتھ چھیڑ چھار پر کب کا فارغ کر چکے ہیں اصول تو یہ تھا کہ آپ اپنے.برادر خورد اور ڈپٹی وزیر اعظم جناب شہباز شریف اور وزیر دفاع خواجہ آصف کو بھی فارغ کرتے چونکہ مشاۂد اللہ خان نے تو ان دونوں کی دیکھا دیکھی محض دکھلاوے کے لیے بیان دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر قربانی کے لیے مشاۂد اللہ جیسے لوگ ہی پارٹیوں میں رکھے جاتے ہیں جو مہمان لیڈروں کے لیے جیلوں ، جلسوں اور استعفوں وغیرہ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مشاۂد اللہ صاحب کو جب جبری ریٹائر کیا گیا تو موصوف نے ضرور سوچا ہوگا کہ کاش وہ کشمیری مہاجر یا پھر ڈار ، خواجہ ، نائیک یا بٹ وغیرہ ہوتے تو انہیں اسطرح ناقابل استعمال قرار نہ دیا جاتا۔

وزیر اعظم صاحب نے پیرس جانے سے پلے ہر فن مولا اور ہر حکومت کے لیے قابل قبول شخصیت جناب زاہد حامد کو ماحولیات کا فالتو قلمدان تھما کر پیرس

پہنچنے کا حکم صادر کیا اور پھر خود بھی وہاں تشریف لے گئے۔برکھا دت نے لکھا ہے کہ میاں صاحب پیرس ماحولیات کے لیے نہیں بلکہ مودی سے ملاقات کے لیے گئے تھے جو کھٹمنڈو میں ہونے والی خفیہ ملاقات کے دوران طے ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ افغان صدر اشرف غنی سے بھی بعد از ہزار منت وسماجت ملاقات ہوئی جسکے لیے میاں صاحب نے ایک پختون جرگہ کابل بھجوایا اور پھر برطانوی وزیر اعظم کی کوششوں سے اشرف غنی جیسے صدر جو محض کابل کا ڈپٹی میئر ہے سے شرف ملاقات نصیب ہوا۔ ماحولیات کی آڑ میں ان ملاقاتوں کا کیا مقصد تھا اور آخر اسکا کیا نتیجہ نکلے گا یہ خدا ہی جانتا ہے مگر پاکستانی اینکر برادری نے اسے اپنی اپنی مرضی اور معاوضے کے مطابق رنگ دیے ہیں۔ اینکروں کی مرضی اور معاوضہ بھی صحافتی اور سیاسی آلودگی کا سبب ہے جس کا توڑ بھی ضروری ہے۔

میاں صاحب نے زاہد حامد کو ماحولیات کا خشک قلم کیوں تھمایا یہ بھی قابل غور ہے۔ ویسے تو میاں صاحب کا طرز حکمرانی بھی قابل غور ہے مگر اُن کے تخت طاؤس کے ارد گرد کا سیاسی، معاشی اور اخلاقی ماحول بھی کچھ اچھا نہیں۔ اس ماحول کا ایک رکن میاں منشا نامی شخص بھی ہے جس کی ایک فیکٹری کے دھویں نے گلابوں اور خوشبوں کی بستی کلر کہار کو اسقدر آلودہ کر دیا ہے کہ وہاں کے مکینوں میں پراسرار بیماریاں پھوٹ پڑی ہیں۔ میاں صاحب کو چاہیئے کہ وہ میاں منشا کو ماحولیات کا مستقل وزیر بنا دیں تاکہ وہ باقی شہروں اور قصبوں کو

گندگی اور کوڑا کرکٹ کا کالا دھواں دیگر غریب لوگوں کا خاتمہ کر دیں۔

ساہیوال اور دیگر شہروں میں جلد ہی کوئلے سے بجلی پیدا کرنے والے پلانٹ چل پڑینگے تو ملک میں غربت کس حدتک کم ہو جائے گی۔ غریب لوگ دھویں اور دیگر آلودہ ہواؤں اور غذاؤں کی وجہ سے بیمار ہونگے تو انہیں جعلی دواؤں ، جعلی ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کی کمی کی وجہ سے جلد ہی اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا مل جائے گا اسطرح میاں صاحب اور دیگر حکمران خاندانوں کے لیے مسائل کم ہو جائینگے ۔ دو تین کروڑ غریب افراد سے ماحول اور معاشرہ پاک ہو گیا تو میاں برادران اور زرادری صاحب کے لیے سیاسی ماحول ہموار ہو جائیگا۔ پلاننگ کمیشن کو چاہیے کہ وہ اسطرف زیادہ توجہ دے اور میاں منشا صاحب کے تجربات سے فائدہ اُٹھائے جس طرح میاں صاحب نے مودی اور اشرف غنی سے ملاقات کا ماحول بتایا ہے وہ اندرون ملک غریب مارارو غربت مٹاؤ پرواگرام پر بھی کام کر رہے ہیں اس سلسلہ ماحولیات کا تازہ شاہکار چالیس ارب روپے کا اضافی ٹیکس ، یورو بانڈ اور خزانے کی بندر بانٹ ہے جس پر عمران خان بھی متفق ہی لگتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پی ٹی آئی حکومت کی عوام کش پالیسیوں پر اعلیٰ عدالتوں میں جاتی ، عوام کو متحرک کرتی اور اسمبلیوں میں آواز اُٹھاتی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور نہ ہی آئندہ اس کی توقع ہے۔

لشکرانہ اور صحافیانہ ماحول سے کچھ یوں لگتا ہے کہ سیاسی آلودگی نے وطن عزیز کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور گندی سیاست نے شرافت، حب الوطنی اور معاشرتی ماحول کو اسقدر آلودہ کر دیا ہے جسکی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ معاشرے کے انتہائی کرپٹ، بے حس اور قابل نفرت کردار جمہوریت کی آڑ میں اقتدار پر قابض ہیں عوام کی بے بسی اور مصلحت کوشی بھی حیران کن ہے کہ وہ ظالم اور دندرہ صفت لوگوں کو نہ صرف ووٹ دیکر کامیاب کرتے ہیں بلکہ اُنکا ظلم وجبر بھی کمال حوصلے اور ہمت سے برداشت کرتے ہیں۔ جعلی دوائیں، جعلی غذائیں، جعلی ڈگریاں اور سندیں، جعلی الیکشن، جعلی جمہوریت اور جعلی سلیکشن سے لیکر ہر طرح اور سطح پر لوٹ مار کرنے والے مافیا کو عوام میں پذیرائی حاصل ہے۔ انتظامی ادارے مافیا کا حصہ ہیں اور مافیا کے مسلط کردہ قوانین کو پوری ایمانداری سے عوام پر لاگو کرتے ہیں۔ پولیس اور پٹوارانہ نظام جبر کے نشان اور ظالمانہ نظام کی پہچان ہیں اور عدلیہ عوام کی طرح بے بس ہے۔ انصاف کے لیے تفتیش اور شہادت تو لازمی قرار دی گئی ہے مگر جھوٹی شہادت اور جعلی تفتیش کا کوئی حل موجود نہیں۔ چرس کا ایک سگریٹ اور ہیروین کی ایک پڑیا یقیناً جرم ہے اور ایسے ہزاروں لوگ جیلوں میں بند چرس اور ہیروئن کا نشہ کرتے ہیں مگر اربوں روپے کی ایف ای ڈیرین بیچ کر کھرب پتی بننے والوں کو جیل کے بجائے اعلیٰ عہدوں پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ وزارت خزانہ کا کام بھی انوکھا ہے۔ یہ وزارت مال کمانے، خزانہ لوٹنے

عوام پر نت نئے ٹیکس مسلط کرنے اور عالمی مالیاتی اداروں سے بھاری سود پر قرض لینے کا ادارہ بن چکا ہے مگر عوام خاموش ہے۔ بہت سال پہلے جب پٹرول سات روپے لیٹر ہوا تو عوام کی طرف سے کوئی رد عمل نہ آیا اسلام آباد میں بیٹھے کسی بیرسٹر انیس جیلانی نے حکومتی ظلم اور عوام کی بے بسی پر کالم لکھ ڈالا مگر نہ حکومت کے کان پر جوں رینگی اور نہ ہی عوام نے اس انگریزی کالم پر توجہ دی۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اُس حکومت میں بھی وہی لوگ تھے جو آج کی حکومت میں ہیں تبدیلی صرف اتنی ہے کہ اُن میں سے جو کھا پی کر مر گئے اب اُن کے بیٹے بیٹیاں اور پوتے نواسے اسمبلیوں میں ہیں۔ بیرسٹر انیس جیلانی نے لکھا کہ حکومتوں، حکمرانوں اور سیاستدانوں نے عوام پر ہر طرح کا ظلم کیا مگر پھر بھی کوئی احتجاج نہ ہوا۔ عوام ظلم سہہ سہہ کر پتھر ہو گئے اور انہی ظالموں کو مسیحا سمجھ کر پوجتے رہے۔ اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا اور بل پاس ہوا کہ ملک کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک ہر چونگی، ہر ناکے، ہر بس کے اڈے، ریلوے اسٹیشن اور ایئر پورٹ پر اترنے اور چڑھنے والے مسافروں کو پیٹھ پر دو دو کوڑے لگائے جائیں بل پاس ہوتے ہیں ہی پولیس حرکت میں آ گئی اور کوڑہ مار پالیسی پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ سال گزر گیا، لوگ کوڑے کھاتے رہے، ظلم برداشت کرتے رہے۔ کولہے اور پیٹھیں سہلاتے رہے مگر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا۔ وزیر خزانہ نے بجٹ سے پہلے حاکم اعلیٰ کو مشورہ دیا کہ وہ کسی جگہ ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر جائیں اور کوڑہ مار

کارروائی کا ملاحظہ کرنے کے بعد عوامی رائے معلوم کریں تاکہ آنے والے بجٹ میں انہیں مزید رگڑا دیا جائے۔

صاحب عالم نے اپنا وزیر خزانہ، وزیر داخلہ، وزیر تجارت اور وزیر دفاع ساتھ لیااور ایک پل پر لگے ناکے پر جا پہنچے۔ لوگ گاڑیوں سے اتر کر کوڑے کھا رہے تھے، درد سے بلبلا رہے تھے۔ زخم سہلا رہے تھے مگر احتجاج نہ کرتے تھے۔ صاحب عالم فوٹو گرافروں صحافیوں اور مشیروں کے جھرمٹ میں آگے بڑھے اور میگا فون پر عوام سے خطاب کیا، اپنی حکومت کے کارنامہ بیان کیے، مستقبل کے پروگراموں کا ذکر کیا اور آخر میں پوچھا کہ میں آپ کی مزید کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

لوگوں نے کہا ہم آپ کے مشکور ہیں کہ دکھ کی اس گھڑی میں آپ نے ہمارا احساس کیا اور اتنے دور ہمیں دیکھنے اور ملنے آئے اور ہمارا حال احوال پوچھا آپ واقعی عوام کا دکھ درد سمجھنے والے عوام کے ہر دلعزیز لیڈر ہیں۔ بس اتنا کریں کہ جہاں جہاں آپ نے کوڑہ مار اسکاڈ تعینات کیے ہیں وہاں اُن کی نفری بڑھا دیں تاکہ وہ جلد جلدی کوڑے مار کر ہمیں فارغ کر دیا کریں ہم لوگوں نے دور جانا ہوتا ہے۔ اکثر مسافروں کو رات کے اندھیرے میں سفر کرنا پڑ جاتا ہے۔ راتوں میں چور ڈاکو اور درندنے بھی نقصان کرتے ہیں جسکی وجہ سے مشکلات

ہیں۔ حاکم اعلیٰ یہ سنکر پریشان ہو گیا یہ کس قسم کی مخلوق ہے جسے غربت، افلاس، بھوک بیماری تو درکنار عزت وذلت کا بھی احساس نہیں۔ وزیر خزانہ نے صاحب عالم کے کان میں کہا حضور ایسی مخلوق ہر حاکم کو میسر نہیں ہوتی جو انسانوں کی پرستش کرتی ہو اور اُسے اپنی عزت نفس کا بھی خیال نہ ہو۔

دیکھا جائے تو آج پاکستان کا ماحول کچھ ایسا ہی ہے۔ ایک طرف حکمران طبقہ اور اشرافیہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف اینکر باز صحافی اور قلمبردار دانشور ایک ایسے آئین اور قانون کی تابعداری کا درس دے رہے ہیں جو حکمرانوں، سیاستدانوں اور اُن کے ہم خیالوں کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہے۔ پتہ نہیں آئین کے کس خفیہ خانے میں منی لانڈرنگ، سمگلنگ، کرپشن، سیاسی، بلیک میلنگ اور حکمران طبقے کو عوام پر مرضی مسلط کرنے کا طریقہ لکھا ہے۔ صحافیوں، اینکروں اور دانشوروں کی ایک جماعت کا فرمان ہے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے اُس کرنے دیا جائے اور پانچ سال تک انتظار کیا جائے۔ عوام سب سے بڑے جج اور عوامی عدالت سب سے بڑی منصف ہے۔ اگر عوام چاہینگے تو پانچ سال بعد موجودہ حکومت اور حکمرانوں کو مسترد کر کے نئے حکمران لے آئینگے۔

عقلمندوں سے کوئی پوچھے کہ نئے حکمرانوں کہاں سے آئینگے؟ میاں برادران

جائینگے تو زرداری صاحبان آجائینگے ۔ موجودہ ترمیم شدہ آئین اور قانون کے تحت عام آدمی معاشی ، سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے اسقدر کمزور ہے کہ وہ حکمران خاندانوں ، ان کی ذاتی سیاسی جماعتوں اور اُن کے پھیلائے ہوئے ہتھکنڈوں کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔ این ۔آر۔ او اور چارٹر آف ڈیمو کریسی کے تحت سیاسی جماعتیں ٹریڈ کارپوریشن میں بدل چکی ہیں اور ان کے مالکان کو آئین میں ترمیم کرنے کے بعد حق حاصل ہے کہ وہ اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان سے لیکر نائب قاصدر کی تعیناتی اپنی مرضی سے کریں۔ موجودہ اور سابقہ پی آئی اے کے چیئرمین سے لیکر نادرہ، احتساب بیورو اور دیگر اداروں کے سربراہان کی سلیکشن اور تعیناتی ذاتی پسند اور ذاتی مفادات کے تحفظ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔ اداروں کے سربراہ اپنے اداروں اور ملک کے مفادات پر ذاتی مفادات اور حکمران طبقے کے احسانات کو ترجیح دیکر لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کرتے ہیں تو عوام اور عدلیہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔ نہ عوام میں احتجاج کی سکت ہے اور نہ ہی عدلیہ کوئی دلیرانہ فیصلہ کرنے کی ہمت ہے۔ عدلیہ عوام کی طرف اور عوام عدلیہ کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ پہلے کون کرے سابق چیف جسٹس جناب افتخار چوہدری نے عتیقہ اوڈھو کی تین بوتلوں پر از خود نوٹس لیا مگر پارلیمنٹ لاجز سے نکلنے والی تین ہزار بوتلوں پر کسی نے نوٹس نہ لیا۔ جناب اسحاق ڈار کا فرمان ہے کہ انہیں حضرت داتا گنج بخشؒ نے ڈیپوٹیشن پر اسلام آباد بھیجا ہے اور میاں صاحب کا بیان ہے کہ پاکستانی عوام

نے انہیں مودی سرکار سے دوستانہ تعلقات بحال کرنے کا مینڈیٹ دیا ہے۔ عدالت اور عوام کا فرض ہے کہ وہ ان دونوں بیانات کی تحقیق کریں اور میاں صاحب اور ڈار صاحب کو عدالت میں طلب کرکے اس کی وضاحت چاہئیں۔ داتا صاحب کی گواہ اُن کی کشف المحجوب اور میاں صاحب کے بیان کی گواہ آئین کی کتاب ہے۔ اگر عدالت چاہیے تو ان دو گواہیوں کی روشنی اور سچائی کو مد نظر رکھتے ہوئے میاں صاحب اور ڈار صاحب کو نا اہل قرار دے سکتی ہے۔

مگر ایسا معاشرہ اور ماحول کہاں سے لایا جائے جو صاف شفاف اور آلودگی سے پاک ہو۔ عوام ٹیلیویژن سکرینوں کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ شائد ٹی وی سکرین سے کوئی فرشتہ صفت انسان نکل کر معاشرتی ماحول اور سیاسی آلودگی کو اپنی کرامت سے پاک کروائے اور عدلیہ عوام کی طرف دیکھ رہی ہے کہ شائد عوام کسی بے لوث اور محب وطن شخص کا چناؤ کریں جو آئین کو عوام کی امنگوں کے مطابق ڈھال دے اور سب انسانوں کے لیے یکساں قوانین کا نفاذ کرے۔ سیاستدانوں، حکمرانوں اور مافیا لیڈروں کو پتہ ہے کہ عوام اور عدلیہ خواہشات اور کرامات کے خواب دیکھ رہی ہیں جبکہ حقیقت اور عمل کی گاڑی کا سٹیرنگ اُن کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

وہ عوام کی نفسیات سمجھ چکے ہیں اور عدلیہ پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا

اختیار رکھتے ہیں ابن خلدون کسی قوم کے زوال کی تین نشانیاں بتلاتا ہے اول ضعف اشراف دوئم سپاہ کا تشدد اور سوئم عیش پسندی پاکستانی سیاسی معاشی اور معاشرتی ماحول کا جائزہ لیں اشرافیہ تو دولیتوں، کرپٹ مافیا لوٹ کھسوٹ کرنیوالوں، سمگلروں اور قانون شکنوں پر مشتمل ہے اور یہی لوگ صاحب اقتدار ہیں۔ سپاہ کی جگہ وزرات خزانہ اور وزارت داخلہ نے لی ہے اور عوام کش پالیسیوں پر گامزن ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ابن خلدون نے تیسرا انڈیکیٹر عیش پسندی بیان کیا ہے جو ظاہر ہے کہ ایک آلودہ سیاسی ماحول اور معاشرے میں اشرافیہ اور اُس کے ماتحت اداروں اور اشخاص کا ہی حق بنتا ہے۔ حکمرانوں اور اشرافیہ کی عیاشیوں کا کسے پتہ نہیں مگر کسی کو بھی ہمت نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر اس برائی کا سامنا کرے۔

میکاولی کا قول ہے کہ حکمران ایسا ہونا چاہیے جس سے عوام محبت بھی کریں اور خوف زدہ بھی رہیں۔ وہ اپنے قول کی تفصیل میں لکھتا ہے کہ امیر کی طبیعت میں شیر اور لومڑی دونوں کی خصوصیات ہونی چاہیے۔ موقع ملے تو شیر کی طرح حملہ کرے اور لومڑی کیطرح مکر وفریب سے کام لیکر اپنا دامن بھی بچالے میاں برادران کا انتخابی نشان شیر اور زرداری صاحب کا تیر خوف کی نشانیاں ہیں۔ اینٹ سے اینٹ بجانا شیرانہ دھمکی ہے اور دبئی میں بیٹھ کر احتساب عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ لینا یقیناً چالاکی ہے۔ آیان علی کی جیت لومڑی

کی کامیاب چال ہے۔ جسے شیر کی اشیر باد حاصل ہے۔ ڈاکٹر عاصم کا مقدمہ یقینا شیر اور تیر کی فتح ثابت ہوگا۔ کراچی آپریشن بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جائیگا اور پنجاب کے شیر اور لومڑیاں عوام کے سینوں پر پنجے گاڑنے میں کامیاب ہونگے عدالتیں یونہی کام کرتی رہیں گی اور ظلم و جبر کے سیاہ بادل یوں ہی چھائے رہیں گے۔

جنرل ضیاالحق (مرحوم) نے غیر جماعتی انتخابات کروائے اور حروں کے مذہبی پیشوا جناب پیر صاحب پگاڑا کے مرید خاص جناب محمد خان جونیجو کو وزارت عظمیٰ کا قلمبندان سونپ دیا۔ جس طرح جناب ذوالفقار علی بھٹو جنرل ضیا الحق کی سادگی، متانت اور مذہبی رحجان سے دھوکہ کھا گئے بلکل ویسے ہی جناب ضیاء الحق، محمد خان جونیجو کو نہ سمجھ سکے۔ جونیجو صاحب نے وزیراعظم بنتے ہی گردن زندا استادرا کا فارمولہ آزمایا اور سب سے پہلے اپنے پیرو مرشد سے تقریباً کنارہ کشی کر لی۔ پیر صاحب نے اس گستاخانہ حرکت پر دو مختصر مگر معنی خیز بیان دیے مگر جناب جونیجو پیر کی بات نہ سمجھ پائے۔ پیر صاحب نے کہا میں بغیر وردی جرنیل اور جی ایچ کیو کا بندہ ہو۔ جونیجو صاحب نے توجہ نہ دی تو پھر فرمایا کہ مجھے بھاری بوٹو کی آواز سنائی دے رہی ہے اور بلی چوہے کا کھیل ختم ہونے والا ہے۔

جونیجو صاحب نے انتظامی اکھاڑ بچھاڑ کے علاوہ زین نوارنی اور دیگر کی ایماپر جنیوا معاہدہ کرڈالا جس نے افغانوں کی روس کے خلاف جیتی ہوئی جنگ کو نہ صرف شکست میں بدل دیا بلکہ افغانستان اور پاکستان کو مستقل بدامنی اور انتشار سے بھی دو چار کر دیا۔ روسیوں کی موجودگی میں افغانستان میں

انتخابات ہوتے اور روس ایک نئی اور منتخب حکومت کو افغانستان کے حوالے کرکے جاتے تو آج افغانستان کا منظر مختلف ہوتا۔ جنرل ضیاء الحق کے فارمولے کے مطابق یہی طے پایا تھا کہ سب سے پہلے ہر دو جانب سے سیز فائر ہوگا۔ مسلم ممالک کی امن فوج اقوام متحد کی زیر نگرانی افغانستان کے تمام صوبوں کا کنٹرول سنبھالے گی اور افغانستان کے علاوہ پاکستان، ایران اور دنیا بھر میں پھیلے افغان مہاجر اور تارکین وطن ان انتخابات میں حصہ لینگے۔ جنرل ضیاالحق کی کاوشوں کے نتیجہ میں دس سے زیادہ افغان شعیہ گروپوں نے علامہ آصف محسنی کی قیادت میں اتحاد کیا اور محسنی ربانی ہم آہنگی کے نتیجہ میں محسنی ربانی گروپ کی شکل میں ایک دس جماعتی اتحاد وجود میں آگیا۔
علامہ آصف محسنی اور علامہ خلیل حسینی ایران سے پاکستان شفٹ ہو گئے اور پشاور کے علاوہ کوئٹہ اور اسلام آباد میں بھی دفاتر قائم کر لیے ہمارے دانشور اور فنکار لینکروں اور صحافیوں کو شائد پتہ نہیں کہ شمالی افغانستان کے صوبہ بدخشان، کنٹر، قندوز، نور ستان اور وادی پنج شیر میں ابتدا سے ہی روس نے دو ڈویثرن کثیر الحرکتی فوج کے علاوہ ایک ڈویثرن کے قریب سپٹناز یعنی سپیشل حرکتی فوج جس کے پاس ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں پر مشتمل دستے کمانڈوز کے علاوہ ٹینکوں، توپوں اور بکتر بند گاڑیوں کی قلیل وقت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ شفٹ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کو تعینات کیا۔
روس نے

ان علاقوں میں خوراک کے بڑے ذخائر کے علاوہ حرکتی ہسپتال، ڈسپنسریاں اور گولہ بارود کے بڑے ذخائر بھی جمع کیے تاکہ شدید موسموں میں بھی فوج کی کارکردگی متاثر نہ ہوسکے۔ روس نے بظاہر ایک چھوٹے اور محدود علاقہ میں اتنی بڑی فوج کیوں تعینات کی؟ اسپر کبھی کسی ائیر مارشل یا ریٹائرڈ جرنیل نے بات نہیں کی۔ ہمارے ریٹائرڈ جرنیلوں، چلبلے اور چمکیلے اینکروں اور دو عدد ایئر مارشلوں کو پتہ ہوگا کہ روس کی اس ڈیپلائیمنٹ سے پہلے فرانس کی کسی گمنام یونیورسٹی سے انجینئرنگ کا طالب علم احمد شاہ مسعود پاکستان کے راستے سے افغانستان کے صوبہ نورستان میں داخل ہوا تو اس کے ہمراہ فرانسیسی، جرمن اور اطالوی صحافیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ نوجوان احمد شاہ مسعود کے گلے میں ایک گٹار تھی اور زبان پر آزادی کا کوئی نغمہ تھا۔ وہ گٹار بجاتا اور ناچتا ہوا اپنے ملک میں داخل ہوا اور فارسی زبان شیریں میں گا رہا تھا کہ میں دور کے دیسوں سے وطن کی مٹی کی پکار پر آگیا ہوں۔ اب میرے وطن پنج شیر میں کوئی خارجی باقی نہ رہے گا۔ ہم ناچیں گئے۔ گائینگے اور اپنی دھرتی پر امن اور سکون سے رہیں گے۔ احمد شاہ مسعود کی یہ ویڈیو بھی فرانسیسی ٹیلیویژن نے دکھائی اور افغانستان کی سرزمین پر ایک لمبے بالوں اور جدید جذبوں والا ہیرو دنیا سے متعارف کروایا۔

جسطرح میرپور آزاد کشمیر کے کسی دیہات میں تعینات ایک سکول ٹیچر راجہ حبیب

الرحمٰن نے جنگ آزادی سے متعلق من گھڑت خبروں اور رومانوی داستانوں کے بیان سے روزنامہ جنگ کراچی کے مردہ گھوڑے میں جان ڈالی اس طرح فرانسیسی، جرمن اور اطالوی صحافیوں نے وادی پنج شیر میں ایک دھاڑتا اور مارتا ہوا شیر اایجاد کیا جو ہر دن روسی ٹینکوں، گاڑیوں، ہیلی کاپٹروں اور فوجیوں کا شکار کرتا تھا۔ وادی پنج شیر جسکا کل رقبہ وادی سوات سے بھی کم ہے میں احمد شاہ مسعود سے منسوب ایسے ایسے کارنامے کشید کیے گئے کہ رہے نام اللہ کا، مغربی میڈیا کے بعد بھارتی میڈیا نے بھی اپنا حصہ ڈالا تو پاکستان کے خفیہ ایوانوں میں خطرے کی گھنٹی بج گئی۔

اب ذرا اتنی بڑی فوج کی ایک محدود علاقہ میں تعیناتی پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ روسی فوج کے مشن اور مقصد کی وجہ عیاں ہوسکے۔ ہمارے چھیل چھبیلے اینکروں کو شائد پتہ ہی ہوگا کہ جس دور میں روس نے ایک بڑی فوج شمالی افغانستان میں تعینات کی اس دور میں بھارت نے سیاچن گلیشئر پر قبضہ کیا اور اس کی سپیشل فورسز کے دستے دریائے نوبرا اور شیوک کے ساتھ ساتھ سکردو کے شمال مشرقی دیہاتوں تک آتے رہے اور دیہاتوں کو تشدد اور لالچ کے ذریعے ترغیب دیتے رہے کہ وہ پاک فوج کو اس بات کی اطلاع نہ کریں مگر دیہاتیوں نے حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے بھارتی دباؤ مسترد کیا اور سکردو میں سوئی ہوئی انتظامیہ کو بھارتیوں کی آمد کی اطلاع دی۔ انتظامیہ نے اس پر کوئی

حرکت نہ کی اور دوسرے سال بھارتی فوج پھر آگئی اور گرمیوں میں اس علاقہ پر قابض رہی۔ اگلے سال موسم گرما کی آمد سے پہلے ہی لوگوں نے پاک فوج کو اطلاع دی تاکہ بھارتی بھیڑیوں کی آمد سے پہلے ہی پاکستانی شیر انکا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو جائیں ۔اگلے سال جو بھارتی ان علاقوں میں پکنک منانے آئے تھے وہ خوشی سے واپس نہ گئے۔ جو بچ نکلے اُن کے کندھوں پر رائفلوں کی جگہ اُن کے دوستوں کی لاشیں تھیں اور پاکستانی مجاہد اُن کے تعاقب میں تھے۔

روسی فوج کی واخان کوریڈور اور بدخشاں میں تعیناتی اور بھارتی افواج کا سیاچین پر قبضہ اور پھر سکردو کی طرف بڑھنا روس وانڈیا مشن کا حصہ تھا جسکا مقصد دونوں جانب سے پیش قدمی کرتے ہوئے شارع ابریشم پر قبضہ کرنا اور پاکستان کو چین سے الگ کرنا تھا۔ لشکر برادری کو شائد پتہ نہیں ہوگا کہ یہ علاقہ ہمیشہ سے ہی گریٹ گیم کا میدان رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اگر کسی سیاستدان ، صحافی اور دانشور کو سیاسی چالبازیوں اور ڈالر گرل کی چالاکیوں اور چستیوں پر تبصرے سے وقت ملے تو وہ تاریخ کشمیر کے علاوہ ینگ ہاسبنڈ اور کرنل ڈیورنڈ کی مہمات پر ایک نظر ضرور ڈالیں۔

یہ علاقہ نہ تو غیر معلوم ہے اور نہ ہی نا قابل عبور ہے اسی راستے سے والی کشمیر امیر کبیر، شاہ ہمدان ، حضرت بُلبل شاہؒ اور دیگر مبلغین وادی کشمیر

میں داخل ہوئے اور کشمیر کے اندھیروں میں نور حق کی شمعیں روشن کیں۔ اسی راستے پر مہاراجہ رنبیر سنگھ کا ایلچی موتی لال مدن چلکر ماسکو پہنچا اور مہاراجہ کشمیر کا روسی بادشاہ کو پیغام پہنچایا۔ یہ راستے بنی نوح انسان کیلیے کبھی بھی اجنبی نہ تھے۔ کھش، ناگ درد اور بدھ تہذیبوں کے مبلغ اور جرنیل انہی راستوں پر چلتے رہے اور دنیا کے نقشے پر، اپنے اپنے آثار چھوڑتے گئے۔ اسی واخان میں چٹ بوئی گلیشیر کے دامن میں انگریز مہم جو کیپٹن ینگ ہاسبنڈ اور روسی مہم جو کیپٹن گروسکی آمنے سامنے ہوئے اور اپنی اپنی حدود پر جھنڈے گاڑھ کر واپس چلے گئے۔ اسی مقام سے میجر ڈیورنڈ نے ہندوستان او رافغانستان کے درمیان ایک سرحد کا تعین کیا اور پامیر سے ہلمند تک اس مقام پر جا ٹھہرا جہاں افغانستان، بلوچستان اور ایرانی صوبہ سیستان کی سرحدیں باہم ملتی ہیں۔

میاں اور مودی کا پیار۔ ینگ ہاسبنڈ اور گروسکی کا ملاپ نہیں البتہ اس ملاقات اور محبت میں کسی نہ کسی کا کوئی پیغام ضروری پنہاں ہے۔ میاں اور مودی کے کچھ سہولت کار بھی ہیں جن میں ایک کا نام جندال ہے۔ میاں، مودی اور ایک نووارد مہماں گریٹ گیم کے نئے مہرے ہیں جن کی چال ماسکو، لندن اور واشنگٹن میں بیٹھے لمبے ہاتھ چلنے والے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم نئے کھیل اور کھلاڑیوں پر ایک نظر ڈالیں، ضروری ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی علقمندانہ

عسکری اور سفارتی چال پر کچھ کہہ لیں۔ جنرل ضیاء الحق کو روسو انڈیا منصوبے کا پتہ چلا تو مرحوم جنرل کے ساتھیوں نے اس منصوبے کے توڑ کے لیے حکمت عملی تیار کی جو وقت اور حالات کے مطابق سب سے بہتر اور قابل عمل چال تھی۔ جنرل ضیاء الحق نے سکردو اور گلگت کے علاوہ اور ملحقہ آزاد کشمیر میں موجود فوجی دستوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ لائین آف کنٹرول اور سیاہ چین سیکٹر کو بھی مضبوط کیا مگر ڈیونڈ لائن پر سوائے اطلاع دینے والی چوکیوں کے علاوہ فوجی نقل و حرکت میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ اسطرح کا اقدام ڈیورنڈ لائین خاصکر واخان اور رپامیر کے علاقوں میں رسیوں کے لیے ایسا جواز مہیا کرتا جس کی وجہ سے غیر ضروری ٹکراؤ یا کوئی بڑا حادثہ ہو سکتا تھا۔ جنرل ضیا الحق نے چین کو بھی اعتماد میں لیا تاکہ بوقت اشد ضرورت چین سے بھی مدد حاصل کی جا سکے۔

فوجی حکمت عملی کی ترتیب کے بعد جنرل ضیاء الحق نے احمد شاہ مسعود سے بھی تعلق بڑھایا اور اسکے بھائی احمد داؤد جو کہ اُستاد ربانی کا داماد تھا کے لیے بہت سی مراعات کا فیصلہ کیا گو کہ مغربی اور بھارتی میڈیا احمد شاہ مسعود کی بہادری کے قصے بیان کرتا نہیں تھکتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ شمالی علاقوں میں روسیوں نے احمد شاہ مسعود سے نہ کوئی بڑی جنگ لڑی اور نہ ہی اُسے تنگ کیا۔ روسیوں کی موجودگی میں یورپی اور روسی سمگلر واخان اور

پنج شیر کے علاقوں سے معدنیات نکالتے رہے اور احمد شاہ مسعود کو اسکا حصہ بھی ملتا رہا۔ احمد شاہ مسعود کی آمد سے جو مجاہدین ان علاقوں میں کارروائیاں کرتے تھے۔ وہ بھی نکال دیے گئے چونکہ احمد شاہ مسعود اور گلبدین حکمتیار کے مابین چپقلش کی وجہ سے دیگر مجاہدین کے لیے آسان نہ تھا کہ وہ احمد شاہ اور روسیوں سے ایک ہی وقت میں ٹکرا سکیں۔ وادی پنج شیر اور بدخشاں کے علاقوں میں جو تباہ شدہ ٹینک، توپیں اور گاڑیاں ٹیلی ویژن پروگراموں میں دکھلائی جاتی ہیں وہ دراصل احمد شاہ کی آمد سے قبل اور شمالی اتحاد اور افغان گروپوں کے مابین ہونی والی جنگوں کا نتیجہ ہیں۔

سیاہ چین اور کارگل سیکٹر میں بھارتی منصوبے کی ناکامی اور پاکستان کی دفاعی حکمت عملی کے نتیجے میں رسوا انڈیا منصوبے کے عیاں ہوتے ہی روسیوں نے واخان، پنج شیر اور بدخشاں کے دیگر علاقے بشمول قندوز کے خالی کر دیے۔ روسی جاتے وقت سوائے ہیلی کاپٹروں اور ہوائی جہازوں کے اسلحہ، ایمونیشن، ٹینک اور توپیں مقامی تاجک کمانڈوں کے حوالے کر گئے جو کے روسیوں کی مستقبل کی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کا ایک پہلو تھا۔ روسیوں نے جانے سے پہلے بھارتی مشیروں کو تاجروں، چرواہوں اور مجاہدوں کے روپ میں اس علاقے میں تعینات کیا اور یوں جاتے جاتے شمالی اتحاد اور بھارت کا تعلق جوڑ گے۔

پنج شیر کی طرح اسی علاقے میں ایک نیم خود مختار ریاست بھی تھی جسکا حکمران سید کیان تھا۔ نورستان کے اس علاقہ میں ہنزہ کی طرح ایک ریاست ہے جس کی آبادی کا نوے فیصد اسماعیلی فرقے کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ تعلیم یافتہ، پرامن اور جدید طرز زندگی کے حامل ہیں۔ جنکا تعلق ساری دنیا سمیت چترال، گلگت اور ہنزہ کے اسماعیلیوں سے ہے۔ اسماعیلی فرقہ باشعور بااخلاق ہونے کے علاوہ ایک رجسٹرڈ کیمیونٹی ہے جس میں کوئی دوسرا داخل نہیں ہو سکتا۔ تیرہ سالہ روسو افغان جنگ کے دوران سید کیان کا علاقہ بھی بلکل محفوظ رہا اور اس علاقہ میں کاروبار زندگی پرامن طریقے سے چلتا رہا۔ روسیوں نے جانے سے پہلے اس علاقہ کے اسماعیلی پیشوا جو کہ جناب آغا خان کا متعین کردہ یا پھر پشیتنی امام ہوتا ہے کو تحفے میں بہت سے ٹینک اور دیگر جنگی ساز وسامان بھی دے گئے اسی دور میں ٹائم میگزین میں سید کیان کی ایک تصویر چھپی جس میں وہ فل ہیڈ گیر پہنے ٹینک پر سوار ہیں۔ روسیوں کی اس چال کے باوجود اسماعیلی علاقے آج تک پرامن ہیں اور کسی وار لارڈ یا پھر طالبان نے بھی انہیں تنگ نہیں کیا۔

جنرل ضیاالحق نے سید کیان اور احمد شاہ مسعود سے بیک وقت اور بروقت رابطہ کیا اور جناب آغاخان کو روسی انخلاء اور افغانستان میں انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت کا یو این او کی طرف سے چیف کوارڈینیٹر اور

آپریشن سلام کا چیف ہیڈ مقرر کرا دیا۔ احمد شاہ مسعود نے جنرل ضیاء الحق کی زندگی میں ہی پاکستان آنے اور پاکستانی قیادت سے ملنے کی ہامی بھر لی تھی مگر احمد شاہ کا دورہ جنرل ضیاء الحق کی رحلت کے بعد ہوا۔ روس کے پنج شیر سے انخلاء کے بعد نجیب اللہ حکومت نے بھی احمد شاہ مسعود پر کوئی حملہ نہ کیا چونکہ نجیب حکومت کا افغان آرمی چیف جنرل آصف دلاور اور چیف آف جنرل سٹاف جنرل گل آقا احمد شاہ مسعود کے قریبی دوست تھے۔ جنرل ضیاالحق کی وفات کے بعد احمد شاہ مسعود نے پاکستان کا طویل دورہ کیا اور ضیاء فارمولے کی نہ صرف حمایت کی بلکہ مستقبل کی افغان حکومت میں اہم رول ادا کرنے کا عزم بھی دہرایا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ضیاالحق فارمولے کے تحت طے پایا کہ دس جماعتی اتحاد میں شامل تمام سیاسی اور عسکری جماعتیں عام انتخابات میں حصہ لینگی اور یہ انتخابات روسیوں کی موجودگی میں اقوام متحدہ کی نگرانی میں ہونگے۔ انتخابات کے نتیجے میں جو پارٹی یا اتحاد الیکشن میں کامیاب ہوا اُسے حکومت سازی کا اختیار دیا جائے گا۔ افغان جمہوری حکومت کے قیام پر روسی افواج ملک بھر میں بچھائی گئی بارودی سرنگیں صاف کرینگی اور ملک کا انتظام منتخب جمہوری حکومت کے حوالے کریں گی اسلام آباد میں قائم آپریشن سلام (سلامتی) کا ہیڈ کواٹر جس کے سربراہ جناب پرنس کریم آغا خان تھے افغان

نمائندوں کی مدد سے کام کریگا اور سارے افغانستان میں سڑکوں، سکولوں، ہسپتالوں اور گھروں کی تعمیر کریگا۔ مگر یہ ہو نہ سکا۔

جناب محمد خان جونیجو نے جنرل ضیاء الحق کے امن پروگرام کو لفٹ نہ کرائی اور آل پاکستان پولیٹیکل پارٹیز کانفرنس بلا کا جنیوا معاہدے کی راہ ہموار کی۔ اس معائدے کی وجہ سے جنگ بندی نہ ہو سکی اور روسی افواج افغانوں سے لڑتی ہوئی دریائے آموں کے پار چلی گئی جاتے ہوئے جگہ جگہ اسلحہ کے انبار چھوڑ گئی اور سارے ملک میں بارودی سرنگوں کا جال پھیلا گئی۔ روسیوں کے جاتے ہی دو سو وار لارڈ اور چھ سو کے قریب فیلڈ کمانڈ میدان میں آگئے اور ہر ایک کو کئی کئی سو ٹن ہتھیار اور ایمونیشن اپنے اپنے علاقے میں دستیاب ہو گیا۔

تاریخ اور حقیقت کے تناظر میں دیکھا جائے تو پاکستان اور افغانستان کا امن تباہ کرنے میں جتنے افغانی قائدین قصوروار ہیں اتنے ہی پاکستانی سیاستدان بھی ہیں۔ اگر محمد خان جونیجو جینوا معاہدے کا ڈھونگ نہ رچاتے تو افغانستان اور پاکستان کی یہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔ جنرل ضیاء الحق کی آمریت کا ڈھول پیٹنے والے کبھی اپنی کوتاہیوں پر بھی نظر ڈالیں تو انہیں پس دیوار بہت کچھ نظر آئیگا جس کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔

دیکھنا ہے کہ جنرل ضیاالحق کے بعد دونوں جانب کی سیاسی اور مذہبی قیادت نے کس حدتک اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور حالات کا رخ بدلنے میں کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ شائد دنیا کبھی ایسا وقت بھی دیکھے گی کہ افغانستان اور پاکستان کے قائدین اس سوچ پر متفق ہونگے کہ دونوں ملک اگرچہ الگ اور آزادنہ حیثیت رکھتے ہیں مگر تعلق ایک ہی جسم جیسا ہے جس کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک ہی روح کار فرما ہے۔ جیسا کہ بیان کیا ہے کہ جنرل ضیاالحق میں حالات کا رخ بدلنے کی صلاحیت تھی مگر اُس کے بعد سبھی حالات بھگاڑنے والے آئے اور اب حالات اپنے بھگاڑ کے عروج پر ہیں۔ دہشتگردی ایک ایسے اژدھا کا نام ہے جس کے کئی خونخوار منہ ہیں ۔ ہتھیار بند اور بارود بردار دہشت گردوں کی معاونت اور سہولت کے مراکز ہر ملک، ہر شہر اور ہر بستی میں موجود ہیں۔ بم دھماکے، اغوابرائے تاوان ، ٹارگٹ کلنگ ، بھتہ وصولی کرپشن ، لینڈ مافیا، کمیشن مافیا، شوگر مافیا، پولیس مافیا، سیاسی مافیا، مذہبی فافیا، صافی مافیا، ثقافتی مافیا اور برادری مافیا سمیت سینکڑوں مافیا جات ایک ان دیکھی حکومت اور قوت ، بن چکے ہیں جن کے یکساں مفادات ، مقاصد اور احداف ہیں ۔ وہ ملک اور اقوام جن کی سوچ ، قوت ، دولت اور سرپرستی میں دہشت گردی کا اژدھا پل کر جوان ہوا آج ان کے پاس بھی کوئی ایسا فارمولہ نہیں جو اس جن کو قابو کرسکے یا پھر ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کردے ۔

کیپٹلیزم کیمونزم کی جنگ کا آخری اور فیصلہ کن معرکہ افغانستان کی سرزمیں پر لڑا گیا جس کے نتیجے میں نہ صرف کیمونزم کو شکست ہوئی بلکہ سویٹ یونین اور وار سا پیکٹ بھی ختم ہوگیا۔ سنٹرل ایشیائی ریاستوں اور پولینڈ سمیت سارا مشرقی یورپ روسی اثر سے آزاد ہوگیا اور دیوار برلن کے انہدام نے مشرقی اور مغربی جرمنی کو پھر ایک جرمن قوم اور ملک میں تبدیل کردیا۔

دیکھا جائے تو کولڈ وار دوسری گریٹ گیم کا ایندھن افغانی اور دنیا بھر کے مسلمان مجاہدین اور جہاد کی آڑ میں بنے مگر فوائد اہل یورپ نے حاصل کیے۔ کولڈ وار گریٹ گیم کی جگہ اسلامو فوبیا اور دہشت گردی کی اصلاحات سامنے آئیں تو مغربی میڈیا کی ہمنوائی میں پاکستانی میڈیا اور میڈیا سے متعلق صحافیوں، دانشوروں اور سیاستدانوں نے بھی پاکستان، اسلام اور افواج پاکستان پر حملہ آور ہونے کا کوئی موقع ضائع نہ کیا۔ وہ سیاستدان اور صحافی جو فوجی حکومتوں کے تنخواہ دار ملازم تھے وہ بھی جمہوریت اور آزاد صحافت کا چوغہ پہن کر عالمی امن، مغربی جمہوریت، انسانی حقوق اور عوامی راج کا گیت آلاپنے لگے اس دو عملی اور دوغلے پن کی وجہ نہ جمہوریت سے محبت، عوام سے اُنس، امن کی چاہت اور انسانی حقوق کی پاسداری تھا اور نہ ہی وطن سے محبت اور ملکی مفاد تھا۔ ان لوگوں کا ایجنڈ ذاتی اور مفاداتی تھا اور آج بھی ہے۔

میاں برادران اور جنرل ضیاء الحق کی قربت سے کون واقف نہیں۔ میاں خاندان کی سیاست اور کاروباری عظمت کا سہرا جنرل ضیاء الحق کے سر سجتا ہے۔ ضیاء الحق کی ہی مہربانیوں سے یہ خاندان سیاست میں آیا اور پھر کھوئی ہوئی کاروباری اہمیت کو بام عروج تک لے گیا۔ میاں خاندان کے پہلے دو ادوار اور جاری حکومتی کاروبار نہ تو عوام کو کچھ دے سکا اور نہ ہی ملکی معیشت میں کوئی واضح تبدیلی آئی تھک تھگڑی اور شعبدہ بازانہ ترقی نے ملک کو ہمیشہ کنگال ہونے کے قریب کیا اور جمہوریت کے نام پر ملکی خزانہ لوٹنے والے ہر بار مزید خوشحال ہوئے۔ موٹروے، پیلی ٹیکس، قرض اتارو ملک سنوارو اسکیموں کے بعد سستی روٹی، لیپ ٹاپ، دانش سکولوں اور اب کسان پیکج ہیلتھ سکیم، نندی پور بجلی منصوبہ، اُرینج ٹرین اور میٹرو بس نے میاں صاحبان، خواجہ برادران، مشیران اور وزیران کو تو کروڑ سے ارب پتی اور ارب سے کھرب پتی بناء دیا مگر عوام کو ذلت و پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے۔

میاں صاحبان نے وہاں سے شروع کیا ہے جہاں زرداری صاحب چھوڑ کر گئے تھے۔ یعنی جو بچا تھا وہ اُٹھاتے چلے آئے اور تقریباً ڈھائی سال سے میگا پراجیکٹ کے نام پر اُٹھا رہے ہیں مگر کوئی پوچھنے والا نہیں۔ دونوں بڑی پارٹیوں کا

میثاق جمہوریت پر متفق ہونا درحقیقت جمہوری ڈکٹیٹر شپ پر متفق ہونے کے مترادف ہے۔ دونوں بڑی جماعتوں نے آئین میں ترمیم کے ذریعے ایک ایسا آئینی ماحول بھی پیدا کر دیا ہے۔ جس کی قوت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ سیاسی جماعتوں کے قائدین ہیں۔ میونسپل کمیٹی کے ممبر سے لیکر نیشنل اسمبلی کے ممبر، سینٹر، وزیراعظم، صدر اور اعلیٰ عدلیہ کے جج تک کی تعیناتی ہی نہیں بلکہ احتساب بیورو کے چیئرمین، صوبائی و مرکزی الیکشن کمشنر، مسلح افواج کے سربراہان اور سینٹ کے چیئرمین تک کی تعیناتی ان کی مرضی اور منشاء سے ہی ہوتی ہے۔ جوڈیشل کمیشن ججوں کی تعیناتی کرتا ہے اور حکمران جماعت کے ہم خیال لوگ چاہیے وہ گھر کے افراد ہی کیوں نہ ہوں مسلح افواج کے سربراہان مقرر کرتے ہیں۔ جنرل مشرف بڑے میاں صاحب کے پسندیدہ جرنیل تھے اور جنرل کیانی زرداری صاحب کے منظور نظر تھے۔ جنرل کاکڑ کو سیاستدان دوراہے پر لے آئے تو خاندانی عزت اور راوایات نے جنرل وحید کاکڑ کو حوصلہ دیا وہ باعزت ریٹائر ہو کر گھر چلے گئے۔ ایوب خان جنرل اسکندر مرزا کی پسندیدہ شخصیت تھے اور جنرل ضیاء الحق بھٹو صاحب کی برادری کے انتہائی عاجز اور منکسر المزاج شخصیت تھے۔

ہمارے سیاستدان روز اول سے ہی یہ بھول جاتے ہیں کہ کاشتکاری کے لیے بیل اور ٹریکٹر استعمال ہوتے ہیں نہ کہ ہاتھی اور ٹینک؟ ہاتھیوں اور ٹینکوں سے فصل

نہیں اگتی بلکہ زمین ہی برباد ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بھی بھول رہے ہیں کہ جن بڑے منصوبوں پر وہ پیسہ پانی کی طرح بہار ہے ہیں وہ صرف چند لاکھ لوگوں کی سہولت کے لیے اور چند سالوں کے لیے ہیں جس طرح حکمران ملک کنگال کر رہے ہیں اگر یہ روش برقرار رہی تو اگلی تین دیہائیوں میں اس ملک کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔

ہمارے حکمران خاندان یورپ، امریکہ، بھارت اور ملایشا میں اپنے محلوں اور جاگیروں میں عیش کرینگے اور بڑی شاہراؤں پر غیر ملکی تجارتی کمپنیاں اپنی اجارہ داری قائم کر لینگیں۔ ریلوے کا نظام بھارت کے ہاتھ ہوگا اور زیادہ تر ٹرینیں کراچی سے چمن اور واہگہ سے کابل اور مزار شریف تک چلینگی۔ پی آئی اے پر کسی میاں منشا یا کسی ڈار یا خواجہ صاحب کی اجارہ داری ہوگی اور سٹیل مل اگر حکومت سندھ نے واقع ہی خرید لی تو وہ زرداری صاحب کی ذاتی مل ہو گی۔ پاکستانی مرد وزن منشاء میاں، متل، زرداری جندال اور کچھ غیر ملکی کمپنیوں کی ملازمت کرینگے اور جو کچھ کمائینگے ہر شام اُسکا سودا سلف لیکر اپنا اور بچوں کا پیٹ پالینگے۔ عوام اپنے ہی ملک میں اجنبی اور غیر ملکی کمپنیوں کے غلام ہونگے۔

جس ملک میں مافیا حکمران ہو، اپوزیشن کا نام و نشان نہ ہو اور آئین ایک خاص

طبقے کے تحفظ کا آئینہ دار ہو تو اُسے جمہوریت نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ عرض کیا ہے کہ قائداعظمؒ کی رحلت کے بعد جمہوریت اور آمریت کے کھیل میں نہ کبھی کھلاڑی بدلے اور نہ ہی ریفری اور جیوری۔ البتہ کھیل کے قانون بدلتے رہے۔ خود غرضی اور عوام دشمنی کے اس کھیل میں جیت صرف کھلاڑیوں کی ہوئی اور ہار عوام کی ہوئی چند روز پہلے ایک محفل میں ایک جیالہ فوج کو گالیاں دے رہا تھا بعد میں پتا چلا کہ اس کا ایک بھائی فوج میں کرنل ہے۔ دو سال پہلے ایک صاحب اسی طرح فوج پر برس رہے تھے جنکا بڑا بھائی فوج میں لیفٹیننٹ جنرل ہے۔ بی بی سی کو اسلام آباد سے با خبر رکھنے والے مظہر عباس بھی تو جنرل اطہر عباس کے بھائی ہیں۔ ایک کامران کیانی بھی ہیں جو سب کے بھائی ہیں۔

باغ آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے جناب امیر اکبر خان عباسی عالم دین اور درویش صفت شخصیت تھے۔ عباسی صاحب نے 1947ء کے جہاد کشمیر کا مشاہدہ کیا اور جن جن لوگوں نے اس جہاد سے مفادات حاصل کیے وہ اُن سے سخت نالاں تھے۔ آزاد حکومت قائم ہوئی تو مفاداتی ٹولے کی چاندی ہو گئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ میرپور کے کسی گاؤں کے سکول میں راجہ حبیب الرحمٰن نامی ایک ماسٹر تھے جنہیں کہانی نویسی کا فن آتا تھا۔ راجہ حبیب نے راولاکوٹ، باغ، پلندری اور مظفرآباد سے ایسے ہیرو تلاشے کہ جن سے گاؤں والے بھی واقف نہ تھے۔ سردار

عبدالقیوم خان، سردار ابراہیم خان، کیپٹن نتھا خان، سردار غفار خان کو راجہ صاحب نے نپولین، منٹگمری، آئیزن ہارو، چرچل، سن ٹوژو، رومیل اور مارشل ٹیٹو کے سامنے لا کھڑا کیا۔ بہادری، جرات اور بیباکی کے من گھڑت قصے اور رپورٹیں راجہ حبیب الرحمٰن ہر روز لکھتے اور کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ جنگ کو بھجواتے۔ان قصوں اور معرکوں کو عوام نے اس قدر جنون سے پڑھا کہ روزنامہ جنگ کا جنگ نامہ کراچی سے راولپنڈی اور پھر ساری دنیا میں پھیل گیا۔

جہاد آزادی کشمیر پونچھ شہر اور سرینگر پر قبضے کی صورت میں اپنے مقصد کے حصول پر ختم ہونا تھا مگر دونوں محاذوں پر مجاہدین کمانڈروں نے مفادات کو اولیت دی اور جہاد کو فساد اور پھر شکست میں بدل دیا۔ پونچھ کا محاصرہ کرنے والے پانچ بریگیڈ کئی ماہ تک اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ بھارتی آکر اُن سے پونچھ کا چارج سنبھالیں۔ بارہ مولہ میں بیٹھے پٹھان قبائلی جتھے اوڑی سے لوٹے گئے تین لاکھ روپے حاصل کرنے کی خاطر مقامی مجاہدین سے لڑ پڑے اور بھارتی فوج کو سرینگر میں داخل ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔

اس سیاسی اور عسکری تماشے کے بعد درویش صفت امیر اکبر عباسی نے کپڑے الٹے پہننے شروع کر دیے۔ وہ جہاں جاتے ایک ہی فقرہ دھراتے ” نوکری ہندوستان کی

تنخواہ پاکستان کی'' لوگ پوچھتے کہ اُلٹے کپڑے کیوں پہنتے ہو تو عباسی صاحب کہتے کہ جب نظام ہی اُلٹا چل رہا ہے تو الٹے کپڑے پہننے میں کیا حرج ہے۔

ذرا دیکھئے اور سوچئے کہ ہم جس معاشرے اور ماحول میں جی رہے ہیں اس میں کونسی بات سیدھی ہے۔ میڈیا عوام کو حقائق بتلانے کے بجائے من گھڑت قصے سنا رہا ہے۔ دانشور اپنے آقاؤں کی خدمت میں لگے ہیں، عدالتیں انصاف سے عاری ہیں۔ آئین مفاد پرست سیاسی ٹولے کا محافظ ہے۔ وزرات خزانہ غریبوں کی جیبوں سے لیکر بینکوں میں جمع پونجی لوٹنے میں لگی ہے۔ پولیس خوف اور دہشت کا نشان ہے، دہشت گردوں کو بھارت اور معاشی دہشت گرد پال پوس رہے ہیں۔ میاں صاحبان جمہوری بادشاہ ہیں بھارت اور معاشی دہشت گرد وطن عزیز پر حملہ آور ہیں اور حکومت وقت کے دونوں ، سے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ مشتاق مہناس اور مودی سرکار میاں صاحب کے عصاب پر سوار ہیں اور ملک کا نظام اُلٹا چل رہا ہے۔ مشتاق مہناس میڈیا اور مافیا کی مدد سے آزاد کشمیر کا وزیر اعظم بننا چاہتا ہے۔ اور مودی واہگہ سے کابل اپنی موٹر کار پر جانا چاہتا ہے۔ میاں صاحب کہہ چکے ہیں کہ پاکستانی عوام نے انہیں مودی سے دوستانہ تعلقات کا مینڈیٹ دیا ہے اور جاوید چوہدری نے لکھا کہ مشتاق مہناس کو میاں صاحب نے آزاد کشمیر کا وزیر اعظم بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ

اس کے پیچھے چھپا کیا راز ہے۔ کیا یہ لینڈ مافیا اور مودی کا اسرار ہے یا کشمیر پر کسی کا روبار کا معاملہ ہے۔ مودی اور مشتاق مہناس سے میاں صاحبان کی محبت، کشمیر پر سودے بازی، آئینی ترمیم کے بعد آئین سے عوام کی دوری، جمہوریت کی آڑ میں آمریت، میثاق جمہوریت اور این آر او سب اُلٹے چکر ہیں۔ جناب میر اکبر عباسی کے فقرے پر غور کریں۔ نوکری ہندوستان کی اور تنخواہ پاکستان کی، یعنی خدمت اغیار کی اور تنخواہ، مراعات، عیاشیاں اور مستیاں پاکستانی عوام سے لوٹی ہوئی دولت اور قومی خزانے پر ڈاکہ ڈالنے کی۔ سوچیں اور غور کریں کہ ہمارے بے صلاحیت لیڈر ہمیں ہانک کر کہا لے جارہے۔ ان میں تو ضیا الحق اور پرویز مشرف جیسی صلاحتیں بھی نہیں۔ اگر حالت یہی رہی تو وہ دن دور نہیں جب نوبت اُلٹے کپڑے پہننے تک آ جائے گی۔ بیان کردہ حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو آج جنرل راحیل شریف اور اُن کے محب وطن ساتھیوں کو جنرل ضیا الحق سے زیادہ مسائل کا سامنا ہے۔ اٹھارویں ترمیم کے ذریعے ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت سیاستدانوں نے ملک لوٹنے اور کسی بھی مزاحمت کی صورت ملک توڑنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ ملکی اداروں بشمول عدلیہ کو کسی نہ کسی شکل میں اپنے دائرہ اختیار میں کر لیا ہے اور احتساب کو مذاق میں بدل دیا ہے۔ ساری سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فوج آئی ایس آئی اور فوج کی معاونت کرونیوالے اداروں کو بھی زیر نگیں کیا جائے تاکہ بچا کچھا پاکستان بھی لوٹ کر بیرون ملک منتقل کیا جائے۔ حالیہ آل پارٹیز

کانفرنس کے ذریعے عوام اور فوج کو پیغام دیا گیا کہ ذاتی مفاداتی سیاسی ٹولہ اندر سے ایک ہے اور کسی بھی صورت عوام کو خوشحال اور ملک کو محفوظ نہیں دیکھنا چاہتے۔ آل پارٹیز کانفرنس مرحوم جونیجو کی آل پارٹیز کانفرنس کا چربہ ہے جسکا مقصد اقتصادی راہداری کا راستہ روکنا، بھارت کو افغانستان میں مراعات دینا اور ملک کو کنگال کرنا ہے۔

جسطرح جونیجو مرحوم کی آل پارٹیز کانفرنس نے جنیوا معاہدے کی راہ ہموار کی تھی۔ اس طرح حالیہ آل پارٹیر کانفرنس اور آنیوالی کانفرنسیں، احتجاج، رخنے، ہڑتالیں، اسمبلیوں کے ہنگامہ خیز اجلاس، ٹیلی ویژن شوز اور اینکروں کی چالبازیاں اور تبصرے آخر کار پاکستان اور چین کے تعلقات بگاڑنے کا موجب بنیگے اور بھارت بھرپور فائدہ اُٹھائے گا۔ مودی میاں محبتیں اور مشتاق مہناس کا آزاد کشمیر کی سیاست میں رول گرینڈ سازش کا حصہ ہے جسکی نشاندہی سلیم صافی نے اپنے انگریزی کالم میں کی ہے۔ سلیم صافی کے مطابق میاں صاحب نے فوج اور سیاسی جماعتوں کو باہم لڑانے اور خاموش تماشائی بننے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ کرپشن، بدامنی، دہشت گردی کا دور چلتا رہے اور میاں صاحب اپنے ایجنڈے پر گامزن رہیں۔

میاں ، مودی اور گریٹ گیم

جنرل ضیا الحق (مرحوم) نے غیر جماعتی انتخابات کروائے اور حروں کے مذہبی پیشوا جناب پیر صاحب پگاڑا کے مرید خاص جناب محمد خان جونیجو کو وزارت عظمیٰ کا قلمبندان سونپ دیا۔ جس طرح جناب ذوالفقار علی بھٹو جنرل ضیا الحق کی سادگی، متانت اور مذہبی رجحان سے دھوکہ کھا گئے بلکل ویسے ہی جناب ضیاء الحق، محمد خان جونیجو کو نہ سمجھ سکے۔ جونیجو صاحب نے وزیر اعظم بنتے ہی گردن زندا استادرا کا فارمولہ آزمایا اور سب سے پہلے اپنے پیرو مرشد سے تقریباً کنارہ کشی کر لی۔ پیر صاحب نے اس گستاخانہ حرکت پر دو مختصر مگر معنی خیز بیان دیے مگر جناب جونیجو پیر کی بات نہ سمجھ پائے۔ پیر صاحب نے کہا میں بغیر وردی جرنیل اور جی ایچ کیو کا بندہ ہوں۔ جونیجو صاحب نے توجہ نہ دی تو پھر فرمایا کہ مجھے بھاری بوٹو ں کی آواز سنائی دے رہی ہے اور بلی چوہے کا کھیل ختم ہونے والا ہے۔

جونیجو صاحب نے انتظامی اکھاڑ پچھاڑ کے علاوہ زین نورانی اور دیگر کی ایما پر جنیوا معاہدہ کر ڈالا جس نے افغانوں کی روس کے خلاف جیتی ہوئی جنگ کو نہ صرف شکست میں بدل دیا بلکہ افغانستان اور پاکستان کو مستقل بدامنی اور انتشار سے بھی دو چار کر دیا۔ روسیوں کی موجودگی میں افغانستان میں

انتخابات ہوتے اور روس ایک نئی اور منتخب حکومت کو افغانستان کے حوالے کر کے جاتے تو آج افغانستان کا منظر مختلف ہوتا۔ جنرل ضیاء الحق کے فارمولے کے مطابق یہی طے پایا تھا کہ سب سے پہلے ہر دو جانب سے سیز فائر ہوگا۔ مسلم ممالک کی امن فوج اقوام متحد کی زیر نگرانی افغانستان کے تمام صوبوں کا کنٹرول سنبھالے گی اور افغانستان کے علاوہ پاکستان ، ایران اور دنیا بھر میں پھیلے افغان مہاجر اور تارکین وطن ان انتخابات میں حصہ لینگے۔ جنرل ضیاالحق کی کاوشوں کے نتیجہ میں دس سے زیادہ افغان شعیہ گروپوں نے علامہ آصف محسنی کی قیادت میں اتحاد کیا اور محسنی ربانی ہم آہنگی کے نتیجہ میں محسنی ربانی گروپ کی شکل میں ایک دس جماعتی اتحاد وجود میں آگیا۔

روسی فوج کی واخان کوریڈور اور بدخشاں میں تعیناتی اور بھارتی افواج کا سیاچین پر قبضہ اور پھر سکردو کی طرف بڑھنا روس وانڈیا مشن کا حصہ تھا جسکا مقصد دونوں جانب سے پیش قدمی کرتے ہوئے شارع ابریشم پر قبضہ کرنا اور پاکستان کو چین سے الگ کرنا تھا۔ یہ علاقہ ہمیشہ سے ہی گریٹ گیم کا میدان رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اگر کسی سیاستدان ، صحافی اور دانشور کو سیاسی چالبازیوں اور ڈالر گرل کی چالاکیوں اور چستیوں پر تبصرے سے وقت ملے تو وہ تاریخ کشمیر کے علاوہ ینگ ہاسبنڈ اور کرنل ڈیورنڈ کی مہمات پر ایک نظر ضرور ڈالیں۔

میاں اور مودی کا پیار۔ ینگ ہاسبنڈ اور گرو کی کا ملاپ نہیں البتہ اس ملاقات اور محبت میں کسی نہ کسی کا کوئی پیغام ضروری پنہاں ہے۔ میاں اور مودی کے کچھ سہولت کار بھی ہیں جن میں ایک کا نام جندال ہے۔ میاں، مودی اور ایک نووارد مہاس گریٹ گیم کے نئے مہرے ہیں جن کی چال ماسکو، لندن اور واشنگٹن میں بیٹھے لمبے ہاتھ چلنے والے ہیں۔

تاریخ اور حقیقت کے تناظر میں دیکھا جائے تو پاکستان اور افغانستان کا امن تباہ کرنے میں جتنے افغانی قائدین قصوروار ہیں اتنے ہی پاکستانی سیاستدان بھی ہیں۔ اگر محمد خان جونیجو جینوا معاہدے کا ڈھونگ نہ رچاتے تو افغانستان اور پاکستان کی یہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔ جنرل ضیاء الحق کی آمریت کا ڈھول پیٹنے والے کبھی اپنی کوتاہیوں پر بھی نظر ڈالیں تو انہیں پس دیوار بہت کچھ نظر آئیگا جس کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔

دیکھنا ہے کہ جنرل ضیا الحق کے بعد دونوں جانب کی سیاسی اور مذہبی قیادت نے کس حدتک اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور حالات کا رخ بدلنے میں کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ شائد دنیا کبھی ایسا وقت بھی دیکھے گی کہ افغانستان اور پاکستان کے قائدین اس سوچ پر متفق ہونگے کہ دونوں ملک اگرچہ

الگ اور آزادنہ حیثیت رکھتے ہیں مگر تعلق ایک ہی جسم جیسا ہے جس کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک ہی روح کارفرما ہے۔

دہشتگردی ایک ایسے اژدھا کا نام ہے جس کے کئی خونخار منہ ہیں۔ ہتھیار بند اور بارود بردار دہشت گردوں کی معاونت اور سہولت کے مراکز ہر ملک، ہر شہر اور ہر بستی میں موجود ہیں۔ بم دھماکے، اغوا برائے تاوان، ٹارگٹ کلنگ، بھتہ وصولی، کرپشن، لینڈ مافیا، کمیشن مافیا، شوگر مافیا، پولیس مافیا، سیاسی مافیا، مذہبی مافیا، صحافی مافیا، ثقافتی مافیا اور برادری مافیا سمیت سینکڑوں مافیا جات ایک ان دیکھی حکومت اور قوت بن چکے ہیں جن کے یکساں مفادات، مقاصد اور احداف ہیں۔ وہ ملک اور اقوام جن کی سوچ، قوت دولت اور سرپرستی میں دہشت گردی کا اژدھا پل کر جوان ہوا آج ان کے پاس بھی، کوئی ایسا فارمولہ نہیں جو اس جن کو قابو کر سکے یا پھر ہمیشہ لیکے نیست و نابود کر دے۔ دیکھا جائے تو کولڈ وار دوسری گریٹ گیم کا ایندھن افغانی اور دنیا بھر کے مسلمان مجاہدین اور جہاد کی آڑ میں بنے مگر فوائد اہل یورپ نے حاصل کیے۔ کولڈ وار گریٹ گیم کی جگہ اسلاموفوبیا اور دہشت گردی کی اصلاحات سامنے آئیں تو مغربی میڈیا کی ہمنوائی میں پاکستانی میڈیا اور میڈیا سے متعلق

صحافیوں ، دانشوروں اور سیاستدانوں نے بھی پاکستان ، اسلام اور افواج پاکستان پر حملہ آور ہونے کا کوئی موقع ضائع نہ کیا۔ وہ سیاستدان اور صحافی جو فوجی حکومتوں کے تنخواہ دار ملازم تھے وہ بھی جمہوریت اور آزاد صحافت کا چوغہ پہن کر عالمی امن ، مغربی جمہوریت ، انسانی حقوق اور عوامی راج کا گیت آلا پنے لگے اس دو عملی اور دوغلے پن کی وجہ نہ جمہوریت سے محبت ، عوام سے اُنس ، امن کی چاہت اور انسانی حقوق کی پاسداری تھا اور نہ ہی وطن سے محبت اور ملکی مفاد تھا۔ ان لوگوں کا ایجنڈ ذاتی اور مفاداتی تھا اور آج بھی ہے۔

میاں برادران اور جنرل ضیاء الحق کی قربت سے کون واقف نہیں ؟ میاں خاندان کی سیاست اور کاروباری عظمت کا سہرا جنرل ضیاء الحق کے سر سجتا ہے۔ ضیاء الحق کی ہی مہربانیوں سے یہ خاندان سیاست میں آیا اور پھر کھوئی ہوئی کاروباری اہمیت کو بام عروج تک لے گیا۔ میاں خاندان کے پہلے دو ادوار اور جاری حکومتی کاروبار نہ تو عوام کو کچھ دے سکا اور نہ ہی ملکی معیشت میں کوئی واضح تبدیلی آئی تھک تھگڑی اور شعبدہ بازانہ ترقی نے ملک کو ہمیشہ کنگال ہونے کے قریب کیا اور جمہوریت کے نام پر ملکی خزانہ لوٹنے والے ہر بار مزید خوشحال ہوئے۔ موٹروے ، پیلی ٹیکسی، قرض اتارو ملک سنوارو اسکیموں کے بعد سستی روٹی ، لیپ ٹاپ ، دانش سکولوں اور اب کسان پیکج، ہیلتھ ، سکیم

نندی پور بجلی منصوبہ ،اُورینج ٹرین اور میٹرو بس نے میاں صاحبان ، خواجہ برادران ، مشیران اور وزیران کو تو کروڑ سے ارب پتی اور ارب سے کھرب پتی بنا دیا مگر عوام کو ذلت و پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے۔

میاں صاحبان نے وہاں سے شروع کیا ہے جہاں زرداری صاحب چھوڑ کر گئے تھے۔ یعنی جو بچا تھا وہ اُٹھاتے چلے آئے اور تقریباً ڈھائی سال سے میگا پراجیکٹ کے نام پر اُٹھا رہے ہیں مگر کوئی پوچھنے والا نہیں۔ دونوں بڑی پارٹیوں کا میثاق جمہوریت پر متفق ہونا در حقیقت جمہوری ڈکٹیٹر شپ پر متفق ہونے کے مترادف ہے۔ دونوں بڑی جماعتوں نے آئین میں ترمیم کے ذریعے ایک ایسا آئینی ماحول بھی پیدا کر دیا ہے۔ جس کی قوت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ سیاسی جماعتوں کے قائدین ہیں۔ میونسپل کمیٹی کے ممبر سے لیکر نیشنل اسمبلی کے ممبر، سینٹر، وزیر اعظم، صدر اور اعلیٰ عدلیہ کے جج تک کی تعیناتی ہی نہیں بلکہ احتساب بیورو کے چیئرمین، صوبائی و مرکزی الیکشن کمشنر، مسلح افواج کے سربراہان اور سینٹ کے چیئرمین تک کی تعیناتی ان کی مرضی اور منشاء سے ہی ہوتی ہے۔ جوڈیشل کمیشن ججوں کی تعیناتی کرتا ہے اور حکمران جماعت کے ہم خیال لوگ چاہیے وہ گھر کے افراد ہی کیوں نہ ہوں مسلح افواج کے سربراہان مقرر کرتے ہیں۔ جنرل مشرف بڑے میاں صاحب کے پسندیدہ جرنیل تھے اور جنرل کیانی زرداری صاحب کے منظور نظر تھے۔ جنرل کاکڑ کو سیاستدان دورا ہے پر لے

آئے تو خاندانی عزت اور راوایات نے جنرل وحید کاکڑ کو حوصلہ دیا وہ باعزت ریٹائر ہو کر گھر چلے گئے۔ ایوب خان جنرل اسکندر مرزا کی پسندیدہ شخصیت تھے اور جنرل ضیاء الحق بھٹو صاحب کی برادری کے انتہائی عاجز اور منکسر المزاج شخصیت تھے۔

ہمارے سیاستدان روز اول سے ہی یہ بھول جاتے ہیں کہ کاشتکاری کے لیے بیل اور ٹریکٹر استعمال ہوتے ہیں نہ کہ ہاتھی اور ٹینک؟ ہاتھیوں اور ٹینکوں سے فصل نہیں اگتی بلکہ زمین ہی برباد ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بھی بھول رہے ہیں کہ جن بڑے منصوبوں پر وہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں وہ صرف چند لاکھ لوگوں کی سہولت کے لیے اور چند سالوں کے لیے ہیں جس طرح حکمران ملک کنگال کر رہے ہیں اگر یہ روش برقرار رہی تو اگلی تین دیہائیوں میں اس ملک کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔

ہمارے حکمران خاندان یورپ، امریکہ، بھارت اور ملایشا میں اپنے محلوں اور جاگیروں میں عیش کرینگے اور بڑی شاہراؤں پر غیر ملکی تجارتی کمپنیاں اپنی اجارہ داری قائم کر لیگیں۔ ریلوے کا نظام بھارت کے ہاتھ ہوگا اور زیادہ تر ٹرینیں کراچی سے چمن اور واہگہ سے کابل اور مزار شریف تک چلینگی۔ پی آئی اے پر کسی میاں منشا یا کسی ڈار یا خواجہ صاحب کی اجارہ داری ہوگی اور سٹیل

مل اگر حکومت سندھ نے واقع ہی خرید لی تو وہ زرداری صاحب کی ذاتی مل ہو گی۔ پاکستانی مزدور منشا، میاں، متل، زرداری جندال اور کچھ غیر ملکی کمپنیوں کی ملازمت کرینگے اور جو کچھ کمائینگے ہر شام اُسکا سودا سلف لیکر اپنا اور بچوں کا پیٹ پالینگے۔ عوام اپنے ہی ملک میں اجنبی اور غیر ملکی کمپنیوں کے غلام ہونگے۔

جس ملک میں مافیا حکمران ہو، اپوزیشن کا نام و نشان نہ ہو اور آئین ایک خاص طبقے کے تحفظ کا آئینہ دار ہو تو اُسے جمہوریت نہیں کیا جا سکتا۔ قائداعظمؒ کی رحلت کے بعد جمہوریت اور آمریت کے کھیل میں نہ کبھی کھلاڑی بدلے اور نہ ہی ریفری اور جیوری۔ البتہ کھیل کے قانون بدلتے رہے۔ خود غرضی اور عوام دشمنی کے اس کھیل میں جیت صرف کھلاڑیوں کی ہوئی اور ہار عوام کی ہوئی۔

باغ آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے جناب امیر اکبر خان عباسی عالم دین اور درویش صفت شخصیت تھے۔ عباسی صاحب نے 1947ء کے جہاد کشمیر کا مشاہدہ کیا اور جن جن لوگوں نے اس جہاد سے مفادات حاصل کیے وہ اُن سے سخت نالاں تھے۔اس سیاسی اور عسکری تماشے کے بعد درویش صفت امیر اکبر عباسی نے کپڑے الٹے پہننے شروع کر دیے۔ وہ جہاں جاتے ایک ہی فقرہ دھراتے "نوکری ہندوستان کی تنخواہ پاکستان کی" لوگ پوچھتے کہ اُلٹے کپڑے کیوں پہنتے ہو تو عباسی صاحب کہتے

کہ جب نظام ہی اُلٹا چل رہا ہے تو الٹے کپڑے پہننے میں کیا حرج ہے۔

جناب میر اکبر عباسی کے فقرے پر غور کریں۔ نوکری ہندوستان کی اور تنخواہ پاکستان کی، یعنی خدمت اغیار کی اور تنخواہ، مراعات، عیاشیاں اور مستیاں پاکستانی عوام سے لوٹی ہوئی دولت اور قومی خزانے پر ڈاکہ ڈالنے کی۔ سوچیں اور غور کریں کہ ہمارے بے صلاحیت لیڈر ہمیں ہانک کر کہاں لے جا رہے ہیں؟ ان میں تو ضیا الحق اور پرویز مشرف جیسی صلاحیتیں بھی نہیں۔ اگر حالت یہی رہی تو وہ دن دور نہیں جب نوبت اُلٹے کپڑے پہننے تک آ جائے گی۔ بیان کردہ حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو آج جنرل راحیل شریف اور اُن کے محب وطن ساتھیوں کو جنرل ضیا الحق سے زیادہ مسائل کا سامنا ہے۔

اٹھارویں ترمیم کے ذریعے ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت سیاستدانوں نے ملک لوٹنے اور کسی بھی مزاحمت کی صورت ملک توڑنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ ملکی اداروں بشمول عدلیہ کو کسی نہ کسی شکل میں اپنے دائرہ اختیار میں کر لیا ہے اور احتساب کو مذاق میں بدل دیا ہے۔ ساری سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فوج آئی ایس آئی اور فوج کی معاونت کرنیوالے اداروں کو بھی زیر نگیں کیا جائے تا کہ بچا کھچا پاکستان بھی لوٹ کر بیرون ملک منتقل کیا جائے

۔ حالیہ آل پارٹیز کانفرنس کے ذریعے عوام اور فوج کو پیغام دیا گیا کہ ذاتی

مفاداتی سیاسی ٹولہ اندر سے ایک ہے اور کسی بھی صورت عوام کو خوشحال اور ملک کو محفوظ نہیں دیکھنا چاہتے۔ آل پارٹیز کانفرنس مرحوم جونیجو کی آل پارٹیز کانفرنس کا چربہ ہے جسکا مقصد اقتصادی راہداری کا راستہ روکنا، بھارت کو افغانستان میں مراعات دینا اور ملک کو کنگال کرنا ہے۔ جسطرح جونیجو مرحوم کی آل پارٹیز کانفرنس نے جنیوا معاہدے کی راہ ہموار کی تھی۔ اس طرح حالیہ آل پارٹیز کانفرنس اور آنیوالی کانفرنسیں، احتجاج، رخنے، ہڑتالیں، اسمبلیوں کے ہنگامہ خیز اجلاس، ٹیلی ویژن شوز اور اینکروں کی چالبازیاں اور تبصرے آخر کار پاکستان اور چین کے تعلقات بگاڑنے کا موجب بنیگے اور بھارت بھرپور فائدہ اُٹھائے گا۔ مودی میاں محبتیں اور مشتاق مہناس کا آزاد کشمیر کی سیاست میں رول گرینڈ سازش کا حصہ ہے جسکی نشاندہی سلیم صافی نے اپنے انگریزی کالم میں کی ہے۔ سلیم صافی کے مطابق میاں صاحب نے فوج اور سیاسی جماعتوں کو باہم لڑانے اور خاموش تماشائی بننے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ کرپشن، بدامنی، دہشت گردی کا دور چلتا رہے اور میاں صاحب اپنے ایجنڈے پر گامزن رہیں۔

بل ۔ کمیشن ۔ بل

کھانے کا بل ، تنخواہ کا بل ، سودا سلف خریدنے کا بل ، اسمبلی میں پاس ہونے والے قانون کا بل ، بجٹ کا بل ، ڈاکٹر کا بل ، دوا کا بل ، ٹھیکیدار کا بل ، بل بل بل ؟؟؟ جدھر دیکھو بل ، جدھر جاؤ بل ہر جگہ ایک بل آپکا منتظر ہوگا۔ بل کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔ بل کی جڑواہ بہن یا بھائی یا سوتن یا پھر رشتہ دار کا نام کمیشن ہے۔ کھانے کے بل میں ٹیکس کے علاوہ ویٹر کا کمیشن ، سودا سلف خریدنے پر دوکاندار کے بل میں اُسکا اپنا کمیشن ، قانون سازی کے بل میں نامعلوم قوتوں کا کمیشن ڈاکٹر کے بل میں نرس کا کمیشن ، دوا کے بل میں فارمیسی کا کمیشن ، ٹھیکیدار کے بل میں افسروں ، انجینئروں اور سیاستدانوں کا کمیشن اور بڑے بڑے منصوبوں میں چھوٹے چھوٹے ذہنوں اور گھٹیا سوچ کے حامل خود غرض اور کرپٹ سیاستدانوں اور حکمرانوں کا کمیشن ہوتا ہے۔ جو مزدوروں ، کسانوں ، محنت کشوں اور تنخواہ دار طبقوں کی جیبوں سے زبردستی نکالا جاتا ہے۔

اسمبلی میں ہر سال بجٹ کا بل پیش کیا جاتا ہے اور اس بل کی تیاری سے پہلے مراعات یافتہ طبقہ اپنی مراعات اور لوٹ مار کو قانونی تحفظ دینے اور مزید مراعات اور سہولیات کے لیے بھاری کمیشن کا پتھر بجٹ بل پر رکھ دیتا ہے اور

بل پیش کرنیوالا انتہائی چالاکی اور حسابی شعبدہ بازی سے کام لیکر عوام الناس کو فریب دیتا ہے۔

بل، کمیشن، فریب، جھوٹ، بجٹ، منی بجٹ، دغا، دھوکہ اور شعبدہ ملکر کرپشن کی راہ ہموار کرتے ہیں اور قومی رہنما اور رہبر اسے جمہوریت، خدمت، ترقی اور تعمیر کہہ کر اپنے من پسند دانشوروں، صحافیوں، سول سوسائٹی کی نمائندہ پوڈر کریم کی تہوں اور کامدار ساڑھیوں میں لپٹی خواتین اور امپورٹڈ سوٹوں اور بوٹوں سے مزین بوڑھے مردوں کے ذریعے اس کی تشہیر کرتے ہیں۔

حال ہی میں پنجاب اسمبلی نے حقوق نسواں کے حوالے سے ایک بل پیش کیا اور پاس بھی کروالیا۔ بل پاس ہوا تو حکمران جماعت کے مرد وزن ہمراہ این جی او سے منسلک خواتین اور سول سوسائٹی کی پوڈر پارٹی میڈیا پر نمودار ہوئے اور بل کی حمائیت میں کم اور مولویوں اور مفتیوں پر زیادہ گرجے اور برسے۔

روشن خیال اینکروں اور اینکرینوں نے اپنے من پسند مہمانوں کو دعوت مناظرہ دی اور پھر اُن کی روشن خیالی، دین بیزاری اور آزاد خیالی کو کھل کر داد بھی دی۔ ایک سیاسی خاتون نے ایک عالم دین کو برا بھلا تو کہا مگر ساتھ ہی خدا کا شکر ادا کیا کہ اُن جیسے مرد اُن کے معاشرے میں کم ہیں ورنہ اُنکا معاشرہ شدید گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے۔ محترمہ نے جس معاشرے کی بات کی اُس

کی تشریح نہ ہوئی۔ اُن کے معاشرے سے مراد پنجاب کا معاشرہ ہے یااُن جیسے لوگوں کا معاشرہ جس سے جاگیردارانہ، کارخانہ دارانہ، سیاستدانہ اور نو دولتیا معاشرہ لیا جاسکتا ہے۔ اگر مراد جدید کرپٹ اور آزاد خیال معاشرہ ہے تو سیاسی خاتون نے سچ کہا چونکہ ایسے معاشرے میں کسی دینی اقدار، اخلاقیات یا پھر کسی مولوی، مفتی یا عالم دین کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اگر محترمہ کا مطلب پنجاب سے لیا جائے تو عالم دین نے ٹھیک کہا کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ اگر عالم دین کی بات پر غور کیا جائے تو پنجاب اسلامی، اخلاقی اور اعلیٰ روایات کا حامل معاشرہ ہے جس کی بنیاد اولیائے کاملین اور علمائے حق نے رکھی ہے۔ نئے قوانین، نئے بل اور نئی بحث کے بجائے اگر حکمران سنجیدہ ہوتے تو وہ سب سے پہلے پولیس کا نظام درست کرتے چونکہ پولیس ہی معاشرتی برائیوں کی بنیاد ہے۔

اینکروں، صحافیوں، این جی او اور سول سوسائٹی کے سولو فائیٹروں نے بل اور بل کے بال بچوں کی افادیت تو بیان کی مگر اس بل کے بنیادی فوائد کا ذکر نہ کیا۔
اس بل کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ حکمران جماعت کی کرپشن اور لوٹ مار سے توجہ ہٹ گئی اور ایک نئی بحث نے عوام کی توجہ کرپشن اور کمیشن مافیا کے کارناموں

سے ہٹادی۔ اس بل کا دوسرا فائدہ پولیس کو ہوا جو اب سارے پنجاب میں چن چن کر ظالم مردوں پر قہر خداوندی بن کر نازل ہوگی اور تھانیدار روزانہ کروڑوں کمائے گا۔ پولیس والے اور اُن کے ٹاؤٹ تھانوں میں فون کرکے شکایات درج کروائینگے اور مرد حضرات حسب توفیق رشوت دیکر جان چھڑا ئیگے۔ تمام شادی شدہ حضرات کو اب جھگڑا ٹیکس بھی جیب میں رکھنا ہوگا۔ پولیس والے اپنی ہم خیال عورتوں کو بازاروں میں پھیلا دینگے جو ہر چلتے مسافر پر الزام لگا کر مک مکا کرکے یا پھر پولیس کو بتا کر اپنا کمیشن وصول کرینگی۔ لوگ اپنے دشمنوں کو بھی الزامات لگا کر تھانے کی ہوا لگوائینگے اور تھانیدار کی خدمت بھی کروائینگے۔

اس بل کے بعد حکمران اپنے ووٹروں، سپوٹروں اور گھریلو نوکروں کو محافظ نسواں فورس بھی بھرتی کریں گے اور انہیں ایک سے بائیس تک مختلف گریڈ دے کر قومی خزانے پر چند ارب روپے کا مزید بوجھ ڈالیں گے۔ نئ سیکمیں، نے منصوبے، نئے پراجیکٹ، نئے پراڈکٹ اور نت نئے کارنامے نواز لیگ کا پرانا وطیرہ ہے۔ قرض اتارو ملک سنوارو، پیلی ٹیکس، پیلی ویگن، ڈالر اکاؤنٹ، سستی روٹی، لیپ ٹاپ، دانش سکول جیسے کامیاب منصوبوں کے بعد سولر پارک، نندی پور، میٹرو بس اورنج ٹرین اور نوجوانوں کو آسان قرضے دینے کے بعد اب مفت علاج اور حقوق نسواں جیسے منصوبے اعلیٰ حکومتی، سیاسی اور مفاداتی

ذہنوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ تحفظ نسواں فورس کے علاوہ پنجاب بھر میں شلٹر ہوم بنائے جائیں گئے جن کی تعمیر پر اربوں روپے خرچ ہونگے۔ ان شلٹر ہومز کی تزئین وآرائش کے علاوہ لنگر خانے، محافظ اور انتظامی عملہ بھی بھرتی ہوگا جنہیں خزانے سے ہی تنخواہیں دی جائیگی۔ اگر یہ عملہ پولیس سے لیا گیا تو پھر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں آنیوالی عورتوں کا کیا حشر ہوگا۔ اگر کوئی عورت ایک رات حوالات میں گزار آئے تو معاشرہ اُسے قبول نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ کوئی عورت پولیس کی نگرانی میں چلنے والے شلٹر ہوم میں قیام کرآئے۔ اگر یہ شلٹر ہوم خالی رہے تو پھر بھی پولیس اسکا مصرف نکال لے گی اور اُسے بُرائی کا اڈہ بنا کر مال کمائے گی۔

ان فوائد کے علاوہ سب سے بڑا ذاتی فائدہ اور قومی خزانے کو نقصان ان کروڑوں ڈالروں کا ہوگا جس سے کسی غیر ملکی کمپنی سے یہ ٹریکنگ سسٹم خریدا جائیگا۔ کڑا پہنانا کوئی مذاق نہیں بلکہ یہ ایک جدید اور مہنگا سسٹم ہے جس کے لیے تربیت یافتہ عملہ، ٹریکنگ سسٹم اور اس کی دیکھ بھال ضروری امر ہے۔ یہ کڑا یا رنگ ایسے مجرموں کو پہنایا جاتا ہے جنہیں جیل یا حوالات میں نہیں رکھا جاتا مگر وہ ایک حد سے باہر بھی نہیں جاسکتے۔ ان ملزمان کا کورٹ ٹرائیل جاری رہتا ہے اور عدالتی فیصلے تک وہ شہر کی حدود سے باہر نہیں جاسکتے۔ اگر کوئی ملزم ایسا کرے تو پولیس اسے فوراً گرفتار کرلیتی ہے۔ حقوق تحفظ

نسواں کا اس سسٹم سے کوئی تعلق نہیں بنتا چونکہ ملزم کو صرف گھر سے باہر رکھنا مقصود ہے۔ ٹریکنگ سسٹم سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ملزم کو شہر بدر کیا جائیگا تاکہ وہ گھر نہ آسکے۔ کیا اس سے بہتر نہیں کہ اُسے جیل میں ڈال دیا جائے۔ کسی بھی شادی شدہ شخص کو محض گھریلو جھگڑے پر گھر بدر کرنا انصاف، حقوق انسانی اور اسلامی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ یورپی ممالک میں رنگ پہنانے کا مقصد ملزم کو بیروزگاری سے بچانا ہے تاکہ وہ اپنی نوکری یا کاروبار جاری رکھ سکے۔ وہ شادی شدہ مجرم جو جیلوں میں ہوتے ہیں۔ پولیس پندرہ دن بعد انہیں بھی گھر لاتی ہے اور چند گھنٹوں کے لیے انہیں گھر کے اندر تنہائی میسر کرتی ہے۔

شادی شدہ عورتیں جن کے بچے ہوتے ہیں انہیں بھی کڑا پہنایا جاتا ہے اور جیل کے بجائے انہیں گھر میں قید کیا جاتا ہے۔ اُن کی نقل و حرکت مارکیٹ، چرچ، ہسپتال، کلب قبرستان اور رشتہ داروں کے گھروں تک محدود ہوتی ہے۔ اگر حکومت نے یہ سسٹم، کسی ملک سے خریدا تو اس پر کروڑوں ڈالر خرچ ہونگے اور کروڑوں کا کمیشن بھی کمایا جائیگا۔ ہے نا فائدے کا بل ؟؟۔

جس میں کمیشن در کمیشن کا بندوبست کرلیا گیا ہے۔ لہٰذا اس بل کو کمیشن کیساتھ ملا کر ہی پڑھا جائے اور اس کے فوائد پر بھی لکھا اور بولا جائے۔ یہ

فائدے کابل ہے۔ نقصان کانہیں اسے اسلام، روایات اور معاشرے سے الگ معاشی بل سمجھا جائے چونکہ یہ چندلوگوں کے فائدے کے لیے بنایا گیا ہے۔

اگر کسی دانشور، معیشت دان یا نجومی وغیرہ کو اس بل میں مزید فائدے نظر آئیں تو وہ ."ن لیگ" الفائدہ کمیٹی سے رجوع کر سکتا ہے۔اپنا خیال رکھیے اور بل کے مضر اثرات سے بچیئے گا۔

مغلوں سے پہلے غزنوی، غوری، لودھی اور سوری حکمران تھے اور اُن سے پہلے جے پال، انند پال اور چوہان اپنا شاہی فرمان جاری کرتے تھے۔ مغلوں کے بعد سکھ آئے اور پھر انگریز دور آگیا ملکہ وکٹوریہ اور شاہ جارج کے سکے نے نانک شاہی کا خاتمہ کیا تو موجودہ پاکستان میں نئے جاگیردار، گدی نشین پیر، ٹھیکیدار اور کارخانہ دار خاندان پہلے وکٹوریہ اور پھر جارج کے گیت گانے لگے۔ انگریزی دور میں پریس کا وجود سامنے آیا تو مضمون نویس، کالم نگار اور رپورٹر بھی اپنا بستہ اُٹھائے اخباروں کے دفاتر سے منسلک ہو گئے۔

اخبار سے پہلے کتاب کا دور تھا اور اُس سے پہلے تقریر، مشاعرہ اور تھیٹر اظہار خیال کے ذرائع تھے۔ مصنفین کتابوں، شعروں اور بعد میں سٹیج پر پیش کیے جانے والے کھیلوں کے ذریعے اپنا پیغام عوام الناس تک پہنچاتے اور اکثر حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بن جاتے۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کی تعریف و توصیف میں لکھی جانے والی کتابوں، اشعار، قصیدوں، قصوں اور گیتوں پر انعام و اکرام سے نوازا جاتا۔ درباری شاعروں قصیدہ خوانوں اور مصنفوں کو جاگیریں، خلعتیں اور القابات سے بھی نوازا جاتا۔ یہی حال رقاصاؤں اور

مصاحبوں کا تھا۔

فریدالدین عطار نے ”پرندوں کی مجلس“ لکھی تو نہ صرف یہ کتاب ضبط کر لی گئی بلکہ فرید کو بھی جیل جانا پڑا۔ ابن الہیثم کو سائنسی نظریات اور خلیل جبران کو معاشی، سیاسی اور اخلاقی برائیوں پر قلم اُٹھانے کی سزا ملی اور کتابیں نذرِ آتش کر دی گئیں۔ ایسا ہی حال مقررین کا تھا۔ ادھر کسی ظالم حکمران کے خلاف آواز اُٹھی کہ شاہی فرمان جاری ہوا اور سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ انگریز گئے تو اُن کے حواری سیاستدانوں کے روپ میں ملک پر قابض ہو گئے۔ لوگ سکندر مرزا، ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف پر تنقید تو کرتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ انہیں ایوانِ اقتدار تک لانے والے اور ان کے قصے اور قصیدے لکھنے اور پڑھنے والے کون تھے؟ جناب بھٹو نے سکندر مرزا کو قائداعظم سے بڑا لیڈر اور ایوب خان کو ایشیا کا ڈیگال اور صلاح الدین ایوبی کہا۔ جناب بھٹو کو خان عبدالولی خان اور ائیر مارشل اصغر خان نے اپنی پارٹیوں میں کوئی بڑا مقام دینے سے انکار کیا تو یحییٰ خان نے انہیں پیپلز پارٹی بنانے کا مشورہ دیا۔ جناب بھٹو نے ہی جنرل ضیاء الحق کو آرمی چیف بنایا اور جنرل پرویز مشرف کے مشرف بہ اقتدار ہونے کی کہانی زیادہ پرانی نہیں۔

جناب پرویز مشرف کے سارے قصیدہ خوان، قصہ گو، ادیب، کالم نگار اور نورتن آجکل جناب میاں نواز شریف کے دربار سے منسلک ہیں۔ یہ سارے فنکار اور قلم کار پرانے سروں میں نئے گیت بنا اور گا رہے ہیں اور اینکر حضرات دھمال پر دھمال ڈال رہے ہیں۔ موجودہ دور میں قصیدہ گو اور قصہ خوانوں کی جگہ بڑے صحافیوں، اینکروں، تجزیہ نگاروں اور مبصروں نے لے رکھی ہے اور ہر دور کے شاہوں سے پلاٹ، بنگلے اور بیرون ملک اثاثے حاصل کیے ہیں۔ اکثر سینئر صحافیوں، اینکروں اور تجزیہ نگاروں کے گھر اور فلیٹ امریکہ، مغربی ممالک اور دبئی وغیرہ میں ہیں اور اُن کے بچے بھی بیرون ملک پڑھتے ہیں جو سب مختلف درباروں اور سرکاروں کی عنائیت ہے۔ کچھ شاہ کے دربانوں نے بخشا تو کچھ اغیار کے قصے اور قصیدے لکھنے پر نچھاور کیا گیا۔
اسکندر مرزا سے لیکر پرویز مشرف تک سبھی حکمران زوال پذیر ہوئے مگر شاہی دربار سے منسلک درباریوں، قصیدہ گوؤں اور قصہ خوانوں پر کبھی زوال نہ آیا چونکہ یہ لوگ ہر دربار اور ہر سرکار کی ضرورت ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں بہت سے قلم کار وزیر اور مشیر ہیں اور باقی بچ جانے والے تجزیہ نگار، مبصر، اینکر اور فنکار ہیں۔

ایسے لوگوں کے لیے حضرت سعدیؒ نے لکھا ہے کہ اے نادان کیا تجھے پتہ نہیں کہ بادشاہ کا قصیدہ لکھنے والے ہاتھ سے وہ ہاتھ افضل ہے جو مٹی سے بھرا ہوا ہے اور محنت سے رزق کما کر تیرا پیٹ بھرتا ہے۔ ہمارے سینئر صحافی، کالم نگار، مبصر اور اینکر بھول جاتے ہیں کہ جو کچھ وہ حکمرانوں سے وصولتے ہیں وہ عام لوگوں کی محنت اور مشقت سے کمایا ہوا پیسہ ہے جو جناب اسحاق ڈار مختلف ٹیکسوں کی صورت میں محنت کشوں کے بینک اکاؤنٹوں اور جیبوں سے نکالتے ہیں۔ کیا مشتاق منہاس جیسے صحافی کبھی اپنے خرچے پر بذریعہ ہوائی جہاز کراچی تک گئے تھے؟ یقیناً نہیں۔ مگر جب سے موصوف شاہی دربار سے منسلک ہوئے ہیں شاہ کی ہوائی سواری میں اُن کی سیٹ مختص کر دی گئی ہے۔ کرنل اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ میں نے زندگی میں بڑے بڑے عہدوں پر چھوٹے چھوٹے لوگوں کو اور چھوٹے چھوٹے عہدوں پر بڑے بڑے لوگوں کو فائز دیکھا۔ کالکارنجن قانون گو لکھتا ہے کہ شیر شاہ سوری کی کامیابی کا ایک راز یہ تھا کہ قصیدہ گوؤں اور قصہ خوانوں سے پرہیز کرتا تھا۔ اگر ایسا کوئی فنکار شیر خان تک رسائی حاصل کر لیتا تو وہ اُسے فوراً کسی مہم پر بھجوا دیتا۔ ہمارے بہت سے سینئر صحافی، قصیدہ گو، قصہ خوان اینکر اور تجزیہ نگار اس انعام کے حقدار ہیں کہ انہیں وقت ضائع کیے بغیر سیاہ چین یا شمالی وزیرستان بھجوایا جائے۔ اگر یہ لوگ اسلام آباد جیسے پر تعیش شہر میں ہی رہے تو قوم اور ملک کے لیے مہلک ثابت ہونگے۔

مشہور کشمیری شاعر اور دانشور غنی کاشمیری نے صدیوں پہلے لکھا تھا کہ دریا کا پانی دیوار کے قدم چومتا ہے مگر بالآخر اسے گرادیتا۔ اے نادان تو قصیدہ گوؤں سے دور رہ اور زوال سے بچ ورنہ تو صفحہ ہستی سے ہی مٹ جائے گا۔

سینئر صحافی جناب نواز رضا کے دو کالم میرے سامنے ہیں۔ پہلا کالم جناب وزیراعظم کی کشمیر پالیسی اور دوسرا مریم نواز شریف سے ملاقات کے متعلق ہے۔ میں نے میاں نواز شریف کی کشمیر پالیسی والا کالم نہیں پڑھا اور نہ ہی یہ کالم پڑھنے کی ضرورت ہے۔ میں کشمیری ہوں اور کشمیر کے حالات میرے سامنے ہیں۔ جبکہ حقیقتاً میاں صاحب کی کوئی کشمیر پالیسی ہی نہیں ۔ میاں صاحب نے کبھی بھی مودی کی موذی کشمیر پالیسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی آزاد کشمیر میں ہونے والی حکومتی کرپشن اور عوام کش پالیسوں پر کوئی روک لگائی ہے چونکہ میاں صاحب پیپلز پارٹی کے ساتھ ہونے والے میثاق جمہوریت پر عمل پیرا ہیں۔ میاں صاحب اقتدار سنبھالنے کے بعد آزاد کشمیر کے جیالے وزیراعظم چوہدری عبدالمجید سے بغل گیر ہوئے اور انہیں اپنا بڑا بھائی قرار دیا۔ اگر میاں صاحب کی کوئی کشمیر پالیسی ہوتی تو وہ مولانا فضل الرحمٰن کو کشمیر کمیٹی کا چیئرمین نہ لگاتے اور نہ ہی مجیدی حکومت کو کھل کر لوٹ مار کرنے کا موقع فراہم کرتے ۔ میاں صاحب کی کشمیر پالیسی مشتاق منہاس کے

مشوروں کے گرد گھومتی ہے اور مسلسل گھماؤ میں ہے۔ کیا میاں صاحب نے آزاد کشمیر کے جنگلات کی بے دریغ کٹائی اور نیلم ویلی سے معدنیات اور نباتات کی سمگلنگ کو روکا ہے اور سمگلر وزیر سے کوئی باز پرس کی ہے؟؟۔ کیا مشتاق منہاس نے اُنہیں جاگراں پاور پروجیکٹ اور جہلم نیلم منصوبے میں ہونے والی کرپشن پر کوئی بریفنگ دی ہے؟؟۔ اگر جاگراں ٹو اور تھری پر کام ہوتا تو یہ منصوبے تین سال قبل مکمل ہو چکے ہوتے اور کرپشن کرنیوالا وزیر جیل میں ہوتا۔ کیا میاں صاحب کو وزیراعظم چوہدری عبدالمجید اور اُن کے صاحبزادوں کے کارناموں سے کسی وزیر، مشیر اور وزیراعظم بھگتانے والے صحافی نے آگاہ کیا ہے؟ سینئر صحافی حاجی نواز رضا کو وزیراعظم ہاؤس سے فراغت ملے تو وہ صرف میرپور کا ہی دورہ کر لیں اور خود دیکھیں کہ مجید حکومت نے ایشیاء کا لندن کہلانے والے میرپور شہر کا کیا حشر کر رکھا ہے۔ سڑکیں ٹوٹ کر کھنڈرات بن چکی ہیں اور ہر طرف تجاوزات کی بھر مار ہے۔ بڑی سڑکیں اور خوبصورت عمارتیں لنڈا بازروں میں تبدیل ہو چکی ہیں اور شہر کے سارے پارک مویشی منڈی کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ ہر طرف غلاظت کے ڈھیر ہیں اور مریضوں سے ہسپتال بھرے پڑے ہیں۔ میرپور کوٹلی روڈ توسیع اور مرمت کے لیے دو سال پہلے کھودی گئی تھی جو تاحال کھدی پڑی ہے۔ چکث ریحام پل پانچ سال سے زائد عرصہ سے زیر تعمیر ہے جس پر دو سال سے کوئی کام ہی نہیں ہوا۔ یہی حال آزاد کشمیر کے دیگر شہروں، قصبوں اور سڑکوں کا ہے۔ سرکاری نوکریاں صرف حکومت حکمران برادری کے لیے

ہیں جوڈوگرا دور کی تازہ جھلک ہے۔ چار سال تک آزاد خطہ میں پبلک سروس کمیشن ہی نہ تھا چونکہ نوکریاں بیچی جاتی تھیں اور اب بھی بک رہی ہیں۔ حاجی نواز رضا اور اُن کے دانشور وزیراعظم اور مستقبل کی وزیراعظم مریم نواز شریف سے سوال ہے کہ کیا یہی آپ لوگوں کی کشمیر پالیسی ہے؟؟؟؟

جہاں تک مریم نواز شریف کی قیادت میں کام کرنیوالے تھنک ٹینک کا تعلق ہے تو اس تھنک ٹینک کا کام صرف اور صرف عمران خان پر تنقید کرنا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہے۔ کیا کسی لیڈر اور پارلیمنٹرین کو زیب دیتا ہے کہ وہ بداخلاقی اور بھڑ بولے پن کا مظاہرہ کرے اور وہ بھی ایک ایسی خاتون کی مرضی و منشا سے جو خود کو مستقبل کی قائد تصور کیے گدی نشینی کی دعویدار ہے۔ مریم نواز شریف اگر واقعی مدبر اور مستقبل پر نظر رکھنے والی شخصیت ہیں تو وہ نیشنل سیکورٹی پر توجہ دیں نہ کہ عمران خان کے الزامات پر۔ بجائے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے وہ عمران خان کی تنقید کا جواب تعمیری سوچ اور عمل سے دیں اور معاملات کو درست کرنے پر توجہ دیں۔

پاکستان ہر طرف سے دشمن کے نشانے پر ہے اور میڈیا سمیت خود غرض سیاستدانوں اور نام نہاد دانشوروں کا مخصوص ٹولہ دشمن کا آلہ کار ہے۔ فوج، اسلام، پاکستان اور آئی ایس آئی اپنوں اور غیروں کی تنقید کا حدف ہیں اور عوام

الناس کو دیگر مسائل میں اُلجھانے والے مستقبل کی قائد کے تھنک ٹینک کا حصہ ہیں۔

حیرت ہے کہ ایک فضول اور غیر تعمیری سوچ کی تشہیر کرنیوالے سینئر صحافی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے بلکہ فخر و تکبر سے کہتے ہیں کہ وزیراعظم ہاؤس میرے لیے نئی جگہ نہیں میں نے بہت سے وزیراعظم بھگتائے ہیں۔

آج ہم جس مشکل مقام اور تباہی کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں اس سے بچ نکلنے کے لیے دانشمند اور دوراندیش قیادت کی ضرورت ہے۔ ٹھیکیدارانہ سوچ اور تاجرانہ سیاست پر قصیدے لکھنا نہ تو صحافت ہے اور نہ ہی ملک اور قوم کی خدمت ۔ اگر حالات یہی رہے تو شاہنامے لکھنے والے جلد ہی نوحے اور زوال نامے لکھیں گے مگر کوئی پڑھنے والا، داد دینے والا اور صلے میں سونے کی اشرفیاں نچھاور کرنیوالا نہ ہوگا۔

را' نوازیاں اور اپنی کارستانیاں'

مسلم لیگ (ن) کی حکومت کے بارے میں یہ رائے عام ہے کہ یہ جب بھی حکومت میں آتے ہیں ایک ان کی گردنوں میں سریا آ جاتا ہے۔ اپوزیشن میں ہوتے ہوئے جو ہر ایک کے لیے میسر اور اپروچ میں ہونے والے خود کو الگ مخلوق سمجھنے لگتے ہیں اور صرف اپنے مطلب اور فائدے کے لیے ہی میل ملاقات اور تعلق رکھتے ہیں۔ اقتدار اور اختیارات پانچ سے سات افراد کے درمیان ہی گردش کرتا ہے۔ یہ اقتدار کا نشہ، گردن میں سریا انہیں ایک سے زائد مرتبہ عبرت ناک نتائج دکھا چکا ہے مگر اس کے باوجود میاں صاحبان اور ان کے مشیران بھول جاتے ہیں کہ یہ چھڑی کسی وقت بھی الٹی گھوم سکتی ہے اور چل بھی جاتی ہے۔ موجودہ اقتدار ملنے کے بعد تمام سیاسی جماعتوں کو ساتھ چلنے کا عزم کیا گیا، عمران خان سمیت دیگر تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ رابطہ کیا گیا۔ مگر جوں ہی اقتدار کے ایوانوں میں قدم رکھا اپنی پرانی روش کو پھر سے شروع کر دیا گیا، عوام سے رابطے نہ ہونے کے برابر۔ عمران کا دھرنا سو دن سے زائد کا رہا طاہر القادری صاحب نے بھی ٹف ٹائم دیا تو اس دوران انہیں فوراً اپوزیشن اور سیاسی جماعتیں یاد آئی اور جمہوریت کا آلاپ شروع کر دیا گیا۔ مگر جوں ہی قدرے سنبھلے تو اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ دیگر سیاسی جماعتوں سے یا قائدین سے ، تو اختلافات یا ناراضگیاں ہو سکتی ہیں

یہاں حال یہ ہے کہ کابینہ کے اندر وزرا ایک دوسرے کو.برداشت نہیں کر رہے ایک دوسرے کے خلاف نہ صرف سازشیں بلکہ سر عام میڈیا میں آ کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہماری بات چیت نہیں ہمارے تعلقات خراب ہیں۔ ایسے حالات میں کیا حکومت چلے گی اور عوام کی کیا فلاح ہو گی۔ یہ ہے میاں اینڈ کمپنی کا اندر کا حال بلکہ بے حال۔ میاں شہباز شریف فیملی اور نواز شرف فیملی کے آپس میں بھی حالات کچھ بہت اچھے نہیں۔ ایک طرف حمزہ کو پروموٹ کیا جاتا ہے تو دوسری طرف مریم نواز کو۔ جہاں حالات ایسے ہوں وہاں ملک پر حکومت تو کیا ایک گھر کا نظام بھی چلانا مشکل ہوتا ہے۔

اس تمام صورتحال کو ذہن میں رکھنے کے بعد اگر ملکی حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس وقت ملک میں حکمرانی صرف پاک آرمی کی وجہ سے چل رہی ہے۔ دہشت گردی کا ناسور اپنے آخری مراحل میں داخل ہوا ہے تو آرمی چیف کے بولڈ سٹیپ کی وجہ سے ورنہ مصلحتوں کا شکار جمہوری حکومتیں جس طرح سے چلتی رہی ویسے ہی یہ بھی اپنا وقت پورا کرتی اور گزر جاتی۔ طالبان کے پیچھے کون کون سی طاقتیں کارفرما رہی ہیں ان کو سے باہر آنا، بلوچستان کو ICU بے نقاب آرمی کے آپریشن سے ہی ممکن ہوا۔ کراچی کا واپس پاکستان کا حصہ بنانا۔ گوادر پورٹ جیسے اقدامات شروع کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مگر اسے ممکن بنایا آرمی چیف کے پختہ ارادوں نے۔ جبکہ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ایم کیو ایم کو

مفادات کے لیے استعمال کیا گیا اور ملک کا سودا کیا جاتا رہا۔ جس میں سابق آرمی چیف پرویز مشرف سمیت دیگر سیاسی جماعتیں شامل ہیں۔ الطاف حسین کی را سے فنڈنگ کا ذکر ہر دور میں ہوتا رہا مگر ڈھکے چھپے الفاظ میں۔ ملک کا سودا کرنے والوں کو اقتدار کی خاطر ساتھ ملایا جاتا رہا اور بھارتی جاسوسوں پاکستانی پارلیمنٹ کے اندر بٹھایا گیا صرف اپنی کرسی اور اقتدار کی خاطر 'را' کے ایجنٹ اس سے قبل بھی گرفتار ہوتے رہے۔ صرف را' نہیں بلکہ موساد، سی آئی اے، ایم آئی 6 کے لوگ بھی پکڑے جاتے رہے اور' ہمارے سوداگر حکمران سودا کرکے انہیں چھوڑتے رہے۔ اب پاک آرمی کے سپاہ سالار نے جب پوری دنیا کو بتا دیا کہ اب ایسا نہیں چلے گا۔ یہاں غیر کا کوئی ایجنڈا نہیں چلے گا، تو ملک میں بیٹھے ہوئے اور ملک سے باہر مہرے حرکت میں آگئے ہیں۔ الطاف حسین کی گردن پر ہاتھ آیا تو انڈیا سمیت دیگر پاکستان دشمنوں نے نت نئی چالیں چلنا شروع کی ہیں۔ ایسے میں سیاسی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ جمہوری حکومت سے متوقع تھا مگر یہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ بلوچستان سے کلبھوشن پکڑا گیا تو میاں نواز شریف کے بولنے کی بجائے کو بولنا پڑا۔ پھر یہ 'را' میاں صاحب کے اپنے گھر سے بھی جا نکلی تو ISPR آرمی چیف اور اس پر بھی یہاں سکوت اور خاموشی ہی رہی۔ الطاف حسین سے لیکر کل کلبھوشن تک کتنے ہی ایجنٹ آئے اور یہاں اپنے کالے کرتوتوں سے پاک سرزمین کو ناپاک کرتے رہے۔ ایسے میں اگر ملک کی حرمت کو بچانے کے لیے ایک مردِ حُر نے کمر باندھ لی ہے

تو وزیر اعظم صاحب آپ بجائے استعمال ہونے کے اور اپنی دوستیاں نبھانے کے ملک کو عزیز تر جانتے اور کھل اقدامات کا اعلان کرتے۔

میاں نواز شریف اور ان کے رفقاء جو بجائے اپنی حکومت کو بچانے کے اس درخت کا تنا ہی کاٹ رہے ہیں جس کی شاخوں پر سوار ہیں۔پانامہ لیکس آج کل پوری دنیا کی طرح پاکستان کے میڈیا کے اعصاب پر سوار ہے۔پانامہ لیکس دراصل موزیک فورنزیکا ایک لافرم کا ریکارڈ ہے جس میں دنیا بھر کے امراء جائز یا ناجائز طریقے سے اپنی کمائی ہوئی رقم کو ایسے بے نامی کمپنیوں اور اکاؤنٹ میں رکھتے ہیں جہاں انہیں ٹیکس نہیں دینا پڑتا میں سے جو ریکارڈ چوری ہوا یا خود کرایا گیا اس میں Mossack Fonsece 1977 سے لیکر 2015 تک کا ریکارڈ ہے۔اس میں 200 سے زائد ممالک کے افراد شامل ہیں جن کے نام بے نام فہرستوں میں شامل ہیں، یہ تقریباً 12 ملین افراد ریکارڈ ہے۔اور ابھی تک جن اہم شخصیات کے نام افشاء ہوئے ان میں 12 سابقہ اور حالیہ سربراہان مملکت یا ان کے خاندان ہیں۔ان ممالک میں سعودی عرب، روس، چائنہ، بھارت سمیت یوکرائن، انگلینڈ، آئس لینڈ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان شامل ہے۔

اس بے نامی فہرست میں 220 سے زائد پاکستانیوں کے نام شامل ہیں۔جن میں سیاسی خاندانوں میں ملک کے وزیر اعظم میاں نواز شریف کے بچے وزیر اعلیٰ

شہباز شریف کے رشتہ دار (ثمینہ درانی ، الیاس معراج)بینظیر بھٹو ، زرداری صاحب کے قریبی دوست حسن علی جعفری ، محترم رحمٰن ملک ، عثمان سیف اللہ و خاندان ، چوہدری شجاعت کے رشتہ دار (زین سکھیرا وغیرہ) عمران خان کے قائم کردہ شوکت خانم کا نام اس لیکس میں تو نہیں آیا مگر اس سے قبل آف شور کمپنیوں میں پیسے لگانے کے حوالے سے اور واپس لینے کے حوالے سے عمران خان کئی بار کہہ چکے ہیں۔ اسی طرح کاروباری اشخاص میں ملک ریاض، اعظم سلطان ، عقیل حسین، عبدالرشید سورتی ، خواجہ اقبال ، محمود احمد ، صدرالدین ہاشوانی ، شہباز یٰسین ، عبداللہ فیملی، گل محمد ، شاہید نذیر ، ذوالفقار لاکھانی اور ذوالفقار پراچہ وغیرہ کے نام شامل ہیں ۔ جن چند ججز کے نام آئیں ہیں ان میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس فرخ عرفان اور ملک عبدالقیوم شامل ہیں جبکہ اس گنگا میں میڈیا ٹائیکون میر شکیل الرحمٰن کا نام بھی شامل ہے ۔ یوں پاکستانی اشرافیہ جن میں ہر شعبے کے افراد شامل ہیں نے اس گنگا میں شنان کر رکھا ہے ۔ دنیا پر حکمرانی کرنے والے امریکہ کے سرمایہ داروں نے 60 فیصد سرمایہ ان آف شور کمپنیوں میں لگا رکھا ہے ۔ دنیا میں 80 سے زائد جزیرے اور ممالک ہیں جہاں یہ دھندہ ہوتا ہے ۔ مگر کسی کا نام ابھی اس فہرست میں شامل نہیں۔ دنیا کو سبق پڑھانے والے ٹرانسپیرنی انٹرنیشنل جیسے عالمی ادارے کا نام بھی اس پانامہ لیکس میں شامل ہے ۔ کئی ممالک میں احتجاج جاری ہے اور ایسے سربراہان جن کے نام اس بے نام لیکس میں آئے ہیں خود کو اقتدار سے الگ ہونے کا مشورہ

دیا جا رہا ہے۔

پاکستان میں چونکہ بھیڑ چال ہوتی ہے جن دیگر ممالک میں شور شرابہ دیکھا تو یہاں بھی وزیر اعظم کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف حکومتی صفوں کی صورتحال آپ کے سامنے پیش کی ہے کہ یہاں آپسی جھگڑے ہی اتنے ہیں کہ کسی اپوزیشن کی ضرورت ہی نہ تھی ،ایسے میں وزیر اعظم کے مشیروں نے انہیں فوراً خطاب فرمانے کا مشورہ دے کر جلتی میں تیل کا کام کیا اور عمران خان نے جوابی خطاب فرما دیا ۔جس کے بعد پیپلز پارٹی جو قدرے خاموش تھی بھی میدان میں آ گئی اور اب مشترکہ اپوزیشن کی تیاری زوروں پر ہیں ۔ کہیں کمیشن ، کہیں انکوائری اور کہیں استعفٰی کی باتیں چل رہی ہیں ، ایسے میں میاں نواز شریف کی صحت کا اچانک خراب ہونا ، آصف علی زرداری کو لندن میں موجود ہونا ، حسین نواز کا سعودی حکام سے ملاقات ، عمران ، نثار سمیت تمام راہنماؤں کو لندن حاضری دینا کسی تبدیلی کا تو نہیں بلکہ سودے بازی کا پیش خیمہ ضرور ہے ۔

بھارت کا پاک چائنہ کوریڈور کو نقصان پہنچانے کے عزائم ،افغانستان اور ایران میں را کے مراکز ، آرمی چیف کا پاک چائنہ کوریڈور پر براہِ راست بیانات اور ذاتی دلچسپی وغیرہ وغیرہ۔اس میں کوئی شق نہیں کہ آپ ایک خوش قسمت انسان ہیں

جسے رب تعالی نے بنا کسی امتحان اور کوشش کے دیا ہے۔ مگر آج آپ کو جو مشکلات اور پریشانیاں لاحق ہیں ان کا ایک ہی حل ہے ملک سے مخلص ہو جائیں اور بجائے اپنی افواج سے سینگ پھسانے کے دشمن کے خلاف اکھٹے ہو جائیں۔ ورگرنہ یہاں کبھی دھرنا کبھی لیکس، کبھی بل، کبھی لوڈ شیڈنگ یہ آپ کی حکومت کو تو لے ڈوبیں گے۔ یہ تمام، صورتحال میاں نواز شریف کی جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ سیاسی صحت پر بھی منفی اثرات ڈالتے نظر آرہے ہیں۔

براستہ ایران

حال ہی میں بھارتی ایجنٹ بلوچستان سے گرفتار ہوا جسکا آپریشنل بیس ایران کا ساحلی شہر چاہ بہار تھا۔ چاہ بہار میں اس ایجنٹ کا بظاہر سونے کا کاروبار تھا جس کی آڑ میں وہ پاکستان میں جاسوسی اور دہشت گردی کا نیٹ ورک چلاتا تھا۔ دنیا بھر میں پھیلتے انیٹلی جنس نیٹ ورک کے ایجنٹ یا کارندے طرح طرح کے حلیے اور روپ اپناتے ہیں جنھیں Cover کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بھیس بدل کر دوسرے ملکوں میں کام کرتے ہیں اور معلومات حاصل کرنے کے علاوہ اُن ملکوں میں بغاوتیں اور تشدد آمیز کاروائیاں بھی کرواتے ہیں۔ بھارت ہمارا ازلی دشمن ہے اور ہمیشہ سے ہی ہماری قومی سلامتی، یکجہتی اور پرامن ریاستی ماحول کو تباہ کرنے کی سازشوں میں مشغول رہتا ہے۔

1965 کی جنگ کے بعد بھارتی وزیراعظم اندرہ گاندھی کی خواہش پر RAW کا ادارہ وجود پذیر ہوا جسکا پہلا حدف مشرقی پاکستان تھا۔ اس ادارے کے کچھ اغراض و مقاصد پر ''را'' کے سابق چیف اور بھارتی قومی سلامتی کے اہم عہدیدار اے ایس دلت نے روشنی ڈالی ہے کہ یہ ادارہ کس طرح کام کرتا ہے۔ دلت نے اپنی کتاب ''کشمیر واجپائی کے دور میں'' زیادہ فوکس کشمیر پر رکھا ہے

مگر جہاں ضرورت پڑی پاکستانی سیاستدانوں ، اعلیٰ عہدیداروں ، صحافیوں اور جرنیلوں کو ذلیل کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔ دلت نے کشمیری قیادت کا تو بھانڈہ پھوڑا ہی ہے مگر پاکستانیوں کو بھی نہیں بخشا۔ دلت نے یٰسین ملک کی ساس اور سالے صاحب کی سرگرمیوں اور کاروبار سے واضح کیا کہ یٰسین ملک اور مشعل ملک کی شادی بھی انیٹلی جنس ایجنسیوں کی کارگزاری ہے۔ اسی طرح امان اللہ خان کی بیٹی سے سجاد لون کا رشتہ بھی ہے۔ سجاد لون کا باپ عبدالغنی لون پاکستان مخالف شخص تھا جو آزادی کشمیر اور الحاق پاکستان کا صف اول کا دشمن تھا۔ عبدالغنی لون کی زندگی پر لکھتے ہوئے دلت کہتا ہے کہ وہ تو خدا کے وجود کا ہی قائل نہ تھا اور مقبوضہ کشمیر میں قائم God Less سوسائٹی کا ممبر تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ عبدالغنی لون کی موت کے بعد سجاد لون نے بتایا کہ ایک زمانے میں اُس کے والد God Less سوسائٹی کے ممبر تھے مگر بعد میں اس سوسائٹی سے الگ ہو گئے۔

امرجیت سنگھ دلت کی تحریر کئی حوالوں سے اہم ہے جس پر کسی نے توجہ نہ دی۔ دلت نے بڑے دلچسپ پیرائے میں نہ صرف پاکستانیوں اور کشمیریوں پر طنز کے تیر برسائے بلکہ جی بھر کر توہین بھی کی ہے۔ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی کے مترادف دلت نے خوبصورتی سے ہماری اہم شخصیات کی ذاتی زندگیوں کو بھی نہ چھوڑا اور جہاں موقع ملا آئینہ دکھلا دیا۔

یٰسین ملک کے متعلق لکھتا ہے کہ مشعل اور ملک کی شادی سی آئی اے کی کوشش بتلائی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ Though Strange, one theory doing the round is that Yasin's marriage is a CIA Operation to get him to marrry a Pakistani girl. The reason is that this is to get Yasin dependent on someone they know and trust.

آگے چل کر لکھتا ہے کہ

And now like the American Usman Rahim who is also married to a Pakistani.

یٰسین ملک کے سسرالیوں کے متعلق دلچسپ معلومات دیتے ہوئے دلت لکھتا ہے کہ مشعل ملک بلکہ مشعل مالوك یا ملکھ (Mulluck) کی والدہ ریحانہ مسلم لیگ خواتین ونگ کی سابق ممبر ہیں اور انتہائی تیز و طرار ہیں (Even Smarter) اوریٰسین ملک اپنی ساس کے مکمل کنٹرول میں ہیں آگے لکھتا ہے کہ :۔

Mushaal's brohter, Haider Ali Hussain Mulluck, is a Profesor at Naval war College and a fellow at the Joint special operation Univeristy in USA . But more important by , his mentor throughout his career has been david petraeus, the former military commander who also served as CIA Chief under Barack Abama.

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یٰسین ملک اور دلت کے درمیان کبھی بھی خوشگوار تعلقات نہیں رہے۔ دلت خود لکھتا ہے کہ یٰسین ملک نے کبھی بھی اُسے عزت نہیں دی اور ہمیشہ اکھڑ پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک ملاقات کا احوال لکھتا ہے کہ یٰسین ملک نے بالمشافہ ملاقات کے دوران جوتوں سمیت اپنے پاؤں میرے سامنے رکھی کافی ٹیبل پر پھیلائے اور بات کرنے سے پہلے سگریٹ سلگایا مگر میں نے محسوس نہ کیا۔ بات چیت پر صرف اتنا ہی کہا کہ ہمیں آزادی دے دو۔ دلت لکھتا ہے کہ یٰسین اب اپنی کشتیاں جلا چکا ہے۔ وہ تو بولیویا کا چی گوارا ہے اور نہ ہی کشمیر کا فاروق عبداللہ ؟یٰسین ملک کے متعلق بہت کچھ لکھنے کے بعد وہ حتمی فیصلہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :I will always think of Yasin as the James dean of Maisuma. ہمارے لوگوں کی ذہنیت اور بھارتیوں کے بخار میں مبتلا لوگوں کے متعلق لکھتے ہوئے دلت کہتا ہے کہ :

There was also a fellow running a TV channel, Ejaz Haider. He called me up while i was at Lahore and asked me to come on show.

میرے انکار پر اس نے کہا :

No, no, I need you, please come, he said.

شو کے بعد اُس نے کہا کہ یہ بڑی بات ہے پہلی بار را کا چیف کسی پاکستانی

ٹیلیوژن چینل پر آیا ہے اسی صفحہ پر لکھتا ہے کہ ایک کانفرنس کے دوران مجھے اور میری بیگم پران کو مشہور سیاسی اور سفارتی شخصیت محترمہ شیریں رحمان نے کلفٹن میں واقع اپنے انتہائی خوبصورت گھر میں مدعو کیا جہاں وہ اپنے تیسرے شوہر کے ہمراہ رہائش پزیر ہیں۔ان کا خاوند انتہائی نفیس (چارمنگ پرسن) شخص جو زندگی کی تمام آسائیشوں سے بھرپور زندگی بسر کرتا ہے۔اس ڈنر پر ہمارے علاوہ دیگر مہمان بھی تھے جن میں محترمہ کا دوسرا اسابق خاوند بھی موجود تھا۔ مہمانوں میں ٹیلی ویژن اینکر نسیم زہرہ بھی شریک ہوئیں اور پھر انہوں نے مجھے کیسپر کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

And they began calling me casper, which i understood is the name of a friendly ghost on an American Tv show.

سابق آئی ایس آئی چیف، سعودی عرب اور جرمنی میں رہ چکے پاکستانی سفیر اور مہران بینک سکینڈل کے اہم کردار جنہیں حکومت پاکستان نے اُن کی سابق کارستانیوں کے بعد ٹریک ٹوڈپلومیسی میں بھی اہم رول دیا کے متعلق دلت لکھتا ہے کہ اسلام آباد میں ہونے ولی ایک میٹنگ کے بعد مجھے اپنی ایمبیسی میں کاک ٹیل پارٹی پر جانا تھا۔ اُس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے اس لیے میں نے اسلام آباد میں شاپنگ کا پروگرام بھی کینسل کر دیا۔ میں نے جنرل اسد درانی کو اپنی مصروفیات کا بتایا تو موصوف نے کہا

would you care to have a drink? General Sahib it is five in the afternoon and so bloody hot, i said in any case, where is the drink here, i have got a bottle in my car, he said. if you are interested i will bring it up to your room

وہ اپنی کارے سے بلیک لیبل کی بوتل لائے اور شام کے پانچ بجے ہم نے شراب پی ہم نے مے نوشی کا لطف اُٹھایا اور ایک دوسرے کی چٹکیاں لیں We enjoyed taking digs at eachother قارئین کرام یہ ہے ہماری کشمیر پالیسی اور وطن دشمن قوتوں سے ہم آہنگی۔ کلبوشن براستہ ایران آئے یا امرجیت سنگھ دہلی سے، بات ایک ہی ہے۔ اصل چیز دشمن ایجنٹ نہیں بلکہ اس کے سہولت کار ہماری اجتماعی ذھنیت اور مقامی ایجنٹ ہیں جو اپنے کردار اور افعال سے کسی نہ کسی صورت ملک دشمنی کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اپنی نمود نمائش سے لیکر کاروبار دشمن ملکوں سے مراعات اور دیگر لوازمات کو ملک کی سلامتی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جنرل درانی جیسے کرداروں کا انتہائی اہم اور حساس عہدوں پر فائز رہنا اور پھر بلیک لیبل ڈپلومسی سے منسلک ہونا انتہائی خطرناک ہے۔ اگر کشمیر کا مسئلہ شراب کی بوتل پر حل ہونا ہے تو بہتر ہے کہ اُسے قدرت کے فیصلے پر چھوڑ دیا جائے۔ کشمیر سیاسی، علاقائی اور انسانی مسئلہ ہی نہیں

بلکہ ایک روحانی اور دینی مسئلہ بھی ہے۔ کشمیر علمائے حق اور اولیائے کاملین کی جاگیر ہے جسے کوئی شرابی ٹولہ حل نہیں کر سکتا۔ انوار ایوب راجہ اپنی کتاب لینٹھا میں ایک کشمیری مجاہد کرنل عبدالحق مرزا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ کرنل صاحب وادی کشمیر میں جانے سے پہلے وادی نیلم گئے اور وہاں کی مشہور دینی اور روحانی شخصیت جناب حافظ برکت اللہ صاحبؒ سے دواریاں شریف میں ملے۔ کرنل صاحب نے حافظ صاحب سے دعا کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا کہ میں کیا کروں والئی کشمیر نہیں مانتے۔ والئی کشمیر کیسے مانیں؟ صرف جنرل درانی ہی نہیں بلکہ ساری کشمیری قیادت سوائے چند ایک کے بلیک لیبل کی شوقین ہے۔ آزاد کشمیر کا سیاسی شرابی کلچر تو ساری دنیا میں مشہور ہے۔ وزیر صاحبان کبھی ائیر پورٹوں پر اور کبھی اُڑتے جہازوں میں شراب کی بوتلیں لہراتے اور اُدھم مچاتے ہیں تو کبھی مظفرآباد کے ہوٹلوں میں شراب پی کر اپنے ہی وطن کی بیٹیوں سے اجتماعی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بھارتی درندوں اور آزاد کشمیر کے سیاستدانوں میں کیا فرق ہے؟ کوئی ہے جو اُسکا جواب دے۔

کلبوشن یادو ایک ایجنٹ نہیں بلکہ ادارہ ہے جسکے اصل ایجنٹ ہماری سیاست، صحافت، صنعت اور سفارت تک ہر شعبے میں موجود ہیں۔ کردار کی گراوٹ کا یہ حال ہے کہ مرحوم سردار عبدالقیوم خان کیساتھ دہلی جانیوالا آزاد کشمیر کے

سیاستدانوں کا وفد رات بھر شراب خانوں میں مد ہوش رہا۔ انوراایوب راجہ اپنی تحریر سرزمین بے آئین " میں لکھتے ہیں کہ ایک آئین کے باوجود ملک بے آئین ہے ایسا " آئین جس پر خود حکمران عمل نہیں کرتے اُسے آئینی اور جمہوری حکومت یا ملک کیسے کہا جاتا ہے۔ جس مقدمے پر دس دن فیصلہ ہو سکتا ہے، عدالتیں اُسے دس سال تک طول دیتی ہیں چونکہ عدلیہ سپریم ہے اور جو چاہے کر سکتی ہے۔

وطن عزیز میں اپنا وکیل وہ نہیں جو علمی قابلیت رکھتا ہو بلکہ اچھا وکیل وہ ہے جو لاکھوں اور کروڑوں میں فیس لیتا ہو اور اپنی پسند کا فیصلہ کروانے کا ماہر ہو۔ اسی طرح اچھا سیاستدان وہ نہیں جو عوام دوست ہو بلکہ وہ ہے جو غنڈوں کی فوج لیکر چلتا ہو، بڑے محلوں میں رہتا ہو اور کروڑوں کی گاڑیوں میں سفر کرتا ہو۔ کرپٹ ہو، مل مالک ہو اور اربوں کی بے نامی جائیدادوں کا مالک ہو۔ مصنف لکھتا ہے کہ ہمارے عوام ایسے سیاستدانوں سے محبت کرتے ہیں اور جانیں تک نچھاور کر دیتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے المیے کا ذکر کرتے ہوئے انوار ایوب راجہ لکھتے ہیں کہ راکے بریگیڈیئر راج بیگ سنگھ نے پہلے مشرقی پاکستان کی سرحد پر سو سے زیادہ ٹریننگ سنٹر کھولے جہاں مکتی بانی کو فوجی تربیت دی جاتی تھی اور بعد میں

یہ ٹریننگ سنٹر مشرقی پاکستان کے اندر نہ صرف کام کرنے لگے بلکہ مختلف مقامات پر پاک فوج پر حملہ کرنیوالی مکتی بانی فورس کو قیادت بھی مہیا کرنے لگے۔ مصنف لکھتا ہے کہ نہ جانے کتنے راج بیگ سنگھ بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں مصروف عمل ہونگے اور پڑوسی ممالک کی مدد سے وطن عزیز کو نقصان پہنچا رہے ہونگے سات سال پرانی اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے آج بھی حرف با حرف سچ ثابت ہو رہا ہے۔ اسی تحریر میں ایرانی مفادات اور بھارت سمیت دیگر ممالک سے تعلقات کا بھی ذکر ہے۔

دیکھا جائے تو آج ہمارے اپنے ہی لوگ کلبوشن اور راج بیگ سنگھ کا روپ دھارے وطن کی سلامتی کے درپے ہیں اگر اندر سے کوئی کنڈی نہ کھولے تو چور آسانی سے گھر میں نہیں گھس آتا آج ہمارے سیاستدانوں اور حکمرانوں نے نہ صرف گھر کے دروازے کھول رکھے ہیں بلکہ دیواریں بھی کھوکھلی کر دی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ پاک فوج جو اس مقدس گھر کی محافظ ہے اور پوری طرح چوکس ہے۔ ورنہ براستہ ایران افغانستان اور واہگہ سے آنیوالے کیسپر اور اُن کے میزبان ہمہ وقت اس گھر کو برباد کرنے کا تہیہ کے ہوئے ہیں۔ پاکستان ان کا عارضی گھر ہے جہاں یہ لوگ صرف عیش کرنے اور حکمرانی کرنے آتے ہیں۔ یہ لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کا دوسرا روپ ہیں جو سب کچھ لوٹ کر بیرون ملک لے جا رہے ہیں۔

مسلمان خطرے میں ہے

جب سے پاکستان بنا ہے اس کی عظمت ، حرمت ، بقا و سلامتی کے خلاف جس قدر خود پاکستانیوں نے سازشیں کیں کسی اور نے نہ کیں۔ پاکستان بننے سے پہلے اور بعد مذہبی سیاسی جماعتوں نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ذات پر حملے کیے اور تقسیم ہند کی بھرپور مخالفت کی ۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے فوراً بعد مسئلہ کشمیر سامنے آیا تو ان ہی سیاسی جماعتوں نے جہاد کشمیر کو فساد قرار دیا اور کشمیری مسلمانوں کے حق میں کبھی کلمہ خیر نہ کہا۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کی رحلت کے بعد اقتدار مسلم لیگی جاگیرداروں ، بیوروکریسی اور غیر ملکی ٹھیکی داروں کے ہاتھ میں آیا جن کا اولین مقصد اقتدار کی کرسی پر براجمان رہنا اور اپنے غیر ملکی آقاؤں کو خوش کرنا تھا۔

سابق مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ بنگالی مسلمانوں کا رہن سہن ، تہذیب وثقافت مغربی پاکستانیوں سے مطابقت نہ رکھتی تھی اور نہ ہی وہاں جاگیرداری نظام تھا ۔ مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمان زیادہ روشن خیال ، دینی امور کے پابند ، سادہ زندگی کے عادی ، مزدور ، کسان ، ماہی گیر اور محنت کش تھے ۔ یہ لوگ اپنی ہزاروں سالہ ثقافتی اور روایتی زندگی کے عادی

تھے جس کی وجہ سے وہ مغربی پاکستانی متکبر اور خود سر بیوروکریسی اور غلامانہ ذہن کی حامل جاگیر دارانہ سیاست سے نبھاہ نہ کر سکے۔ سوچ و فکر کی نا ہمواری اور مغربی پاکستان میں رائج جاگیر دارانہ اور متکبرانہ سیاسی ماحول نے دونوں حصوں کے مسلمانوں میں سوچ ، فکر اور جذبہ حب الوطنی کو مشکوک کر دیا اور ایک ایسا فکری اور تمدنی خلا پیدا ہوا جسے ہمارے ازلی دشمن بھارت نے اپنی شاطرانہ پالیسیوں سے پر کیا۔ وہ غیر ملکی آقا جو سیاسی اشرافیہ اور جاگیر دارانہ سیاسی سوچ کے پشت پناہ تھے وہ بھی بھارت سے جا ملے اور آخر کار اس قوم نے وہ دن بھی دیکھا جب اندرا گاندھی نے دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں غرق کرنے کا نعرہ بلند کیا۔ قائداعظمؒ کے پاکستان کے دو ٹکڑے ہوئے تو دونوں جانب سوشلسٹ نظریات کی پرچارک سیاسی جماعتیں برسر اقتدار آئیں مگر عوام کی حالت ویسی ہی رہی جیسے پہلے تھیں۔ بنگالی مسلمان اس بات پر حیران تھے کہ انہوں نے پاکستان سے علیحدگی سے کیا پایا ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کے خلاف بغاوت کے صلے میں بھارتی تسلط ملا تو بھارتی فوجی اور سویلین لٹیروں نے شہر اور گاؤں لوٹ لیے ، فیکٹریاں اور ملیں اُٹھا کر بھارت منتقل کر دیں ، بینک لوٹے اور ہزاروں جوان عورتیں اغوا کر کے لے گئے۔ بھارتی درندوں اور ڈاکوؤں سے جو بچا وہ مکتی باہنی اور عوامی لیگی غنڈوں نے لوٹنا شروع کیا اور عام آدمی کی زندگی اجیرن کر دی۔ مسلمان ہی مسلمان کا دشمن بنا ، ایک دوسرے کا خون بہایا ، ملک تباہ کیا اور مغربی پاکستان سے

ملی آزادی کو ہمیشہ کے لیے عوامی لیگ اور بھارت کی غلامی میں بدل دیا۔
1971 کے بعد مغربی پاکستان مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کا پاکستان بن گیا اور اس نئے پاکستان میں عوامی نیشنل پارٹی، پیپلز پارٹی، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام اور دیگر علاقائی جماعتوں میں سوچ و فکر کے علاوہ لسانی، علاقائی، صوبائی اور مسلکی کشمکش شروع ہو گئی۔ سازشوں نے بغاوتوں کا روپ دھارا تو متفقہ آئین بھی کسی کام نہ آیا۔ عوامی نیشنل پارٹی اور بلوچ سردار افغانستان روس، بھارت، عراق، شام اور مصر کی گود میں جا گرے اور بلوچستان میں بغاوت ہو گئی۔ آزاد بلوچستان، پختونستان اور سندھو دیش کی تحریکوں نے زور پکڑا تو اجمل خٹک سمیت بلوچ اور پختون لیڈروں نے جلال آباد اور کابل میں ڈیرے ڈال لیے جہاں را، خاد، مساد، کے جی بی اور کسی حد تک ساوک نے بھی انہیں مالی، سیاسی، صحافتی اور سفارتی امداد فراہم کی۔ تحریک استقلال کو کچھ عرصہ تک ایران نے سپورٹ کیا مگر بعد میں اسے کسی بھی ملک نے گلے نہ لگایا۔
بات یہاں ہی ختم نہ ہوئی اور مذہبی سیاسی جماعتوں نے اپنے ہم مسلک پیٹرو ڈالر سے مالا مال عرب بھائیوں سے چندہ، خیرات، زکواۃ تو وصولا ہی مگر ساتھ ساتھ مسلکی بنیاد پر قائم ہونے والے لاکھوں مدارس کے لیے اربوں ڈالر

بھی وصول کیے ۔ اسی مسلکی ، لسانی اور علاقائی کشمکش نے پاکستان کو سرد جنگ کا تھیٹر بنا دیا اور دنیا بھر کی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اپنے سفارتخانوں اور ہمدردوں کے ذریعے پاکستان کو سوچ و فکر کی جنگ کا میدان بنا دیا۔ رہی سہی کسر روس وافغان جنگ نے پوری کی اور پھر دہشت گردی نے وطن عزیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

پیپلز پارٹی اور نواز لیگ نے اقتدار کی باریاں لینی شروع کیں تو دہشت گردی کے ساتھ کرپشن اور لوٹ مار پاکستانی سیاست کا بنیادی جز بن گیا۔ کک بیک ، بیرون ملک سرمائیہ کی منتقلی اور کمیشن مافیا نے لینڈ مافیا، واٹر مافیا، پٹرول مافیا اور دیگر مافیا جات کو جنم دیا تو لوٹ مار کی دولت سے بڑے بڑے پلازے ، مارکیٹیں اور عظیم الشان ہاؤسنگ سکیمیں معرض وجود میں آگئیں جن سے ملک کے اندر کئی آزاد جزیرے اور خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔

دیکھا جائے تو ملک میں نہ جمہوریت ہے اور نہ آمریت بلکہ مافیا کی حکمرانی ہے۔ بھتہ خوری ، ٹارگٹ کلنگ ، اغوا برائے تاوان ، جبری قبضہ ، بے دخلی اور دہشت گردی کے باقائدہ ادارے قائم ہیں جنہیں پولیس ، میڈیا اور دیگر حکومتی اداروں کی مدد حاصل ہے۔ مشہور صحافی اور دانشور یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ پانامہ لیک جیسے قصے حکمران خاندان کا کچھ نہیں بھگاڑ سکتے ۔ آخر کروڑوں

پاکستانیوں نے انہیں ووٹ دیے ہیں۔ دانشور صحافی نے ٹھیک کہا ہے۔ اگر یہ لوگ جیل میں ہوں تب بھی ان ہی کو ووٹ دینگے۔ اس ملک کے اسی فیصد ووٹر ان لوگوں کی ملوں کے مزدور، زمینوں پر کام کرنیوالے ہاری اور کسان، گھروں اور کاروباری اداروں کے ورکر اور کامے ہیں۔ صحافی، سرکاری ملازم اور کارندے ان کے تنخواہ دار غلام ہیں۔ دہشت گرد، غنڈے اور مافیاکے سرغنے ان کے بزنس پارٹنر اور مفادات کے محافظ ہیں۔ اگر لوگ انہیں ووٹ نہیں دینگے، بھتہ اور رشوت سے انکار کرینگے، لوٹ مار اور کرپشن کی راہ میں حائل ہونگے تو اُن کا حشر بلدیہ ٹاؤن فیکٹری کے مزدوروں، ماڈل ٹاؤن کے مرکز منہاج القرآن، اقبال پارک میں تفریح کے لیے آنیوالے شہریوں آرمی پبلک سکول اور باچا خان یونیورسٹی کے طالب علموں جیسا ہوگا۔ آیان علی کا، تفتیش کار آفیسر قتل ہوگیااور جرمانہ کرنیوالا مجسٹریٹ تبدیل کر دیا گیا۔ شاہ رخ جتوئی اور مصطفےٰ کانجو کو معافی نامہ مل گیااور جن غریبوں کو ایس ایم ظفر، اکرم شیخ، اعتزاز احسن، بابر اعوان اور دیگر نامور وکیلوں تک رسائی نہ تھی وہ کب کے پھانسی پر جھول گئے۔ قانون اور انصاف کا بول بالا غریب، غیرت مند، بے قصور اور بے سہارا کے خون پر ہوتا ہے۔ جو رشوت کی سکت نہیں رکھتا اسکا چالان کبھی پیش نہیں ہوتا اور نہ عدالتیں انصاف کرتی ہیں۔

آج ملک کرپشن، مفادات، لوٹ مار، مافیا جات اور دہشت گردی کا شکار ہے اور

میڈیا ان کی آواز ہے۔ طالبان اور داعش کے علاوہ نان کائینیٹک اور فورتھ جنریشن وار وطن عزیز پر مسلط ہے۔ جبکہ سیاسی اور دینی قیادت اس قابل نہیں کہ وہ اس چوطرفہ یلغار کا سامنا کرسکے۔ دیکھا جائے تو محسوس اور غیر محسوس انداز میں ہر سطح کے قائدین کسی نہ کسی طرح اس جنگ کا حصہ ہیں اور یلغاریوں کے مددگار اور سہولت کار ہیں۔

ملکی سطح پر دیکھا اور پرکھا جائے تو آرمی چیف جنرل راحیل شریف اور اُن کے کچھ رفقائے کار نان کائینیٹک اور فورتھ جنریشن وار سمیت دیگر شرور سے بخوبی آگاہ ہیں اور ہر میدان میں اُنکا مقابلہ بھی کر رہے ہیں مگر جو لوگ عوامی نمائندگی اور جموریت کے لبادے میں بیان کردہ شیطانی اور فسادی قوتوں کے آلہ کار ہیں وہ نہ صرف وطن دوست اور محافظ قوتوں کے مخالف ہیں بلکہ اُن کے دشمن بھی ہیں۔

عالمی سطح پر دیکھا جائے تو کسی بھی جگہ ماحول خوشگوار نہیں۔ افغانستان، شام، لیبیا، عراق، یمن اور لبنان دینا کے نقشے پر تو ہیں مگر دنیا کا حصہ نہیں۔ ان ملکوں کے عوام در بدر ہیں اور وار لارڈ حکمران ہیں۔ مصر، اُردن، مراکش اور سوڈان جیسے ملک اندرونی الجھاؤ میں ہیں اور بیرونی مدد کے سہارے چل رہے ہیں مشرقی بعید اور سنٹرل ایشیائی ممالک پر سکتہ طاری ہے۔

جبکہ بنگلہ دیش عملاً بھارت کے زیر سائیہ ہے۔ ایران، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں پر بھارت کا اثر غلبے اور تسلط کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ ایرانی صدر نے اسلام آباد آ کر بیان دیا ہے کہ بھارت ہمارا دوست ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ بھارت ایران کی بندر گاہ چاہ بہار کو گوادر کے.برابر لانے اور چینی سرمایہ کاری کو روکنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ ایک طرف پاکستان چین کوریڈور منصوبے پر کام کر رہا ہے تو دوسری جانب تاپی گیس منصوبے کے ذریعے بھارت کو مالا مال کرنے پر بھی کار بند ہے۔ بھارت پاک ایران گیس منصوبے سے الگ ہے اور پاکستان بھی اس پر زیادہ زور نہیں دے رہا۔ بھارت اور ایران کے دوستانہ تعلقات کے علاوہ ایران سعودی عربیہ مخالفت بھی زوروں پر ہے۔ دونوں ملک سفارتی، معاشی، صحافتی اور دیگر کئی محاذوں پر حالت جنگ میں ہیں۔

اسلامی تاریخ میں فتح مکہ کے بعد نبی آخر الزماں ﷺ نے کعبہ شریف کو بتوں سے پاک کیا اور اب سو سال بعد سرزمین عرب پر بھارتی وزیر اعظم عالم اسلام کے بد ترین دشمن، لاکھوں مسلمانوں کے قاتل اور دہشت گرد نریندر مودی کی خوشنودی کی خاطر ایک جدید بت خانہ قائم ہوا ہے۔ بات یہاں ہی نہیں رکی بلکہ خادم حرمین شریفین شاہ سیلمان نے اسی مودی کو رسول خدا کی دھرتی پر دعوت دی اور سعودی عرب کا سب سے.بڑا سول ایوارڈ بھی دیا۔ سعودی عرب کی زمین پر پہلی بار ایک اور کام بھی ہوا کہ مودی جیسے دشمن اسلام کے سامنے عرب حسیناؤں کو

پیش کیا گیا جنھوں نے دشمن امت رسول ﷺ کے سامنے اپنے نقاب اُلٹ دے اور مسکراہٹوں کے ساتھ اس ناپاک درندے سے ہاتھ ملائے۔

دیکھا جائے تو ترکی کے بعد پاک فوج ہی میدان میں کھڑی ہے اور ہر طرح کی یلغار کا مقابلہ کر رہی ہے۔ ترکی یورپ کا دروازہ ہے۔اور یورپین ممالک نہ چاہتے ہوئے بھی ترکی کی طرفداری پر مجبور ہیں۔ پاکستان گریٹ گیم کا مرکز ہے۔ اور عالمی قوتوں کے نشانے پر ہے۔ سیاسی قیادت ذاتی اور مفاداتی سوچ کے دائرے میں مقید ہے اور مافیا عملاً حکمران اور قانون اور آئین کی حددود اور قید سے آزاد ہے۔

پاک فوج ایک طویل جنگ لڑ رہی ہے جسے اندرونی سازشوں اور بیرونی حملہ آوروں کا سامنا ہے۔ پاک فوج کی تربیت اور پاکستانی سپاہی کا جذبہ حب الوطنی اور جذبہ ایمانی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ طویل جنگ لڑنے کا حوصلہ اور ہمت رکھتا ہے۔ آج مسلمان کس قدر غیر محفوظ اور بے یارو مددگار ہے کہ ایران اور سعودی عرب جیسے اسلامی ممالک کو مودی جیسے بت پرست کے سامنے جھکنا پڑ گیا ہے۔ پاکستانی سیاستدان، حکمران، مافیا اور اشرافیہ بھی خوف میں مبتلا ہے اور اپنے اثاثے اور اولادیں یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک میں منتقل کر رہے ہیں ۔ دوسری طرف ایک اور طبقہ ہے کہ جب کسی کا بیٹا وطن کی آبرو پر جان

نچھاور کرتا ہے تو اُس کی ماں اور باپ دوسرا بیٹا جنرل راحیل شریف کے سپرد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے اُسی جگہ تعینات کردو جہاں اس کا بھائی شہید ہوا ہے۔ شہیدوں کی بیوائیں اپنے بچوں کو میدان جنگ میں جانے کی ترغیب دے رہی ہیں اور تربیت کر رہی ہیں۔ بہنیں اپنے شہید بھائیوں کی بہادری کے گیت گاتی ہیں اور شہیدوں کی شان میں نظمیں لکھتی ہیں۔ جس گاؤں میں جس قدر شہیدوں کے مزار ہیں اُس گاؤں کے نوجوان اسی قدر پر جوش اور پر عزم ہیں جبکہ حکمرانوں کے بچے فخر سے کہتے ہیں کہ الحمد اللہ بیرون ملک اربوں کھربوں کے اثاثے ہمارے ہیں جو ہم نے اس ملک کو لوٹ کر بنائے ہیں۔ خون کا نذرانہ پیش کرنے والے اور لوٹ مار کرنیوالے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ بھول رہے ہیں کہ جب انسانوں کے بنائے قوانین انصاف نہ کریں تو خدائی قوانین حرکت میں آجاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو آج مسلمان ہر جگہ خطرے میں ہے اور اُسکی وجہ بد اعمالی اور دین سے دوری ہے۔ اسلام ایک عقیدہ ہے اور خدا کا متعین کردہ اصول ہے جسے کبھی زوال نہیں آسکتا۔

قاضی کہاں ہے

ماہرین عمرانیات کہتے ہیں کہ انسانوں نے باہم رہنا شروع کر دیا تو بستیاں آباد ہو گئیں۔ پھر بستیوں کی تعداد بڑھ گئی تو ایک قبائلی معاشرہ بن گیا۔ معاشرہ بنا تو معاشرتی مسائل نے بھی جنم لیا۔ جن میں عورتوں، زمینوں، جائیدادوں، جانوروں، پانی کے کنوؤں سے لیکر جنگلوں اور پہاڑ کی ملکیت تک کے جھگڑے لڑائیوں اور قتل و غارت کا موجب بننے لگے۔ اِن جھگڑوں اور مسائل سے نبرد آزماء ہونے کیلئے قبائلی لیڈروں اور سرداروں نے ملکر کچھ اصول بنائے اور باہمی رضامندی سے ایک قبائلی ریاست کا وجود سامنے آیا۔ چونکہ ہر شخص اِس ریاست کے امور چلانے کا اہل نہیں تھا۔ اس لئے ایک دانا شخص کو منصف مقرر کر دیا گیا۔ جو حالات، واقعات اور گواہوں کے بیانات کی روشنی میں فیصلے کرتا اور منصف کا ماتحت عملہ ان فیصلوں پر عمل درآمد کرواتا۔ یوں کچھ بنیادی اصولوں جنہیں ابتداء میں قوانین کی حیثیت حاصل تھی ایک منصف یا جج کی عقلی دلیل اور علم کی روشنی میں معاشرتی اور ریاستی امن و ترقی کا موجب بنا۔

معاشرہ و ریاست جدید ہو یا قدیم اُس کی ترقی اور امن بنیادی اصولوں اور

قوانین کے نفاذ اور ایک منصف یا جج کے اِن اصولوں اور قوانین کے تحت فیصلوں سے ہی ممکن ہے۔ مملکت خداداد پاکستان کی حالت زار دیگر مسلمان ملکوں سے مختلف نہیں۔ چونکہ مسلمان حکمران عدلیہ اور پولیس یعنی قاضی اور اُس کا ماتحت عملہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور ان سے اخذ کردہ قوانین سے نہ صرف مبرا ہیں بلکہ ان کے عملی نفاذ سے بھی روگرداں ہیں۔ جب حکمرانوں، قاضیوں اور ماتحت عملے پر کسی قانون کا نفاذ نہ ہو اور اُن کی خواہش، آسائش اور حکم کو ہی اصول، قانون اور ریاستی وجود تصور کرلیا جائے تو محض ایک برائے نام اسلامی معاشرہ اور ریاست زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ دیکھا جائے تو آج ملک ایک عجیب بحران سے دوچار ہے۔ مگر سوائے فوج اور فوج کی معاونت کرنیوالے انٹیلی جنس اداروں کے کوئی ادارہ کام نہیں کررہا۔ حکمران جماعت اور اپوزیشن ملکی وسائل لوٹنے اور لوٹی ہوئی دولت بیرون ملک منتقل کرنے میں لگی ہوئی ہیں اور میڈیا اسے اچھالنے اور مال کمانے پر۔ عدلیہ خاموش ہے اور کبھی کبھی اپنی بے بسی یا پھر حکمرانوں کو اصولوں اور قوانین کی پاسداری کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ کوئی معزز جج یا خود جناب چیف جسٹس کسی تقریب میں یا پھر عدالت میں ایسا جملہ کہہ دیتے ہیں جس سے عدالتی وجود اور قاضی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ملک کے اندرونی مسائل کا تجزیہ کیا جائے تو تمام تر اندرونی مسائل تین بڑے مسئلوں سے منسلک

ہیں اوران تین بڑے مسئلوں کی بنیاد عدل کا فقدان ہے۔اگر عدلیہ چاہے تو یہ تین مسئلے تین ماہ میں ختم ہو سکتے ہیں اور ملک میں خوشحالی اورامن بحال ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلا مسئلہ بُری حکمرانی ہے جس کی ذمہ دار عدلیہ ہے۔اگر آئین کی شک 62اور 63 کا من و عن نفاذ ہوتا تو کوئی کرپٹ، نااہل، سمگلر، ڈاکو، چور، نام نہاد پیر، عالم دین اور نو دولتیا جاگیردار اسمبلی میں نہ آتا۔الیکشن سے پہلے جب یہ لوگ بحیثیت امیدوار جج صاحبان کے سامنے پیش ہوئے تو معزز و محترم ججوں نے نہ صرف آئین کی شق 62اور 63 کا مذاق اڑایا بلکہ اسلامی اصولوں اور قوانین کی بھی توہین کی۔ ججوں نے شادیوں کی تعداد، ازواج کیساتھ شب بسری کے اوقات، قومی ترانہ، آیت الکرسی، دعائے قنوت اور نماز کی چند دعائیں سنیں اور الیکشن لڑنے کا اہل قرار دے دیا۔ بہت سے امیدوار سزا یافتہ تھے جن کی سزائیں الیکشن سے پہلے معاف کردی گئیں اور جن لوگوں نے بینکوں سے قرض لیکر ہڑپ کئے تھے انہیں بھی معافی نامے اور اجازت نامے جاری کردیئے گئے۔اگر عدلیہ چاہے تو ان تمام سزایافتگان، ٹیکس چوروں اور دھوکہ دہی کے ذریعہ الیکشن لڑنے والوں کی سابق سزاؤں کو بحال کردے اور نہ صرف انہیں اسمبلیوں سے باہر نکال دے بلکہ جرمانوں کے ساتھ سزائیں بھی دے۔

عدلیہ نے کئی بار نیب کو ڈیڈ لائن دی مگر نیب چیئرمین نے کسی بھی ڈیڈ لائن پر کام مکمل نہ کیا۔ میگا کرپشن کیسوں سے لیکر نندی پور، اورنج ٹرین، میٹرو بس، انرجی منصوبے، ہاؤسنگ سکیموں کی لوٹ مار اور ملک کے اندر ذاتی ریاستوں کے قیام سے لیکر بیرون ملک اثاثے اور اب پانامہ پیپر تک نیب نے کسی بھی مسئلے پر دھیان نہیں دیا اور نہ ہی عدلیہ اور الیکشن کمیشن اِن مسائل پر دھیان دینے کے موڈ میں ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ کسی کرپٹ سیاستدان، نااہل اور غاصب حکمران کو عدلیہ، الیکشن کمیشن، عوام یا پھر نیب کا ذرہ بھر ڈر نہیں اور نہ ہی کسی اصول کی پاسداری اور قانون کے نفاذ کا خوف ہے۔ سیاسی جماعتیں اپنے قائدین کی کرپشن کا دفاع کر رہی ہیں اور اُن کے اعلیٰ ترین عہدیدار اور وزیر میڈیا پر اسے جائز اور درست قرار دے رہے ہیں۔ کچھ کالم نگار اور نام نہاد دانشور کعبے میں جا کر قسم کھانے کو تیار ہیں کہ اُن کے پسندیدہ عہدیدار اور حکمران فرشتہ سیرت انسان ہیں۔ اکثر تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ جناب آصف زرداری، نواز شریف، الطاف بھائی اور دیگر سیاستدانوں اور حکمرانوں کو نومبر کا انتظار ہے۔ یہ لوگ بینڈ بجاتے، دھمال ڈالتے اور گیت گاتے پاکستان آئینگے اور نہ صرف ملک کی اینٹ سے اینٹ بجائینگے بلکہ ملک کو کنگال کرکے کسی سُپر پاور کے حوالے کردینگے۔

آخر کیا وجہ ہے ان لوگوں نے ایسا کیوں تصور کر رکھا ہے کہ جنرل راحیل شریف کے بعد آنیوالا آرمی چیف ان کی ذاتی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کرلیگا۔ یہ بہت بڑا سوال ہے جس پر نہ صرف فوج بلکہ ہر ذی شعور اور حب الوطن شہری کو سوچنا ہوگا۔ ایم کیو ایم اور بھارتی خفیہ ایجنسی کے تعلقات سب کے سامنے ہیں مگر حکومت اسپر خاموش ہے۔ اچکزئی اور افغان انٹیلی جنس ایجنسی کے تعلقات کی ویڈیو فلمیں ٹی وی دکھا چکے ہے مگر حکومت نے اسپر توجہ نہ دی چونکہ اچکزئی برادران حکومت کا حصہ ہیں۔ عوامی نیشنل پارٹی اور بھارت کے تعلقات ڈھکی چھپی بات نہیں۔ جبکہ مولانا فضل الرحمٰن کے بیرونی دنیا سے تعلقات بھی تحقیق طلب ہیں۔ جناب آصف علی زرداری اور اسحاق ڈار کے بیرون ملک اثاثے پاکستان کے مجموعی اثاثوں سے کسی طور کم نہیں اور اب وزیراعظم پاکستان کے معصوم بچوں کے اثاثوں کا حجم شائد ملکی اثاثوں سے کئی گنا بڑھ کر ہیں۔ بظاہر تو فوج نے اس لوٹ مار پر کوئی بیان جاری نہیں کیا مگر کوئی بات ایسی ہے کہ پاکستان کی سب سیاسی جماعتیں اور لیڈر کسی خوف میں مبتلا ہیں اور نومبر تک کے عرصے کو گندی سیاست اور کرپشن سے کمائی ہوئی دولت کیلئے بُرا شگون تصور کئے ہوئے ہیں۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ عوام کی نمائندگی کی

دعویدار سیاسی جماعتوں اور آئین کی محافظ قومی اسمبلی اور سینٹ ممبران کو نہ تو عوام کے سامنے جوابدہی کا خوف اور نہ کسی آئین و قانون کی پاسداری کا خیال ہے۔ وہ عوام کی نبض کو جانتے ہیں اور انہیں پتہ ہے کہ عوام میں اتنا شعور ہی نہیں کہ وہ ان کا احتساب کر سکیں۔ عوام کی حیثیت غلامانہ ہے اور وہ رعایا کی طرح بادشاہوں کا حکم ماننے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کرپٹ اور لٹیرے سے پوچھا جائے تو وہ پورے تکبر اور تڑی سے کہتا ہے کہ فیصلہ عوام پر چھوڑو۔ پانچ سال بعد عوام فیصلہ کرینگے۔ اُنہیں یقین ہے کہ عوام میں ہمت اور شعور نہیں کہ وہ احتساب کریں۔

پاکستان کے اندرونی حالات اسقدر ابتر ہیں کہ کسی بھی وقت کوئی بڑا حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔ پچھلی اور موجودہ حکومت نے ملکر دہشت گردی کو پروان چڑھایا ہے جس میں دہشت گردوں کی بھتہ خوروں، اغواء کاروں اور سمگلروں اور بیرون ملک دولت جمع کرنیوالوں کے ذریعے مالی معاونت، الیکشن میں ووٹوں کا حصول، اپنے ملٹری ونگز کی تربیت اور اسلحہ کی ترسیل شامل ہے۔ پچھلی اور موجودہ حکومت نے قومی اداروں کو ناکارہ اور کھوکھلا کر دیا اور کوئی بھی ادارہ فعال کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ بیرونی قرضوں کا بوجھ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ ملک دیوالیہ ہونے کے قریب ہے۔ کرپشن انتہا کو چھو رہی ہے اور عام آدمی کی جان و مال کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری نہیں رہی۔ جرائم پیشہ

عناصر کو حکومت کی آشیر باد حاصل ہے اور عدلیہ کا رویہ نرم ہے۔اس کی بڑی مثال عیان علی کے پچیس سے زیادہ پھیرے ہیں۔ پکڑے جانے کے باوجود یہ ثابت نہیں ہوا کہ چوبیس بار پانچ کروڑ کس کے لئے جاتے تھے؟اس کے علاوہ درجنوں اداکارائیں ، ماڈلز ، فنکار اور صحافی بھی اسی طرح کے کارناموں میں ملوث ہیں مگر کسی کو ان کی پرواہ نہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں ہونے والے قتل عام، مصطفیٰ کانجو اور جتوئی کے دن دیہاڑے فائرنگ کے شوق کو بھی قتل کی شوقیہ واردات سمجھ کر درگزر کردیا گیا ہے۔لاہور ایئرپورٹ پر پکڑے جانے والے سونے کے بیوپاری اور ان جیسے دیگر بیوپاریوں اور ان کے سہولت کاروں پر بھی قانون کی گرفت نہیں اور نہ ہی عدلیہ متحرک ہے۔بڑے قانون دانوں اور وکیلوں کا خیال ہے کہ از خود نوٹس حکومتی کاروبار میں مداخلت ہے اور اچھی روایت نہیں۔ سیاستدان اور سیاسی مفکر کہتے ہیں کہ مارشل لاء کسی مسئلے کا حل نہیں بلکہ مسائل پیدا کرنے کا جواز ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ملک کو موجودہ حالات اور نام نہاد قیادت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے؟اگر یہ ہوا تو حادثہ یقینی ہے۔مایوسی کے اس عالم میں دھیان پھر قاضی وقت کی کرسی کی طرف جاتا ہے۔اعلیٰ عدلیہ چاہے تو از خود نوٹس لیکر آف شور کمپنی مالکان، بیرون ملک اثاثہ جات رکھنے والوں سے سات یوم کے اندر جواب مانگیں کہ وہ ثابت کریں کہ یہ پیسہ کس طرح بیرون ملک لیکر گئے؟اگر یہ لوگ جواب نہ دے سکیں تو ان کی اسمبلی رکنیت ختم کردیں اور نیب اور ایف۔آئی۔اے سمیت دیگر اداروں پر مشتمل ٹیم بنا کر

تفتیش کا عمل شروع کریں۔ان لوگوں کے نام، اثاثے اور دولت انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ اس پر وقت اور پیسہ ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ جن لوگوں کی دولت ہے وہ خود ثبوت پیش کریں نہ کہ کوئی نام نہاد کمیشن مزید اربوں ڈالر تین سال بعد سب اچھا کی رپورٹ پیش کریں۔ جہاں تک نیب اور الیکشن کمیشن کا تعلق ہے ان میں اتنی سکت نہیں اور نہ ہی دلچسپی ہے۔ عدلیہ کا ترازو قاضی وقت کے ہاتھ ہے جسے حکمرانوں اور عوام کے درمیان عدل کا اختیار ہے۔آج عوام پوچھ رہے ہیں کہ قاضی کہاں ہے؟ اگر قاضی نے عدل نہ کیا تو پھر حکمران، عوام اور قاضی خدائی عدل کے منتظر رہیں اور یہ بھی سوچ لیں کہ الٰہی عدل عذاب الٰہی کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔

یہ بھی سوال ہے

ایک نجی ٹی وی پر نشر ہونے والے پروگرام سوال یہ ہے کو دیکھنے کے بعد احساس ہوا کہ ہم کتنے غیر ذمہ دار ہیں ، بنا تحقیق کے بنا علم ہونے کے اپنا فلسفہ یوں عوام پر یوں لاگو فرماتے ہیں جیسے ہم ہر علم پر قادر ہیں اور جو جو کہہ رہے ہیں حرف حرف درست اور تحقیق کیا ہوا ہے۔ ٹی وی پر مذاکرہ کرنے والے تمام اینکرز حضرات کو چاہیے کہ وہ اپنے میک اپ سے تھوڑا سا وقت بچا کر تحقیق پر بھی توجہ دیں۔ پروگرام سوال یہ ہے کہ میزبان سے گزارش ہے کہ وہ اپنا فلسفہ جھاڑنے سے پہلے پولیس کی تاریخ اور کارناموں پر توجہ دے لیتے اور انسانی حقوق ، آداب آدمیت اور اہمیت پر لیکچر دینے کا مطلب بھی بیان کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ جس پولیس POLICE سے پہلے پولیس والے کو جناب نئیر بخاری کے بیٹے یا گارڈ نے تھپڑ مارا اور پھر دھکا دیا وہ کس منہ سے معاشرے میں زندگی بسر کرے گا، وہ اپنے خاندان قبیلے، بیوی بچوں کے سامنے کس طرح جائے گا۔ کیا نئیر بخاری نے انسانیت اور آدمیت کی تزلیل نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔ میں جناب نئیر بخاری کا ہمدرد نہیں اور نہ ہی پولیس سے کوئی دشمنی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کچہری میں موجود سینکڑوں لوگوں میں جناب پولیس مین کو ایک

ہی مشکوک شخص نظر آیا جو پچھلے پینتالیس سال سے علاقے کی سیاست میں ہے، وزیر، مشیر، سینٹر، ممبر اسمبلی اور چیئرمین سینٹ رہا ہے اور آئے روز اس کی تصویریں اخباروں میں چھپتی ہیں۔ راولپنڈی اسلام آباد کے چند ہی لوگ ہیں جنھیں بچہ بچہ جانتا ہے۔ جن میں راجہ ظفرالحق، شیخ رشید احمد، ظفر علی شاہ، چوہدری تنویر، نئیر بخاری، اجہ پرویزاشرف، چوہدری نثار علی خان اور راجہ بشارت شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ سیاست میں اور عوام کے درمیان رہتے ہیں اگر کوئی پولیس والا راجہ ظفرالحق، ظفر علی شاہ یا چوہدری نثار علی خان کی تلاشی لینا چاہے تو اول اسے باوردی ہونا چاہیے، وہ انہیں سلام کرے جو کہ لفظ پولیس کا حصہ ہے اور بنیادی تربیت کا بھی حصہ ہوگا، پھر کہے مجھے اس بناء پر آپ کی تلاشی لینا ہے۔ دنیا بھر کی مہذب پولیس اسی طرح ایک عام، آدمی سے ڈیل کرتی ہے۔ اگر بھرے ہجوم میں ایک سفید کپڑوں میں موجود داڑھی والا شخص کسی کو بھی روکے اور تلاشی لینا شروع کردے تو پھر معاملہ الٹ سکتا ہے۔ جناب لاشکر سے گزارش ہے کہ وہ پنڈی اسلام آباد کے کسی ناکے پر تھوڑی دیر کے لیے تشریف لے جائیں اور مشاہدہ کریں کہ پولیس والے ہر داڑھی والے کی گاڑی، موٹر سائیکل اور سائیکل روک کر تلاشی لیتے ہیں اور اگر وہاں فوج یا رینجر نہ ہو تو تھوڑا بہت چائے پانی بھی لے لیتے ہیں۔

جناب لاشکر سے گزارش ہے کہ وہ لفظ پولیس POLICE پر بھی توجہ دیں اور دیکھیں

کہ کیا ہماری پولیس اپنے نام کی لاج رکھ رہی ہے۔ پولیس کی تربیت، کردار اور عمل میں پولیس نام کا کوئی عمل دخل ہے۔ پولیس کا مطلب ہے نرم خو، وفا شعار حکم بردار، نرم مزاج، ذہین، معاملہ فہم، سمارٹ اور چاق وچوبند۔ ہمارے ملک میں پولیس کے مقابلے میں پولس کا لفظ رائج ہوگیا ہے جس کا مطلب ہے متکبر، معاملات بگاڑنے والا، نا قابل اعتماد اور خوف پھیلانے والا۔ جناب لشکر سے درخواست ہے کہ وہ جناب وزیر داخلہ سے گزارش کریں کہ وہ پولس کو پولیس بنا دیں تاکہ آپ کے سوال کا جواب آسان ہو جائے۔

سوال یہ بھی ہے کہ پولیس جن لوگوں کی تزلیل کرتی ہے، جن کے گھر اجاڑتی ہے، جھوٹے مقدمے بناتی ہے، ذلیل و رسواء کرتی ہے، جنہیں تشدد کے ذریعہ مار دیتی ہے یا پھر مطلب کا بیان لیتی ہے، جن کی عزتیں اور آبروئیں لوٹ لیتی ہے اور دہشتگرد بننے پر مجبور کر دیتی ہے آخران کا غم خوار کون ہے؟ کیا جناب لشکر کو ماڈل ٹاؤن یاد نہیں ؟جس بچی کی حاملہ ماں اور پھوپھی پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنیں اس کا بھی ایک سوال ہے جس کا جواب کسی کے پاس نہیں ۔ نہ صدر، نہ وزیراعظم، نہ وزیر داخلہ، نہ آئی جی پولیس، نہ خادم اعلیٰ اور نہ لشکر اعلیٰ کے پاس ۔

دھرنا گردی اور دہشت گردی ! یہ تحریر ہے جناب اسد اللہ غالب کی جنہوں نے لکھے

میں قسم کھانے کی دھمکی دے رکھی ہے کہ انکا دوست بینکر انتہائی ایماندار، نیک نام اور فرشتہ صفت انسان ہے۔ یہ بہت بڑی قسم ہے مگر قسم کھانے والے کی کون قسم کھائے کہ اس کی قسم میں کوئی سقم نہیں۔ جناب اسد اللہ غالب میاں صاحبان پر غلبہ پانے کی کوشش جاری رکھیں مگر مستقبل قریب میں انھیں سوائے قسمیں کھانے کے اور کچھ نہیں ملنے والا۔ ان سے پہلے عرفان صدیقی اور عطاالحق قاسمی صحافیوں کا کوٹہ لے چکے ہیں اور مزید کی گنجائش شائد نہیں۔ وہ حکومت کے حق میں لکھتے رہیں، قسمیں کھاتے رہیں اس میں بھی بہت سے فوائد ہیں۔

آپ نے دھرنا گردی لکھا ہے اور مشورہ دیا ہے کہ وزیر اعظم اگر میری مانیں توجسطرح فوج دہشت گردوں اور سہولت کاروں کو نیشنل ایکشن پلان کے تحت نشانے پر لے رہی ہے اسی طرح دھرنا گردوں سے بھی نبٹیں۔ آگے لکھتے ہیں کہ دھرنے والوں کیساتھ دہشت گردوں جیسا سلوک کیا جائے۔ کیازبردست مشورہ ہے۔ ایسے قیمتی مشورے پر جناب مولانا فضل الرحمان اور اتحادی جماعتوں سے جناب وزیراعظم کو مشورہ لینا چاہیے۔ لگتا ہے کہ ماڈل ٹاؤن والے آپریشن کا مشورہ بھی کسی ایسے ہی دانا نے دیا ہوگا۔ سوال یہ بھی ہے کہ اس مشورے پر کسی لینکر، صحافی اور صافی وغیرہ نے کوئی پروگرام نہیں کیا حالانکہ اسپر ایک عدد جرگہ ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قیمتی مشورہ جناب وزیراعظم تک نہیں

پہنچا ہو۔

جناب اسد اللہ غالب کی حمایت میں بیگم تنویر لطیف نے کعبے کی قسم کے عنوان سے لکھا ہے کہ ایسی جسارت اللہ پر راسخ یقین رکھنے والا سچا مسلمان ہی کر سکتا ہے۔ آپ نے جناب اسد اللہ غالب کی تحریر کو روحانی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ آخر میں لکھتی ہیں کہ اسد اللہ غالب کا کالم آزاد کشمیر کے جون میں ہونے والے انتخابی معرکے سے قبل گلی گلی شہر شہر ٹیلیفونک رابطوں کا موضوع بن رہا ہے۔ دلوں کی دنیا بدلنے کے لیے کعبے کا حوالہ ہی کافی ہے۔ بیگم تنویر لطیف سے گزارش ہے کہ کالم نگاروں کی قلابازیاں نام کی کتاب پڑھ لیں اور بندہ مومن کی ایک پرانی امریکہ یاترا کا احوال بھی کسی سے معلوم کر لیں۔ جہاں تک آزاد کشمیر کے گلی کوچوں اور شہروں کا تعلق ہے تو اس بد قسمت خطہ زمین کی گلیاں ویران اور شہر سنسان ہیں۔ مجاور حکمران ہیں اور عوام بد حال ہیں۔ برادری حکومت ڈوگرا راج کی یاد دلا رہی ہے۔ لگتا ہے ان کو بھی شاید حکمران برادری کے فون آرہے ہوں گے کہ ان کا اگلا پروگرام کیا ہے۔ کونسا جنگل کاٹ کر بیچنا ہے اور کونسے منصوبے کو کاغذی شکل دے کر مال کمانا ہے۔ اسد اللہ غالب اور آنے والے الیکشن کا معاملہ کیا ہو سکتا ہے اس کی تشریح میڈم تنویر لطیف ہی کر سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم کشمیری دانشور اور چاچائے صحافت مشتاق منہاس کی صورت میں میاں خاندان اپنا پسندیدہ حکمران کشمیر کی گدی پر

بٹھا دیں اور اس گدی کو اسد اللہ غالب کی گود میں رکھ دیں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے حکمران ویسے بھی تو برائے نام ہی تو ہوتے ہیں۔ وہاں کانگرس اور بی جے پی کے چرن چھونے والے اور یہاں پیپلز پارٹی کے مجاور اور ن لیگ کے خادم عوام پر جبراً مسلط کیے جاتے ہیں۔

شاہ صاحب اور امریکن فقیرنی! نام نہاد حق اظہار کی آڑ میں نصرت جاوید لکھتے ہیں کہ وہ ذاتی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی املاک کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ دنیا میں احتجاج کے اور بھی طریقے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جب وہ اسلام آباد میں مقیم سفارت کاروں سے ملتے ہیں تو انہیں شکایات ملتی ہیں کہ مسلمان گستاخانہ کارٹونوں پر جس طرح ری ایکشن کرتے ہیں وہ درست نہیں۔ شاہ صاحب یقیناً سید ہیں۔ چونکہ وزیر دفاع انہیں ہمیشہ شاہ جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ شاہ جی سے گزارش ہے کہ ایک سید زادے کو ایسی وکالت زیب نہیں دیتی۔ آپ قرآن کریم کا مطالعہ کریں کہ گستاخان رسول ﷺ کے متعلق اللہ کا کیا حکم ہے۔ سورۃ توبہ اور سورۃ یونس پر ایک نظر ڈالیں اور دو چار روز کے لیے سرہانے رکھے انگریزی ناول کو تھوڑا دور کافی ٹیبل پر رکھ دیں۔ آپ نے جرمن مسخرے اور ترک صدر کی مثال پیش کی ہے جس کا گستاخان رسول ﷺ سے موازنہ درست نہیں۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ایک مسلمان ملک میں بسنے والا دیہاتی کس طرح احتجاج نوٹ کروائے۔ آپ نے ایک بار

ابن خلدون پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ابن خلدون نے صرف ایک لفظ ایجاد کیا تھا اور وہ ہے عصبیت ۔آپ نے اس کی وضاحت نہیں کی جو کہ آپ کا فرض تھا۔ابن خلدون نے عصبیت کو وسیع تر معنوں میں پیش کیا ہے۔ جس میں غیرت و حمیت بھی شامل ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ مغربی ممالک اظہار رائے پر قدغن نہیں لگا سکتے ۔ مہربانی فرما کر آپ ایک انگریزی کالم ہالوکاسٹ پر لکھ دیں اور پھر دیکھیں کہ آپ کا کیا حشر ہوتا ہے۔ سوائے ترک اور ایرانی سفارت خانے کے کوئی شکایت کنندہ مغربی سفارت کار آپ کے قریب آئے گا اور نہ ہی اپنی محفل میں بلائے گا آپ آرام سے گھر بیٹھیں گے اور مقدمہ ابن خلدون اور تاریخ کا مطالعہ کریں گے۔ سارا مغرب آپ پر ابل پڑے گا اور آپ کا تماشہ بنا دے گا۔آزادی اظہار رائے ، انسانی حقوق اور عالمی امن صرف کمزور اور دبی کچلی عوام کو ذلیل و رسواء کرنے کے بہانے ہیں۔

امریکہ میں مقیم اپنے سٹائل میں ورسٹائل زاہدہ ، عابدہ، درویشنی اور فقیرنی جنھوں نے حال ہی میں جھلی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جسے پاکستانی سرکاری اور نیم سرکاری دانشوروں نے علم تصوف پر لکھے جانے والی کتابوں کا نچوڑ قرار دیا ہے۔ میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے آج کل سارے درویش اور درویشنیاں کسی نہ کسی سیاسی جماعت اور حکمران ٹولے سے منسلک ہیں ۔ پیر اعجاز پیپلز پارٹی کے صدراورامریکن ولیتان لیگ سے وابسطہ ہیں ۔آپ

جب بھی پاکستان تشریف لاتی ہیں جاتی عمرہ کا دورہ بھی کرتی ہیں۔ آپ کی حکمران خاندان سے قربت راز کی بات نہیں بلکہ آپ ان سرکاری لکھاریوں میں شامل ہیں جن کا تعلق ن لیگ کے تھنک ٹینک سے ہے۔ پانامہ پیپر پر اوّل تو ایک درویش صفت شخصیت کو لکھنا ہی نہ چاہئے تھا اور اگر لکھنا ضروری تھا تو محترمہ تہمینہ درانی کی تقلید میں کہنا چاہیے تھا کہ عوام کا حق لوٹا دو۔ آپ نے لکھا کہ وزیر اعظم ڈٹ گئے۔ کس بات پر ڈٹ گے کہ وہ لوٹا ہوا مال واپس نہیں کریں گے۔ کیا یہ درویشی ہے؟ آپ نے پھر فرمایا کہ وزیر داخلہ نیویارک میں ہیں۔ پتا نہیں درویشوں اور فقیروں کو شاہوں کے قصیدے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ تھوڑا وقت نکالیں اور امام غزالی کی اور ابن عربی کو پڑھ لیں۔ وقت ملے تو حضرت نورالدین اویسیؒ کی منازل فقر، حقیقت تصوف اور راہ حقیقت کا مطالعہ کریں یا پھر صرف سیاسی کالم لکھیں اور فقر و ولایت کا سہارا لے کر جھلی کو بدنام نہ کریں۔

آپ کا تازہ ترین شوشاہ آرمی چیف پر ہے کہ وہ وزیر اعظم سے ایک سال کی مددت ملازمت بڑھانے کی خواہش رکھتے ہیں چونکہ انہیں اپنی پبلک سٹی دیکھ کر احساس ہوا ہے کہ قبل از وقت ریٹائر منٹ کا اعلان درست نہ تھا۔ آپ نے فوج اور سپہ سالار کو دبے لفظوں میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ آخر میں لکھتی ہیں کہ آرمی چیف بھی جب ہیرو بنا دیے جائیں تو ان کا بھی پھر گھر جانے کو دل نہیں

کرتا۔ سوال یہ بھی ہے کہ آپ میں اور حسین حقانی میں کیا فرق ہے ؟امید ہے آپ جواب دیں گی۔

کوئی ہے

پرانی کہاوت ہے کہ شہر میں بڑی آسودگی تھی، دور دراز سے آنیوالے قافلے شہر میں رکتے تھے اور نئی نئی چیزیں شہریوں کے ہاتھ بیچتے تھے۔ شہر والے ان چیزوں کے بدلے میں اپنی مصنوعات تاجروں کو فروخت کرتے اور خوب منافع کماتے تھے۔ یہ شہر زمین پر جنت کا ٹکڑا تھا۔ ہر سو ہریالی تھی، پہاڑ جنگلات سے بھرے تھے، اونچی چوٹیوں پر برفباری ہوتی تھی اور شہر کے اردگرد سینکڑوں میل پر پھیلی خدا کی زمین سرسبز کھیتوں پھلدار باغوں اور پھولوں سے مزین تھی۔ بارش رکتی تو درمیانی پہاڑیوں اور ٹیلوں پر، عجب منظر آمڈ آتا۔ سرسبز پہاروں اور ٹیلوں پر سفید اور بھوری گائیں، بھیڑیں، بکریاں اور گھوڑے چرنیں چلے آتے۔ مال مویشی ان چراگاہوں پر ایسے نظر آتے جیسے قدرت نے سبز زمین پر رنگ برنگے نقش گاڑھ دیے ہوں۔ ڈھلتے سورج کی کرنیں ان ٹیلوں پر الودعی شعاعیں بکھیرتیں تو نور ورنگ کا حسین منظر دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا۔ کہتے ہیں کہ شہر بے مثال کے جنوب میں صحرا تھا اور پھر سمندر تھا جہاں دنیا بھر سے تجارتی جہاز آکر رکتے اور پھر قافلوں کی صورت میں اپنا تجارتی سامان شہر تک لاتے۔

شہر کا حاکم رعایا پرور تھا۔ شہر اور اردگرد کی بستیوں میں قانون کی

حکمرانی تھی اور داروغہ شہر کسی ظالم اور جابر کو سخت ترین سزا کے بغیر نہ چھوڑتا تھا۔ عدل وانصاف کے لیے قاضی مقرر تھے۔ جو بروقت اور درست فیصلے کرتے تھے۔ صحرا میں کئی نخلستان تھے اور ہر نخلستان شہر سے بڑا تھا۔ یہ نخلستان عادل حکمران کے والد کے دور میں آباد ہوئے اور ہزاروں لوگ ان نخلستانوں میں جا کر آباد ہو گئے۔ حاکم شہر جہاندیدہ اور مستقبل کی خبر رکھنے والا تھا۔ اسے سمجھ تھی کہ اگر شہر کی آبادی ایک حد تک تجاوز کر گئی تو شہر کی خوشحالی اور امن متاثر ہوگا۔ سڑکیں اور گلیاں تنگ ہو جائیگی، پانی کی کمی ہوگی اور زرعی زمینیں آہستہ آہستہ ختم ہو جائیگی۔ جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر ہونگے اور بیماریوں کا نہ رکنے والا سلسلہ رعایا کی صحت اور ذہنی آسودگی کو متاثر کر دیگا۔

حاکم نے شہر کی آسودگی اور حفاظت کو مد نظر رکھتے ہوئے پہاڑوں سے آنیوالے دریاوں کو بند باندھ کر انکا رخ صحرا کی طرف موڑ دیا۔ صحرا میں بڑے بڑے تالاب بنوائے اور ہر تالاب کے گرد اگر بیس ہزار کھجور کے پودے لگوائے۔ کہتے ہیں کہ کھجور کا ایک درخت ایک انسانی زندگی کو خوارک مہیا کرتا ہے۔ عاقل بادشاہ نے ان نخلستان میں بیس ہزار لوگوں کو بسنے کی دعوت دی تو شہر کی نصف آبادی نخلستانوں میں منتقل ہو گئی۔ لوگوں نے نخلستانوں میں مزید شجرکاری کی، کھیت بنائے اور غلے کی اسقدر بہتات ہوئی کہ اردگرد کی ریاستوں سے لوگ

غلہ خریدنے شہر بے مثال اور اس کے نخلستان کی منڈیوں کا رُخ کرنے لگے۔
حاکم نے خدائی احکامات پیروی میں قدرت کے چار اُصول اپنائے اور روگردانی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں۔ اول زمین کی طرف متوجہ ہوا تاکہ عوام الناس کو اچھی، عمدہ اور صحت مند غذا سستے داموں ملے۔ اس اصول کے معاون اصولوں کے تحت زراعت کی تعلیم، ہنر اور اوزار مہیا کرنیوالے کارخانے لگوائے تاکہ لوگ اس اصول سے فیض یاب ہو سکیں۔ اسی اصول کے تحت کپڑا بننے، رنگنے اور اسے خوشنما بنانے کے لیے دور دراز کے ملکوں سے کاریگر منگوائے اور کارخانے لگائے۔ خوارک اور لباس کے اصولوں کیساتھ رہائش کے اصول کو اولیت دی تاکہ لوگ کشادہ اور ہوادار مکانوں میں رہ سکیں۔ غذا، لباس اور رہائش کے اصولوں پر کام مکمل ہوا تو حاکم نے تمام اصولوں اور صنعتوں پر فضیلت والے اصول سیاست پر توجہ دی تاکہ عوام الناس باہمی میل ملاپ، اخوت، محبت، مساوات اور بھائی چارے کی فضاء میں ایک ایسے معاشرے سے منسلک ہوں جسے کسی اندرونی خلفشار اور بیرونی حملے کا خوف نہ ہو۔ شہریوں نے اس اصول کے تحت علم، عقل اور شعور رکھنے والوں کو اپنا سردار منتخب کیا جو لالچ، ہوس اور بد اعمالیوں سے نہ صرف مبرا تھے بلکہ عام لوگوں کو بھی ان قباحتوں سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ عقل و شعور اور ایمان کامل سے مزین ان افراد نے حاکم وقت کی مدد کی اور قدرت کے متعین کردہ دیگر اصولوں میں پر مبنی قوانین بنائے تاکہ عام لوگ علم، عدل، تجارت اور دیگر شعبوں میں بے خوف ترقی کر سکیں۔

ترقی، خوشحالی اور امن کا یہ سلسلہ چند نسلوں تک چلا اور پھر رفتہ رفتہ شہر کی رونقیں ماند پڑنے لگیں۔ عادل حکمران کی رحلت کے بعد پڑوسی ملک کے حکمران نے ایک ایسی چال چلی جس نے شہر بے مثال کو بے حال کر دیا۔ دشمن ملک کے ایجنٹوں نے تاجروں صنعت کاروں اور استادوں پر توجہ مذکور کی اور انہیں تحائف دیکر ایسے اصولوں او، رقوائد پر ترغیب دی جو سراسر شیطانی وسوسوں پر مبنی تھے۔ علماء نے قدرتی اصولوں اور الٰہی احکامات کو پس پشت ڈال کر مادی اصولوں کا پرچار اس حکمت سے کیا کہ معاشرے کی اقدار ہی بدل گئیں۔

پڑوسی ملک نے سچائی اور حکمت کو فریب قرار دیکر اسے علماء کی ایک جماعت پیدا کی جو چرب زبانی میں کوئی ثانی نہ رکھتی تھی۔ ان علماء نے عوام کو اسقدر فریب زدہ کیا کہ وہ علمائے حق کے دشمن ہوگئے۔ فریب زدہ عوام نے عادل بادشاہ کے ولی عہد کے خلاف بغاوت کی اور اسے سارے خاندان سمیت قتل کر دیا۔ ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر اس شہر بے مثال کے ایک بڑے صنعت کار اور ڈاکوؤں کے سردار نے باہمی مشاورت سے دشمن ملک کے بادشاہ کی ایماء پر ایک ایسی جماعت تیار کی جو لوٹ مار اور دیگر جرائم کی ماہر تھی۔ ڈاکوؤں کے سردار نے ایک شاطر اور بے رحم ڈاکو کو داروغہ شہر مقرر کیا۔

پولیس کی جگہ ایک ڈاکو فورس تیار کر لی۔ اس طرح عدلیہ ، انتظامیہ اور دیگر شعبوں میں ایسے لوگ بھرتی کیے جو نہ صرف عوام دشمن تھے بلکہ پڑوسی دشمن ملک کے ایجنٹ بھی تھے۔ ڈاکواور صنعت کار نے ایک طرف ملکی وسائل کو لوٹنا شروع کیا تو دوسری طرف عوام کو نفسیاتی طور پر نقلی علماء اور دشمن کی ایماء پر مفلوج کر دیا۔ صنعت کار نے چھوٹے صنعت کاروں سے کام چھین لیا اور سارے شہر کے صنعت پر قابض ہو کر اسے اپنے بھائیوں ، بیٹوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا۔

ڈاکو نے خزانے کو ہی نہیں بلکہ عام لوگوں کو بھی لوٹا اور سب کچھ شہر بے مثال سے ہزاروں میل جزیرے میں منتقل کر دیا۔ ان دونوں کی دیکھا دیکھی بہت سے جرائم پیشہ لوگوں نے یہی روش اختیار کی چونکہ عدالتوں نے ایسے قوانین کی پیروی شروع کر دی جو ان ہی جرائم پیشہ لوگوں نے اپنی سہولت اور لوٹی ہوئی دولت کے تحفظ کے لیے بنائے تھے۔ یوں عوام عدالتوں سے مایوس ہو کر جرائم پیشہ عناصر کی حکمرانی کو تسلیم کرنے اور اُن کی غلامی قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ عادل بادشاہ کے دور میں شہر بے مثال اور اس کے دیہاتوں ، قصبوں ، بندرگاہوں اور نخلستانوں کی حفاظت کے لیے ایک جری اور بہادر فوج معرض وجود میں آچکی تھی مگر کشمکش اور فریب زرہ ماحول میں فوج کئی وجوہات کی بنا پر

خاموش رہی۔ فوجی جرنیلوں کا خیال تھا کہ ان کی ذمہ داری ملکی سرحدوں کی نگرانی ہے نہ کہ اندرونی معاملات درست کرنا ہے۔ یہ کام علمائے سیاست، مدبرین اور منتظمین کا ہے۔ انہیں پتہ تھا کہ علمائے سیاست، مدبرین اور منتظمین اغیار کے ہاتھوں بک چکے ہیں اور ملکی دولت لوٹ کر دور دراز جزیروں میں منتقل کر چکے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ خاموش رہے۔

جن دنوں شہر بے مثال بد اعمال اور عیاش ٹولے کے ہوش و حرص کے نشانے پر تھا ان ہی دنوں دشمن ملک کے ہنر مندوں اور کاریگروں نے کمال مہارت سے شہر بے مثال کی زمینوں اور نخلستانوں کو سیراب کرنے والے دریاؤں کا رخ اپنی طرف موڑ لیا۔

پڑوسی ملک کے ایجنٹوں نے ساحلوں اور بندرگاہوں پر موجود آبادی کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا اور اُن کے سرداروں کو بھاری رشوت دیکر ساحلی علاقوں میں بغاوت کروادی۔ ساحل اور بندرگائیں ویران ہو گئیں تو لالچی صنعت کار اور ڈاکو خاندان نے تجارت اور صنعت پر اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کے تحت پڑوسی دشمن ملک کی اجارہ داری تسلیم کر لی۔ ان قوانین کے تحت مال تجارت پڑوسی دشمن ملک کے تاجر سستے داموں خرید کر دوسرے ملکوں کو مہنگے داموں بیچنے لگے تو شہر بے مثال کے خوشحال عوام بدحال ہو گئے۔ دریا اور ڈیم خشک ہو گئے، نخلستان اُجڑ گئے، بندرگاہوں پر آنیوالے جہاز پڑوسی دشمن ملک کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے لگے۔ کھیت ویران ہو گئے اور عوام الناس

پینے کے پانی کو بھی ترسنے لگے۔ دیہاتوں، قصبوں اور نخلستانوں کی آبادی نے شہر کا رخ کیا تو لوگ روٹی کے ٹکڑے اور پانی کی بوند کو ترسنے لگے۔ چند ہزار لوگ جو ڈاکوؤں کے سردار اور لیٹرے صنعت کار کے دست و بازوں تھے اپنے خاندانوں سمیت اپنے اپنے جزیروں پر چلے گئے۔ قدرت کے اصولوں اور قوانین الٰہی سے انحراف نے شہر بے مثال کو اجڑے دیار میں بدل دیا۔ شہر اجڑ گیا، بستیاں ویران ہوگئیں، نخلستان پھر صحرا میں بدل گے اور بندرگاہ پر مچھیروں کی چند بستیاں باقی رہیں۔

کثیر آبادی موت کی وادی میں چلی گئی اور جو بچ گئے وہ پڑوسی ممالک کی طرف چلے گئے۔ بہت سے راستوں میں مر گئے اور جو بچ نکلے انہیں پڑوسی ممالک نے اپنی غلامی میں لے لیا۔

فوج البتہ اپنی چھاؤنیوں میں محفوظ رہی چونکہ چھاؤنیوں کے کنوؤں میں ابھی تک وافر مقدار میں پانی تھا اور خوراک کی بھی کمی نہ تھی۔ فوجی جوان اب بھی سرحدوں کی حفاظت پر مامور تھے اور کسی حملہ آور کو شہر بے مثال کی طرف آنے کی جرات نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ کئی ماہ تک چیلیں، گدھ اور جنگلی جانور شہر بے مثال میں ڈیرے ڈالے رہے اور پھر تھک کر چلے گئے بدبو اور تعفن ختم ہوا تو دوسرے ممالک کے سیاح شہر بدحال کا نظارہ کرنے آنے لگے۔ کہتے ہیں کہ

عرصہ بعد شہر کے کھنڈرات کے درمیان باقی بچے بلند مینار پر ایک عورت نمودار ہوئی اور زور سے پکارا کہ کوئی ہے؟؟

مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ فوج دور سرحدوں پر واقع چھاؤنیوں اور قلعوں میں تھی، غیر ملکی سیاح بربادی کا نظارہ کر کے جا چکے تھے، جنگلی جانوروں اور درندوں کی ضیافت کا کوئی سامان باقی نہ تھا۔ عظمت رفتہ کا گواہ ایک مینار اور بچ جانیوالی ایک بوڑھی عورت باقی تھی۔ وہ ہر رات مینار سے پکارتی کہ کوئی ہے مگر کوئی جواب نہ آتا۔ چند روز بعد وہ بوڑھی عورت بھی مر گئی۔

کیا کوئی جو میری آواز سن سکتا ہے اور اس ملک بے مثال کو چوروں، ڈاکوؤں اور ان کے ہم خیالوں سے بچا سکتا ہے؟ اگر کوئی ہے تو جلدی کرے ورنہ رات ہو جائے گی اور آخری بوڑھی عورت کی آواز آئے گی کہ کوئی ہے؟ مگر یہاں کوئی نہ ہوگا۔

میرا وطن مافیا کی جنت

وقت گزرتا رہا جگہیں اور مناظر بدلتے رہے امن و امان قصہ ماضی ہوا تو دہشت اور خوف نے انسانی اخلاقی رویے، معاشرتی اور معاشی اصول اور ریاستی قوانین ہی بدل دیے۔ ہر انسان دوسرے انسان کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا تو طاقتور اقوام نے کمزور قوموں پر من مانے قوانین کا نفاذ کیا اور اُن کی آزادی اور عزت چھین لی۔ چھوٹے اور معاشی لحاظ سے کمزور ممالک کے حکمرانوں، سیاستدانوں، دانشوروں، صحافیوں اور میڈیا ہاؤسز کے مالکان نے ہی نہیں بلکہ مذہبی اور دینی سکالروں نے بھی ملک دشمنی، قوم فروشی اور دینی بیزاری کا کھل کر مظاہر کیا اور طاقتور اقوام اور حکمرانوں کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔

اگر کسی کمزور اور ناتواں نے قومی وقار، ملکی مفاد، دین اسلام اور افواج پاکستان کی بات کی تو نام نہاد دانشوروں اور صحافیوں کے مخصوص ٹولے نے انہیں غیرت بریگیڈ کا نام دیکر بے غیرتی کا عملی مظاہرہ کیا اور مال کمایا۔ سیاست اور صحافت کے کاروبار نے دیگر صنعتوں پر غلبہ حاصل کر لیا چونکہ عالمی منڈی میں سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار یہی ہے۔ نظریہ پاکستان، افواج پاکستان، اسلام اور آئی ایس آئی کے خلاف لکھنے اور بولنے والے صحافیوں، سیاستدانوں اور دانشوروں کی عالمی سطح پر پذیرائی ہوتی ہے اور دیکھتے ہی

دیکھتے ان کا طرز زندگی بدل جاتا ہے۔

سبط حسن اپنی تحریر ماضی کے مزار میں لکھتے ہیں کہ عراق کی ایک ریاست اریک کے حکمران توھیگل نے 220 قبل مسیح میں عراق کے گزرے ہوئے بادشاہوں کی ایک فہرست تیار کی جنکا زمانہ حکومت ہزاروں سال پر محیط تھا۔ یہ حکمران سومیر، عکاذ اور اسور تہذیبوں کے دور میں ہوئے جن کے آثار آج بھی محفوظ ہیں۔ ان بادشاہوں کے نام اور القاب ان کے اوصاف پر مبنی تھے۔ ایک حکمران کا نام یا لقب کلبدن یعنی کتا تھا چونکہ یہ حکمران انسانوں کے بجائے کتوں سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ دوسرے بادشاہ کا نام قلومو یعنی بھیڑ تھا جس کی وجہ اُس کی سستی، کاہلی اور مخلوق خدا سے بیزاری تھی۔ اسی دور میں زرقاقین یعنی بچھو نام کا ایک بادشاہ بھی ہو گزرا ہے جو انتہائی ظالم اور سفاک تھا۔

میں سبط حسن کی تحقیق کا قائل نہیں ہوں اور نہ ہی مغربی محققین کی تحریروں میں عمیق سچائی دیکھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تحریروں میں کسی پیغمبر یا الہامی کتاب کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ یہ لوگ عظیم سیلاب یعنی طوفان نوحؑ کا سرسری ذکر تو کرتے ہیں مگر تفصیل اور تشریح سے گریزاں ہیں۔ بابلی تہذیب کا قرآن کریم بھی ذکر ہے مگر مغربی محققین اسپر خاموش ہیں۔ اسی طرح قدیم تحریروں کے تراجم بھی ان لوگوں نے اپنی ضرورت کو مد نظر رکھ کر

کیے ہیں جس میں کسی الہامی کتاب، الٰہی قوانین اور انسانی روایات کا کوئی ذکر نہیں۔

سبط حسن کی ساری تحریریں اسی انداز میں لکھی گئی ہیں جن میں دلچسپی کا مواد بہر حال موجود ہے۔ سبط حسن کی مذکورہ تحریر کا خیال اپنے حکمرانوں، سیاستدانوں، صحافیوں اور دانشوروں کے کردار، خیالات اور اوصاف کی وجہ سے آیا۔ تاریخ انہیں بھی تو غیر ملکی قوتوں کے آلہ کار، چائینہ کٹنگ، دہشت گردوں کی معاونت، مافیا کی سرپرستی، کرپشن غیر ملکوں میں اثاثوں کی منتقلی، سوئس اکاؤنٹ، پانامہ پیپر، وکی لیکس، عوام کش، حکومتی پالیسیوں، این آر او، میثاق جمہوریت، قومی غیرت اور ملکی وقار پر سودے بازی، ذاتی مفادات کی حفاظت اور اقرباپروری جیسے جرائم میں ملوث مجرموں کے طور پر یاد کرے گی۔

زرداری اور نواز شریف کے گھرانوں کا تکبر، عوام کش پالیسیوں، عیش و عشرت کی زندگی اُن کے حامیوں کے مظالم اور اُن کے وکیلوں، ہمدرد افسروں، صحافیوں، سیاستدانوں اور مفاد پرست منافقوں کی چالیں دیکھ سورۃ القصص میں بیان کردہ قارون کا واقع یاد آجاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے کسی صحافی نے لکھا تھا کہ اگر زرداری اور شریف خاندان ایک کروڑ ڈالر مہانا خرچ کریں تو ان کی دولت سو سال تک بھی خرچ نہ ہو پائے گی۔ ساری دنیا اور سارا پاکستان جانتا ہے کہ دونوں گھرانوں نے یہ دولت کسطرح کمائی اور کیسے بیرون ملک منتقل کی

مگر نہ دنیا کو اس پر شرمندگی ہے اور نہ پاکستانیوں میں اتنی جرات ہے کہ وہ ان لیڈروں سے اس دولت کا حساب لیں۔

دنیا اس بات پر خوش ہے کہ واحد ایٹمی مسلمان ریاست معاشی تباہی کے دھانے پر ہے اور اس ریاست کا ہر فرد غیر ملکی مالیاتی اداروں کا مقروض ہے۔ ان مالیاتی اداروں کی منصوبہ بندی میں پاکستان دشمن غیر ملکی اداروں اور ایجنسیوں کے ذہن کارفرما ہیں جنہیں پاکستانی حکمران سیاسی جماعتوں، بیوروکریسی، اشرافیہ، انتظامیہ اور نشریاتی اداروں کے مالکان سمیت کچھ کاروباری اداروں کی مکمل تائید و حمائیت حاصل ہے۔

موجودہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ بہت جلد ملکی اور غیر ملکی قوتوں کا شیطانی ملاپ کسی بڑے حادثے کا موجب بن سکتا ہے اور ریاست ایک باجگزارانہ حیثیت میں تبدیل ہو کر آزادی اور عزت سے محروم ہونے والی ہے۔

خدانہ کرے اگر ایسا ہوا تو اس حادثے کی تمامتر ذمہ داری پاکستانی مسلح افواج، عدلیہ اور بے حس عوام پر ہوگی۔ جہاں تک سیاستدانوں کا تعلق ہے تو جنرل پرویز مشرف کے بعد وہ میثاق جمہوریت کے لبادے میں جی بھر کر ملک لوٹ

رہے ہیں۔

سورۃ القصص میں بیان ہے کہ قارون کا طرز زندگی دیکھ کر عام لوگ حسرت سے کہتے تھے کہ کاش ان کے پاس بھی ایسے ہی محلات، باغات، خزانے، غلام، کنیزیں اور دیگر مال و دولت کے انبار ہوتے جیسے قارون کے پاس ہیں۔ تفسیروں میں لکھا گیا ہے کہ قارون حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا چچیرا بھائی اور عام آدمی تھا۔ قارون نے کسی طرح فرعون کے دربار تک رسائی حاصل کرلی اور پھر ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت جمع کرنے لگا۔ اسکا تعلق تو بنی اسرائیل سے تھا مگر فرعون سے تعلق کی بنا پر وہ اپنی ہی قوم کا خون چوستا اور مظالم ڈھاتا تھا۔ قرآن کی تاریخ کے مطابق چند سالوں میں قارون کے پاس اسقدر دولت جمع ہو گئی کہ اُس کے خزانوں کی چابیاں اُٹھانے کے لیے ایک بڑی جماعت درکار تھی۔ جب وہ شاہانہ لباس پہن کر نکلتا تو سبک رفتار گھوڑوں کی کئی قطاریں اُس کی سواری کے ہمراہ چلتیں۔ وہ بڑے تکبر سے چلتا اور کہتا کہ یہ سب اُس کی ذہانت اور عقل کی وجہ سے ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے جب صدقہ، عشر اور زکوٰۃ کے احکامات کا اعلان کیا تو قارون نے حکم ربّی کی مخالفت کی اور عوام کو یہ کہہ کر ورغلانے لگا کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ معمولی لوگ ہیں جنھوں نے پیغمبری کی آڑ میں تمہارا عقیدہ چھین

لیا اور اب صدقہ اور زکوۃ کا حکم دیکر تمہارا مال ہڑپنا چاہتے ہیں۔ اسپر بھی بات نہ بنی تو ایک عورت کو لالچ دیکر حضرت موسیٰ کی کردار کشی کا سامان پیدا کیا۔ پیغمبر خدا نے عورت کو قوم کے سامنے پیش کیا اور آخرت کا خوف دلایا تو اُس نے اقرار کیا کہ یہ سب قارون کی چال تھی اور وہ اس کے بہکاوے میں آ گئی تھی۔

یہاں قارون کا واقع اختتام پذیر ہوتا ہے اور عذاب الٰہی کی ابتداء ہوتی ہے۔ بیان ہے کہ جب قارون اپنی ریاست سمیت زمین میں دھنسنے لگا تو وہی لوگ جو حسرت سے کہتے تھے کہ کاش ہم بھی قارون جیسے ہوتے کہنے لگے اللہ کا شکر ہے کہ ہم قارون جیسے نہ تھے ورنہ آج اُس کے ساتھ عذاب میں پکڑے جاتے۔

ذرا غور کریں تو آج ہم ایک ایسے ہی دور سے گزر رہے ہیں۔ عام لوگوں کی زبان پر ارب اور کھرب پتی پاکستانیوں کے قصے ہیں۔ نواز شریف، زرداری، ملک ریاض، پرویز مشرف، جنرل کیانی، مشتاق مہناس، فریال تالپور، چوہدری مجید، ٹن وزیر، مولانا فضل الرحمٰن، اسفندیار ولی، شیرپاؤ، مجیب الرحمٰن شامی، حسن نثار، نجم سیٹھی اور دیگر کی دولت کے انبار دیکھ کر لوگ حسرت سے کہتے ہیں کہ کاش وہ بھی ایسے ہی ہوتے۔

سب جانتے ہیں کہ زرداری اور شریف خاندان ماضی قریب میں عام لوگ تھے اور اُن کے خاندانی وسائل بھی محدود تھے۔ محنت

اور ایمانداری سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ دنیا کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے۔ دونوں خاندانوں نے ٹیکس چوری، سیاسی بلیک میلنگ، کرپشن، کک بیک اور اقتدار میں آ کر غیر قانونی ہتھکنڈوں اور کمیشن مافیا کی سرپرستی سے ملکی خزانہ لوٹا اور جمہوریت کی آڑ میں پاکستانی عوام کے گلے میں عالمی مالیاتی اداروں کی غلامی کا طوق ڈال دیا۔

ملک ریاض کا شمار ان دونوں گھرانوں کی صف میں آتا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ ایم ای ایس کا معمولی اہلکار چند سالوں میں کھرب پتی کیسے بن گیا۔ یہ سب جنرل پرویز مشرف، فوجی جرنیلوں، آصف علی زرداری، گجرات کے چوہدریوں اور شریف خاندان کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ملک ریاض نے ٹیلی وژن پروگراموں میں کہا کہ وہ اپنی فائل کے نیچے ٹائیر لگا دیتا ہے اور رشوت کے زور پر وہ اپنا کام نکالتا ہے۔ ملک ریاض نے تو اپنی کرپشن کا اعتراف کر لیا مگر وہ لوگ جو ملک ریاض سے رشوت لیکر غیر قانونی کام کرتے ہیں ان پر حکومت اور عدلیہ نے کوئی توجہ نہ دی۔ اگر ملک میں عدل و انصاف نامی کوئی چیز ہوتی تو اگلے ہی روز چیف جسٹس آف پاکستان ملک ریاض کو عدالت میں طلب کر لیتے اور تب تک جیل میں رکھتے جب تک اُن رشوت خور افسروں سیاستدانوں اور حکمرانوں کے چہرے بے نقاب نہ ہوتے اور انہیں سزائیں نہ ملتیں۔

ملک ریاض نے پاکستان کے اندر ایک ملک آباد کر رکھا ہے جہاں پاکستان کا آئین ، قانون اور عدالتیں بے بس ہیں۔ بحریہ ٹاؤن کی کسی بھی ہاؤسنگ سکیم میں ہونے والے جرائم اور بحریہ ٹاؤن انتظامیہ کی طرف سے مکینوں پر زیادتیوں کو کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی ہاؤسنگ سکیم میں پولیس سٹیشن نہیں اور نہ ہی میڈیا کو ان ہاؤسنگ سکیموں میں رونما ہونے والے حادثات ، جرائم اور جبر کی رپورٹ کرنے کی اجازت ہے۔ بحریہ ٹاؤن کے اپنے قوانین ہیں اور ان ہاؤسنگ سکیموں کے مکین ملک ریاض کی رعایا ہیں۔

رحمان ملک اور ملک ریاض کی کہانی ایک جیسی ہے۔ رحمان ملک کے سر پر جنرل ضیاء الحق نے دست شفقت رکھا اور پھر پیپلز پارٹی نے اُسے اپنا لیا۔ رحمان ملک کی داستان عظمت ذوالفقار مرزا کھل کر بیان کر چکے ہیں اور جناب خورشید شاہ پر مبشر لقمان نے ثبوتوں سمیت کئی ٹیلی ویژن پروگرام پیش کیے جس پر چیف الیکشن کمشنر ، چیف جسٹس آف پاکستان ، چیئرمین نیب اور حکومت پاکستان نے کوئی توجہ نہ دی۔

ملک ریاض ، رحمٰن ملک ، خورشید شاہ ، کیانی برادران ، چیئرمین احتساب بیورو چوہدری قمرالزمان اور محترم نواز شریف کے ذاتی عملے میں شامل اہلکاروں کی معمولی حیثیت سے اعلیٰ ترین منازل پر ترقیاں نوجوان نسل کے شوق اور خواہشات کو اُبھارتی ہیں کہ وہ بھی آئین اور قانون کی بھاڑ کو پھلانگ کر دنوں ،

مہینوں اور چند سالوں میں نہ صرف کروڑ پتی اور ارب پتی بن جائیں بلکہ سینٹ، قومی یا پھر صوبائی اسمبلی کی ایک عدد سیٹ خرید کر سیاسی میدان میں بھی مقام بنا لیں۔

نوجوان صحافیوں اور قلمکاروں کے لیے جناب حسن نثار، مجیب الرحمٰن شامی، نذیر ناجی، نجم سیٹھی، کامران خان، جاوید چوہدری، حامد میر، سلیم صافی، انصار عباسی، ابصار عالم مشتاق مہناس، امتیاز عالم اور دیگر ارب پتی صحافی، دانشور، کالم نگار اور اینکر پرسن، جادوگرانہ خوشحالی کی مثال ہیں۔ بہت سے نوجوان صحافی ان صاحبان علم و قلم کی راہ پر چل نکلے ہیں اور مختلف سیاسی جماعتوں اور غیر ملکی اداروں سے وفاداری کا حلف لیکر پاکستان، اسلام، افواج پاکستان، آئی ایس آئی، شہدائے اسلام، بانیان پاکستان، تحریک پاکستان، ملت اسلامیہ اور اُمت رسول ﷺ پر اپنے اپنے انداز اور مینڈیٹ کے مطابق یلغار کر رہے ہیں۔

مشتاق منہاس نوجوان صحافیوں کے لیے تازہ ترین اور تیز رفتار ترقی کی مثال ہے۔ مشتاق منہاس نے جماعت اسلامی کے صدقہ وخیرات پر تعلیم حاصل کی اور پھر جماعت اسلامی ہی کی سفارش پر بحیثیت رپورٹر کام شروع کیا۔ نصرت جاوید کیساتھ بحیثیت معاون اینکر کئی بار اپنی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ

میرے عزیز رشتہ دار مجھے بہت سے کاموں کے لیے سفارش کا کہتے ہیں مگر انہیں پتہ نہیں کہ میری ایسی حیثیت نہیں کہ میں انہیں نوکریاں دلواسکوں یا اُن کے بچوں کو کسی سکول میں داخلے کے لیے سفارش کا بندوبست کروں۔

آگے کیا ہوا اور حافظ افضل بٹ نے وادی نیلم سے اُتر کر اسلام آباد پریس کلب کی مسجد میں بحیثیت موذن کس طرح نوکری حاصل کی اور پھر عظیم صحافی اور دانشور بنکر ملک اور قوم کی کون کون سی خدمت سرانجام دی اسکا بہتر احوال مشتاق منہاس ہی جانتا ہے۔چونکہ بٹ صاحب کی صحافیانہ سیاست اور جرنلسٹ ہاؤسنگ سوسائٹی کی طاقت نے دونوں کو پہلے چوہدری پرویز الٰہی کے پنجاب دربار اور پھر آزاد کشمیر کے ایک ٹن وزیر اور جناب رحمٰن ملک کی مہربانیوں نے انہیں کشمیر ہاؤسنگ سکیم کا کرتا دھرتا بنادیا۔ دو ہاؤسنگ سکیموں اور دو سیاسی جماعتوں سے قربت نے مشتاق منہاس کو چانکیائی سیاست اور لینڈ مافیا کی تربیت نے ایسے گر سکھائے کہ وہ میاں خاندان کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ وہ مشتاق منہاس جو اپنے کسی رشتہ دار کو اسلام آباد میں معمولی نوکری اور عام سکول میں داخلے کی حسرت پر نادم تھا میاں خاندان کا خادم اور آزاد کشمیر کا حاکم بن گیا۔ آج مشتاق منہاس آزاد کشمیر اسمبلی کا ممبر، ارب پتی سیاستدان، حکومت کا وزیر اور چند ماہ بعد وزیراعظم بننے والا ہے۔ شنید میں ہے کہ رائے ونڈ کا شاہی خانوادہ کچھ عرصہ بعد آزاد کشمیر کی باجگزار حکومت بدل دے

گا اور مشتاق منہاس کو تخت کشمیر پر بٹھا کر مودی سرکار سے نیا سیاسی کاروبار شروع کریگا

۔

مشتاق منہاس نوجوان صحافیوں کے لیے۔برق رفتار ترقی کی بہترین مثال ہے۔ بشر طیکہ وہ حافظ افضل بٹ کی شاد گری کا اعزاز حاصل کر سکیں ۔ لینڈ مافیا اور صحافی مافیا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر کسی صحافی کو لکھنا پڑھنا اور بولنا نہ بھی آئے تو وہ مشتاق منہاس اور حافظ افضل بٹ کے سو فیصد آز مودہ نسخوں پر طبع آزمائی کرے تو کامیابی یقینی ہے۔ صحافیوں ، دانشوروں اور لکھاڑیوں کی ترقی غیر ملکی ایجنسیوں اور پاکستان مخالف اقوام کی ہمنوائی اور مافیا کی خدمت سے وابستہ ہے۔ لینڈ مافیا سے لیکر واٹر مافیا، مرغی اور انڈہ مافیا تک سینکڑوں مافیا گروپوں نے ملک کی معیشت ، صنعت اور سیاست پر کنٹرول حاصل کر رکھا ہے۔ عدلیہ ان مافیا گروپوں پر کوئی قدغن لگانے سے قاصر ہے۔ انتظامیہ اور سیاسی اشرافیہ ان کی شراکت دار اور وظیفہ خوار ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو صرف ایک قارون کا سامنا تھا جبکہ پاکستان اور پاکستانی عوام کے سامنے مافیاجات کی صورت میں وقت کے قارونوں کی ایک فوج کھڑی ہے جسے ملکی اور غیر ملکی دہشت گردوں اور ملک دشمن حکومتوں اور ریاستوں کی مکمل حمائیت حاصل ہے۔

فرمان الٰہی ہے کہ جب ظلم و جبر ایک حد سے تجاوز کر جائے تو الٰہی قوتیں خود بخود حرکت میں آجاتی ہیں۔ آج پاکستان مافیا کی جنت اور عام آدمی کے لیے جہنم ہے۔ عام آدمی کے لیے زندگی عذاب اور مافیا سے منسلک قانون شکنوں کے لیے عشرت گاہ ہے۔ میاں، زرداری اور چوہدری خاندانوں نے جو کچھ پچاس سالوں میں جمع کیا مافیا جات نے بیس سالوں میں ان سے سوگنا زیادہ کما کر انہیں نہ صرف اپنے ساتھ ملا لیا بلکہ اپنی مرضی و منشا کے تابع بھی کر لیا۔

آج عام لوگ جس حسرت سے پاکستان کی گلیوں اور محلوں کی خاک سے اُٹھنے والے نو دولیتوں کے تاج محل اور شاہانہ طمطراق دیکھتے ہیں وہ جلد ہی ان کا عبرت ناک انجام بھی ضرور دیکھیں گے۔ قدرت کا اپنا آئین، قانون اور طریقہ نفاد ہے۔ جسطرح ان لوگوں نے صدیوں کا سفر دنوں میں طے کیا ہے اسی طرح ان کا انجام بھی چند منٹوں میں ہوگا۔ صحافی مافیا کے سرغنہ اگر یہ تحریر پڑھیں تو وہ اسکا مذاق ضرور اُڑائیں گے اور اُسے کسی غریب پاکستانی کی خواہش سے تعبیر کرینگے چونکہ تکبر اور رعونت سے بھرے دماغوں میں قدرت کے کاموں کو سمجھنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سکندر مرزا، ایوب، بھٹو، یحییٰ، مجیب، ضیاء الحق، رضا شاہ پہلوی، حافظ الاسد، قذافی اور صدام حسین کے دلوں اور دماغوں میں بھی قدرت کے اشاروں کو سمجھنے کی گنجائش باقی نہ تھی۔ شائد یہی

وجہ تھی کہ وہ بھی باقی نہ رہے۔